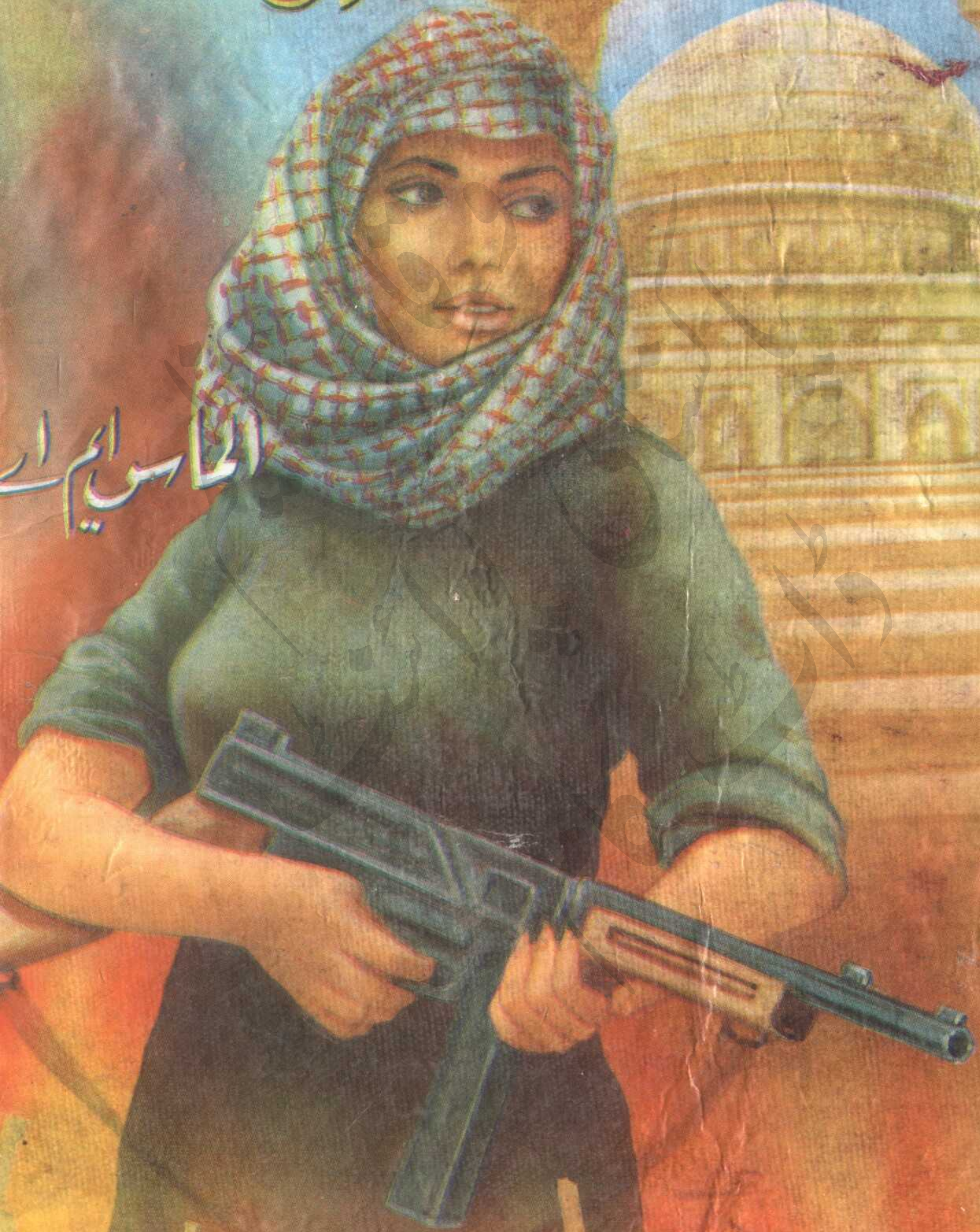


زرقا

الخامس ايم



فہرست

61 — 9	ماہ منتخب	1
106 — 62	سلامہ	2
157 — 107	معرکہ چنی گوث	3
213 — 158	زرقا	4
271 — 214	سلجوقی ساحرہ	5
325 — 272	جمال پیکر جمال	6
383 — 326	صحرا نور و شہزادہ	7
431 — 384	آغا بیگی	8
482 — 432	شوخی زبان حمیدہ	9
542 — 483	ہائی پی شیا	10

غریب شہر

اسلامی تاریخی ناول اور اسلامی تاریخی کہانیوں کے قاری جانتے ہیں کہ تاریخی ناول نویسی کا اسلوب اس قدر ترقی یافتہ ہو گیا ہے کہ اب ناول اور کہانی یا افسانہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ خاص کر آپ کے محبوب ناول نگار اور افسانہ، کہانی نویس زیب ملیح آباد (الماس ایم۔ اے) کے سلسلہ میں تو ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں انہیں افسانہ اور ناول پر اس درجہ قدرت حاصل ہو چکی ہے کہ خواہ افسانہ، کہانی ہو یا ناول ان کی تحریر کی سنگتگی، بذلہ سخی، معاملہ بندی اور محاورہ نگاری ہر جگہ یکساں طور پر برقرار رہتی ہے بلکہ آگریوں کہا جائے کہ انہوں نے تاریخی ناول نگاری کو طویل افسانہ نگاری میں سمودیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

زیر نظر دس کہانیاں دراصل دس ناولٹ ہیں جن میں ناول نگاری کے تمام لوازم موجود اور جاری و ساری ہیں۔

امید ہے کہ آپ اپنی پسندیدگی سے مطلع فرمائیے گا۔

نیاز مند

الماس ایم۔ اے (زیب ملیح آباد)

ماہِ خشب

ہونی بھاگ رہی تھی اور شکاری کتے بھونکتے، غراتے، اس کا پیچھا کر رہے تھے۔

وہ ہرنی ہی تھی، گیارہ سال کی بچی، یمن کے مرغزار میں اڑتی پھرتی تھی۔ سامنے جرش کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا — اس کا گھر، اس کا گاؤں ہی اس کی دنیا اور کل کائنات تھا۔ ماں، باپ، دو ماہ کا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ نانا، نانی نے پالا تھا۔ ان کے سوا اس کا اور کوئی نہ تھا۔

اونچی نیچی پگڈنڈیوں اور غم کھیتوں میں بھاگتے بھاگتے اس کی سانس پھول گئی۔ بردہ فروشوں کا کردہ اسے پکڑنے پر بضد تھا۔ آخر پکڑی گئی۔ جیسے شکاری کتے ہرن کو پکڑ لیتے ہیں۔ بردہ فروشوں کے سردار نے اس کی گردن پر ہاتھ ڈالا۔ اس نے زور سے ہاتھ پر کلٹ لیا اور پھر بھاگی۔ آخر کار پکڑی گئی۔ گاؤں والے اپنی جانیں بچا کر اپنے اپنے گھروں میں گھسے ہوئے تھے۔ کسی کو کسی کی فکر نہ تھی، سوائے اپنے۔

خیزراں دلی پتلی، نازک اندام، ستواں ناک، سرخ و سفید چہرہ، کمر تک لٹکے

ہوئے بال، جھوم کر چلتی تو بید کی شاخوں کی طرح لراتی معلوم ہوتی تھی۔ اسی لئے لوگ اسے خیزراں کہتے تھے۔

برودہ فروش، اسے ایک بڑے کیمپ میں لے آئے۔ جہاں اس جیسی بہت سی لڑکیاں، عورتیں اور مرد پہلے ہی موجود تھے۔ اس کے ہاتھ باندھ دیئے گئے اور پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔

کئی روز تک وہ اس کیمپ میں قید رہی اور داروگیر کا سلسلہ جاری رہا۔ برودہ فروشی عام تھی۔ پکڑے ہوئے غلام اور کنیزیں سرعام فروخت ہوتیں۔ نیلام ہوتا اور جو جس کی زیادہ بولی دیتا وہ ہمیشہ کے لئے اس کا مالک ہو جاتا۔ کوئی داد و فریاد نہ تھی۔ برودہ فروشی ایک مستند پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری کا زمانہ تھا ابو مسلم خراسانی قتل ہو چکا تھا اور ابو جعفر منصور عباسی، تخت بغداد پر متمکن تھا۔ بغداد جو پہلے ایک گاؤں تھا اسے اسی خلیفہ نے ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل کیا تھا۔

نیا بغداد دجلہ اور فرات کے قریب تعمیر ہوا۔ وسط شہر میں ایوان شاہی تعمیر کئے گئے۔ شہر پناہ کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے کے درمیان ایک میل کا فاصلہ تھا اور ہر دروازے پر لوہے کے بڑے بڑے پھانگ نصب کئے گئے تھے۔ مسجد، محل کے قریب تعمیر ہوئی۔ منصور نے شہر کو چوبیس ہزار محلوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر محلے میں ایک مسجد اور حمام تھا۔ دریائے دجلہ سے بہت سی نہریں ان مسجدوں تک پہنچائی گئی تھیں۔ ان نہروں پر ایک سو پچیس پل تھے اور نہروں کے کنارے چار ہزار سیلیں رکھی جاتی تھیں۔ بغداد کی تعمیر پر اس دور میں چار کروڑ آٹھ لاکھ اور تین درہم خرچ ہوئے تھے۔ اس کی سڑکیں چالیس چالیس ہاتھ چوڑی تھیں۔ پچاس ہزار مزدوروں اور کاریگروں نے دن رات کام کیا۔ کاری گر اور صنایع موصل، کوفہ، واسط اور بصرہ وغیرہ سے بلوائے گئے تھے۔

بغداد دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد ہوا اور دجلہ کے مشرقی کنارے پر ۱۵۱ھ میں ایک اور شہر عباسی ولی عہد ابو عبد اللہ محمد مہدی کے لئے بسایا گیا۔ اس شہر کا نام ”رصافہ“ رکھا گیا۔

عباسی امراء اور شہزادے برودہ فروشوں کے اہم گاہکوں میں تھے۔ اس لئے برودہ فروش سب سے پہلے بغداد کا رخ کرتے۔ بغداد میں انہیں غلاموں اور کنیزوں کی منہ مانگی قیمت ملتی تھی۔

عباسی ولی عہد محمد مہدی گھوڑا اڑاتا ہوا رصافہ جا رہا تھا۔ جوانی کا عالم، وہ سیر و شکار کا شوقین تھا۔ حالانکہ مدینہ منورہ میں حضرت امام مالکؒ کے پاس رہ کر حدیث کی سند بھی حاصل کی تھی لیکن طبیعت رنگین پائی تھی۔ منصور نے اس کی لالہ بلی طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس کی شادی ایک عباسی امیر زادی ریحہ بنت سفاح سے کر دی تھی لیکن مہدی کو پریشان نظری پسند تھی۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب ترکی تلاش میں رہا کرتا تھا۔

برودہ فروش، رسیوں سے بندھے غلاموں اور کنیزوں کو گھسیٹتے ہوئے شہزادے کے قریب سے گزرے۔ شہزادے نے گھوڑا روک لیا۔ ولی عہد کا اتالیق خالد بن برک ساتھ تھا۔ خوبرو امیر زادے کو دیکھ کر برودہ فروش بھی رک گئے۔

برودہ فروشوں کا سرغنہ شہزادے کے قریب آیا۔ شہزادے نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟“

”بغداد“ سرغنہ نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”انہیں فروخت کرنے۔“ سرغنہ نے کنیزوں اور غلاموں کی طرف اشارہ کیا۔

شہزادے نے ایک طائرانہ نظر، ان قیدیوں پر ڈالی۔۔۔ پھر اس کی نظریں خیزراں پر آکر رک گئیں۔

”یہ لڑکی؟“ شہزادے نے ہاتھ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔ سرغنہ نے جھپٹ کر اسے شہزادے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ خیزراں نے سر اٹھا کر شہزادے کو دیکھا اور پھر غصے سے زمین پر تھوک دیا۔ شہزادہ خیزراں کی اس حرکت پر مسکرانے لگا۔

”یہ لڑکی بیچو گے؟“ شہزادے نے پوچھا۔

”تم مجھے نہیں خرید سکتے؟“ سرغنہ کی بجائے خیزراں نے غصے سے جواب دیا۔

”کیوں؟“ شہزادے کو دلچسپی پیدا ہوئی۔

خیزراں نے اکڑ کر کہا۔ ”میں نے سردار سے وعدہ لیا ہے کہ میں اپنی قیمت خود مقرر کروں گی۔“

”بھلا ہم بھی تو سینس، تم نے اپنی کیا قیمت مقرر کی ہے؟“ شنزادے کی دلچسپی بڑھ گئی۔

”میری قیمت ایک لاکھ ہے۔“ خیزراں نے غرور سے سر اٹھا لیا۔ شنزادے نے قدرے توقف کیا۔ شاید وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ جواب نہ پا کر خیزراں نے شنزادے کا مذاق اڑایا۔

”میں کہتی تھی نا۔۔۔ کہ تم مجھے نہیں خرید سکتے۔“

شنزادے نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اتنی قیمت کی وجہ کیا خوبی ہے تم میں؟“
خیزراں نے جواب دیا۔ ”میرا خود منہ سے نہیں بولتا۔ بادشاہوں کی نظریں اس کی خوبیاں دیکھ لیتی ہیں۔ میری قیمت بھی کوئی بادشاہ ہی ادا کر سکتا ہے۔ تم جیسا معمولی سوار ایک لاکھ کمال سے لائے گا؟“

”گستاخ لڑکی۔۔۔“ خالد برک نے دخل دیا۔ ”تو خلافت عباسیہ کے ولی عہد شنزادہ ممدی سے گفتگو کر رہی ہے۔“
برہ فروشوں کے حواس گم ہو گئے۔ وہ گھوڑوں سے کودے اور شنزادے کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

خیزراں بولی۔ ”بد قسمت ہے وہ سلطنت جس کے شنزادے اس طرح کے ہوں۔“

شنزادے نے برا مانے بغیر پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”خیزراں“

”خیزراں۔۔۔“ شنزادے نے زیر لب کہا پھر بولا۔ ”خیزراں۔۔۔ ہم منہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں۔“

خیزراں مسکرائی اور بولی۔ ”تم شنزادے ہو تو بے وقوف بھی ہو۔“
”اوب سے بات کر خیزراں!“ خالد برک نے پھر دخل دیا۔ خیزراں نے خالد کو دیکھا اور پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”میں شنزادے کا اتالیق ہوں۔ ان کا استاد!“

خیزراں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”تم استاد ہو تو شنزادے کو سمجھاؤ کہ ایک لاکھ میں کثیر نہیں خریدی جاتی۔ یہ تو بادشاہ بننے سے پہلے خزانہ خالی کر دے گا۔“
خالد برک کی نظریں خیزراں کی پیشانی پر جم گئیں۔ خالد کو علم نجوم اور علم قیافہ میں بڑا ملکہ تھا۔ اس نے کہا۔ ”پورا خزانہ دے کر بھی اگر تمہیں خریدا جائے تو یہ سودا منگنا نہیں پڑے گا۔“ شنزادہ حیرت سے اپنے استاد کا منہ دیکھنے لگا۔ خالد نے کہا۔
”ولی عہد محترم! خیزراں کی پیشانی کہہ رہی ہے کہ ایک دن اس کے سامنے پوری خلافت عباسیہ سر جھکائے گی۔“

سودا ہو گیا۔ برہ فروش کو ایک لاکھ درہم ادا کئے گئے اور خیزراں کو رصافہ کے قصر الذہب میں پہنچا دیا گیا۔ دو سرا قصر، قصر الخلاس، شنزادے کی بیوی رملہ بنت سفاح کے لئے مخصوص تھا۔

قصر میں قدم رکھتے ہی خیزراں کی خدا داد ذہانت کو چار چاند لگ گئے۔ مشہور زمانہ اساتذہ کو خیزراں کی تعلیم و تربیت پر مقرر کیا گیا۔ دینیات اور علم حدیث کے لئے علامہ دہرامام اوزاعی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ خیزراں کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ اس بیدار مغز لڑکی نے مستقبل کو مد نظر رکھتے ہوئے اصول جہانبانی اور رموز مملکت کی تعلیم میں خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا اور ڈیڑھ سال کے مختصر عرصے میں ہر علم و فن میں ماہر اور مشتاق ہو گئی۔

عقل و دانش اور حسن سیرت کے ساتھ، خدا نے اسے حسن صورت سے بھی پوری طرح آراستہ کیا تھا۔ شعر و ادب سے شنزادے کو بھی دلچسپی تھی اور شاعروں کا ایسا قدر دان تھا کہ ایک بار کسی شاعر نے اس کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ ایک شعر پر وہ اس قدر خوش ہوا کہ اس شاعر کو بیس ہزار دینار انعام دے ڈالا۔

خلیفہ منصور کو معلوم ہوا تو اس نے شاعر کو بلا کر سولہ ہزار دینار واپس لے لئے اور صرف چار ہزار، اس غریب شاعر کو دے دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ممدی کو تنبیہ کی کہ ایک شاعر کی ایک سال کی خدمت کا معاوضہ صرف چار ہزار دینار ہے۔ دولت عباسیہ میں خلیفہ منصور سب سے زیادہ کنجوس مشہور ہے۔

مزارے۔ آخر اور کینیز بھی تو ہیں۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ وہ ہماری بہو رستہ بت
سلاح سے بھی زیادہ خرچ کرتی ہے۔“

خلیفہ کا پارہ چڑھنے لگا تھا۔ شخصی حکومت اور بادشاہت میں بادشاہ کا حکم ہی
قانون ہوا کرتا ہے۔ خالد برک نے یہی مناسب سمجھا کہ اس وقت جان بچائی جائے اور
خیزراں کی خوبیوں کے بیان کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھے۔

اس نے کہا۔ ”اعلیٰ حضرت! خادم کو غلطی سے یہ خیال تھا کہ اس کے فرائض
میں شہزادے کے اطوار و کردار کی درستی ہے۔ آئندہ یہ غلام شہزادے کے خانگی
معاملات پر بھی نظر رکھے گا۔“

خالد برک کا جواب بڑا جامع تھا۔ خلیفہ کو فکر ہوئی کہ کہیں شہزادے کو اس کے
اخراجات پر ٹوکنے سے بات نہ بڑھ جائے۔ اس نے جلدی سے بات بدل۔

”برک! ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم شہزادے کے اخراجات پر پکڑ کرو۔ ہم
تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر شہزادے نے ہاتھ نہ روکا تو خود اسے تکلیف اٹھانا پڑے
گی۔“

خالد برک نے دیکھا کہ بادشاہ ذرا نرم ہوا ہے تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے
ہوئے بولا۔

”عالی جاہ! بالکل درست فرماتے ہیں۔ شہزادہ ممدی اخراجات کی طرف سے اس
وقت بہت پریشان ہیں۔“

”پریشان ہے، آخر کیوں؟“ خلیفہ کو خود پریشانی ہو گئی۔

”یعنی کینیز خیزراں، شہزادے کے بچے کو جنم دینے والی ہے۔“ خالد برک
نے بے دھڑک بتا دیا۔ خلیفہ کا غصہ ختم ہو گیا اور وہ مسکرانے لگا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔“ خلیفہ نے کہا۔ خالد برک کی جان میں جان آئی۔

خلیفہ نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ”برک! اگر خیزراں کے لڑکی ہو تو طبرستان اور اگر لڑکا
ہو تو طبرستان اور رے دونوں امارتیں شہزادے ممدی کو ہماری طرف سے نذر کی
جائیں۔“

خیزراں کے دشمنوں نے تو خیزراں کو ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس کی

خیزراں نے نانا، نانی کو بھی اپنے پاس محل میں بلوا لیا لیکن وہ زیادہ دن اس
ساتھ نہ دے سکے۔ خیزراں، ماں کی طرف سے بری تھی۔ اس لئے اس کا ج
فطرتاً برروں کی طرف تھا۔ اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے محل میں برری اور
غلام اور کینیز مقرر کیں۔

خیزراں نے اپنی ذہانت کے زور پر بہت جلد علمی مدارج طے کئے۔ دوسری
طرف اس کے حسن و لیاقت کا ایسا جلوہ چلا کہ ممدی کے دل و دماغ پر چھا گئی اور وہ
اسی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ دوسری تمام بیگمات اور کینزوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ جو
عقلندہ تھیں انہوں نے چڑھتے سورج کی پرستش کو اپنایا اور خیزراں کی مخالفت چھوڑ کر
اس سے میل ملاقات بڑھالی۔ جو کم عقل تھیں وہ سازشوں میں لگ گئیں اور خیزراں
کو نیچا دکھانے اور ممدی کی نظروں میں گرانے کے بہانے تلاش کرنے لگیں۔

شہزادہ ممدی حد درجہ فضول خرچ تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ خیزراں اپنی فیاضیوں
سے ہاتھ اٹھانے پر آمادہ نہ تھی۔ اخراجات بڑھتے گئے۔ شہزادے کے گزارے کی رقم کا
بیشتر حصہ، خیزراں کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا۔ خلیفہ منصور، روپے پیسے کے معاملے
میں بڑا سخت تھا۔ جب خیزراں کی فضول خرچیوں کی خبر اس کے کانوں تک پہنچی تو اس
نے خالد برک کو طلب کیا۔ خالد دست بستہ حاضر ہوا۔ خلیفہ نے کہا۔

”برک! ہم نے سنا ہے کہ کوئی کینیز خیزراں ہے جو ملکوں کی طرح رہتی ہے۔“
”عقل سبحانی نے جو کچھ سنا ہے وہ بالکل درست ہے۔“ برک نے فوراً جواب

دیا۔

خلیفہ چونک پڑا۔ اسے برک سے ایسے جواب کی امید نہیں تھی۔ اس نے
تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔ ”برک! ہم نے تمہیں شہزادے کا اہلیق اس لئے مقرر نہیں
کیا تھا کہ تم اسے کھلی چھٹی دے دو۔“

برک نے ذرا سوچ کر کہا۔ ”عالی جاہ! غلام کو اپنے قصور کی نشاندہی فرمائی جائے
تاکہ وہ اصلاح کر سکے۔“

خلیفہ کا مزاج گرم ہو گیا۔ اس نے مجبور کر کہا۔ ”کیا یہ قصور کم ہے کہ ایک
معمولی کینیز کو شہزادہ اتنی ڈھیل دے کہ وہ ایک عباسی ملکہ کی طرح ٹھٹھٹ باٹ سے زندگی

قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ اس نے الہادی محمد موسیٰ کو جنم دے کر رے اور طبرستان کی گورنری شہزادے کو دلا دی۔

مہدی مع اپنے حرم کے بغداد سے طبرستان چلا گیا۔ دوسرے سال اس نے ایک بچی بانو کو جنم دیا اور پھر تیسرے سال اس کے بطن سے ہارون رشید پیدا ہوا۔ خیزراں کا مرتبہ اور شان و شوکت دن بدن بڑھتی گئی۔ شہزادہ مہدی تمام دیگر بیگمات اور کینڑوں کو چھوڑ کر خیزراں کا ہو کر رہ گیا۔

خیزراں، ولی عہد شہزادے کے دل و دماغ پر تو حکومت کر رہی تھی، ان بچے اور بچیوں کی پیدائش کے بعد اس نے مکمل انتظام اور اصول جہانبانی کا عملی تجربہ شروع کیا۔

مہدی پہلے ہی خیزراں کی لیاقت کا قائل تھا۔ اس نے خیزراں کی ملکی انتظام میں دلچسپی دیکھ کر اسے آہستہ آہستہ اپنے اختیارات سونپنا شروع کر دیے یا خیزراں نے خود اپنی قابلیت سے ان اختیارات پر قبضہ کر لیا۔

چند ہی دنوں میں رے اور طبرستان کی کاپا پلٹ گئی۔ خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا۔ رعیت شہزادے کی بجائے خیزراں پر جان بچھلور کرنے لگی۔ خلیفہ کو تمام حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ اس کے دل میں بھی خیزراں کے لئے جگہ پیدا ہو گئی اور خیزراں کے خلاف عملاتی سازشوں کا جو جال بچھایا گیا تھا وہ شکستہ ہو کر رہ گیا۔

عباسی خلیفہ منصور بائیس سال پر شکوہ فرمانروائی کے بعد ۱۵۸ھ میں حج کے لئے روانہ ہوا۔ چلتے وقت اس نے ولی عہد شہزادہ مہدی اور خیزراں کو بلا کر چند نصیحتیں کیں اور پھر کوفہ روانہ ہوا۔ کوفہ پہنچ کر خلیفہ منصور نے حج عمرہ کا اہرام باندھ کر قرآنی کے بکروں پر نشان لگا کر انہیں آگے روانہ کیا لیکن عمرہ قسمت میں نہ تھا۔ کوفہ سے دو منزل آگے بڑھا تھا کہ شدید درد کا حملہ ہوا اور بیر معونہ پہنچ کر ۶ ذی الحجہ ۱۵۸ھ کو منصور نے انتقال کیا۔ خلیفہ کے ساتھ ربيع کاتب تھا۔ اس نے ولی عہد شہزادہ مہدی کے لئے عمائدین سلطنت سے بیعت لی۔ اہل مکہ سے عباس بن محمد اور محمد بن سلیمان نے بیعت لی۔

اس طرح مہدی بحیثیت خلیفہ ۳ ذی الحجہ ۱۵۸ھ میں تخت خلافت پر بغداد میں

مستحکم ہوا اور خیزراں کو ”ملکہ دوراں“ کا لقب دے کر سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا۔ ملکہ خیزراں کا بچپن غمت میں گزرا تھا۔ وہ دکھ درد کا مزہ چکھ چکی تھی۔ اس لئے کسی کو دکھ میں نہ دیکھ سکتی تھی اور فوراً ”مظلوم کی حمایت پر آمادہ ہو جاتی تھی۔ سخاوت اور فیاضی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

زمانہ ولی عہدی میں جب وہ ملکہ نہ تھی تو اس کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ طبرستان اور رے کی تمام آمدنی نصف ماہ بھی نہ چلتی تھی اور مہدی، باپ سے گزارے کا قاضہ کرنے لگتا تھا۔ ان حالات میں مہدی کے جشن جلوس کی تیاریاں جس پیمانے پر شروع ہوئیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ افسوس کہ ملکہ خیزراں نے جس ولولے اور شوق سے جشن کی تیاریوں کا حکم دیا تھا اتنی ہی بے دلی سے اسے ملتوی کرانا پڑا۔ ملکہ کی خوشیاں افسردگی میں تبدیل ہونے لگیں۔

شہزادی بانو خیزراں کی اکیلی لڑکی تھی۔ شہزادی عرصے سے بیمار تھی لیکن اب اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ شاہی طبیبوں نے سر توڑ کوشش کی۔ دور دور سے ماہرین علاج بلائے گئے مگر شہزادی کی طبیعت ایسی بگڑی کہ پھر نہ سنبھل سکی اور جس شہزادی نے ابھی جوانی میں مشکل سے قدم رکھا تھا وہ ملکہ خیزراں اور مہدی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئی۔

خیزراں پر کیا گزری، اس کے بیان کے لئے الفاظ نہیں۔ مہدی خلافت عباسیہ کا تاجدار گم صم کھڑا تھا۔ شہزادہ الہادی اور ہارون رشید جو کسی حد تک سمجھ دار ہو چکے تھے۔ اپنی اکلوتی بہن کی لاش سے لپٹ کر دھاڑیں مار رہے تھے۔ خیزراں کو تو جیسے سکتے ہو گیا تھا۔ آنکھیں خشک بال، بکھرے ہوئے، چہرہ زرد۔ وہ گہرا کر ایک ایک کام نہ دیکھتی جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ کیا ہو گیا ہے مگر اس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

خیزراں خلافت عباسیہ کی ملکہ تھی۔ جس کے ایک اشارے پر لاکھوں گردنیں تن سے جدا ہو سکتی تھیں مگر اس میں اپنی بیٹی کو بچانے کی طاقت نہ تھی۔ اس کو موت پر اختیار نہ تھا۔ موت آئی اور بانو کو سب کے سامنے اس کے ہاتھ سے چھین کر لے گئی۔ اس کی دولت، حکومت، طاقت کچھ بھی نہ کر سکی۔

بانو کو موت نے خیزراں کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا۔ بیٹی کا غم ماں کو لے

”وقت! اس کا بہترین علاج ہے۔ جوں جوں وقت گزرے گا ملکہ کی طبیعت بہتر ہوتی جائے گی۔“ طیب نے کہا۔

ابو عبیدہ کچھ سوچنے لگا۔ طیب کو وزیر اعظم کی پریشانی کا علم تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ خلیفہ ممدی نے دربار میں جانا چھوڑ دیا ہے اور ملکی انتظام میں ابتری پیدا ہو رہی ہے۔

طیب نے کہا۔ ”وزیر اعظم! ایک علاج اور ہے لیکن اس میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔“

”فرمائیے۔ میں دل و جان سے حاضر ہوں۔“

طیب نے کہا۔ ”آپ خلیفہ کی دوسری بیگمات کی ان لڑکیوں کو جو مرحومہ کی ہم عمر ہیں کسی طرح ملکہ کے پاس بھیجیے۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“ وزیر اعظم کی سمجھ میں نہ آیا۔

”دیکھئے ملکہ کو جوان بیٹی کا غم ہے۔۔۔ لیکن ملکہ کی مزاج پر سی کو آنے والے یا

تو عمائدین سلطنت ہوتے ہیں یا سن رسیدہ بیگمات۔ ان کی مزاج پر سی سے ملکہ کا غم کم نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ملکہ کے کانوں میں جوان لڑکیوں کے قہقہے پہنچیں تو

اس کا بہت اچھا اثر ہو گا۔“

”آپ کا یہ محض خیال ہے؟“ وزیر اعظم نے پوچھا۔ ”یا آپ کو یقین ہے کہ اس کا اچھا پڑے گا؟“

”امید پر دنیا قائم ہے۔“ شاہی طیب نے ہنس کر کہا۔

ابو عبیدہ نے اپنے دفتر پہنچ کر ظہیر یمنی، داروغہ محلات کو بلوایا۔ ظہیر ایک وجیہ و ثکیل جوان تھا۔ یہ خلیفہ ممدی کی ایک بیگم بنت الا جندہ کا غلام تھا۔ بیگم نے اسے نوعمری میں خریدا تھا۔ بنت الا جندہ کے بطن سے ممدی کی تین لڑکیاں عالیہ، منصورہ اور سلیمہ تھیں۔ اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لئے ظہیر یمنی کی اپنے بیٹے کی طرح پرورش کی تھی اور یہ عالیہ، منصورہ اور سلیمہ کے ساتھ شاہی محل میں پل کر جوان ہوا تھا۔

پھر اسے بنت الا جندہ نے ممدی سے کہہ کر ناظم محلات لگوا دیا۔ اس عہدے پر

بیٹھا۔ خیرزاں کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اس کی بھوک، پیاس اڑ گئی۔ چاند جیسی بیٹی دیکھتے ہی دیکھتے اسے داغ دے گئی۔

خلیفہ ممدی کو دہرا غم تھا۔ ایک بیٹی ممدی دوسرے خیرزاں کی حالت دیکھی نہ جاتی۔ خلیفہ نے سرکار، دربار کے کاموں کو بلائے طاق رکھ دیا۔ وہ تو پہلے بھی برائے نام کام کرتا تھا۔ تمام بوجھ تو ملکہ خیرزاں نے اٹھا رکھا تھا۔

ادھر خیرزاں چارپائی سے لگی ادھر خلیفہ نے امور سلطنت سے منہ موڑا اور خیرزاں کی بیٹی سے آ لگا۔ کئی روز بعد خیرزاں کا سکتے کا عالم ختم ہوا۔ خیرزاں نے آنکھ جھپکی اور پھر آنسوؤں کے سوتے پھوٹ پڑے۔ ایسا روئی کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔۔۔ رونے سے دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا۔

دن تو خیر جیسے تیسے گزر جاتا لیکن رات کاٹنے نہ کنتی۔ خیرزاں پاگلوں کی طرح چلاتی۔ ”بانو کو بلاؤ۔۔۔ بانو کو بلاؤ“ جانے والے کب واپس آتے ہیں۔ ممدی کو بھی رونا آجاتا اور وہ منہ پھیر کر آنسو پونچھ لیتا۔

خیرزاں کی گوشہ نشینی اور خلیفہ ممدی کی امور سلطنت سے غفلت نے بد عنوانیوں اور شورشوں کو سر اٹھانے کا موقع دیا۔ امراء اور وزراء پریشان ہو گئے۔ انہوں نے باہم مشورہ کیا اور وزیر سلطنت کو خلیفہ کے پاس اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تاکہ خلیفہ کو دربار آنے پر آمادہ کیا جائے۔

وزیر سلطنت ابو عبیدہ اللہ معاویہ بن یسار بڑا بیدار مغز اور جہاندیدہ وزیر تھا۔ اس نے خلیفہ کے پاس جانے سے پہلے طیب شاہی سے مشورہ کیا اور ملکہ کے علاج کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔

”ملکہ دوراں کا یہ حل کب تک رہے گا؟“ ابو عبیدہ اللہ نے شاہی طیب سے پوچھا۔

”ملکہ کو کوئی جسمانی مرض نہیں ہے۔“ طیب نے بتایا۔

”پھر۔۔۔؟“

”اولاد کا غم بوجھ بن کر ملکہ کے اعصاب پر سوار ہے۔“

”پھر بھی اس کا کوئی علاج تو ہو گا؟“

ساتھ بڑے ہال میں داخل ہوا۔ اس نے سرخم کر کے بیگمات خلافت عباسیہ کو سلام کیا۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ تمام بیگمات پردوں کے پیچھے وزیراعظم کی گفتگو سننے کے لئے بے چین تھیں۔

”محترم بیگمات خلافت عباسیہ!“ وزیر سلطنت کی آواز ابھری۔ ”اس جاں نثار نے آپ سب کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ کو محلات شاہی اور مقبوضات خلافت عباسیہ کے ان حالات سے آگاہ کر کے آپ کا عملی تعاون حاصل کیا جائے۔ اس وفادار تخت و تاج کو یہ کہنے میں کوئی تہجک نہیں کہ اس وقت بیگمات عالی مقام نے میرا ساتھ نہ دیا تو خدا نخواستہ خلافت عباسیہ پر ایسا وقت آئے گا جسے ٹالنا کسی کے بس میں نہ ہو گا۔“

وزیر سلطنت خاموش ہوا تاکہ بیگمات کا رد عمل معلوم ہو، دو چار لمحے بعد پردے کے ایک طرف جنبش ہوئی اور ایک زریں کمر کنیز نے نمودار ہو کر پہلے ادب سے وزیر سلطنت کو سلام کیا پھر بولی۔

”ملکہ ریحہ بنت ابوالعباس فرماتی ہیں کہ وزیر سلطنت ہم سے جس طرح کا تعاون چاہتے ہیں، خلافت کے مفاد کی خاطر، ہم ان سے تعاون کریں گے۔“ پھر تو ہر طرف سے پردے سرکنے لگے اور کنیزیں اپنی اپنی بیگمات کے پیغامات لے کر آئے لگیں۔ ہر بیگم نے وزیر سلطنت کو اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ وزیر سلطنت کو اس طرف سے اطمینان ہوا تو اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

”بیگمات اعلیٰ درجات! ملک میں جگہ جگہ شورشوں نے سر اٹھا رکھا ہے۔ بغاوتیں شروع ہو گئی ہیں۔ مرو کے علاقے سے اطلاع آئی ہے کہ — ایک زندیق متفق نے سر اٹھایا ہے۔ اور وہ خدائی دعویٰ کر رہا ہے (نحوذ باللہ) ملک کا یہ حال ہے لیکن خلیفہ محترم کو بانو تہ اور ملکہ خیزراں کے غم نے گھیر رکھا ہے۔ خلیفہ، حرم سرا سے برآمد نہیں ہوتے۔ دربار نہیں لگاتے۔ نظام سلطنت الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔“

وزیر سلطنت رد عمل معلوم کرنے کے لئے پھر خاموش ہو گیا۔ ملکہ ریحہ بنت ابوالعباس کی کنیز نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔

”ملکہ ریحہ بنت ابوالعباس فرماتی ہیں کہ ہمیں بتایا جائے کہ ہم اس سلسلے میں کیا

کسی جوان کا تقرر نہ ہوتا تھا لیکن ظہیر کی سفارش خیزراں نے بھی کی تھی۔ اس لئے ظہیر کا تعلق یمن سے تھا اور یمن، ملکہ خیزراں کا وطن تھا۔

ابو عبید نے ظہیر کو حکم دیا کہ ملکہ خیزراں کے علاوہ خلیفہ ممدی کے حرم میں جتنی بیگمات ہیں انہیں ایک جگہ اکٹھا کیا جائے تاکہ میں ان سے ملکی معاملات میں ضروری مشورہ کر سکوں۔

ظہیر نے وزیر سلطنت کا حکم ملتے ہی تمام بیگمات اور حرم کی ان کنیزوں سے جنہیں بیگمات کا درجہ حاصل تھا، فردا فردا رابطہ قائم کر کے وزیر سلطنت کا پیغام پہنچایا۔ یہ بیگمات اور کنیزیں الگ الگ محل میں رہتی تھیں۔ انہیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ کسی خاص مجلس — جس میں شرکت کا حکم خلیفہ نے دیا ہو کے علاوہ کبھی ایک جگہ جمع نہ ہوتی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے وزیر سلطنت کے پیغام پر ناک بھوں چڑھائی لیکن پھر یہ خیال کرتے ہوئے کہ وزیراعظم نے کسی مصلحت کے تحت ہی انہیں ایک جگہ جمع ہونے کی درخواست کی ہے۔ وہ سب رضامند ہو گئیں۔

ظہیر نے ابو عبید کو بیگمات کی رضا مندی سے آگاہ کیا تو اس نے سوچا شاید اس طرح بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔ ظہیر نے تمام بیگمات کو وقت مقررہ پر ایک مقام پر یکجا کیا۔ وہ بیگمات جو ایک دوسری کی شکل سے بیزار تھیں بڑے خوشگوار ماحول میں ایک دوسری سے ملیں اور رسمی گفتگو کرنے لگیں۔

اپنے اپنے محل کے گھنے ہوئے ماحول سے انہوں نے پہلی بار قدم نکالا تھا اور لئے پہلے تو انہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوا لیکن پھر وہ جلد ہی آپس میں کھل مل گئیں اور عام عورتوں کی طرح باتیں کرنے لگیں۔

ان کی باتیں لباس و زیورات کی حدیں پار کر کے ملکی معاملات اور پھر ملکہ خیزرا کی علاقے تک پہنچ گئیں۔ وہ ہر طرح کی باتیں کر رہی تھیں مگر اپنے شوہر یعنی خلیفہ ممدی کے ذکر سے قصداً گریز کرتی تھیں۔

وزیر سلطنت ابو عبید کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہال کے چاروں طرف پردے کھینچ دیئے گئے۔ خاموشی طاری ہو گئی۔ ابو عبید سنجیدہ صورت بنائے ظہیر یمنی کا

کر سکتے ہیں۔“ اسی قسم کے پیغامات دوسری بیگمات نے بھی بھجوائے۔

ابو عبید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”شہزادی بانو قہ کے غم میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ شاہی طبیب کی تشخیص کے مطابق ملکہ خیزراں کو غم کے سوا اور کوئی بیماری نہیں۔ چنانچہ شاہی طبیب کا مشورہ ہے کہ ملکہ خیزراں کے محل میں خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے تاکہ محل پر چھائے ہوئے غم کے دبیز بادل چھٹ جائیں۔ ملکہ خیزراں کا غم دور ہو گا تو خلیفہ وقت کے ذہن پر اچھا اثر پڑے گا۔ اور اس طرح وہ پھر انتظام ملکی کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔“ وزیر باتدبیر کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ تمام بیگمات نے آپس میں صلاح و مشورے کے بعد یہ طے کیا کہ وہ سب معہ تمام شہزادیوں کے اسی وقت ملکہ خیزراں کے محل میں جائیں گی اور ہر طرح سے اس کا دل ہسلانے اور غم دور کرنے کی کوشش کریں گی۔

ملکہ خیزراں کے محل میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ حاجب، کاتب، حافظ، قاری پس پردہ بیٹھے تھے۔ خلیفہ ممدی نے ذکر و ورد کے احکامات صادر کئے تھے۔ لوگ صبح سے شام تک تلاوت کرتے اور خیزراں کی سلامتی کی دعائیں مانگتے۔ خلیفہ ہر وقت برہنہ سر اور برہنہ پا ملکہ کی مسہری کے گرد چکر لگاتا رہتا۔ اسے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ دن رات کے شمار کا۔

خزاساں کا ایک خوش الحان قاری آیا ہوا تھا۔ وہ جب تلاوت کرتا تو ایک عجیب ساں پیدا ہو جاتا۔ ہر شے جیسے ساکت ہو جاتی اور فضا میں اس کی آواز سے نغمہ بار ہو جاتیں۔ اس وقت بھی وہ تلاوت میں مصروف تھا۔

ملکہ خیزراں پر بدستور غفلت طاری تھی۔ زوال کا وقت ہو رہا تھا۔ اس لئے تلاوت کلام پاک بند کر دی گئی تھی۔ یکایک محل سرا کی راہداریوں میں قدموں کی چاپ پیدا ہوئی۔ پھر اس میں تیزی پیدا ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں لوگ راہداری میں چلنے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

کنیزیں گھبرا کر بھاگیں تاکہ اس شور کو بند کریں لیکن انہیں ناکامی ہوئی۔ آنے والوں کو روکنے یا منع کی ان میں ہمت نہ تھی۔

خلیفہ ممدی کی بیگمات، شہزادیوں اور کنیزوں کے ساتھ خیزراں کی حرم سرا میں

داخل ہو رہی تھیں۔ حرم سرا کا سکوت ٹوٹ گیا۔ خاموشی میں ہنگامہ سا پیدا ہو گیا۔ سب بیگمات اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ خیزراں کے کمرہ خاص میں داخل ہو گئیں۔ اس ہنگامے سے گھبرا کر ملکہ خیزراں نے آنکھیں کھول دیں۔ بیگمات نے باری باری خیزراں کو سلام کیا اور بڑی محبت سے مزاج پرسی کی۔ بالکل اسی طرح جیسے انہیں کوئی گلہ نہ ہو اور انہیں اس سے کوئی گلہ بھی نہ تھا۔ اس لئے کہ ملکہ خیزراں نے خلافت کے پہلے ہی دن تمام بیگمات کے گزارے کی رقم دگنی کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ احکامات بھی جاری کر دیئے کہ توشہ خانہ، باورچی خانہ اور ملازمین کی تنخواہیں بھی شاہی خزانے سے ادا کی جائیں۔

ملکہ خیزراں تمام بیگمات کے ایک ساتھ مزاج پرسی کے لئے آنے سے بہت خوش ہوئی۔ اس کے چہرے پر زندگی سی دوڑ گئی۔ وہ تکیوں کے سہارے سنبھل کر بیٹھ گئی اور ان سے باتیں کرنے لگی۔

بیگمات نے شہزادیوں کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا تاکہ شور نہ ہو مگر شہزادیاں، البر جوانیاں کب تک خاموش رہیں۔ ایک عرصے کے بعد انہیں اکٹھا ہونے کا موقع ملا تھا۔ ایسے مواقع کبھی کبھی آتے تھے۔ سب بہنیں آپس میں گھل مل گئیں۔ سیلیوں کی مانند اور پھر باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

خلیفہ ممدی نے محل میں قدم رکھا تو یہاں کی رونق دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ جس اداس محل کو چھوڑ کر گیا تھا وہاں اب رونقیں مچلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ خیزراں کی حرم سرا میں تمام بیگمات کو موجود پا کر اسے اور خوشی حاصل ہوئی۔

خیزراں بڑی محبت اور خلوص سے تمام بیگمات کے ساتھ محو گفتگو تھی۔ خلیفہ کو محل کی رونقیں واپس آتی دکھائی دینے لگیں۔ بیگمات بھی اس محل میں بہت خوش تھیں اور بہنوں کی طرح آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ خلیفہ بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گیا۔ اس طرح محل کی بہاریں پھر لوٹ آئیں۔

شہزادیاں دبا دبا ہوا مانیہا سے بے خبر بلبلوں کی طرح چہچہا رہی تھیں۔ ان میں سے کسی ایک شہزادی نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اس کی آواز خیزراں کے کمرے میں بھی پہنچ گئی۔

آئی۔ منصورہ نے جواب دیا۔

”بیٹی! میں کے پاس رہتی ہے۔ آپ رکھیں گی تو ضرور رہوں گی۔“ خیزراں کے چہرے پر بحالی آگئی۔ اس نے بنت الامنہ کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

”منصورہ کو اعتراض نہیں تو میں روکنے والی کون ہوں — یہ تو فخر کی بات ہے۔“

ملکہ دوراں کا چہرہ خوشی سے دک اٹھا۔ اس نے خلیفہ کو مخاطب کیا۔ ”شہزادے —“ خیزراں کمال محبت سے مددی کو شہزادہ کہتی تھی۔ خلیفہ ہو جانے کے باوجود وہ مددی کو شہزادہ ہی کہتی رہی۔ خلیفہ نے خیزراں کو پیار سے دیکھا۔

”شہزادے! اعلان کر دیا جائے کہ ہم نے منصورہ کو گود لے لیا۔ اب یہ ہماری بیٹی ہے۔ بنت خیزراں!“

اس اعلان سے بنت الامنہ کو بے پناہ مسرت ہوئی۔ اس کی بیٹی کی قسمت کھل گئی۔ منصورہ، مرحومہ بانو قہ کی جانشین بنائی جا رہی تھی۔

منصورہ جب شہزادیوں میں واپس پہنچی تو اس پر مبارکباد کے ڈوگرے برسائے گئے۔ بعض شہزادیوں کو اس کی قسمت پر رشک آیا اور بعض حسد سے جلنے لگیں۔

خیزراں نے بستر چھوڑ دیا۔ اسے کوئی بیماری تو تھی نہیں۔ غم کا ایک بوجھ تھا جسے منصورہ نے اتار دیا۔ خلیفہ نے دربار جانا شروع کر دیا۔ تمام رعیت میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

جشن جلوس جو ملتوی کر دیا گیا تھا پھر زور و شور سے اس کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خیزراں نے منصورہ کے روپ میں بانو قہ کو پالیا تھا۔ شہزادے المادی اور ہارون کو بہن مل گئی۔

جشن جلوس کی تقریبات کا آغاز جمعہ کی صبح کو کیا گیا۔ محلات شاہی، بغداد کے کوچہ و بازار اور خلافت عباسیہ کے تمام صوبوں کے صدر مقامات کو خوبصورتی سے سجایا گیا۔ دکانیں آراستہ ہوئیں۔ خاص بازار لگائے گئے۔ جگہ جگہ میلے منعقد ہوئے۔

خلیفہ مددی بن منصور نے سب سے پہلے قصر شاہی کے حرم میں جلوس فرمایا۔ یہ تقریب صرف خواتین کے لئے مخصوص تھی۔ حرم شاہی کی بیگمات، امراء، وزراء اور

خیزراں نے پوچھا۔ ”یہ کس کی آواز ہے؟“

خلیفہ کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے تو بیگمات گھبرا گئیں۔

”کس کی آواز تھی یہ؟“ خلیفہ نے خیزراں کا سوال دہرایا۔

”میری بچی ہے۔“ بنت الامنہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”اس کی گستاخی معاف کی جائے۔“

اپنے خون کی آواز کون نہیں پہنچاتا۔ بنت الامنہ کی تین لڑکیاں تھیں۔ عالیہ، منصورہ اور سلیمہ۔ تہقہہ لگانے والی منصورہ تھی۔ اسے اقبال کرنا پڑا۔

خیزراں نے پوچھا۔ ”کیا نام ہے شہزادی کا؟“

”منصورہ —“ بنت الامنہ بولی۔ ”منا سمجھ بچی ہے ملکہ دوراں“ وہ گڑ گڑانے لگی۔

”شہزادی کو بلایا جائے۔“ خیزراں نے حکم دیا۔

کینیز دوڑ پڑیں۔ شہزادی کو حاضر کر دیا گیا۔ خوف کے مارے چہرہ زرد، ہاتھ پیر کاٹتے ہوئے۔ ماں تڑپ اٹھی اور دل ہی دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگی۔ منصورہ سر جھکا کر ملکہ خیزراں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں ہر طرف خاموشی تھی۔

”کیا نام ہے شہزادی؟“ خیزراں کی آواز نے سکوت کو توڑا۔

”منصورہ“ شہزادی کے منہ سے بمشکل نکلا۔

”ہمارے پاس آؤ۔“ ملکہ دوراں نے نرمی سے حکم دیا۔ شہزادی منصورہ مسہری کے قریب پہنچ گئی۔

”اور پاس آؤ۔“

منصورہ ملکہ کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ملکہ دوراں نے ہاتھ بڑھا کر منصورہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ منصورہ خود کو نہ سنبھال سکی — پھول کی طرح ملکہ کی گود میں جا گری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ملکہ خیزراں نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ سب کی نظروں میں حیرانیاں رقص کرنے لگیں۔ ملکہ خیزراں نے منصورہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ ”ہمارے پاس رہو گی منصورہ؟“ منصورہ سنبھل چکی تھی۔ خوف دور ہو چکا تھا۔ محبت عود کر

معزز عمائدین کی عورتوں، شہزادیوں اور شہزادوں نے حصہ لیا۔

خلیفہ شاہی لباس میں تخت زریں پر جلوہ افروز ہوا۔ سب سے پہلے ملکہ خیزراں نے دس زر پوش خوانوں میں نذر گزاری۔ یہ ایک لاکھ درہم کا نذرانہ تھا جو کھڑے کھڑے لونڈیوں میں لٹا دیا گیا۔ پھر شہزادے الملادی اور ہارون رشید نے ایک ایک ہزار کی نذر پیش کی۔ بڑی بیگم ریحہ بنت ابوالعباس کے بھی دو لڑکے تھے۔ علی اور عبید اللہ۔ انہوں نے پانچ، پانچ سو کا نذرانہ حضور میں پیش کیا۔ تین اور شہزادے یعقوب، اسحاق اور ابراہیم، دوسری بیگمات سے تھے۔ غرضیکہ تمام شہزادوں اور شہزادیوں نے نذریں گزاریں۔ پھر وزیر سلطنت اور دوسرے معزز ارکان کی بیگمات نے حسب مرتبہ خلیفہ کو نذریں پیش کیں۔

اب خلیفہ کی باری تھی۔ اس نے اپنی شان فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ بیش قیمت جواہرات کے ہار، طلائی اور نقرئی ظروف، تمام خواتین میں تقسیم کئے گئے۔ اس پوری تقریب کے دوران خیزراں بے چین سی رہی۔ اس کی نظریں بار بار شہزادی منصورہ کو تلاش کر رہی تھیں مگر اس کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

شہزادی منصورہ ریحہ بنت ابوالعباس بنت الامجد کی منجھلی بیٹی تھی۔ خوبصورت، دلی پتلی، تتلی کے مانند، شاید اس لئے وہ خیزراں کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے اسے اپنی بیٹی بنا لیا۔

منصورہ نے اپنے غلام ظمیر کے ساتھ پرورش پائی تھی۔ یہ یعنی غلام بڑا خوبصورت بچہ تھا۔ کسی اشرف کا خون تھا۔ جو ملکہ خیزراں کی طرح بردہ فردشوں سے ہوتا ہوا شاہی محل میں آیا تھا۔ اسے ملکہ خیزراں جیسی تقدیر تو نہ ملی پھر بھی اس کی پرورش شہزادوں کی طرح ہوئی تھی۔ ظمیر اور منصورہ میں پہلے انسیت پیدا ہوئی پھر عمر کے ساتھ ساتھ اس میں چنگی پیدا ہوتی گئی اور جوانی میں قدم رکھتے ہی وہ ایک دوسرے کو شدت سے چاہنے لگے۔ منصورہ کی ماں ریحہ بنت ابوالعباس کو ان کی محبت پر کوئی اعتراض نہ تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ وقت آنے پر وہ ان دونوں کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر دے گی لیکن وقت آنے سے پہلے منصورہ کی قسمت نے پلٹا کھلایا اور وہ ہمیشہ کے لئے ملکہ خیزراں کے محل میں پہنچ گئی۔

منصورہ نے جب ملکہ دوراں کے محل میں قدم رکھا تو یہاں کے ٹھاٹ باٹ اور عیش و آرام دیکھ کر اس کی عقل ٹھکانے نہ رہی۔ اپنے محل میں اسے اور اس کی دونوں بہنوں کو صرف ایک کینز کی خدمات حاصل تھیں لیکن اس محل میں کینزوں کی فوج اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی۔ وہ ایک کو آواز دیتی تو درجن بھر کینزیں دوڑ پڑتیں۔ آخر وہ ملکہ دوراں --- اور ملکہ خیزراں کی بیٹی تھی۔

ظمیر یعنی ناظم اور داروغہ محلات تھا۔ اسے محل کی دیکھ بھال اور نگہبانی کے لئے ہر وقت بیگمات اور شہزادیوں، شہزادوں کے سامنے پیش ہونا پڑتا تھا۔ وہ ہر شہزادی کو جانتا، پہچانتا اور ان کے عادات و اطوار سے بخوبی واقف تھا لیکن اس نے سوائے منصورہ کے اور کسی طرف آج تک آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ تمام بیگمات اور شہزادیاں اس کی شرافت کی مداح تھیں۔

منصورہ جب تک اپنی ماں کے پاس رہی اس کی اور ظمیر کی مختصر اور طویل ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ وہ بے دھڑک ایک دوسرے سے ملتے اور گھنٹوں حال دل بیان کرتے۔ مستقبل کے رنگین خواب دیکھے جاتے۔ ان کے درمیان سوائے وقت کے اور کوئی نہ تھا۔

ملکہ دوراں کے محل میں آنے کے بعد جہاں اس کے مرتبے میں اضافہ ہوا وہاں اس پر کچھ پابندیاں بھی عائد کر دی گئیں۔ ملکہ خیزراں کے محل کے اندر اسے وہی اختیارات حاصل تھے جو خود ملکہ خیزراں کو تھے لیکن اس کے ساتھ ہی منصورہ کو ملکہ کی اجازت کے بغیر غلام گردش تک میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ یہاں تک وہ اپنی سگی بہنوں اور ماں سے بھی پیشگی اجازت کے بغیر گفتگو نہیں کر سکتی تھی۔

منصورہ کو پہلے تو ان پابندیوں سے کچھ الجھن ہوئی لیکن پھر یہ سوچتے ہوئے کہ جو شان و شوکت اور عزت و وقار اسے اس محل میں حاصل ہوا ہے، اس کے مقابلے میں یہ پابندیاں کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس لئے اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور خوش و خرم دن گزارنے لگی۔

لیکن اس دن وہ حادثہ پیش آگیا جس نے نہ صرف اس کی زندگی میں تلاطم پیدا کر دیا بلکہ ملکہ خیزراں کا پرسکون ماحول بھی درہم برہم ہو گیا۔

نہ جانیے گا۔ ملکہ خیراں کو خبر ہو گئی تو غضب ہو جائے گا اور — میں بے موت ماری جاؤں گی۔“

”میں جاؤں یا نہ جاؤں —“ شہزادی نے کہا۔ ”لیکن اطمینان رکھو، تمہارا نام ہرگز میری زبان پر نہیں آئے گا۔“

کینز چلی گئی اور منصورہ کے دل و دماغ میں جنگ ہونے لگی۔ ایسے موقعوں پر اکثر دماغ ہی کو شکست ماننا پڑتی ہے۔ منصورہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی اور اس کے قدم غلام گردش کی طرف اٹھنے لگے — انجام سے لاپرواہ ہو کر۔

ظہیر کو دیکھ کر منصورہ سب کچھ بھول گئی۔ خوف کی زنجیر جو اس کے قدموں سے لپٹی ہوئی تھی، تمنائوں اور آرزوؤں کی پیٹیم ضرروں سے ٹوٹ گئی۔

ظہیر یعنی آگے بڑھا پھر دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ دو ہفتوں کی جدائی ختم ہو گئی۔ سب لوگ جشن جلوس میں مشغول تھے اس لئے انہیں کسی نے نہ دیکھا۔

غلام گردش عام کھلی جگہ تھی، کسی کا بھی ادھر سے گزر ہو سکتا تھا — وہ دونوں چھپتے چھپاتے پائیں باغ میں آ گئے — اور چپا کے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔

شکوے، شکایت کے دفتر کھل گئے۔ یہ دفتر بند ہوئے تو کتاب دل کی ورق گردانی شروع ہو گئی۔ وقت گزرتا رہا لیکن ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔

ملکہ خیراں کے محل میں زنانہ جشن جلوس ختم ہونے کو تھا۔ نذرانے پیش کئے جا چکے تھے۔ انعامات تقسیم ہو چکے تھے۔ خلیفہ مہدی کا دربار خاص میں انتظار ہو رہا تھا۔ منصورہ کی کئی خیراں کے علاوہ شاید خلیفہ نے بھی محسوس کی تھی لیکن خیراں کو خاموش دیکھ کر اس نے بھی اس ذکر کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔

خیراں نے بیگمات کی طرف دیکھا۔ سب کے چہرے کہہ رہے تھے کہ منصورہ کی غیر حاضری، غیر معمولی ہے۔ ملکہ خیراں غصے سے تملارہی تھی۔ اور ندامت سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

خلیفہ مہدی چلنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھا تو منصورہ، نظریں جھکائے، بوجھل قدموں سے داخل ہوئی۔ ملکہ خیراں کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے سرخی دوڑ گئی۔

”کیا آپ ان سے ملنے جائیں گی؟“ کینز نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ شہزادی منصورہ خاموش رہی۔

کینز کو جواب نہ ملا تو اس نے دوبارہ ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”شہزادی صاحبہ! آپ وہاں

شہزادی منصورہ نے جشن جلوس میں شرکت کے لئے خاص لباس زیب تن کیا تھا جو ملکہ خیراں نے اسی تقریب کے لئے خصوصی طور پر تیار کروایا تھا۔ پھر مشاطہ نے اسے ہیرے جواہرات سے آراستہ کیا اور مروجہ سرخی پوڈر سے اس کی خوبصورتی کو اور نکھارا۔ اب وہ سچ سچ دامن نظر آتی تھی۔ اس نے آئینہ دیکھا تو اپنے آپ کو دیکھ کر خود ہی شرمائی۔

مشاطہ نے بڑھ کر اس کی بلائیں لیں اور ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔ نذرانے کی اشرفیاں تھال میں بھری اس کے سامنے رکھی تھیں۔ تیار ہو کر اس نے دربار جلوس میں جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ کینز خاص گھبرائی ہوئی اس کے پاس پہنچی۔ منصورہ سمجھ گئی کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ اس نے مشاطہ کو رخصت کر دیا۔

”کیا بات ہے؟“ شہزادی نے پوچھا۔ کینز نے چاروں طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”غضب ہو گیا شہزادی! وہ یہاں تک آ گئے۔“

”کون آ گئے؟“ شہزادی کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ ”وہی — آپ کے —“ کینز نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

شہزادی منصورہ ایک دم گھبرا گئی۔ اور مارے خوف کے اسے پسینہ آنے لگا۔ اس نے فوراً اپنی پریشانی اور گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی کیونکہ اس وقت اس کی ذرا سی غلطی سے فتنہ پیدا ہونے کا امکان تھا۔

”کیا ظہیر یہاں آیا ہے؟“ منصورہ کو جیسے یقین نہ آیا ہو۔ ”جی ہاں شہزادی! وہ غلام گردش کے کونے میں کھڑے ہیں۔ آپ کو بلایا ہے۔“

کینز نے ایک ہی سانس میں بیان کر دیا۔ ”یا اللہ خیر —“ منصورہ نے بے اختیار کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”اچھا تم جاؤ۔“

”کیا آپ ان سے ملنے جائیں گی؟“ کینز نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔ شہزادی منصورہ خاموش رہی۔

کینز کو جواب نہ ملا تو اس نے دوبارہ ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”شہزادی صاحبہ! آپ وہاں

اس کی ندامت کا علاج تو ہو گیا تھا لیکن غصہ برقرار تھا۔ جمائدیہ ملکہ خیزراں نے شہزادی کے لرزیدہ قدموں سے اس کے دل کا کچھ نہ کچھ حال معلوم کر لیا۔ مگر اس وقت کی نزاکت کا احساس بھی تھا۔ یہ اس کے وقار کا مسئلہ تھا۔ وہ بیگمات کے سامنے اپنا اور شہزادی منصورہ کا وقار ہر صورت برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

اس نے متا بھرے لہجے میں شہزادی سے پوچھا۔ ”کہاں دیر کر دی، میری بیٹی نے۔ نصیب دشمنان، طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

شہزادی منصورہ اپنی تاخیر کے ہزاروں جواب سوچتی ہوئی آئی تھی۔ اس نے ملکہ کا سوال سنا تو جواب فوراً ”لیوں تک آگیا، کہنے لگی۔“

”محذرت خواہ ہوں مادر مہربان! سر میں سخت درد پیدا ہو گیا تھا۔“

ملکہ مسکرائی۔ اس کا وقار بچ گیا تھا۔ منصورہ نے سوچا چلو جان بچی تو لاکھوں پائے۔ مگر ملکہ خیزراں کے دل میں غلطی کی پھانس چبھ کر رہ گئی۔

خلیفہ نے شہزادی کا نذرانہ قبول کیا۔ اسے انعام دیا اور مردانہ جشن جلوس میں شرکت کے لئے دربار خاص میں چلا گیا۔

تمام بیگمات ہمیشہ خوشی رخصت ہو گئیں۔ ملکہ خیزراں بھی اٹھ گئی مگر شہزادی منصورہ کی کئی گھنٹے کی غیر حاضری اسے بے چین کئے ہوئے تھی۔ اس نے اس سلسلے میں شہزادی سے براہ راست گفتگو کرنا مناسب نہ سمجھا اور فی الحال خاموش ہو گئی۔

جشن جلوس کی تقریبات کے اختتام پر خلیفہ نے ملکی انتظام کی طرف توجہ کی۔ نام تو خلیفہ مہدی کا تھا مگر انتظام کی باگ ڈور، ملکہ خیزراں کے ہاتھ میں تھی۔ مہر خلافت بھی خیزراں کے پاس رہتی تھی۔ خیزراں، ولی عہدی کے زمانے ہی میں سلطنت کی اونچ نیچ سے پوری طرح واقف ہو چکی تھی۔ خدا داد ذہانت نے خیزراں کو نہ صرف خلیفہ بلکہ ارکان حکومت میں پہلے ہی مقبول کر دیا تھا۔ اب مہدی کے ہاتھ میں خلافت آئی تو خیزراں کے بھی اصل جوہر ظاہر ہونے لگے۔

خیزراں نے سب سے پہلے رفائہ عاتقہ پر توجہ دی۔ کوڑھیوں اور جذامیوں کے لئے بیت المال سے وظائف مقرر کئے تاکہ روزی کی تلاش میں انہیں جا بجا مارے مارے نہ پھرتا پڑے۔ قیدیوں کے اہل و عیال کے لئے جن کے گزر اوقات کی کوئی

صورت نہ تھی روزینہ مقرر کر دیا۔ عیسیٰ آباد میں ایک نئی ٹیکسال بنانے کا حکم دیا اور رومی سرحد پر جا بجا قلعے تعمیر کرانے کا انتظام شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی شفا خانوں، محتاج خانوں۔۔۔ اور مدرسوں میں بھی اضافہ کیا گیا۔

خلیفہ مہدی اور ملکہ خیزراں کو علم تھا کہ ماضی میں مکہ اور مدینہ کے لوگوں کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے۔ ان کے دل میں ان مقالات مقدسہ اور وہاں کے لوگوں کے لئے ہمدردی کے جذبات تھے۔ ملکہ خیزراں کے حکم سے مسجد حرام کے ارد گرد کے مکانات کو خرید کر اس میں اضافہ کیا گیا اور وہاں ولید اموی کے نام کا جو کتبہ لگا ہوا تھا، اسے ہٹوا کر خلیفہ کے نام کا کتبہ لگایا گیا۔ پرانے غلاف اتارے گئے۔ دیواروں پر مشک و عنبر ملا گیا اور قبایلی اور دیبا کے تین غلاف چڑھائے گئے۔

خیزراں نے مکہ اور مدینہ کے جملہ حقوق بحال کرائے۔ خلیفہ منصور کے عہد میں اولاد رسول کی جو جائدادیں ضبط کی گئی تھیں وہ ان کے مالکوں کو واپس کر دی گئیں۔ حرمین کے باشندوں میں کئی کروڑ روپے نقد اور ڈیڑھ لاکھ کے پارچہ جات تقسیم کرائے۔ خیزراں نے مدینہ والوں کا دل جیتنے کے لئے انصار مدینہ کے پانچ سو جوانوں کو منتخب کرا کے عباسی لشکر میں شامل کیا۔ بقول علامہ ذہبی حرمین کے بسنے والوں کی جتنی خدمت مہدی اور خیزراں نے کی اس سے پہلے کسی خلیفہ نے نہ کی تھی۔

ملکہ خیزراں کی تمام تر توجہ ملکی انتظام کی طرف تھی۔ اس کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ اکثر اسے وقت پر کھانا کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔ امراء اور وزراء ہر وقت اسے گھیرے رہتے۔ اس کی مصروفیت سے شہزادی منصورہ نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس کی پہلی غلطی پر ملکہ خیزراں بظاہر طرح دے گئی تھی لیکن وہ سمجھ بیٹھی کہ ملکہ کو کچھ خبر ہی نہ ہو سکی۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔

منصورہ اور ظہیر یمنی کی ملاقاتوں میں اضافہ ہو گیا۔ محلات کی تمام کینز اور غلام، ظہیر یمنی کے ماتحت تھے۔ وہ سب کچھ دیکھتے اور خاموش رہتے۔ جب ملکہ خیزراں کو کوئی اعتراض نہ تھا تو وہ خواہ مخواہ ظہیر یمنی کی مخالفت کیوں مول لیتے۔ شہزادی کو سوائے ملکہ خیزراں کے کوئی اور روکنے ٹوکنے والا نہ تھا۔ اس لئے وہ بڑی آزادی اور دیدہ دلیری سے ظہیر یمنی سے ملتی۔ ظہیر کو دیر ہو جاتی تو وہ اپنی خاص کینز کے ذریعے

پیغام بھیج کر اسے بلوالیتی۔ خیزراں صبح اپنے محل سے نکل کر دیوان خاص میں چلی جا
تو پھر رات گئے اسے واپسی نصیب ہوئی۔ محل دن بھر خالی رہتا اور منصور اور ظہیر عباسی
پورے محل میں دندناتے پھرتے۔

ایک شام، ملکہ دوراں خلاف معمول جلدی واپس آگئی۔ وہ بہت پریشان تھی
مرو کے علاقے سے بغاوت کی خبر آئی تھی۔ اس نے تمام عمائدین کو دوسری صبح صبح
و مشورے کے لئے طلب کیا تھا۔ بغاوت کی خبر نے اسے حد درجہ پریشان اور مضطرب
دیا تھا۔ اسی لئے وہ آرام کرنے اور تازہ دم ہونے کے لئے جلد اپنے محل میں آکر
تھی۔ خیزراں نے اپنے دونوں بیٹوں الہادی، ہارون اور منصورہ کے لئے محدث و
علامہ شریک کی خدمات حاصل کی تھیں۔ علامہ صبح و شام بچوں کو درس حدیث اور جواب سے بہت خوش ہوئی۔ ملکہ چلتے وقت علامہ سے بولی۔
”خوش قسمت ہیں وہ شہزادے جنہیں آپ جیسے استاد میسر ہوں۔“

اس وقت بھی علامہ درس حدیث دینے میں مصروف تھے۔ الہادی اور
منصورہ ادب سے بیٹھے تشریح سن رہے تھے۔ خیزراں ادھر سے گزری۔ بچوں کو درہوئے بھی علم اور استاد کے مرتبے کا لحاظ کریں۔“
میں مصروف دیکھا تو خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ اتنے میں شہزادہ ہارون جو باہر گیا ہوا تو
بھاگتا ہوا داخل ہوا اور علامہ کے قریب پہنچ کر بولا۔

”استاد محترم! صبح آپ نے جس حدیث کی تشریح بتائی تھی وہ میری سمجھ
نہیں آئی۔ پھوپھو طاہرہ نے میرا مذاق اڑایا ہے۔ پھر سے تشریح فرمائیے۔“
علامہ نے نظر اٹھا کر شہزادے کو دیکھا لیکن جواب دینے کے بجائے پھر اپنے گسے بے ساختہ نکلا۔
میں مصروف ہو گئے۔

شہزادے کو اپنا مذاق اڑائے جانے کا بہت غم تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد کاغفے لگی۔
سے تشریح پوچھ کر اپنی پھوپھی کو مطمئن کر دے۔ علامہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو
نے سوال دہرایا۔

علامہ نے نظر اٹھا کر شہزادے کی طرف دیکھا لیکن اس بار بھی کوئی جواب
دیا۔ ملکہ خیزراں بڑی دلچسپی سے استاد اور شاگرد کی مکالمات دیکھ رہی تھی۔
شہزادہ ہارون کو ماں کی موجودگی سے شاید کچھ جرات ہوئی۔ اس نے غصے
علامہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تو نے یہ باتیں پتے کیوں نہ بتائیں؟“

اس نے کہا۔ ”کنیز نے کئی بار کہنے کا ارادہ کیا لیکن آپ اس قدر مصروف تھے کہ میں کچھ نہ کہہ سکی۔“

”ملکہ کو غصہ آگیا۔ اس نے کہا۔ ”تو نے ہمیں اتنے اہم معاملے سے بے رکھا۔ اس جرم کی پاداش میں کیوں نہ تیرا سر قلم کرا دیا جائے؟“

”بے شک، کنیز خطا وار ہے۔ میری موت تو اس وقت بھی تھی جب یہ رازم کو کسی اور ذریعے سے معلوم ہوتا۔ میں نے خود یہ بتا کر اپنی موت کو جلد آواز ہے۔“

ملکہ خیزراں پر کنیز کی بات کا بڑا اثر ہوا۔ پھر اس نے فوراً ”منصورہ کی ماں ملنے کا فیصلہ کیا۔“

خیزراں نے کہا۔ ”ہم، بنت ابوالعباس کے محل جا رہے ہیں۔ شہزادی کو اس خبر نہ ہونا چاہئے۔“ کنیز نے سر جھکا دیا۔ ملکہ خیزراں جہاں کھڑی تھیں، وہیں سے دایرہ ہو کر بنت الا جمنہ کے محل کی طرف چل پڑی۔

ملکہ خیزراں، بنت الا جمنہ کے محل میں پہنچی تو اس کی کنیزیں، ملکہ کو دیکھا گھبرا گئیں۔ ملکہ دوراں، آج سے پہلے اس محل میں کبھی نہ آئی تھی۔

کنیزوں نے دوڑ کر بنت الا جمنہ کو خبر کی تو وہ استقبال کے لئے بھاگی۔ راہدار میں بنت الا جمنہ نے ملکہ کا استقبال کیا۔ بنت الا جمنہ نے کہا۔

”زہے نصیب کہ آج ملکہ دوراں نے اس محل کو زینت بخشی۔“

ملکہ دوراں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں کمرے میں داخل ہوئیں۔ بنت الا جمنہ کہنے لگی۔ ”تشریف رکھئے ملکہ دوراں!“

”میں بیٹھنے نہیں آئی۔“ ملکہ نے ترشی سے کہا۔

بنت الا جمنہ گھبرا گئی۔ اسے اپنے محل کی دیواریں ہلتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دوراں کا ذرا سا غصہ اس محل کو زمین بوس کر سکتا تھا۔ اس نے عاجزی سے کہا۔

”فرمائیے! میں تعمیل حکم کے لئے حاضر ہوں۔“

”ظہیر یعنی کون ہے؟“ خیزراں نے پوچھا۔

محلات شاہی کا ناظم۔“ بنت الا جمنہ خوفزدہ ہو گئی۔

”یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔“ ملکہ بولی۔ ”شہزادی منصورہ سے اس کا کیا تعلق ہے؟“

بنت الا جمنہ کی سمجھ میں پوری بات آگئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ظہیر یعنی کاسرزمین پر لوٹ رہا ہو۔ بنت الا جمنہ نے سنبھل کر کہا۔

”ملکہ دوراں! ظہیر میرا غلام ہے۔ اسے میں نے اپنی اولاد کی طرح پالا، تعلیم و تربیت دی۔ منصورہ اور ظہیر بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ لیکن اب منصورہ صرف منصورہ نہیں بلکہ شہزادی منصورہ ہے۔ ملکہ دوراں کی بیٹی۔ ظہیر سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر کچھ تھا تو وہ ختم ہو چکا۔“

”ہم نے تحمل سے کام لیا ہے۔ ناظم محلات کو اس جرات کی سزا دے سکتے تھے لیکن۔۔۔“ خیزراں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ بنت الا جمنہ خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ بولی۔

”ملکہ دوراں! خدا کے لئے میری بچی کی جان بخش دیجئے۔“

ملکہ خیزراں نے مسکرا کر کہا۔ ”بنت الا جمنہ! منصورہ اب تمہاری بیٹی نہیں۔ وہ ملکہ دوراں کی نور نظر ہے۔ اچھا حکیم مرض کو ختم کرتا ہے اور مرض کو ختم کرنے کے لئے مریض کو ختم نہیں کرتا تم اطمینان رکھو ہم علاج کا ہر طریقہ آزمائیں گے۔“

ملکہ خیزراں اٹے پاؤں واپس چلی گئی۔ بنت الا جمنہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ کہتی بھی تو کیا۔۔۔ اسے وہ کہہ کر ظہیر پر غصہ آ رہا تھا۔ منصورہ تو بچی تھی۔ لیکن کیا ظہیر کی عقل ماری گئی تھی۔ اسے ملکہ دوراں کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔

ملکہ خیزراں نے اپنے محل کی حرم سرا کے قریب آنے سے ظہیر یعنی کو روک دیا۔ اس نے شہزادی منصورہ پر بھی پابندی لگا دی کہ وہ راہداری کے باہر قدم نہ رکھے۔ منصورہ کو ان پابندیوں کا علم ہوا تو وہ باغی ہو گئی۔ ظہیر یعنی سے اس کی محبت عشق کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اور ان حدود سے واپس آنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔

شہزادی نے ظہیر کو پیغام بھیج کر بلوایا۔ ملکہ خیزراں، دوسرے محل گئی ہوئی تھی۔ شہزادی نے راہداری میں قدم رکھا تو کنیزوں نے خبردار کیا۔ لیکن شہزادی نے

انہیں ڈانٹ دیا۔ کینیز خوشامد پر اتر آئیں۔ شزاوی نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اس قدم صدر دروازے کی طرف بڑھتے رہے۔

سورج غروب ہوئے کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ موی شمعیں باغ میں جگہ جگہ روشن تھیں۔ صدر دروازے پر بھی کانی روشنی تھی شزاوی صدر دروازے کے قریب پہنچی تو اس کے ساتھ آنے والی ایک کینیز نے آگے بڑھ کر ظہیر کو اطلاع دی۔ ظہیر تیزی سے شزاوی کے قریب آیا۔ شزاوی کو دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔

”غضب کیا منصورہ! کتنی نادان ہو۔“ ظہیر نے لرزتے ہوئے کہا۔
منصورہ نے پلٹ کر دیکھا۔ کینیز دور دور چلی گئیں۔ منصورہ نے ظہیر کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر باغ میں چلی گئی۔ ظہیر کا پورا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔
”کیا محبت اسی کا نام ہے؟“ منصورہ نے طنز کیا۔

”مگر — — —“ ظہیر کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔
”تم بزدل ہو — — —“ ملکہ سے ڈرتے ہو۔“ منصورہ کو غصہ آ گیا۔
منصورہ کے طنز نے ظہیر یعنی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے نظر بھر کر منصورہ دیکھا اور پھر بڑے عزم سے بولا۔

”منصورہ! تم میری ہو۔ ملکہ خیزراں تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتیں۔ میں جان دے کر بھی تمہیں حاصل کروں گا۔“ محبت مصلحت پر غالب آ گئی۔
ظہیر یعنی نے محبت سے ہاتھ پھیلانے اور منصورہ دوڑ کر ان میں سمٹ گئی۔
اب انہیں نہ ملکہ خیزراں کا خوف تھا اور نہ مستقبل کی فکر۔ ظہیر اور منصورہ ایک مصنوعی چشمے کے پاس ایک گل پوش قطعہ زمین پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔
”میں کل ملکہ مادر سے صاف صاف کہہ دوں گی۔“ منصورہ نے کہا۔
”کیا کہہ دو گی؟“ ظہیر نے پوچھا۔

”یہی کہ میں تم سے محبت — — —“ وہ شرما گئی۔
”اس کا انجام کیا ہو گا کچھ پتہ ہے؟“ ظہیر نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”جو سب کا ہوتا ہے۔ جو شیریں کا ہوا — — —“ منصورہ نے لاپرواہی سے کہا۔

ظہیر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”منصورہ! مجھے آج یہ اپنی زندگی کی آخری رات معلوم ہوتی ہے۔ میں تمہیں دل بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم اس وقت تک میرے سامنے سے نہ ہٹا جب تک ملکہ دوراں کے سپاہی میرا سر قلم نہ کر دیں۔“
منصورہ کے آنسو نکل آئے۔ اس نے کہا۔ ”ظہیر! یقین کرو اگر ملکہ کے سپاہیوں نے تمہیں قتل کر دیا تو میں برج سے گر کر اپنی جان دے دوں گی۔“
چاند کی آخری تاریں تھیں۔ ہر طرف ظلمت اور خاموشی کی حکومت تھی۔
مادر النہر کے علاقے میں کوہ سام کی چوٹی سر بلند کئے کھڑی تھی۔ جسے دیکھنے سے خوف آتا تھا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا اور پھر اسی اندھیرے اور تاریکی میں شہر خشب کے قریب کوہ سام کے ایک غار میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔
جس نے لوگوں کے ہوش اڑا دیئے۔

قری مینے کی پچیس تاریخ تھی کہ کوہ سام کے ایک غار میں روشنی پیدا ہوئی۔ یہ روشنی آہستہ آہستہ اتنی تیز ہوئی کہ سام کی پوری پہاڑی روشن ہو گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے دن نکل آیا ہو۔

شہر خشب کے لوگ گھبرا کر اپنے مکانات سے نکل آئے۔ وہ حیرت سے پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تمام شہر والے ایک جگہ اکٹھا ہوئے۔ انہیں شبہ ہوا کہ شاید پہاڑ پر آگ لگ گئی ہے لیکن نہ کوئی شعلہ تھا نہ چنگاری اور نہ دھواں۔ اس روشنی میں گرمی بھی نہ تھی۔ بلکہ ایسی ٹھنڈک تھی جیسی چاندنی میں ہوتی ہے۔ سب کی نظریں پہاڑ کی طرف تھیں۔ وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے اس عجیب و غریب روشنی کو دیکھ رہے تھے۔

کچھ لوگوں نے جرات کی اور پہاڑ کی طرف بڑھنے لگے۔ مجمع ان کے ساتھ ہو لیا۔ سب ڈرتے ڈرتے اس غار کے قریب پہنچ گئے۔ غار روشن تھا اور ایک گولا سا اس کے اندر چمک رہا تھا۔ یہ روشنی اس گولے سے پھوٹ رہی تھی۔

لوگوں کی حیرت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو گیا جب کوہ سام کی چوٹی سے ایک بھاری آواز بلند ہوئی۔
”اے غافلو — — —!“

سب کی نظریں پہاڑ کی چوٹی کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک لانا سا ہیوٹی، سیاہ چوٹے میں لمبوس ایک انسان، جس کے چہرے پر سیاہ نقاب تھا، پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ان سے مخاطب تھا۔

”اے عاقلو — اے نادانو! آنکھیں کھولو اور مجھ پر ایمان لاؤ۔ میں تمہارا خدا ہوں۔ (نمود باللہ) میرا قیام عرش بریں پر ہے۔ لیکن میں ہر بات پر قادر ہوں۔ جب چاہوں، انسانی پیکر میں نمودار ہو جاتا ہوں۔ بدعتوں کو دور کرنے اور ظالموں کو سزا دینے کے لئے میں نے عرش سے اتر کر سب سے پہلے حضرت آدمؑ کے جسم میں حلول کیا، پھر نوحؑ کے جسم میں پھر اسی طرح مختلف پیغمبروں کے قالب میں ہوتا ہوا ابو مسلم خراسانی کے روپ میں آیا۔ میں نے بنی امیہ کا تختہ الٹ کر عباسی خلافت کی بنیاد رکھی۔ مگر عباسی احسان فراموش نکلے۔ انہوں نے ابو مسلم خراسانی کی قدر نہ کی۔ خلیفہ منصور عباسی نے انہیں قتل کر دیا — میں یہ ظلم نہ دیکھ سکا۔ اب میں تمہارے سامنے حاکم بن حکم کے پیکر میں آیا ہوں — خراسانیوں اور دوسرے لوگوں کو عباسیوں کے ظلم و ستم سے چھٹکارا دلانے۔ تمہارے ایمان درست کرنے، تمہیں جنت کی بشارت دینے۔“

آواز بند ہوئی۔ سیاہ نقاب سے تیز کرینیں نکلنے لگیں۔ ایسی کرینیں اور شعاعیں کہ لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ شر نخشب کے عالم دین اور پیش امام اپنی جگہ سے آگے بڑھے اور بولے۔

”اے حاکم بن حکم! اگر تو واقعی خدا ہے تو بتا کہ اس غار سے روشنی کیوں آ رہی ہے۔ اس کا منبع کیا ہے؟“

”آواز پھر بلند ہوئی۔“ اے سادہ دل بندو! اس روشنی سے نہ گھبراؤ۔ یہ نور اور یہ روشنی تمہارے لئے ہے۔ تم رات کے اندھیرے سے گھبراتے تھے۔ ہم نے تمہارے لئے دنیا میں ایک دوسرا چاند بھیجا ہے۔ جب آسمانی چاند پردہ ظلمت میں چھپ جائے گا تو یہ ارضی چاند تمہیں روشنی دے گا۔“ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ حاکم بن حکم نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”تمہارے دلوں کی تاریکی ابھی دور نہیں ہوئی۔ ہم ارضی چاند کو حکم دیتے ہیں کہ وہ غار سے بلند ہو کر اپنے نور

کی شعاعیں اطراف میں پھیلانے تاکہ تمہارے قلوب مصفا ہو جائیں اور تم اپنے خدا کو پہچانو۔“

اس کے ساتھ ہی کوہ سام کے نیچے کنوئیں نما غار سے ایک چاند آہستہ آہستہ بلند ہونا شروع ہوا۔ شر نخشب کے باسی، عالم حیرت میں اپنی کھلی آنکھوں سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ گول، چودھویں کا پورا چاند، غار سے نکل کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے آسمانی چاند چڑھتا ہے۔

”لا ریب — تو ہمارا خدا ہے۔“ عالم دین کی زبان سے نکلا اور وہ سجدے میں گر گیا۔ اسے دیکھ کر ایک ایک کر کے نخشب والے سجدہ ریز ہو گئے۔ چاند چڑھتا رہا۔ روشنی پھیلتی رہی۔ اس کی شعاعوں سے بارہ بارہ میل کا علاقہ منور ہو گیا۔ جس نے بھی یہ چاند دیکھا وہ کوہ سام کی طرف بھاگا اور آتے ہی سجدے میں گر پڑا۔

رات بھر یہ تماشہ ہوتا رہا۔ چاند نے رات بھر اس رفتار سے سفر کیا کہ صبح کے وقت وہ پھر اسی غار میں واپس آ گیا۔ اس پہلی رات کو حاکم بن حکم پر ساڑھے پانچ سو مسلمان اپنا ایمان نچھاور کر بیٹھے۔ یہ تعداد دوسرے دن پانچ ہزار اور دو ماہ بعد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔

حاکم بن حکم یا حکم بن حاکم اور بعض تاریخ دانوں کے مطابق حکیم بن عطانے بروکے ایک گاؤں میں ممدی کی خلافت کے چھٹے سال یعنی ۱۲۳ھ ہجری میں خروج کیا۔ یہ مرتد یک چشم تھا۔ اور شکل صورت کے لحاظ سے شاید دنیا کا بد صورت ترین انسان ما۔ اس کا دل اور اس کے عقائد جس قدر مکروہ تھے اس سے کہیں زیادہ اس کا چہرہ ہیئت تھا۔ اپنی بد صورتی کو چھپانے کے لئے اس نے اپنے چہرے پر سونے کا ایک مصنوعی چہرہ چڑھا رکھا تھا۔ یہ چہرہ انتہائی چمکدار تھا اور اس سے شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ ہر وقت سیاہ کپڑوں میں لمبوس رہتا اور چہرے پر سیاہ نقاب ڈالے رکھتا تھا۔ اس لب کی مناسبت سے اسے برقی اور متضخ کہتے تھے۔ اپنے دعویٰ خدائی کے بعد وہ ہم متضخ کے نام سے مشہور ہوا تھا۔

متضخ بہت بڑا حکمت دان اور کیا گیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ ابو مسلم خراسانی کا دست راست رہ چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے ابو مسلم خراسانی کو خلیفہ کے دربار میں

جانے سے بہت روکا تھا۔ ابو مسلم خراسانی کے قتل کے بعد اس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے حکمت اور کیمیا کی طرف توجہ دی۔ اور اپنی ذہانت کے زور پر ام نے مختلف دھاتوں کا آمیزہ بنا کر سونے کے ایک گول ٹکڑے پر ملا۔ اس سے اس گول ٹکڑے میں اس قدر چمک پیدا ہو گئی کہ اس کی روشنی بارہ میل کے علاقے تک منور کر دیتی تھی۔

یہ مصنوعی چاند، آدمی رات گزرنے پر غار سے نکلتا اور صبح دم اسی غار میں واپس چلا جاتا۔ اسی لئے اس چاند کو ماہِ خشب یعنی آدمی رات کا چاند کہتے ہیں۔ ماوراء النہر کا شہر خشب بھی اسی نسبت سے مشہور ہوا۔

حکیم متنع انتہائی اعلیٰ دماغ کا مالک تھا۔ چاند کے علاوہ متنع نے اور بہت سی چیزیں بنائی تھیں۔ اس نے ایک چمڑی بنائی تھی جسے اگر جذامی کے زخموں پر پھیرا جاتا تو وہ اچھا ہو جاتا تھا۔ متنع کی آنکھوں میں ایسی طاقت تھی کہ وہ پوشیدہ چیزوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے لوگوں کو عجیب و غریب شعبہ دکھائے۔ لوگ اس کی مافوق الفطرت طاقت سے مرعوب ہو کر اسے خدا ماننے لگے اور خلافت عباسیہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ عباسی خلیفہ منصور نے ابو مسلم خراسانی کو قتل کرایا تھا اور ان کے خیال میں ابو مسلم اپنے وقت کا خدا تھا۔ حکیم متنع کے خدائی دعوے کی خبر خلیفہ مدی اور ملکہ خیزراں کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ماوراء النہر کا حاکم اس فتنے کو دبائے میں ناکام رہا تھا۔ اس نے ایک بار حکیم متنع کو گرفتار کرنے کے لئے پانچ سو سواروں کا دستہ بھیجا لیکن متنع کے پیروؤں نے اس دستے کا ایسا صفایا کیا کہ ایک بھی زندہ واپس نہ آسکا۔ ان حالات میں حاکم ماوراء النہر نے دربار خلافت سے مدد کی درخواست کی۔

حکیم متنع کی شورش جسے ”فتنہ زنداقتہ“ کہا جاتا ہے کو دبائے اور ختم کرنے کے لئے دس ہزار کا لشکر بھیجا گیا۔ لشکر کی سرداری مشہور سردار ابو عمن کے سپرد کی گئی۔ لشکر کے کوچ کا وقت آیا تو ملکہ خیزراں کے حکم پر تمام امراء، وزراء، بیگات، شہزادیاں اور شہزادے لشکر کو رخصت کرنے کے لئے قصر کے سامنے اکٹھا ہوئے۔ ملکہ خیزراں، خلیفہ کے پہلو میں بڑی شان سے کھڑی تھی۔ اس کے برابر شہزادے الہادی

اور ہارون تھے اور پشت پر شہزادی منصورہ اداس اداس کھڑی تھی۔ لشکر کوچ کے فشار کے ساتھ حرکت میں آگیا۔ ہر رسالہ، ان لوگوں کے سامنے سے گزرتا۔ رسالے کا رسالدار گھوڑا بڑھا کر ملکہ خیزراں اور خلیفہ مدی کے قریب آکر تلوار سے سلامی دیتا پھر آگے بڑھ جاتا۔ رسالے گزرتے رہے پھر ایک رسالہ ایسا آیا جسے دیکھنے کے لئے شہزادی ایک

قدم آگے بڑھ آئی۔ رسالدار ملکہ خیزراں کے قریب آکر سلامی دینے لگا۔ ملکہ خیزراں نے مسکرا کر کہا۔ ”ظہیر یعنی! ہمیں امید ہے کہ جس خوش اسلوبی سے تم نے محلات شاہی کی حفاظت کی ہے، اسی خوبی سے زندیقوں کے ہاتھوں سے دین اسلام کو بچاؤ گے۔ تم شہزادوں میں پرورش پا کر جوان ہوئے ہو۔ اس پرورش کے تقاضوں کو پورا کرنا۔“

ظہیر یعنی سلامی دے کر آگے بڑھ گیا۔ شہزادی منصورہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر وہ بڑی ہمت سے انہیں پی گئی۔

شہزادی منصورہ اور ظہیر یعنی کی محبت کوئی اہم بات نہ تھی جس سے ملکہ خیزراں اس قدر چراغ پا ہوتی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ شہزادی منصورہ ملکہ خیزراں کی بیٹی بننے ہی ایک غیر معمولی ہستی بن گئی تھی اور ملکہ خیزراں نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ ظہیر یعنی میں کوئی عیب نہ تھا۔ سوائے اس کے معاشرتی اعتبار سے اس کا وہ رجبہ نہ تھا جہاں اب شہزادی منصورہ پہنچ چکی تھی۔ ملکہ خیزراں نے شہزادی منصورہ کو گود لیتے ہی اس کے سرے مستقبل کے لئے تنگ و دو شروع کر دی تھی۔ اسے عباسی خاندان کے کسی ایسے شہزادے کی تلاش تھی جو صحیح معنوں میں منصورہ کے لائق ہو اور وقت پڑنے پر ملکہ خیزراں کا دست و بازو بھی ثابت ہو۔

ملکہ خیزراں نے مدی کے عمدہ ولی عمدی سے اب تک جس شان سے مدی اور عباسی حکومت پر اپنا قبضہ برقرار رکھا تھا اس کے پیش نظر وہ چاہتی تھی کہ آئندہ بھی اس کے ہاتھ میں اتنے مضبوط مرے رہیں کہ اس کی حکمت باقی رہے۔

خیزراں کے دونوں شہزادے اس وقت پوری طرح اس کے قابو میں تھے۔ پھر بھی وہ بڑے لڑکے شہزادے الہادی سے مطمئن نہ تھی۔ الہادی کے مزاج میں ضد اور

خود سری تھی۔ اس کے برعکس ہارون خوش مزاج اور تابعدار تھا۔ طلب جاہ کا برا ہو کہ ملکہ خیزراں ماں ہوتے ہوئے بھی بڑے بیٹے کی بجائے چھوٹے بیٹے ہارون کو مستقبل کا خلیفہ بنانے کی درپردہ کوششوں میں مصروف تھی۔ اس طرح شہزادی منصورہ کی شادی کا مسئلہ بھی طلب جاہ سے پیوستہ ہو کر رہ گیا تھا۔

ایک رات سونے سے پہلے ممدی نے شہزادی کی شادی کا ذکر چھیڑا۔ ملکہ خیزراں بھی اس معاملے میں ممدی کو اپنے اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ ممدی نے سرسری بات کی لیکن ملکہ اس معاملے میں سنجیدہ تھی۔ اس نے گفتگو میں بھی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔

خلیفہ نے کہا۔ ”ظہیر یعنی کو شہزادی کے راستے سے ہٹانے کے اور بہت سے راستے تھے؟“

”خلیفہ وقت کا اشارہ ظہیر کے سر کی طرف تو نہیں؟“ ملکہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ خلیفہ نے جواب دینے کے بجائے ایک زیر لب تبسم سے خیزراں کے خیال کی تصدیق کی۔

ملکہ نے محبت بھرے انداز میں خلیفہ کو دیکھتے ہوئے۔

”شہزادی منصورہ آپ کی بیٹی ہے اور اب ہماری بھی۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس کے دل کو کوئی صدمہ پہنچے۔ ہم نے ظہیر کو محاذ جنگ پر بھیج دیا۔ اگر وہ مارا گیا تو شہزادی کو خود بخود صبر آ جائے گا۔ اگر کامیاب واپس آیا تو اس کا عمدہ بڑھ جائے گا اور اس کا شمار شہزادوں میں ہونے لگے گا۔“

ممدی نے مسکرا کر خیزراں کے گلے میں بانیں ڈال دیں اور بولا۔

”ہم تمہاری عقل کی داد دیتے ہیں۔ ملکہ! اسی لئے ہم نے تمام انتظام سلطنت تمہارے سپرد کر رکھا ہے۔“

ملکہ اپنی تعریف سن کر پھولے نہ سائی۔ یکا یک ممدی کو کچھ خیال آیا۔ اس نے کہا۔ ”ملکہ اگر ظہیر کامیاب واپس آیا تو پھر تم‘ اسے کسی اور آزمائش میں تو نہ ڈالو گی؟“

”مستقبل ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے‘ میرے شہزادے! وقت آئے گا تو دیکھا

جائے گا۔“ ملکہ نے پیار سے کہا۔

ادھر خلیفہ اور ملکہ میں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور دوسرے کمرے میں منصورہ اپنے محبوب کا تصور آنکھوں میں لئے کروٹیں بدل بدل کر خواب کی آغوش میں پہنچ چکی تھی۔

منصورہ کی نظروں کے سامنے ایک بلند پہاڑ تھا۔ پہاڑ کی ترائی میں ایک غار تھا۔ ظہیر یعنی اسے اپنے سواروں کے ساتھ غار کے دہانے پر کھڑا دکھائی دیا۔ پھر غار میں روشنی پیدا ہوئی اور ایک شعلہ سا گھومتا ہوا اس میں سے نمودار ہوا اور آواز آئی۔

”اے نادانو! یہ چاند ہم نے تمہارے لئے بنایا ہے۔ کیا یہ ہماری خدائی کا جیتا جاگتا ثبوت نہیں ہے۔ اپنے ہتھیار پھینک دو اور ہمارے سامنے سر جھکا دو۔ ہم تمہارے گناہ معاف کرتے ہیں۔ خلافت عباسیہ احسان فراموش ہے۔ تم اسے مٹا دو۔ تمہارا خدا تمہارے ساتھ ہے۔“

اس ارضی چاند کو دیکھنے اور آواز سننے والے ظہیر یعنی اور اس کے ساتھیوں پر دہشت طاری ہو گئی۔ ان کے جسم کانپنے لگے اور ایک ایک کر کے تمام سر جھک گئے۔ ظہیر یعنی کا سر جھکنے لگا۔ شہزادی یہ منظر نہ دیکھ سکی۔ اس نے زور سے چیخ ماری۔

”ظہیر! ایسا نہ کرو۔ یہ شرک ہے، کفر ہے۔“ چیخ کے ساتھ ہی شہزادی منصورہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔

خلیفہ ممدی اور ملکہ خیزراں، اس کی چیخ کی آواز سن کر کمرے میں آ گئے۔

خیزراں نے بڑھ کر شہزادی کو چمٹا لیا۔

”ڈر گئی، میری شہزادی۔“ خیزراں نے کہا۔

ممدی بولا۔ ”کوئی خوفناک خواب دیکھا ہے شاید۔“

لیکن خواب نہیں حقیقت تھی۔ ابو عون عباسی لشکر کے ساتھ کوہ سام کی اوپوں میں پہنچا۔ اس نے متح کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ جنگ شروع ہو گئی۔ کفر و سلام کی جنگ۔

دن بھر جنگ ہوتی رہی۔ کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ رات ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا

ظہیر کو ششوں اور متعج کی شعبہ بازی کا یہ اثر ہوا کہ متعج ایک عظیم طاقت بن کر ابھرا اور اس نے خلافت عباسیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ابو مسلم خراسانی کے ہمدرد اس کے ساتھ ہو گئے۔ متعج جس طرف لشکر کشی کرتا فتح و نصرت اس کے قدم چومتی۔

دار الخلافہ بغداد میں ہر شخص پریشان تھا۔ مشرکوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ ظہیر یمنی کے مشرک ہو جانے کا عمائدین سلطنت کو بہت افسوس تھا۔ اس کی ذمہ داری وہ ملکہ خیزراں پر ڈالتے تھے۔ انہیں اندرون خانہ حالات کا علم نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ملکہ نے ظہیر یمنی کو اس عہدے سے ہٹا کر غلطی کی اور اسے متعج کے مقابلے پر بھیج کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ متعج کے ذکر کے ساتھ اس کے نائب ظہیر یمنی کا ذکر ضرور ہوتا۔ متعج کی تمام کامیابیوں میں ظہیر برابر کا شریک تھا۔ ملکہ خیزراں نے منصورہ اور ظہیر کے معاملے میں اپنی طرف سے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔

اسے ان دونوں کے تعلقات کا علم ہوا تو منصورہ سے باز پرس کرنے یا اس پر کوئی پابندی عائد کرنے کی بجائے اس نے خاموشی اختیار کی اور موقع ملتے ہی ظہیر کو بغداد سے باہر بھیج کر اطمینان کا سانس لیا۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ملکہ کے دل میں چور تھا۔ وہ دو محبت بھرے دلوں کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس سے ملکہ کا ضمیر مجروح ہوا اور وہ ایک طرح کے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے جو قدم اٹھایا تھا بظاہر اس میں منصورہ کی بھلائی تھی لیکن جوان دل برے بھلے کی تمیز نہیں کیا کرتے۔

ظہیر کے جانے کے بعد منصورہ ملکہ خیزراں سے کچنی کچنی رہنے لگی۔ ملکہ نے اسے محسوس کیا لیکن کیا کر سکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملکہ خود بھی منصورہ سے نظریں چرانے لگی جیسے وہ مجرم ہو لیکن جب سے ظہیر کے مشرک ہونے کی خبریں آنے لگیں، منصورہ کی حالت میں ایک دم تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اب تک اسے ملکہ سے شکوہ تھا لیکن اب وہ ظہیر کے اس فعل سے خود شرمندہ تھی۔ اسے ظہیر سے ایسی امید نہ تھی۔ وہ سوچتی اگر ظہیر پر ظلم ہوا تھا تو اسے اس کی خاطر برداشت کرنا چاہئے تھا۔ اتنا

گیا تو جنگ بند ہو گئی۔

صبح ہوئی تو ظہیر یمنی اپنے رسالے کے ساتھ عائب تھا۔ وہ رات کو چاند کا شعبہ دیکھ کر مع اپنے ساتھیوں کے متعج کی خدائی پر ایمان لے آیا تھا۔ اب ظہیر یمنی اپنے ہی لشکر کے خلاف، زندیقوں کی طرف سے لڑ رہا تھا۔ زندیقوں کو فتح حاصل ہوئی۔ ابو عون میدان جنگ میں شہید ہو گیا اور فوج شکست کھا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

ملکہ خیزراں اور خلیفہ ممدی کو اس شکست کی خبر ہوئی تو خیزراں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اسے زیادہ افسوس ظہیر یمنی کے مرتد ہونے کا تھا — وہ ایک جھوٹے خدا کو سجدہ کر کے کافر ہو گیا تھا۔

شہزادی منصورہ نے اس خبر پر کسی تعجب کا اظہار نہ کیا۔ وہ پہلے ہی ظہیر کو متعج کے سامنے سر جھکائے دیکھ چکی تھی۔

حکیم متعج کو ظہیر یمنی کے ایمان لانے سے بڑی تقویت ملی۔ خلافت عباسیہ کے لشکر کو شکست ہوئی تو اس کے ماننے والوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ ان میں اگر کچھ لوگوں کو پہلے کچھ شک و شبہ تھا تو وہ جاتا رہا — متعج کی خدائی میں استحکام پیدا ہو گیا۔

متعج نے قلعہ کش کو اپنا مستقر بنا لیا۔ اور پھر خلافت عباسیہ کے مقابلے پر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس نے اطراف ماورا النہر میں فوجیں روانہ کیں۔ جنوں نے اس پاس کے تمام قلعوں پر بہ آسانی قبضہ کر لیا۔

حکیم متعج نے ظہیر یمنی کو اپنا نائب مقرر کیا اور زندیقوں کے پورے لشکر کا اسے سپہ سالار اعظم بنا دیا۔

ظہیر نے بھی حکیم متعج کی اطاعت اور فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس کے ساتھ خلیفہ اور ملکہ خیزراں نے جو سلوک کیا تھا اس کی وجہ سے اسے ان سے نفرت ہو گئی تھی۔ اور اس نے انتقام لینے کی ٹھانی۔

ظہیر گھر کا بھیدی تھا۔ اس نے حکیم متعج کو خلافت عباسیہ کے تمام کمزور پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ عباسی قلعہ داروں کے پاس جا کر ظہیر خود متعج کی طرف سے صلح کا پیغام دیتا اور انہیں متعج کی خدائی پر ایمان کی ترغیب دیتا۔

شدید رد عمل کسی طرح مناسب نہ تھا۔

ظہیر کے دل و دماغ پر حکیم متنع کی عظمت کا ایسا سکہ بیٹھا کہ اب اسے سوائے متنع کے اور کسی کی پرواہ نہ رہی۔ قلعہ کش کی رنگینیوں نے اسے منصورہ کی محبت اور خیال سے بھی بے خبر کر دیا۔

نبوت اور خدائی کا دعویٰ کرنے والے بڑے نباض ہوتے ہیں۔ انہیں انسانی کمزوریوں کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں، انسان اور خصوصاً ”جوان طبقہ“ اخلاقی پابندیوں سے آزادی کا بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ اسی لئے وہ ہمیشہ غیر اخلاقی اصولوں کا پرچار کر کے انسانوں کو اخلاقی قدروں کی پامالی کا پورا موقعہ فراہم کرتے ہیں۔

متنع کا قلعہ کش بھی ایسی غیر اخلاقی حرکتوں کا گڑھ تھا۔ اس کی دلکشی کا دارومدار تو متنع کی ذہانت پر تھا۔ اس نے اس مقام کو ایک طرف تو فوجی اعتبار سے اس قدر مضبوط کر دیا کہ اسے فتح کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا اور دوسری طرف اسے اس قدر شاداب کیا کہ اس کی فضاؤں میں کیف و مستی کا ایک دلچسپ سحر ہر دم طاری رہتا۔

قلعے کے محلات میں تسکین قلب کے تمام لوازم اکٹھا کئے گئے تھے۔ وہ قلعہ ارضی خدا متنع کا مسکن تھا۔ اس لئے اس میں فرشتوں، حوروں اور غلام جیسی مخلوق کا بھی اہتمام تھا۔ غرض اس کی رنگینیاں ایسی تھیں کہ ثقہ سے ثقہ شخص بھی یہاں آ کر اپنا ایمان کھو دیتا۔ ظہیر یعنی تو پھر نوجوان اور متنع کا نائب تھا۔ وہ ہر پابندی سے آزاد تھا۔ خوبصورت عورتیں، ہر وقت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتیں۔ شراب اور حسن بے پایاں کے بے محابہ اظہار سے ظہیر ہر وقت مدہوش رہتا۔

متنع کے لشکر میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ اور خلافت عباسیہ کے بہت سے قلعے بھی اس کے ہاتھ میں آ چکے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ اب اس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ بغداد کی طرف بڑھ کر عباسیوں پر کاری ضرب بھی لگا سکتا ہے۔

اسے عباسی خلافت سے ابو مسلم کا انتقام لینا تھا اور بغداد پر قبضہ کر کے اپنی جھوٹی خدائی کو پوری خلافت عباسیہ میں پھیلانا تھا۔ کہتے ہیں کہ متنع کو اپنی بد صورتی کے لئے خدا سے بھی شکوہ تھا۔ وہ خدا کا باغی تھا اور نعرہ زبانی خدا سے بھی انتقام لینا

چاہتا تھا۔

اس انتقام کی اس نے یہ صورت نکالی تھی کہ مخلوق خدا کو آپس میں لڑا کر اس کا خون بہایا جائے۔ تاکہ خدا کو بھی متنع کی طاقت کا اندازہ ہو سکے۔

انسان کس قدر نادان ہے۔ خدا کی طاقت سے مقابلہ کرنے سے پہلے اسے یہ تو سوچنا چاہئے کہ جس طاقت سے وہ خدا کا مقابلہ کر رہا ہے آخر وہ طاقت اسے کس نے عطا کی ہے۔ حکیم متنع نے اس نکتے پر غور کرنے کی کوشش نہ کی اور اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ قلعہ کش سے نکل کر بغداد کی طرف چلا۔

متنع کی روز بروز بڑھتی ہوئی طاقت خلافت عباسیہ کے لئے ایک عظیم خطرہ بن گئی تھی۔ خلیفہ ممدی اور ملکہ خیزراں نے تمام سرداراں اور وزیروں کو طلب کر کے ان کے سامنے اس فتنے کو ختم کرنے کے تمام پہلوؤں پر غور کیا۔ متنع کے شعبدے اور اس کے اعتقادات پر بحث ہوئی۔

متنع کی طاقت کا اصل سرچشمہ، اس کی دماغی اختراع، ماہ نخب کا شعبہ تھا۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ ایک طرف تو متنع کے بڑھتے ہوئے لشکر کو روکا جائے اور دوسری طرف ماہ نخب کی حقیقت معلوم کی جائے۔ کیونکہ جب تک ماہ نخب کا شعبہ موجود ہے۔ لوگ متنع کو سجدہ کرتے رہیں گے۔

وزیر سلطنت ابو عبید کی رائے تھی کہ متنع کے مقابلے پر ستر ہزار کا لشکر بھیجا جائے لیکن ملکہ خیزراں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کے خیال میں اتنے عظیم لشکر کو بھیجنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ اگر خدا خواستہ پہلے کی طرح یہ لشکر بھی شکست سے دو چار ہو گیا تو بہت بڑی بدنامی ہوگی۔

چالیس ہزار لشکر پر سب نے اتفاق کیا۔ اس لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا اور الگ الگ دو سردار مقرر کیے گئے۔

بیس ہزار کی کمان مسیب بن زبیر کے سپرد ہوئی۔ مسیب کو حکم دیا گیا کہ وہ متنع کی یلغار کو روکنے کی کوشش کرے۔ بقیہ نصف فوج معاذ بن مسلم کی کمان میں دی گئی۔ اس فوج کو دور مار منجیقوں سے لیس کیا گیا۔ یہ منجیقیں بیس سیر سے چار من تک وزنی پتھر پھینکنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

اس فوج کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ چکر لگا کر کوہ سام کے پیچھے پہنچے اور شر
نخشب کا محاصرہ کرے۔ اس کے ذمے یہ فرض بھی لگا دیا گیا کہ اگر ممکن ہو سکے تو ماہ
نخشب کا راز معلوم کر کے اسے تباہ کر دے۔

مسیب اور معاذ دونوں بڑے تجربہ کار سپہ سالار تھے۔ رواجی سے پہلے ان
دونوں نے دیر تک آپس میں گفتگو کی اور آپس میں مسلسل رابطہ قائم رکھنے کی
تدبیروں کو آخری شکل دی۔ انہوں نے آپس میں یہ بھی طے کر لیا کہ وقت ضرورت وہ
ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور مشکل وقت میں کمک روانہ کریں گے۔
مسیب اپنا لشکر لے کر دن رات ایک کرتا ہوا متنب کے سر پر پہنچ گیا۔ متنب کو
خیال تھا کہ خلافت عباسیہ کو ایک بار شکست ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ ابھی مقابلے پر
آنے کے قابل نہیں لیکن مسیب نے اس کے سامنے پہنچ کر اس کا یہ خیال غلط ثابت
کر دیا۔

قلعہ کش سے رواجی کے وقت حکیم متنب نے اپنے نائب ظہیر یمنی کو شر
نخشب اور کوہ سام کی حفاظت کے لئے پیچھے بھیج دیا۔ اس کے نقطہ نظر سے کوہ سام کی
حفاظت بے حد ضروری تھی۔ کیونکہ وہیں سے ماہ نخشب نکلتا تھا اور اسی چاند پر اس
کی خدائی کا دار و مدار تھا۔ ظہیر یمنی کو متنب کی یہ بات پسند نہ آئی۔ وہ تو بغداد پر قبضہ
کر کے منصورہ کو حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا مگر اسے خاموش ہو کر متنب کا حکم
ماننا پڑا۔

ظہیر قلعہ کش کو خیر باد کہہ کر نخشب واپس آ گیا۔ متنب نے ظہیر کو تاکید کی
تھی کہ نخشب اور ماہ نخشب کی پوری طرح حفاظت کی جائے۔ اور دشمن اگر اس
طرف کا رخ کرے تو اسے کوہ سام سے دور رکھا جائے۔

معاذ بن مسلم کو ایک لمبا چکر لگا کر کوہ سام پہنچنے کا حکم تھا۔ اس میں اسے کافی
وقت لگ گیا۔

دوسری طرف مسیب بن زبیر کا جلد ہی متنب سے سامنا ہو گیا۔ مسیب نے متنب
کے لشکر سے کچھ دور ٹھہر کر حالات کا جائزہ لیا۔ اسے معلوم ہوا کہ متنب کا لشکر تیس
ہزار سے بھی زیادہ ہے اور کھلے میدان میں اس سے مقابلہ زیادہ سودمند نہیں۔

اس کی فوج میں چھاپہ مار دستے بھی موجود تھے۔ مسیب نے ان دستوں کو بڑی
عقلمندی سے ترتیب دیا۔ پھر متنب کی فوج پر ان تیز رفتار دستوں نے اتنے زبردست
حملے کئے کہ متنب کا لشکر گھبرا گیا۔ متنب بھی اس صورت حال سے پریشان تھا۔ وہ چاہتا
تھا کہ ایک بار مقابلہ ہو اور فیصلہ کن جنگ کی جائے۔

متنب اپنا لشکر لے کر اور آگے بڑھتا کہ مسیب کا سامنا ہو جائے لیکن مسیب
نے مقابلہ کرنے کی بجائے پسپائی کی حکمت عملی اختیار کی۔ اس طرح مسیب نے دن
رات چھاپہ مار جنگ سے متنب کا ناک میں دم کر دیا اور پھر پلٹ کر ایسا زبردست حملہ
کیا کہ متنب کی خدائی کام نہ آ سکی۔ اور اس نے شکست کھا کر قلعہ کش کی طرف ہٹنا
شروع کر دیا۔

معاذ بن مسلم نصف فوج کے ساتھ کوہ سام کے نواح میں پہنچا تو اس نے اپنے
مقابلے میں ایک زبردست لشکر کے ساتھ ظہیر یمنی کو تیار پایا۔ معاذ نے کوہ سام سے
کچھ دور ڈیرے ڈال دیئے۔ معاذ کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ مقابلے
سے پہلے ایک بار وہ ظہیر یمنی سے ملاقات کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کرے۔
وہ ظہیر سے اچھی طرح واقف تھا۔ دونوں میں کئی بار ملاقات ہو چکی تھی۔ ظہیر خود
بھی معاذ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ لیکن ان دونوں کی ملاقات کی کوئی سبیل نہ پیدا ہو
سکی۔

معاذ نے حملے میں پہل کرنے سے قصداً گریز کیا۔ ظہیر بھی اس کے مقابلے پر
آتے ہوئے کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے مدافعت کی پالیسی اختیار
کی اور معاذ کے حملے کا انتظار کرنے لگا۔

دونوں لشکر آئے سانے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔
پھر ایک رات ان کی ملاقات کا قدرت کی طرف سے انتظام ہو گیا۔

معاذ کو ماہ نخشب کی حقیقت معلوم کرنے کی جستجو ہوئی۔ اس وقت بھی راتیں
اندھیری تھیں اور متنب کا چاند نمودار ہو کر قرب و جوار کو منور کرتا تھا۔

معاذ صلح ہو کر اپنے لشکر سے نکلا۔ ابھی چاند بلند نہ ہوا تھا۔ معاذ آہستہ آہستہ
اس غار کی طرف چل دیا۔ جس میں سے چاند نکلا کرتا تھا۔ معاذ ایک سچا مسلمان تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ چاند محض متنع کی عقل و حکمت کا ایک نمونہ ہے۔ جس میں قدر کی بجائے صرف عقل انسانی کو دخل ہے۔

ظہیر کا لشکر کوہ سام کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ معاذ پھونک پھونک کر اٹھا رہا تھا۔ اور جھاڑیوں اور ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے ہر قدم اپنے مارے جانے کا خطرہ تھا لیکن اس کے شوق تجسس نے اسے غار کے بالکل قریب پہنچا دیا۔ اس سے آگے بڑھنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ رک کر چاند کے بل بوتے کا انتظار کرنے لگا۔

چاند اپنے وقت پر غار سے بلند ہونا شروع ہوا۔ اس کی شعاعیں چاروں طرف پھیلنے لگیں۔ معاذ بڑے غور سے چاند کی بناوٹ اور اس سے نکلنے والی شعاعوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس محویت نے اسے خطرے کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ اور جب اسے ہوش آیا تو خطرہ سر پر پہنچ چکا تھا۔

اس وقت روشنی دور دور تک پھیل چکی تھی۔ اور ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ معاذ نے آہٹ پاتے ہی خود کو ایک چٹان کی اوٹ میں کر لیا اور پھر جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے واپس ہوا۔ اچانک ایک سپاہی نے سامنے آکر اس کا راز روک لیا۔ معاذ کے لئے اس کے سوا اب کوئی چارہ نہ تھا کہ اسے ہلاک کر کے راز بنائے۔ اس نے پھرتی سے تلوار کھینچی اور اس کی طرف بڑھا۔

”معاذ تلوار پھینک دو۔ تم چاروں طرف سے میرے سپاہیوں کے گھیرے ہو۔“ یہ آواز ظہیر یعنی کی تھی۔

معاذ نے اس کی آواز پہچان لی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

”معاذ ٹھہر جاؤ ورنہ۔۔۔“ ظہیر نے گرج کر کہا۔

معاذ رک گیا اور بولا۔ ”ظہیر! مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں لیکن میں کسی مشرک کے ہاتھوں مرنے کو تیار نہیں۔“

ظہیر بگڑ کر بولا۔ ”مشرک کون، تم یا میں؟“

”مشرک وہ ہے جو خدا کی ذات میں کسی کو شریک کرے۔“ معاذ نے استقلال

سے کہا۔ وہ ظہیر یعنی سے گفتگو کر کے اسے سمجھانا چاہتا تھا۔ ظہیر نے کہا۔ ”اے معاذ! کیا یہ ابھرتا ہوا چاند متنع کی خدائی کا کھلا ثبوت

نہیں۔ کس انسان میں یہ طاقت ہے کہ ایسا کرشمہ دکھا سکے۔“

”ظہیر خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔ یہ چاند خدائی کا نہیں بلکہ عقل انسانی کا کرشمہ ہے۔“ معاذ نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔

”ہرگز نہیں معاذ!“ ظہیر بولا۔ ”تم، متنع کی طاقت سے واقف نہیں ہو ورنہ ایسا نہ کہتے۔ چاند کے علاوہ قلعہ کش میں کتنی ہی چیزیں ایسی ہیں جو اس کی خدائی پر دلالت کرتی ہیں۔“

معاذ نے کہا۔ ”ظہیر! تمہارا متنع، شداد سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ فرعون کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نمرود کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ یقین کرو آج نہیں تو کل متنع کا بھی وہی حشر ہو گا جو خدائی کا دعویٰ کرنے والے ان مردودوں کا ہوا۔“

ظہیر یعنی کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”چلے جاؤ معاذ! میں تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کرنا چاہتا۔“

معاذ کو تھوڑی سی خوشی ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ظہیر اس کی باتوں سے کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہوا ہے۔

معاذ نے چلتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک سچے مسلمان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ تمہارا ضمیر اس وقت بھی تمہیں ملامت کر رہا ہے۔ ظہیر! اگر تمہیں اس چاند پر یقین ہے تو غار میں جاؤ۔ تمہیں اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ یہ دھاتوں کا بنا ہوا نقلی چاند ہے۔“

ظہیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ معاذ واپس چلا گیا لیکن وہ دیر تک اسی جگہ کھڑا ایک عجیب طرح کی ادھیڑ بن میں گرفتار رہا۔

معاذ اور ظہیر کی ملاقات ہو گئی۔ معاذ نے اسے اسلام کا پیغام دیا۔ ظہیر کفر و اسلام کے درمیان الجھ کر رہ گیا۔ لیکن وہ اسلام پر ایمان نہ لایا۔ معاذ کے لئے اب سوائے جنگ کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ غار کے محل وقوع سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔

دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ظہیر یمنی بھی ایک بلند جگہ پر کھڑا تھا اور اس کی نظریں غار کے دہانے کی طرف تھیں۔ وقت آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔

پھر اندازے کے مطابق وہ وقت بھی آگیا جس وقت پر چاند نکلا کرتا تھا۔ غار میں تاریکی تھی۔ کوئی چنگاری، کوئی شعلہ، کوئی چاند غار سے برآمد نہیں ہوا۔ لمحات، ساعتوں میں اور ساعتیں گھنٹوں میں بدل گئیں لیکن چاند نہ نکلا۔ — مفتاح کا چاند غار کے اندر ہی دم توڑ گیا۔ پتھروں کی بارش نے چاند کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

مسلمانوں نے ”اللہ اکبر“ کا نعرہ لگایا اور جوش و خروش کے ساتھ اندھیرے میں غار کی طرف بڑھنے لگے۔ زندیقوں کا لشکر چاند نہ نکلنے سے گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ان کے بھاگنے سے خشب کے محافظ دستوں کے قدم بھی اکڑ گئے۔ ظہیر یمنی نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی اور وہ بھی لشکر کے ساتھ قلعہ کش کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے دل میں مفتاح کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی تھی۔ نور اسلام کی شمع پھر اس کے دل کے تاریک گوشوں میں جھلکانے لگی۔

معاذ کو خون بہائے بغیر یہ فتح حاصل ہوئی۔ کوہ سام اور شر خشب پر اس کا قبضہ ہو گیا۔

وہ اسی رات چند آدمیوں کو ساتھ لے کر غار پر پہنچا۔ شمعوں کی روشنی میں تلاش کرنے پر اسے غار میں جانے کا راستہ مل گیا۔ وہ غار میں اترتے چلے گئے۔ غار کی تہ پتھروں سے پٹ گئی تھی۔ انہیں ایک جگہ ٹوٹے ہوئے چاند کے کچھ ٹکڑے پڑے ملے اور غار کے مختلف حصوں میں آلات کیما گری کا بہت سا سامان بھی دستیاب ہوا جو ادھر ادھر بکھرا پڑا تھا۔ ماہ خشب کا خاتمہ ہوا اور مفتاح کا ظلم ٹوٹ گیا۔

مسب بن زبیر نے قلعہ کش کا محاصرہ کر لیا تھا۔ قلعے کے تین اطراف پر اس کا مکمل قبضہ تھا لیکن چوتھی سمت پہاڑی نالوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں کا ایسا دشوار گزار سلسلہ تھا جس پر مسب قبضہ نہ کر سکا۔

اس کے پاس نہ تو چھوٹی کشتیاں تھیں اور نہ رسیوں کے پل، اس طرف سے مفتاح کو سامان رسد پہنچتا تھا اور وہ قلعہ بند ہو کر خود کو محفوظ سمجھ بیٹھا تھا۔

ظہیر یمنی شکست خوردہ لشکر کے ساتھ اسی راستے سے قلعہ کش میں داخل

صبح ہوتے ہی معاذ نے منبغی چلانے والے ماہرین اور نشانہ بازوں کو طلب کیا اور انہیں غار کے دھانے کا محل وقوع اچھی طرح سمجھایا۔ معاذ کے اکثر سپاہی چاند کو دیکھ کر خوف زدہ تھے۔ اور ان کے ایمان بھی ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔

معاذ نے فیصلہ کیا کہ اس جھگڑے کا فوراً خاتمہ کر دے ورنہ اس کے لشکر میں ابتری پھیلنے کا خدشہ تھا۔

دوپہر تک ماہرین اور نشانہ باز کوہ سام اور اس کے دہانے کا نقشہ بناتے رہے جس میں سے چاند نمودار ہوتا تھا۔ معاذ نے فاصلے کے تعین میں ان کی مدد کی اور رہنمائی بھی کی۔ چنانچہ دوپہر تک سب لوگ ایک نقشے پر متفق ہو گئے۔ منبغیتیں کھینچ کر آگے لائی گئیں اور ماہرین کے مشورے کے مطابق انہیں تھوڑی تھوڑی دوری کے فاصلے سے نصب کیا گیا۔

بڑے بڑے پتھر صبح ہی سے اٹھا کر لائے جا رہے تھے۔ پتھروں کو اوپر چڑھایا گیا۔ نشانہ بازوں نے نشانے باندھے اور پھر اللہ کا نام لے کر پانچ بڑے بڑے پتھر کو سام کے دھانے کی طرف پھینکے گئے۔ پتھروں کے گرنے اور ٹکرانے سے زبردست دھماکے ہوئے۔

مفتاح کے سپاہیوں نے حیرت سے ان اڑتے پہاڑوں کو دیکھا مگر انہیں تعجب اس بات پر تھا کہ پتھروں کا نشانہ بجائے لشکر کے پہاڑ تھا۔ پتھر پہاڑ سے ٹکرا کر ٹوٹے اور شور پیدا کرتے۔ مفتاح کے سپاہی اسے ایک تماشہ سمجھ کر قہقہے لگاتے رہے۔

نشانچی نشانہ بدل بدل کر پتھر برساتے رہے۔ دو گھنٹے کی کوششوں کے بعد نشانچیوں کا نشانہ درست ہوا اور پتھر سیدھے اس غار میں گرنے لگے جہاں سے چاند بلند ہوتا تھا۔

رات ہو گئی لیکن پتھروں کی بارش بدستور جاری رہی۔ زندیقوں کا لشکر دور کھڑا پتھروں کے گرنے اور دھماکوں کی آوازیں سنتا رہا۔

معاذ اپنے لشکر کے ساتھ دست بہ دعا تھا۔ اس کی دن بھر کی محنت اور کوشش کا نتیجہ نکلنے والا تھا۔ چاند کا ٹکنا اس شکست اور نہ ٹکنا اس کی فتح تھی۔

چاند کے نکلنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ لشکر اسلام کے جیالوں کے دلوں کی

مفتح نے قلعے میں اعلان کرا دیا کہ آج رات آسمانی لشکر قلعے میں آئے گا۔ ان کا شاہان شان استقبال کیا جائے۔ اور آج وہ اپنے بندوں کے سامنے بے نقاب بھی ہو گا۔ تاکہ بندے اپنے خدا کا دیدار کر سکیں۔

ظہیر یعنی کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو لشکر اسلام میں بھیجا اور پیغام دیا کہ آج رات کسی وقت قلعے کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ مسلمان تیار رہیں اور دروازے کھلتے ہی اندر داخل ہو جائیں۔

معاذ بن مسلم بھی نخشہ پر قبضہ کرنے کے بعد قلعہ کش پر مقیم اسلامی لشکر سے آ ملا تھا۔ اسے ظہیر کا پیغام ملا تو اس نے مسیب بن زبیر کے سامنے اس کی تصدیق کی اور بتایا کہ ظہیر اب پہلے والا ظہیر نہیں بلکہ مفتح سے باغی ہے۔ اس لئے اس کے پیغام کو فریب نہ سمجھا جائے۔

شام ہوتے ہی اسلامی لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر قلعے کے سامنے پہنچ گیا۔ مفتح کے حکم پر قلعے کو آراستہ کیا گیا۔ چراغوں کی روشنی میں قلعہ جگمگا اٹھا۔ مفتح کا تمام لشکر قلعے کے وسیع میدان میں جمع ہوا۔ ان کے لئے جگہ جگہ شراب کے ٹکے رکھے گئے۔ کھانے پینے کی دیگر اشیاء وافر مقدار میں لائی گئیں۔ پورے لشکر کی دعوت مفتح نے کی تھی۔ فرشتوں کے لشکر کی آمد کی خوشی میں۔

مفتح کے لئے ایک دنچا اسٹیج بنایا گیا۔ اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئیں۔ اسٹیج کے ایک طرف ایک پختہ حوض تھا جس میں مفتح نے کوئی محلول بھرا دیا تھا۔ آج خدائی کا دعویٰ کرنے والے اس مفتح کو اس اسٹیج پر اپنا جلوہ دکھانا تھا۔

مفتح سیڑھیوں کے پاس آیا۔ سیاہ لباس اور سیاہ نقاب میں چھپا ہوا چہرہ جس سے شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ مفتح سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ظہیر یعنی اس کے پیچھے تھا۔

مفتح نے اوپر پہنچ کر ظہیر یعنی کو نیچے جانے کا حکم دیا۔ ظہیر دو چار سیڑھیاں اتر کر رک گیا۔ مفتح کو اپنے نائب کی یہ حکم عدولی ناگوار گزری۔ لیکن وہ طرح دے گیا۔

اسٹیج پر پہنچتے ہی مے نوشی کا عام اعلان ہوا اور لوگ شراب کے ٹکوں پر ٹوٹ

ہوا۔ اسے امید تھی کہ مفتح، لشکر کو اور خود اسے لعنت ملامت کرے گا کیونکہ لشکر نے بزدلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اور بغیر لڑے بھاگ آیا تھا۔ لیکن مفتح نے ظہیر اور اس کے لشکر کو خوش آمدید کہا۔

اس نے شکست کو بھی ایک حکمت عملی کہہ کر ظہیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ مفتح کے اس رویے نے ظہیر کے دل میں اس کی طرف سے اور شکوک پیدا کر دیئے۔ وہ مصلحتاً خاموش ہو کر وقت کا انتظار کرنے لگا۔

قلعہ کش میں چند ہی روز رہنے کے بعد ظہیر یعنی پر مفتح کی حقیقت کھل گئی۔ ظہیر کو نائب ہونے کی حیثیت سے مفتح کی غلوت میں جانے کی اجازت تھی۔ ظہیر جب بھی مفتح کے غلوت کدہ میں جاتا۔ اسے عیش و عشرت میں مصروف پاتا۔ بے شمار حسین و جمیل عورتیں اس کے گرد جمع رہتیں۔ ہر وقت شراب کے دور چلتے رہتے۔

ظہیر کے دل میں مفتح کی عظمت کا جو تصور تھا۔ وہ ان باتوں کو دیکھ کر چکنا چور ہو گیا۔ اس کا دل روز بروز مفتح سے باغی ہوتا گیا۔ اس کے دستے کے بعض سوار جو اس کے ساتھ مشرک ہو گئے تھے وہ بھی ظہیر کے ہم خیال ہو گئے۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ مفتح کے جانی دشمن ہو گئے۔ ظہیر نے سمجھا بھجا کر انہیں قابو کیا اور صبر کی تلقین کی۔

قلعہ کش کا قدرتی محل وقوع، اس کی تسخیر میں حائل تھا۔ عباسی لشکر نے سر توڑ کوشش کی مگر وہ فتح نہ ہو سکا۔

مفتح کا شکست خوردہ لشکر قلعے سے نکل کر کھلے میدان میں مقابلہ کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ مفتح نے کئی بار لشکر کو باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا حکم دیا اور غیبی مدد کا وعدہ کیا لیکن لشکر نے اس کی بات نہ مانی اور مطالبہ کیا کہ مفتح اپنے وعدے کے مطابق فرشتوں کا لشکر بلائے اور عباسیوں کا خاتمہ کرے۔

مفتح لشکر کی طرف سے مایوس ہوا تو اس نے آخری چال چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر زیادہ سے زیادہ خونریزی کرانا تھا۔ اسی لئے اس نے یہ جھگڑا کھڑا کیا تھا۔ لشکر سے مایوس ہو کر اس نے اپنے ہی لشکر کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حکیم متنع، حاکم بن حکم یا حکیم بن عطاء نے اپنے بندوں کو مخاطب کر کے کہا، اے آسمانی خدا کے باغیو اور میرے بندو! ابو مسلم خراسانی کا انتقام پورا ہوا۔ لیکن میں نے میری نافرمانی کی لہذا میں تم سے بھی انتقام لے رہا ہوں۔ اس آسمانی خدا سے بھی انتقام لے رہا ہوں جس نے مجھے اتنی بھیانک شکل دی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے متنع نے اپنا سیاہ نقاب الٹ دیا اور پھر چہرے پر چڑھا ہوا چکدار خول اتار کر ہوا میں لہرایا۔ ظہیر یمنی تلوار کھینچ کر اوپر چڑھ گیا۔

متنع نے کہا، ”اپنے خدا کی صورت آخری بار دیکھ لو۔ میں تمہارا خدا نہیں بلکہ تمہارا اور تمہارے خدا کا دشمن ہوں۔ تم نے میری نافرمانی کی۔ میں نے تمہاری شراب میں زہر ملا دیا۔ اب تم سب سسک سسک کر مر جاؤ گے۔“

ظہیر یمنی نے بڑھ کر متنع پر تلوار کا وار کیا۔ متنع نے سونے کا خول ڈھال کے طور پر آگے کر دیا۔ تلوار خول میں پیوست ہو گئی اور خول، انسانی سر کی مانند تلوار میں لٹک گیا۔

متنع ظہیر یمنی کے وار سے بچ گیا۔ ظہیر نے اسے پکڑنا چاہا لیکن متنع حوض میں کود چکا تھا۔ اس حوض میں اوپر تک شورے کا تیزاب بھرا ہوا تھا۔ متنع دیکھتے ہی دیکھتے تیزاب میں کھل گیا۔

ظہیر یمنی کے آدمی شراب کے مٹکے توڑ رہے تھے تاکہ انسانی جانوں کو بچایا جا سکے۔ مگر اب تک ہزاروں آدمی ایک ایک، دو دو جام چڑھا چکے تھے اور زہر ان کے خون میں سرایت کر گیا تھا۔

قلعہ کش کا دروازہ کھل گیا۔ اسلامی لشکر قلعے میں داخل ہو گیا۔ قلعے کے اندر کا منظر بڑا بھیانک تھا۔ متنع کے لشکری زہر کے اثر سے تڑپ تڑپ کر جان دے رہے تھے۔ تیس ہزار زندیقی دیکھتے ہی دیکھتے زہر کے اثر سے ختم ہو گئے۔

ظہیر یمنی نے مسیب اور معاذ کا استقبال کیا اور اپنی تلوار پھینک کر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔

معاذ نے ظہیر یمنی کو گلے لگا لیا۔ متنع کا مصنوعی سر ظہیر کے پاس تھا۔

خدائی کے دعوے دار حکیم متنع اور قتنہ زنادقہ کے خاتمے کی خبر بغداد پہنچی تو مگر گھر چراغاں ہوا۔ ملکہ خیزراں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

بیگمات اور عمائدین سلطنت آ، آ، آ، کر اسے مبارکباد دیتے اور ملکہ انہیں خلعتوں سے نوازیں۔ غریاء اور مساکین میں پارچہ جات اور نقد رقوم تقسیم کی گئیں۔ خلیفہ مہدی نے قید خانے کے دروازے کھلوا دیئے۔ شکرانے کے نفل اور نمازیں ادا کی گئیں۔ غرض کہ بغداد میں عید جیسا ساں پیدا ہو گیا تھا۔

حکومت کی طرف سے فاتح لشکر اسلام کے استقبال کا اعلان ہوا۔ ہر فرد و بشر کو حکم دیا گیا کہ بغداد سے دو میل آگے نکل کر لشکر کو خوش آمدید کہا جائے۔

بغداد کے باہر قاتیں، چھو لاریاں اور خیمے نصب کئے گئے۔ بغداد کے باہر ایک اور بغداد بس گیا۔ جس دن لشکر اسلام کو پہنچنا تھا اس روز تمام امراء اور وزراء خلیفہ کے ساتھ استقبال کے لئے آگئے۔ ملکہ خیزراں کے ساتھ تمام بیگمات اور شہزادے اور شہزادیاں تھیں۔

شہزادی منصورہ بھی ملکہ خیزراں کے ساتھ تھی۔ اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ اور وہ بہت شرمندہ تھی۔ ظہیر یمنی نے مشرک ہو کر اسے ملکہ کی نظروں میں ذلیل کر دیا تھا۔ لشکر اسلام کی آمد شروع ہوئی۔ اللہ اکبر اور تحسین کے نعروں سے دشت و جبل گونج اٹھے۔ خلیفہ مہدی، ملکہ خیزراں اور شاہی خاندان کے افراد سب سے آگے تھے۔ ان کے پیچھے ابو عبیدہ وزیر سلطنت کے ساتھ تمام اعلیٰ افسران تھے۔

مسب بن زبیر اور معاذ بن مسلم کے گھوڑے سب سے آگے تھے۔ دونوں سردار گھوڑے بڑھاتے ہوئے قریب آئے۔ خلیفہ اور ملکہ کو پا پیادہ دیکھ کر خود بھی جلدی سے گھوڑوں سے اتر کر تعظیم بجا لائے۔ دونوں کے چہرے مسرت سے چمک رہے تھے۔ خلیفہ نے سرداروں کو گلے لگا لیا اور خلعت فاخرہ سے نوازا۔

امیروں نے آگے بڑھ کر ان پر دینار نچھاور کئے۔

ملکہ نے پوچھا، ”کتنے قیدی گرفتار کیے گئے؟“

”صرف ایک قیدی، ملکہ دوراں“ معاذ نے جواب دیا۔

معاذ نے حکیم متنع کے تیزاب میں کود جانے اور زہریلی شراب پی کر تیس ہزار

زندقیوں کے مرنے کے مفصل حالات سے خلیفہ اور ملکہ کو آگاہ کیا۔ اس بڑے پیارے پر انسانی جانوں کے زیاں کا انہیں بڑا افسوس ہوا۔

ملکہ نے کہا۔ ”لشکر اسلام کے دونوں سالاروں کو ان کے مرتبے کے مطابق انعام دینے کا اعلان ہم بعد میں کریں گے تاہم ان جو انمردوں کو پیش کیا جائے جنہوں نے اس جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا ہو۔“

معاذ اور مسیب نے ایسے لوگوں کی فہرست پہلے ہی تیار کر لی تھی۔ معاذ نے وہ فہرست ملکہ کو پیش کی۔ ملکہ نے خلیفہ کے مشورے سے ان تمام لوگوں کو ایک ایک سال کی تنخواہ کے برابر نقد ادا کئے جانے کا اعلان کیا۔ ہر سپاہی کو دو ماہ کی رخصت دی گئی۔ معاذ اور مسیب کو سالاری سے ترقی دے کر صوبوں کی گورنری عطا کی گئی۔

اس طرح یہ مختصر اور پروقار تقریب اختتام کو پہنچنے والی تھی کہ معاذ نے آگے بڑھ کر دست بستہ عرض کیا۔

”ملکہ دوراں کی اجازت سے میں اس واحد قیدی کو خلیفہ کے حضور پیش کرنا چاہتا ہوں جو اس جنگ میں گرفتار ہوا ہے۔“

”اجازت ہے۔“ ملکہ نے مسکرا کر کہا۔

”اس کے ساتھ ہی میں، ملکہ دوراں سے درخواست کروں گا کہ اس قیدی کا قصور معاف کر دیا جائے۔“ معاذ نے کہا۔

”اور جاں بخشی بھی فرمائی جائے۔“ مسیب نے فوراً لقمہ دیا۔

ملکہ نے کہا۔ ”خلیفہ کو اپنے معزز سرداروں کی درخواست قبول کر کے خوشی ہو گی؟“

”ہم بخوشی قبول کرتے ہیں۔“ خلیفہ فوراً بولا۔

معاذ نے مڑ کر ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی لشکر کی بچھلی صف میں ٹھس گیا اور پھر ایک فوجی کو جس کے گلے میں رسی پڑی ہوئی تھی۔ گھسیٹا ہوا آگے لایا۔ اس جوان کے ہاتھ بھی رسی سے بندھے تھے۔

خیزراں کی نظر قیدی پر پڑی تو حیرت سے چلائی ”ظہیر! مشرک۔“ ظہیر یمنی سر جھکائے خلیفہ اور ملکہ کے سامنے آکھڑا ہوا۔

خلیفہ نے معاذ سے کہا۔ ”معاذ! تم نے بڑے غلط آدمی کی ہم سے سفارش کی ہے۔“

ملکہ نے کہا۔ ”افسوس کے ہم زبان دے چکے ہیں۔ ورنہ اسی وقت اس مشرک کا سر قلم کرا دیتے۔“

معاذ نے کہا۔ ”ملکہ دوراں! اجازت دیجئے کہ میں اس قیدی کے قصور کی تفصیل بیان کروں۔ اس کے بعد اگر آپ اسے قتل کرانا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

ملکہ کو ظہیر کو دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ دوسرے لوگ بھی ظہیر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ شہزادی منصورہ نے ایک بار ظہیر کو دیکھ کر ندامت سے نظریں جھکا لیں۔

ملکہ نے کہا۔ ”اس کا سب سے بڑا قصور شرک ہے۔ اور کچھ ہو تو بیان کیا جائے۔“

معاذ نے کہنا شروع کیا۔ ”بے شک ظہیر یمنی مشرک ہوا۔ اس نے متبع کو خدا مان کر سجدہ کیا۔ صرف یہی نہیں۔ ماہ خشب کا شعبہ دیکھ کر تو شہر خشب کے بڑے بڑے علماء نے سر جھکا دیا۔ ظہیر تو پھر ایک نادان فوجی تھا۔ لیکن لہذا تمام باتوں کے باوجود میں برملا یہ اعلان کرتا ہوں کہ قلعہ کش کا فاتح صرف ظہیر یمنی ہے۔“

”معاذ نے جو کچھ کہا ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، ملکہ دوراں!“ مسیب نے بھی معاذ کی تائید کی۔

”مگر یہ سب کیسے ہوا؟“ خلیفہ ممدی نے سوال کیا۔

معاذ بولا ”ماوراء النہر کا قلعہ کش حقیقتاً ناقابل تسخیر تھا۔ اگر ظہیر یمنی قلعے کا دروازہ نہ کھولتا تو عباسی لشکر کو قلعے میں داخل ہونے کے لئے شاید چھ سات ماہ لگ جاتے اور اس کے بعد بھی فتح کا یقین کرنا مشکل تھا۔ لیکن ظہیر نے ہماری طرف دست تعاون بڑھایا اور ہمیں پیغام بھیج کر بغیر کسی لالچ، پیشگی وعدے یا شرط کے قلعے کا دروازہ عباسی لشکر کے لئے کھول دیا۔ محض اس لئے کہ ظہیر تائب ہو کر خدائے برحق پر پھر سے ایمان لے آیا تھا اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔“

خلیفہ اور ملکہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ شہزادی منصورہ کا چہرہ گلاب (مانند کھل گیا۔ اس نے پیار بھری نظروں سے ظمیر کو دیکھا۔ ظمیر اب تک مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

معاذ ذرا رک کر پھر بولنے لگا۔ ”ملکہ دوراں کو یہ سن کر شاید اور زیادہ حیرت کہ جھوٹے خدا حکیم متع کے سر پر پہلا وار کر کے اس کا سر، ظمیر یعنی نے ہی اتارا تھا۔“

”مگر ہمیں تو اطلاع ملی تھی کہ متع نے تیزاب کے حوض میں کود کر جان دی تھی۔“ ملکہ نے کہا۔

”ملکہ دوراں نے درست فرمایا۔ لیکن ظمیر یعنی نے اس کا وہ سراپنی تلواریں اتارا تھا جسے پن کر متع نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔“

معاذ کے اشارے پر ایک سپاہی نے متع کا سونے کا وہ چہرہ معاذ کو دیا جسے ظمیر یعنی نے حاصل کیا تھا۔ معاذ نے اس خول کو بلند کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ہے وہ چہرہ جسے متع اپنے بھیاںک چہرے پر چڑھا کر خدا بن بیٹھا تھا۔“ سب کے دل ظمیر کی طرف سے صاف ہو گئے۔ اور سب اسے رہا دیکھنے کے متنبی تھے۔

خلیفہ نے مسکرا کر کہا۔ ”ظمیر یعنی نے واقعی بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ پھر تم نے اسے اس طرح کیوں گرفتار کر رکھا ہے؟“

”یہ بھی ظمیر کی ہی خواہش پر ہوا ہے۔“ مسیب نے وضاحت کی۔ ”ظمیر نے ہم سے درخواست کی تھی کہ وہ قصور وار ہے۔ اس لئے اسے خلیفہ کے سامنے ایک مجرم کی طرح پیش کیا جائے تاکہ اسے جرم کی سزا دی جائے۔“

”ظمیر نے یقیناً جرم کیا ہے۔ ہم اسے سزا دیں گے۔“ ملکہ دوراں پر وقار انداز میں بولی۔ لوگ گھبرا گئے۔ انہیں ظمیر کے معاف کئے جانے کا پورا پورا یقین تھا۔

”مجرم کو ہمارے قریب لایا جائے۔“ ملکہ نے حکم دیا۔ ظمیر یعنی کو ملکہ کے قریب لے جایا گیا۔ شہزادی منصورہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس

نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

ملکہ دوراں نے آہستہ سے خلیفہ کے کان میں کچھ کہا اور تیز آواز میں فیصلہ سنا دیا۔

”ہم خلیفہ کی اجازت سے ظمیر یعنی کو اپنی فرزندگی میں قبول کرتے ہیں۔ کل شاہی محل میں شہزادی منصورہ کے ساتھ ظمیر یعنی، فاتح شمش کا عقد شہانہ انداز سے ہو گا۔“

شہزادی منصورہ کے خزاں رسیدہ گلشن میں پھر سے بہار آگئی۔



دیران کر دیا تھا اور پوری حکومت میں اسلام کا شرعی نظام حکومت رائج تھا۔ مگر بروہہ فردشی کی لعنت اس وقت بھی موجود تھی۔ ارض حجاز کے مختلف شہروں میں بڑے بڑے بازار لگتے تھے۔ اور کینڑوں اور غلاموں کی نیلامی ہوتی تھی۔

سل زہری کا پیشہ بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ وہ بازار سے خوبصورت لڑکوں اور لڑکیوں کو خریدتا اور انہیں تربیت دے کر اچھے داموں میں فروخت کرتا تھا۔ سلامہ بھی اس کی زر خرید لونڈی تھی جسے وہ پچھلے تین سال سے موسیقی کی تعلیم دلا رہا تھا۔ سلامہ نے اچھا ذہن پایا تھا۔ وہ توجہ اور محنت سے ساز و آواز کے میدان میں تھلکہ مچا رہی تھی۔ اگر سل زہری کو اس کی فروخت سے ایک کثیر رقم حاصل ہونے کی امید تھی تو دوسری طرف سلامہ بھی یہ جانتی تھی کہ اگر اس نے اس فن میں کمال حاصل کر لیا تو وہ غلامی کی زندگی سے چھٹکارا پا کے کسی رئیس یا امیر کے محل کے رونق بنے گی۔ سلامہ کی سریلی تائیں ابھر رہی تھیں اور گلی سے گزرنے والوں کے قدم ہلکے رہے تھے۔ کچھ لوگ تو رک کر سلامہ کے ریلے بولوں کو کانوں کے ذریعے اپنے دل میں اتار لیتے تھے مگر وہ صرف چند لمحوں کے لئے ٹھہرتے پھر آگے بڑھ جاتے تھے۔ سل زہری ایک بڑا رئیس اور تاجر تھا اس کے پس دیوار کھڑے ہو کر گانا سننا خطرے سے خالی نہ تھا۔ سلامہ ساز و آواز کا یہ کھیل اب تک سل زہری کی حویلی کی بلند چار دیواری کے اندر کھیل رہی تھی۔ سل زہری اس وقت تک سلامہ کو عکاظ کے مشہور میلے میں بھی نہیں لے گیا تھا جہاں ہر طرف فن کی نمائش ہوتی تھی اور صاحب فن کو صحیح معنوں میں داد ملتی تھی۔ شاید سل زہری کی نظر عکاظ کے میلے سے بھی زیادہ اونچی تھی۔

سل زہری کی حویلی سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد تھی نماز عشاء ختم ہو چکی تھی۔ اور نمازی اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے تھے۔ سب سے آخر میں ایک جوان عمر نمازی مسجد سے برآمد ہوا اور اس کے قدم آہستہ آہستہ سل زہری کی حویلی کی طرف اٹھنے لگے۔ یہی سلامہ کے ریاض کا وقت تھا۔ ادھر نماز ختم ہوئی اور سلامہ نے ساز سنبھل کر تائیں بکھیرنا شروع کر دیں۔ سلامہ کی تانوں کی گونج بڑھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جوان عمر شیدائی کے قدموں میں تیزی آ رہی تھی۔ وہ بڑھتا ہوا سڑک کے

سلامہ

سلامہ کی سریلی تائیں ابھرتیں تو سل زہری کی پوری گلی گونج اٹھی۔ قدرت نے سلامہ کو ریلی آواز کے ساتھ حسن صورت سے بھی نوازا تھا۔ جب گلی کی کسی تان پر وہ سر کو جھکا دیتی تو چاند جیسے چہرے پر اس کے لائے ہل بکھر جاتے بدلیاں سی چھا جاتیں اور فضا میں ملہار راگ الاپنے لگتیں۔ سلامہ کہنے کو تو لونڈی نہ مگر سل زہری نے اپنی اس دلنواز کینڑ کو اشراف زادوں کا درجہ دے رکھا تھا۔ اس پرورش بڑے انہماک سے کی گئی تھی۔ سل زہری کو خود بھی موسیقی میں دخل تھا۔ اس نے سلامہ کی آواز کے ریلے پن کو دیکھتے ہوئے اس کی تربیت پر کئی ماہر فن دان مقرر کئے تھے۔ سلامہ بڑے دل سے ریاض کرتی اور گھٹنوں ریاض کے باوجود ذرا کم نہ جھکتی تھی۔

یہ بنی امیہ کے آٹھویں خلیفہ کا دور حکومت تھا اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارگراں کو اٹھائے ہوئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز کو خلافت راشدہ کا پانچواں خلیفہ کہا جاتا ہے۔ ان کے سخت گیر انتظام سلطنت نے بنی امیہ کے عشرت کردوں

نکل رہے تھے۔

جوان نے بھی سسل زہری کو پہچان لیا تھا۔ اس نے کمال متانت سے کہا۔

”ہاں، سسل زہری! میں ہوں۔“

”مگر حضرت آپ یہاں؟“

جوان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک لمحے

بعد بولا۔ ”کچھ دیر خاموش رہو۔ باتیں کرنے کو پوری رات پڑی ہے۔“

”مگر جناب! حضرت سنتے تو —“ سسل زہری نے کچھ کہنا چاہا مگر جوان نے

اسے سختی سے ڈانٹا۔ ”خاموش ہو جاؤ سسل — سنتے نہیں یہ آواز — یہ آواز تو

قدرت کا عطیہ ہے۔ خوش نصیب ہے وہ خاتون جسے اللہ تعالیٰ نے یہ لحن داؤدی بخشا

ہے۔“

”یہ ٹھیک ہے مگر حضرت —“

”میں پھر کہہ رہا ہوں سسل!“ خوشرو جوان عبدالرحمن نے اسے پھر ٹوکا۔ ”تم

سمجھ رہے ہو کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔ نہیں سسل ایسا نہیں ہے۔ کچھ دیر کے لئے تم

اس آواز اور میری سماعت کے درمیان سے ہٹ جاؤ پھر میں تمہیں سمجھاؤں گا۔“

”توبہ توبہ حضرت! میں آپ کو گناہگار کہنے کی کیسے جرات کر سکتا ہوں۔“ سسل

زہری نے لجاجت سے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو گناہ سننا ہی ہے تو پھر —“

مگر اس وقت تک عبدالرحمن کی نظریں سسل سے ہٹ کر پھر شمع پر جم گئی

تھیں۔ اور وہ سلامہ کے نغے میں کھو گئے تھے۔ ارض حجاز کے اس خوبو جوان کا پورا

نام عبدالرحمن بن ابی عمارہ تھا۔ ۱۱۱ کا عشقوان شباب ہی تھا۔ مگر اس عمر میں وہ عالم،

فاضل، قیہ اور مجتہد کے درجے پر پہنچ گئے تھے۔ عبدالرحمن کے زہد و تقویٰ، عبادت،

ریاضت اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ کم سن ہونے کے باوجود وہ قس یعنی راہب کے

لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔ عام طور پر وہ اپنا وقت صحن مسجد میں گزارتے اور اگر

کبھی باہر جانے کا اتفاق ہوتا تو ان کی نظریں زمین پر لگی رہتیں۔ وہ راستے میں کسی سے

مفتگو نہ کرتے۔ سر جھکائے مسجد سے جاتے اور اسی طرح واپس آ جاتے۔

کنارے لگی ہوئی ایک بٹی کے پاس پہنچ گیا۔ فانوس نما لالین میں جلتی ہوئی شمع کی

روشنی بہت مدھم تھی۔ مگر جوان کے لئے شاید یہ ایک بڑا سہارا تھا۔ اس نے اپنی

نظریں شمع پر جمادیں اور اپنی سماعت کو حویلی سے اٹھنے والی آواز کے تعاقب میں چھوڑ

دیا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ مسجد سے سب سے آخر میں نکلتا اور سیدھا شمع کے

کھبے کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی نظریں شمع پر جم جاتیں اور کلن سلامہ کی آواز

پر لگ جاتے۔

سسل زہری بڑا محتاط تاجر تھا۔ یہ احتیاط اسے تجربے نے سکھائی تھی۔ اس کی کئی

ترتیب اور غیر تربیت یافتہ کنیزیں حویلی سے فرار ہو گئی تھیں۔ اس احتیاط کے تحت اس

نے حویلی کے باہر ایک مسلح پیردار مقرر کیا تھا جس کا کام تھا کہ وہ سلامہ کے گانے کے

دوران کسی اجنبی کو حویلی کی دیوار کے ساتھ نہ کھڑا ہونے دے۔ اس شب سسل زہری

کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آتے آتے اسے رات ہو گئی۔ وہ حویلی کے

دروازے پر پہنچا تو اچانک اس کی نظر شمع کے کھبے پر پڑی جس کے نیچے کوئی شخص چار

میں لپٹا کھڑا تھا۔ کھبا اگرچہ حویلی کے دروازے سے دور تھا مگر اس کے دل میں شبہ

پیدا ہوا۔ شبہ اس وجہ سے اور زیادہ پیدا ہوا کہ حویلی میں سلامہ کی تائیں بلند ہو رہی

تھیں اور اس کی آواز بلند و بالا چار دیواری عبور کر کے دور تک پہنچ رہی تھی۔

”کون ہو تم؟“ سسل زہری نے قریب پہنچ کر کہا۔ اس کا لہجہ کلنی تلخ تھا۔

جوان پر محویت کا عالم طاری تھا۔ اس کی نظریں شمع پر تھیں مگر حواس سلامہ کی

تائوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ سسل زہری کی آواز کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

جواب نہ پا کر سسل زہری کو غصہ آ گیا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔

”بولنا کیوں نہیں۔ کیا گونگا ہے؟“

سسل زہری نے اس زور سے ڈانٹا تھا کہ اس کے لمبے کی کرنٹنگی سلامہ کی تائوں

پر حاوی ہو گئی۔ جوان کا انہماک ختم ہو گیا اور تصور اور تخیل کے تمام تار شکستہ

گئے۔ اس نے شمع سے نظریں ہٹا کر سسل زہری کو دیکھا۔ سسل زہری کی نظر جب جوان

کے چہرے پر پڑی تو اس کا سارا وجود جیسے ہل کے رہ گیا۔

”ارے — آپ، آپ ہیں۔ آپ عبدالرحمن؟“ سسل کی زبان سے الفاظ

مگر ادھر چند روز سے ان کے معمول میں فرق آگیا تھا۔ کسی شب سہل زہری کی حویلی کے قریب سے گزرتے ہوئے ان کے کانوں میں سلامہ کے نغمے کی آواز پڑی تھی۔ اس آواز کو سن کر ان پر کچھ ایسی بے خودی طاری ہوئی کہ ان کے قدم ویر رک گئے اور ان میں اس وقت تک حرکت پیدا نہ ہوئی جب تک سلامہ کا نغمہ ختم نہ ہو گیا۔ اس شب سے ان کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ نماز عشاء کے بعد راستے کی بنی کے نیچے آکے کھڑے ہو جاتے اور جب تک سلامہ کی تائیں جاری رہتیں، عبدالرحمن بن بنے وہاں کھڑے رہتے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ یہ حویلی کس کی ہے اور موسیقی کی اس ملکہ کا کیا نام ہے۔ انہیں تو بس آواز سے تعلق تھا اور وہ سریلے نغموں پر عاشق تھے۔

سلامہ کی تائیں ختم ہوئیں تو جیسے عبدالرحمن کو ہوش آگیا۔ انہوں نے پلٹ کر سہل زہری کو دیکھا۔ ”سہل زہری بتاؤ تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”مجھے کچھ نہیں پوچھنا ہے محترم! صرف ایک درخواست کرنی ہے۔“ سہل زہری نے بڑے ادب سے کہا۔

”درخواست اور مجھ سے۔ میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں سہل!“ عبدالرحمن نرمی سے بولے۔

”مجھے خدا نے سب کچھ دیا ہے محترم! میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے مبارک قدموں سے اس حویلی کو رونق بخشیں۔“ سہل زہری نے درخواست پیش کی۔

”کون سی حویلی سہل؟“ عبدالرحمن نے سہل زہری کو چونک کے دیکھا۔

”وہ سامنے کی حویلی، جہاں سے نغمہ بلند ہو رہا تھا۔“

”وہ وہ سامنے والی حویلی۔“ عبدالرحمن کی آنکھوں سے حیرت چھلک پڑی۔

انہوں نے فوراً اپنا رخ بدلا اور بغیر جواب دیئے وہ تیز تیز قدموں سے مسجد کی طرف چلنے لگے۔

”سنئے تو محترم! حضرت ذرا ٹھہریئے۔“ سہل زہری کچھ دور ان کے پیچھے آیا مگر جب عبدالرحمن نے کوئی جواب نہ دیا تو ناامید ہو کر واپس چلا گیا۔

سہل زہری اپنی حویلی میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر عجب طرح کی مسرت

اور طہانیت تھی۔ اس نے اندر بیٹھتے ہی آواز دی۔ ”سلامہ! کہاں ہو ادھر آؤ تمہارے لئے خوش خبری ہے۔“

”کیا خوشخبری ہے آقا؟“ سلامہ بھاگتی ہوئی آئی۔

”تم عبدالرحمن بن ابی عمارہ کو جانتی ہو؟“

”یہ کون بزرگ ہیں آقا؟“

”بزرگ۔۔۔ ہاں بزرگ ہیں۔۔۔ مگر ہیں جوان، خوبصورت۔۔۔ اور خوب

سیرت جوان۔“ سہل زہری نے بڑی مسرت سے کہا۔ ”آج کل ان کے نام کا ڈنکا

پورے عرب میں بج رہا ہے۔“

”ان کی خوبصورتی کا ڈنکا؟“ سلامہ نے شوخی دکھائی۔

”نہیں بھئی، یہ بہت بڑے عالم، فاضل اور قبیحہ ہیں۔“ سہل زہری نے

وضاحت کی۔ ”جس محفل میں جاتے ہیں، دور دور سے لوگ ان سے مسئلے مسائل

پوچھنے آتے ہیں۔ اتنی کم عمری میں یہ۔۔۔۔۔“

”آقا!۔۔۔“ سلامی نے برا سامنہ بنایا۔ ”آپ کس کی باتیں لے بیٹھے۔ پہلے

وہ خوش خبری سنائیے جس کے لئے آپ نے مجھے بلایا ہے۔“

”وہی تو بتا رہا ہوں سلامہ! یہ جوان اپنی پرہیز گاری کی وجہ سے ”قس“ کے

لقب سے مشہور ہوا۔“

”پھر وہی بات آقا!“ سلامہ نے دوسری بار بات کاٹی۔ ”مجھے کسی زاہد یا پرہیز گار

کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”تمہیں نہ سہی سلامہ! مگر اس زاہد خشک کو تمہارے نغموں سے دلچسپی ہے۔ وہ

تمہاری آواز پر عاشق ہے۔ اس نے تمہارے نغمے کی تعریف کی ہے۔“ سہل زہری یہ

کہتے ہوئے خوشی سے پھولے نہ سا رہا تھا۔

”عجیب بات ہے آقا۔“ سلامہ نے بے یقینی سے کہا۔ ”ایک طرف تو آپ فرما

رہے ہیں کہ وہ پرہیز گار اور عالم و فاضل ہے دوسری طرف اسے میرے نغمے پسند

ہیں۔ آپ کو یہ کس نے بتایا؟“

”اس محترم ہستی نے مجھ سے خود کہا ہے۔“ سہل زہری نے زور دے کے کہا۔

بی انہوں نے پہچان لیا لیکن جب میں نے حویلی میں چلنے کی دعوت دی تو وہ منہ گھما کر چلے گئے۔“

”اب وہ کہیں نہیں جائیں گے آقا! کل جب وہ میرا نغمہ سننے آئیں تو آپ انہیں ساتھ لے آئے گا۔“

”سلامہ! کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ کل پھر آئیں گے؟“

”ضرور آئیں گے آقا! موسیقی ذہن کی غذا ہے۔ اور شفاف ذہنوں پر اس کا

زیادہ اثر ہوتا ہے۔“

سل زہری نے اس وقت سلامہ کو جواب نہ دیا لیکن دوسری شب وقت مقررہ پر وہ حویلی سے نکلا اور روشنی کے کھجے کے قریب چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ سلامہ کا نغمہ ابھر۔ خاموش فضاؤں میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا مگر سلامہ کا نغمہ عبدالرحمن ”قس“ کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا۔ کھجے کے قریب کوئی نہیں آیا۔ شمع جھللاتی رہی۔ نغمے کی تائیں بکھرتی رہیں۔ سل زہری انتظار کرتا رہا مگر آنے والا نہ آیا۔ سل زہری تھک بار کے واپس آ گیا۔ سلامہ اس کے اواس چرے کو دیکھ کر خود بھی اداس ہو گئی۔ سلامہ کا اندازہ غلط ثابت ہوا تو اس کی انا کو زبردست ٹھیس لگی۔ اس کے خیال میں یہ اس کے فن کی توہین تھی۔ فن کے علاوہ یہ اس کے حسن عالمتاب کی بھی توہین تھی۔ سلامہ تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔

☆☆☆

سلامہ بظاہر توانا کی آگ میں جل رہی تھی مگر اس آگ کے ساتھ ایک اور بھی تپش تھی جو سلامہ کو اندر ہی اندر پھونکنے ڈال رہی تھی۔ یہ ایک تلیدہ انسان کی محبت تھی جو چپکے سے اس کے دل میں اتر آئی تھی۔ وہ رات دن اداس رہنے لگی۔ سل کو اس کی فکر لگ گئی۔ وہ تو سلامہ کی پرورش اس لئے کر رہا تھا کہ اس موتی کے منہ مانگے دام وصول کرے گا مگر سلامہ ہر دم عبدالرحمن قس کا کلمہ پڑھتی تھی۔ ایک دن اس کی وحشت اتنی بڑھی کہ اپنے آقا کے سر ہو گئی۔

”آقا! آپ ایک باز مجھے اس زاہد خشک کی صورت دکھا دیجئے ورنہ —“

”میں نے انہیں تمہاری آواز کے زیرِ دم میں کھویا ہوا دیکھا ہے۔ ان کی محبت انہماک کا یہ عالم تھا کہ میرے ٹوکنے پر بھی وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئے۔ پھر تمہارا نغمہ ختم ہوا تو انہوں نے تمہاری سریلی اور رسیلی آواز کی بہت تعریف کی۔“

سلامہ کو کچھ حیرانی ہوئی اس نے پوچھا۔ ”آپ سے وہ کب ملے، میری انہوں نے کہاں سنی؟“

”سلامہ! یہ سب کچھ آج اور ابھی ہوا ہے۔“ سل زہری نے اسے متاثر کر کے لئے کہا۔ ”میں ابھی واپس آ رہا تھا کہ میری نظر راستے کی روشنی پر پڑی۔ میں دیکھا ایک شخص چادر میں لپٹا کھڑا ہے۔ اس کی نظریں شمع پر تھیں مگر وہ دنیا و مافیہا بے خبر تمہارے نغمے میں کھویا ہوا تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے آواز دی تو یہ دیکھ حیران رہ گیا کہ وہ عبدالرحمن بن ابی عمارہ ہیں۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر میں تو بوجھ گیا۔“

”کیا وہ بہت بڑے بزرگ ہیں؟“ سلامہ کی دلچسپی بڑھی۔

سل زہری نے جواب میں کہا۔ ”ان جیسا نہ کوئی قبیہ ہے اور نہ عبادت ریاضت اور پرہیزگاری میں ان کا کوئی ثانی ہے۔“

”آقا! اگر وہ اتنے ہی اہم آدمی ہیں تو آپ انہیں گھر کیوں نہیں لائے۔“ سلامہ نے بڑے چاؤ سے کہا۔ ”میں انہیں سامنے بٹھا کے نغمے سناتی۔“

”میں نے کوشش کی تھی سلامہ!“ سل بولا۔ ”میں نے حویلی میں آنے کی درخواست کی تھی مگر وہ منہ گھما کر نکل گئے۔ میں آوازیں دیتا ہی رہ گیا۔“

”کیا وہ آپ کو پہچانتے ہیں آقا؟“

”مجھے کون نہیں جانتا سلامہ!“ سل زہری کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”کیا میں یہاں سب سے بڑا تاجر نہیں؟“

سلامہ سہم گئی۔ آواز دبا کے بولی۔ ”آقا میرا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ سب آپ کو جانتے ہیں۔ لوگوں کی ضرورتیں بھی تو آپ پوری کرتے ہیں۔ میں نے اس پوچھا تھا کہ وہ عالم فاضل ہیں۔ شاید آپ کو نہ جانتے ہوں۔“

”مجھے ہر طبقے کے لوگ جانتے ہیں۔“ سل زہری نے اکر کے کہا۔ ”مجھے دیکھ

سلامہ نے بات ادھوری چھوڑ دی یا یوں کہنا چاہئے کہ آقا کا رعب اس پر طاری ہو گیا
”ہوش میں آ سلامہ!“ سل زہری سختی سے بولا۔ ”میں نے تجھے کسی محفل کی
آرائش کے لئے پالا ہے اور تو مسجد کے دروازے سے آس لگا بیٹھی ہے۔ اگر تیرا
خیال ہے کہ میں تجھے ”قس“ کے حوالے کر دوں گا تو یہ تیری غلطی ہے۔ مجھے اصل
رقم کے ساتھ سود بھی چاہئے اور تو اصل کو ڈوبنے پر تلی ہوئی ہے۔“

سلامہ بڑی ذہین تھی۔ اس نے بات بگڑتے دیکھی تو فوراً ”بات الٹ دی۔“
آپ میری بات کو غلط سمجھے۔ بھلا قس کی جیب میں کیا دھرا ہے جو میں ان کے پاس
جاؤں گی۔ میں تو انہیں اس لئے بلا رہی ہوں کہ انہوں نے میری توہین کی ہے اور میں
ان سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔“

”مگر وہ اس دن سے تیرا گنا سننے نہیں آئے پھر میں کیا کروں؟“ سل زہری نے
اپنا پلو بچایا۔

”وہ نہیں آئے تو آپ ان کے پاس جائیے۔ بس ایک بار آپ انہیں گھیر کے
لے آئیے پھر میں جانوں۔“ سلامہ کا لہجہ ملجھانہ تھا۔ سل زہری نرم پڑ گیا۔

”توہین میری بھی ہوئی ہے۔ اس رات میں آوازیں دیتا رہ گیا اور انہوں نے
پلٹ کر جواب بھی نہیں دیا۔“ سل زہری کو بھی شاید ضد ہو گئی تھی۔ ”گھبرا مت
سلامہ۔ میں انہیں ڈھونڈ کے لاؤں گا۔ مگر مجھ سے وعدہ کر کہ تیری نظر اونچی رہے گی۔
قالین اور چٹائی کے فرق کو تو جانتی ہے؟“

”میں وعدہ کرتی ہوں آقا۔“

سل زہری کو معلوم تھا کہ عبدالرحمن زہری مسجد میں مقیم ہیں۔ ان سے
ملاقات کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا مگر سوال یہ تھا کہ وہ قس سے کیا کہے گا۔ قس سے یہ کہنا
کہ سلامہ آپ سے ملنا چاہتی ہے یا انہیں سلامہ کا نغمہ سننے پر آمادہ کرنا۔ یہ دونوں ہی
باتیں بے سبکی تھیں۔ اگر سلامہ کی آواز نے انہیں اتنا ہی متاثر کیا تھا تو پھر انہوں نے
آنا کیوں چھوڑ دیا۔ اسے اس بات کا یقین تھا کہ اگر سلامہ خود ان کے پاس چلی جائے تو
ان کا سارا تقویٰ دھرا رہ جائے گا مگر اس صورت میں اسے اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ
اگر سلامہ کا ایک بار حویلی کے باہر قدم نکل گیا تو پھر ان قدموں کو روکنا ناممکن ہو جائے

گاہ۔ اسی لئے اس نے سلامہ کو قس کا پتہ نہیں بتایا تھا۔

آخر سل زہری نے قس کی تلاش شروع کر دی۔ وہ مسجد میں تو نہیں گیا مگر
اس جتنو میں رہا کہ قس اسے کہیں تنہائی میں مل جائیں تو وہ ضرور بات کرے گا۔ اس
کے ساتھ اس نے سلامہ کے گمانے کے دوران اس جگہ جانا اپنا معمول بنا لیا جہاں اس
نے قس کو پہلی مرتبہ سلامہ کے نغموں پر سر دھنتے دیکھا تھا۔ اس میں سلامہ کی ترغیب
کو بھی دخل تھا۔ سلامہ نے سل زہری کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ موسیقی
وہ جادو ہے جو کسی نہ کسی انداز میں نیک و بد پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر
عام آدمی مغنیوں کے سامنے بیٹھ کے واہ واہ کرتا ہے تو عابد و زاہد حمد باری تعالیٰ اور
مدحت رسول من کروجد میں آجاتے ہیں۔

سلامہ کے ریاض کا سلسلہ جاری تھا۔ اس ریاض میں اب اس کی انا اور قس کا
عشق بھی شامل ہو گیا تھا۔ جس نے سلامہ کے ریلے نغموں میں لہک کے ساتھ سوز بھی
شامل کر دیا تھا۔ سلامہ معمول سے زیادہ وقت تک ریاض کرتی رہتی۔ اور جب سل
زہری سر جھکائے ہوئے حویلی میں واپس آتا تو وہ مجسم سوال بن جاتی مگر یہ سوال الفاظ
کا جامہ نہ پہنتا اور سلامہ پڑمرہ ہو کر بستر پر جا گرتی۔ اسے سخت تعجب تھا کہ قس پر
اس کے نغموں کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ
یا تو اس کے نغموں میں وہ اثر نہیں جو شجر و حجر کو جھومنے پر مجبور کر دیتا ہے یا پھر
عبدالرحمن قس کے سینے میں ایک درد مند دل ہونے کے بجائے پتھر رکھا ہے۔ جو قس
کے تقویٰ سے روز بروز آہن میں بدلتا جا رہا ہے۔ یہ تو سلامہ کا خیال تھا مگر
عبدالرحمن قس کی کیفیت اس سے مختلف تھی۔ انہیں سل زہری نے نغمہ سننے دیکھ لیا
تھا۔ اس کا انہیں دکھ بھی ہوا تھا اور افسوس بھی۔ اس کا علاج انہیں یہی بہتر معلوم ہوا
کہ وہ اس راستے کو ہی چھوڑ دیں جو انہیں بدنامی کے کوچے تک لے جا سکتا تھا۔ پس
انہوں نے عشاء کے بعد مسجد سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔

سلامہ اگرچہ کم عمر اور نا تجربہ کار تھی لیکن فنی تعلیم حاصل کرتے وقت وہ اپنے
استادوں اور ماہرین فن کی باتوں پر پوری توجہ دیتی تھی۔ اس لئے اس کی کم سنی اس
کے تجربہ میں حائل نہ ہو سکی۔ اور اس کا یہ کہنا کہ موسیقی شجر اور حجر کو ہلا کر رکھ دیتی

”حضرت! —“ سہل زہری نے گفتگو میں پہل کی۔ ”مجھے حسرت تھی کہ اپنا سوال آپ کے سامنے پیش کر دوں مگر آپ نے مجھے اس شب موقع نہیں دیا۔“

عبدالرحمن قس متانت سے بولے۔ ”سہل — اگر واقعی تم کوئی خواہش رکھتے یا تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو تو تمہیں پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ تمہارے سامنے کون ہے۔ عبدالرحمن تمہاری ہی طرح خود بھی سوالی ہے پھر بھی اگر تم اپنا مدعا بیان کرنا چاہتے ہو تو میں تمہارے حق میں دعا کروں گا۔ قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار صرف باری تعالیٰ کے پاس ہے جو خلاق عالم ہے اور ہمارے دلوں کے راز جانتا ہے۔“

”اے ریاضت اور اجتہاد کے پیکر عبدالرحمن قس!“ سہل زہری بڑے ادب سے لالہ ”اللہ نے مجھے اتنا دیا ہے کہ مجھے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میری تو صرف خواہش ہے جسے آپ پورا کر سکتے ہیں۔“

”سہل! شاید تم اس شب کی بات دہرانا چاہتے ہو؟“

”حضور! میں نے اپنی بات پوری کب کی تھی۔ آپ نے موقع ہی نہیں دیا۔“

”سہل! میں جانتا ہوں کہ تم ایک بااثر آدمی ہو اور چاہتے ہو کہ تمہاری مدد سے اس سامنے کی حویلی میں جا کے اس ملکوتی نفع کو قریب سے سنو مگر میں اس کی رورت محسوس نہیں کرتا۔“

”مگر عبدالرحمن قس کو کسی کا احسان اٹھانے کی ضرورت نہیں۔“ سہل زہری نے صاف لفظوں میں کہا۔ ”یہ حویلی میری ہے۔ اور میں آپ کا خادم ہوں۔ خوش متی سے آپ جس آواز کو پسند کرتے ہیں وہ میری کنیز سلامہ کے ریلے گلے سے نکلتی ہے۔ اگر جناب غریب خانے پر قدم رنجہ فرمائیں تو نہ صرف میری عزت افزائی ہوگی کہ لگنے والی کنیز بھی اپنے نغموں سے حضور کو خوش کر کے ان ہستیوں میں شامل ہوئے گی جن کے لئے آپ دعا فرماتے ہیں۔“

عبدالرحمن قس اس انکشاف پر کچھ حیران ہوئے۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد لے۔ ”دیکھو سہل! آواز قدرت کا دیا ہوا گراماں قدر عطیہ ہے۔ اچھی آواز سننا اور رات کے عطیے کی تعریف کرنا میرے خیال میں کوئی بری بات نہیں۔ تم جانتے ہو کہ نیا کاسب سے عظیم نغمہ ”ازان“ ہے جس کا پہلا بول کفار کے دل میں دہشت پیدا

ہے، اس کے تجربہ کار ہونے کا ثبوت تھا کیونکہ کچھ ہی دنوں بعد سلامہ کے نغموں نے عبدالرحمن کے انہماک کی مضبوط دیواروں میں دراڑیں ڈال دیں۔ اب وہ نماز عشا کے بعد مسجد سے نکل کر شب کی سیاہی میں ادھر ادھر گھومتے رہتے مگر ان کی روح بے چین سی رہتی اور کسی جگہ انہیں سکون نہ ملتا۔ یہاں تک کہ ایک شب وہ عالم بے خودی میں سہل زہری کی حویلی کی دیوار تک پہنچ گئے۔ حویلی سے سلامہ کی رسیلی آواز اٹھ رہی تھی۔ مگر اب اس آواز میں ایک ڈھکی چھپی ترتیب بھی تھی۔ جس نے قس کے گداز دل کو ایک بار پھر گرما کے رکھ دیا۔ قس اس وقت تک پس دیوار کھڑے رہے جب تک سلامہ کا نغمہ ختم نہ ہو گیا پھر انہیں ہوش آیا اور وہ تیز تیز قدموں سے مسجد واپس ہو گئے۔ انہیں خوشی تھی کہ آج ان کے گناہ سننے میں کوئی شخص نکل نہ ہوا۔

اس کے دوسری شب قس کا دل دیوانہ پھر انہیں سہل زہری کے کونچے کی طرف لے چلا۔ ان کے قدم بڑھتے رہے اور سلامہ کی آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ قس راستے کی اس جگہ کے پاس پہنچ گئے جہاں ان کی پہلی مرتبہ سہل زہری سے ملدھڑکتی ہوئی تھی۔ ان کی نظریں شمع پر لگ گئیں اور سلامہ کی درد بھری آواز ان کے دل کے منہ خانوں میں سمائی رہی۔ انہیں یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کوئی شخص احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ احتیاط سے آنے والا یہ آدمی سلامہ کا آقا سہل زہری تھا۔ وہ اپنے معمول کے مطابق قس کی تلاش میں نکلا تھا۔ آج وہ جیسے ہی حویلی کے دروازے سے باہر آیا تو اس کی نظر روشنی کے کعبے پر پڑی۔ کوئی شخص چادر میں لپٹا ہوا وہاں کھڑا تھا۔ سہل زہری کے دل نے پکار کے کہا کہ آگے بڑھ، یہ وہی قس ہے۔ جس کی تلاش میں تو نے کتنی ہی راتوں کے آرام کو گنوا دیا ہے۔ سہل زہری بڑھتے بڑھتے بالکل ان کی پشت پر پہنچ گیا مگر عبدالرحمن قس سلامہ کے سحر میں گرفتار تھے۔ ان پر کسی کے آنے جانے کا کیا اثر ہوتا۔

سلامہ کے نغمے کا سحر ٹوٹا تو قس کو ہوش آیا۔ انہوں نے شمع سے نظریں ہٹائیں۔ اسی وقت سہل زہری نے کھنکار کر اپنی موجودگی کی اطلاع دی۔ قس نے پلٹ کر دیکھا۔ سہل زہری ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ قس کے ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی مگر وہ کچھ کہہ نہ سکے۔

”آپ کی شاگرد جو ہوں آقا!“ سلامہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ویسے میں آپ کی مسرت بھری آواز سننے ہی سمجھ گئی تھی کہ آپ کو کامیابی ہوئی ہے۔“

”کامیابی تو نہیں مگر کامیابی کی ابتدا ہو گئی ہے۔ میں نے ان کے کان میں بات

ال دی ہے۔“

”کہاں ملے تھے وہ۔ کیا کہا آپ نے۔ انہوں نے کیا جواب دیا؟“ سلامہ کی بیٹابی

بچنے والی تھی۔

”ارے، رے، رے۔۔۔ اتنے بہت سے سوالات؟“ سہل زہری مسکرایا۔

”ان سے کہہ دیا ہے کہ یہ حویلی میری ہے۔ وہ جب جی چاہے یہاں آ کے

سارے نفع سن سکتے ہیں۔“

”میرا خیال ہے کہ انہوں نے انکار نہیں کیا ہو گا۔“

”اللہ، اللہ! یہ زعم۔۔۔ اتنا مان ہے تمہیں اپنے اوپر؟“

”اپنے اوپر نہیں بلکہ اپنی آواز پر، اپنے نغموں پر۔“ سلامہ بڑے استقلال سے

دلی۔ ”میرا تو ابھی ان سے سامنا بھی نہیں ہوا۔“

”سامنا شاید ہو بھی نہ سکے۔“ سہل زہری نے کہا۔ ”وہ عورت کی قربت سے

بھاگتے ہیں۔ میں نے انہیں اطمینان دلایا ہے کہ میں تمہیں پردے میں بٹھا کے انہیں

گانا سنواؤں گا۔“

”پھر تو وہ رضامند ہو گئے ہوں گے؟“

”اس وقت کا انتظار کرو سلامہ!“ سہل زہری نے تھکی آواز میں کہا۔

”عبدالرحمن ایسے پتھی نہیں جو دانہ دیکھتے ہی جال میں آجائیں۔“

”دیکھا جائے گا آقا! انہیں آنے تو دیجئے میرے پاس۔“ سلامہ کی تیوریوں پر بل

پڑ گئے۔ ”اگر میں نے اس توہین کا بدلہ نہ لیا تو میرا نام سلامہ نہیں۔“

”کس کی توہین۔ تمہاری یا میری؟“

”دونوں کی آقا!“ سلامہ کی آواز سے ایک آہنی عزم کا پتہ چلتا تھا۔

سہل زہری ہنسا۔ ”میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ شطرنج کی اس بازی میں مات کسے ہوتی

ہے؟“

کرتا ہے تو دوسری طرف مردہ دلوں میں جان ڈالتا اور انہیں سجدے پر مجبور کرتا ہے

اچھی آواز سے ادا ہونے والا نغمہ بھی روح کی غذا ہے۔ ہم دور سے کھڑے ہو کر

اپنی روح کو فرحت دے سکتے ہیں۔ میں اپنی نظروں کو آلودہ نہیں کر سکتا سہل! خواہ

تمہاری حویلی ہی کیوں نہ ہو۔“

”اور اگر میں یہ کہوں کہ مجھے آپ پر اور آپ کی نظروں پر اعتماد ہے تو

”سہل زہری نے بڑی حکمت سے قس کو گھیرنے کی کوشش کی۔ ”دیکھئے حضور! یہ

آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں سلامہ کو پردے میں بٹھا کر آپ کو اس کے نفع سنواؤں

گا۔ یہ میری خواہش ہے اور اس میں سلامہ کی خواہش بھی شامل ہے۔“

”سہل!۔۔۔۔۔“ قس نے بے بسی سے کہا۔ ”میں تمہاری بات پر غور کروں

لیکن تم میرا پیچھا کرنا چھوڑ دو اور اگر میں تمہیں یہاں دوبارہ نظر آؤں تو اپنی بات ہر

نہ دہرائے۔“

”ایسا ہی ہو گا حضرت! مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ خواہش ضرور پوری کر

گے۔“

عبدالرحمن قس اپنے راستے ہو لئے اور سہل خوش خوش گھر واپس آیا۔

بڑی کوشش کے بعد اس کی القس سے ملاقات ہوئی تھی اس لئے وہ مسرت

سرشار تھا۔ اس نے اسی سرشاری کے عالم میں ایک بار پھر حویلی کی ڈیوڑھی سے سلامہ

کو آواز دی۔ سلامہ اس کی مسرت بھری آواز سننے ہی بھاگتی ہوئی سہل زہری کے پاس

گئی۔

”سلامہ!۔۔۔۔۔“

”میں حاضر ہوں آقا!“ سلامہ نے سہل زہری کی بات بھی نہ پوری ہونے دی

”آج میرے لئے خوشخبری لائے ہیں میرے آقا؟“

”ہاں! ہاں! وہی تو میں بتا رہا ہوں۔“

”مگر آپ تو تنہا آئے ہیں۔ حضرت القس کو ساتھ کیوں نہیں لائے آقا!“

”ہوں۔۔۔۔۔ تم نے اندازہ لگا لیا کہ میں عبدالرحمن قس سے مل کے آ

ہوں۔“ سہل زہری بولا۔ ”بہت عقلمند ہوتی جا رہی ہے میری سلامہ۔“

”میری کینز سلامہ نے درخواست کی ہے کہ حضور حویلی پر تشریف لائیں اور اطمینان سے بیٹھ کے اس کے نفعی سماعت فرمائیں۔ اسے اس بات سے تکلیف ہوتی ہے کہ دنیائے عرب کا سب سے بڑا مجتہد سر راہے کھڑا ہے اور وہ حویلی میں بیٹھی نفعی گاتی رہے۔“ سہل زہری نے بڑی مکاری سے سلامہ کے پردے میں اپنا مدعا بیان کر دیا۔

”یہ نہیں ہو سکتا سہل۔“ عبدالرحمن القس نے فوراً انکار کر دیا۔ ”اخلاق یا شرع اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کا چہرہ دیکھے۔ خواہ وہ عورت کتنی ہی محترم کیوں نہ ہو۔“

”اے القس! سلامہ کو اپنی شکل دکھانے کی ہرگز خواہش نہیں۔ وہ پردے میں بیٹھ کے گنا سنائے گی۔“ سہل زہری نے اپنی آواز اور لہجے میں اور زیادہ انکسار پیدا کر لیا۔ ”سلامہ نے یہ بھی درخواست کی ہے کہ اگر حضور حویلی میں تشریف نہیں لائے تو وہ ہمیشہ کے لئے اپنی آواز بند کر دے گی اور پھر کبھی نہ گائے گی۔“

”نہیں سہل! اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔“ عبدالرحمن القس پریشان ہو گئے۔ ”قدرت نے اسے جو عطیہ دیا ہے اس سے فائدہ نہ اٹھانا کفرانِ نعمت ہو گا۔ وہ ضرور گائے گی۔“

”مرحبا القس! آپ نے سچ فرمایا۔ میرے ساتھ تشریف لے چلئے۔ سلامہ چشم براہ ہے۔“

اور پھر ”بے خطر کود پڑا آتش نمود میں عشق“ سہل زہری آگے آگے تھا اور دنیائے عرب کا جوان عمر اور خوبو زاہد خنک اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں حویلی کے بڑے دروازے سے داخل ہو کے اندر پہنچے۔ سہل کی حویلی بڑی شاندار اور وسیع تھی۔ صدر دروازے کے اندر ایک بڑا باغ تھا۔ پھر اصل عمارت شروع ہوئی تھی۔ بیرونی راہداری سے گزرتے ہوئے سہل زہری مسرت سے چلایا۔ ”سلامہ! تیری دعا قبول ہو گئی ہے۔ حضرت تشریف لے آئے ہیں۔“

اسی وقت ایک کوندا سپالکا اور فتنہ طناز سلامہ اپنے منہ پر پڑے ہوئے سیاہ لسنے بال سیٹھی ہوئی راہداری میں بھاگ کے آگئی۔ یہ اس قدر اچانک ہوا کہ گھبراہٹ

”آقا! مات ہمیشہ اناڑی کو ہوتی ہے۔“

”یہی تو دیکھنا ہے کہ اناڑی کون ہے۔ تم یا عبدالرحمن قس؟“

☆☆☆

عبدالرحمن القس پھر غوطہ لگا گئے۔ سہل زہری چار راتیں مسلسل راستے کی دُک کے پاس جاتا رہا۔ سلامہ کے نفعی تھک تھک کے دم توڑتے رہے مگر ایسا معلوم ہوتا جیسے القس ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔ سلامہ کی انا مجروح ہو رہی تھی۔ اور اس غرور شکست ماننے پر آمادہ ہو گیا تھا کہ ایک شب عبدالرحمن قس ایک بار پھر راہ کی دُک پر نظریں جمائے دکھائی دیئے۔ القس نے سہل زہری کو بائید کر دی تھی کہ وہ اس بارے میں ان سے کوئی سوال نہ کرے۔ سہل زہری خاموشی سے ان کے پیچھے جا کر کم ہو گیا۔ سلامہ شاید اس شب کچھ زیادہ ہی اداس تھی۔ اس نے پورا نغمہ بھی نہ گایا۔ اچانک آدھا نغمہ گا کے خاموش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی القس کی محویت کا ظلم لڑا کے رہ گیا۔ انہوں نے بے چینی سے پلٹ کر حویلی کی طرف دیکھا۔ سہل زہری اسے صرف چار قدم کے فاصلے پر سر جھکائے کھڑا تھا۔

”تم پھر آگئے سہل زہری!“ القس کی آواز کھوکھلی تھی۔

”اے القس! آپ نے میری زبان بندی کی ہے۔ پہلے مجھے گفتگو کی اجازت دیجئے؟“ سہل زہری نے بڑے انکسار سے کہا۔

”استغفر اللہ — انسان، انسان کو حکم کیسے دے سکتا ہے؟“ عبدالرحمن قس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں حاکم نہیں۔ تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔ میں تو مرزا یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے کوئی ایسا سوال نہ کرو جس کے جواب دینے کا مجھے حکم ہو۔ رہا تمہارا سوال تو اس کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔“

”اے القس! آپ نے بے شک میرے سوال کا جواب دیا تھا مگر یہ سوال نہیں، میری کینز کا ہے۔“

عبدالرحمن قس نے سہل زہری کو غور سے دیکھا۔ ”تم اپنی بات کی وضاحت سہل؟“

میں اقس کی نظر سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ سلامہ کے لئے بھی یہ کسی حادثے سے نہ تھا۔ اس کے قدم ایک دم رک گئے اور پیشانی حیا سے عرق آلود ہو گئی مگر اس را تک سلامہ اور اقس کی نظریں ٹکرا چکی تھیں۔ دہلی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھی تھیں اقس نے فوراً نظریں نیچی کر لیں۔

”سل زہری! یہ تم نے کیا کیا؟“ اقس کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی۔

”معاف کر دیجئے حضرت! مسرت نے میرے حواس غائب کر دیئے تھے۔“ سل زہری نے سلامہ کو مخاطب کیا۔ ”میں نے حضرت سے وعدہ کیا ہے کہ تم مارا نہیں آؤ گی۔ بلکہ پردے میں بیٹھ کے نفیے سناؤ گی۔ میں گھبراہٹ میں اپنے وعدے قائم نہ رہ سکا۔ تم فوراً اندر چلی جاؤ سلامہ!“

سلامہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔ مگر بجلی تو چمک کے گر چکی تھی۔ اور کمر خرم دل جل کے رہ گیا تھا۔ سل زہری نے ایک کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ”میں حضور سے معذرت خواہ ہوں۔ یہ سب کچھ مسرت کی زیادتی اور بدحواسی میں ہے۔ میں نے قصداً ایسا نہیں کیا۔“

اقس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر سل زہری کو ایسی نظروں سے دیکھا جن ہزاروں شکوے شکایت بھرے ہوئے تھے مگر غصے یا ناگواری کا شائبہ تک نہ تھا۔ زہری انہیں ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کے چلا گیا۔ پورا کمرہ اس خوش سلیقہ سجایا گیا تھا کہ صاحب خانہ کے ذوق نفاست کی داد دینے کو جی چاہتا تھا۔ وہاں وہ کچھ موجود تھا جو عرب کے ایک بڑے رئیس کی حویلی میں ہونا چاہئے۔

ادھر سل زہری نے اندر پہنچ کے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”سلامہ تم نے غصہ کر دیا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا ان سے سامنا نہ ہونے دوں گا مگر تم تو بے جفا ان کے سامنے پہنچ گئیں۔“

سلامہ خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ سل کی آواز پر چوکی۔ ”ہاں میرے آجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے علم نہ تھا کہ اقس آپ کے ساتھ کھڑے ہیں۔ یہ اچھا نہ ہوا آقا!“ اور سلامہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

سل زہری کے کان میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس نے ذرا سختی سے

”خیر۔۔۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا مگر اب تمہیں احتیاط کرنا ہو گی۔“ اقس کا وقت گزر چکا ہے میرے آقا!“ سلامہ نے نہ جانے کن خیالوں میں

”کیا مطلب ہے سلامہ! میں سمجھا نہیں؟“

سلامہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی ذہانت سے بات بنائی۔ آقا! میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اقس کو یہاں بلا کے نوٹوں کی۔ وہ حویلی میں آگئے اور میرا انتقام پورا ہو گیا۔ اب خواہ اقس مجھے پردے یا بٹھا کے گنا سنیں یا اپنے پاس بلا کے فرمائش کریں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے سلامہ! لیکن تم اپنی طرف سے بے پردہ ہونے کی کوشش نہ کرنا۔“ سل نے تاکید کی۔

”مجھے کیا پڑی ہے آقا۔“ سلامہ کے اس جملے نے سل زہری کے دل میں اٹھتے بے وسوسوں کو ختم کر دیا۔ اس نے سلامہ کو اس طرح دیکھا جیسے اسے بالکل اطمینان گیا ہے۔ پھر دونوں نے مل کر ایک دوسرے کمرے میں پردے کا انتظام کیا۔ کمرے کے درمیان میں ایک باریک جالی کا پردہ آویزاں کیا گیا۔ سلامہ گھنگھرو والا دف لے کر بائیں طرف بیٹھ گئی۔ سل زہری دوسرے کمرے میں جا کر اقس کو ساتھ لے آیا اور ”تم“ سلامہ کے بالمقابل نظریں نیچی کر کے بیٹھ گئے۔ سلامہ کا دل زور زور سے بھڑک رہا تھا۔ اسے خوف پیدا ہوا کہ اگر اس کے دل کی یہی کیفیت رہی تو وہ شاید گالی نہ سکے۔ اس کے علاوہ اسے اس بات کا بھی بھی تو خدشہ تھا کہ کہیں سل زہری کی غیر حالت کو دیکھ کر اس کے دل کی بات تک نہ پہنچ جائے۔

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ پھر سل زہری نے جو اقس کے ابر بٹھا تھا سلامہ سے کہا۔ ”کس بات کا انتظار ہے سلامہ! رات بھیک رہی ہے۔ شروع کرو۔“

”کیا شروع کروں آقا! حمد، نعت یا امراء اقیس کے دل کی دھڑکنیں؟“ سلامہ نے تھر تھراتی مگر نغمہ بار آواز میں کہا۔

سل بھی کھڑا ہو گیا تاکہ حویلی کے باہر تک اقس کو پہنچا آئے۔ اس نے قدم اٹھایا تھا کہ پردے کے پیچھے سے ایک نغمہ بار آواز ابھری۔ ”حضرت اقس کی تشریف آوری کے لئے لونڈی شکر گزار ہے۔“

یہ سلامہ کی مترنم آواز تھی کہ نیزے انی جو اقس کے جگر میں اترتی چلی گئی۔ ان کے پیر جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ منہ پھیر کر نکل جانے کی کوشش کی مگر جیسے سلامہ کا پیکر ان کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ اقس نے خود کو سنبھالا اور بولے۔ ”ان ایمان افروز نغموں کے لئے میں بھی سلامہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں حضرت کا شکریہ قبول نہیں کر سکتی۔“ سلامہ نے اس قدر بے اعتنائی سے کہا کہ اقس حیران رہ گئے۔ سل زہری کو سلامہ پر غصہ آ گیا۔ ”سلامہ! ہوش میں آؤ۔ تم عبدالرحمن بن ابی عمارہ سے مخاطب ہو۔ ادب ملحوظ رہنا چاہئے۔“ سل نے دانٹا۔

”آقا یہ میرا اور عبدالرحمن کا معاملہ ہے۔ آپ اس میں دخل نہ دیجئے۔“ سلامہ نے اس قدر بے تکلفی سے کہا جیسے اس کی عبدالرحمن سے پرانی شناسائی ہو۔ ”ہاں سل زہری! تم دخل نہ دو۔ مجھ سے سوال ہوا ہے میں ہی جواب دوں گا۔“ پھر عبدالرحمن نے پردے کی طرف دیکھا۔ ”سلامہ! شاید تم میرا شکریہ اس وجہ سے قبول نہیں کر رہی ہو کہ یہ زر و جواہر سے خالی ہے۔“

”حضرت کے دامن میں زر و جواہر سے زیادہ قیمتی چیزیں موجود ہیں، بشرطیکہ آپ مجھے کچھ دینا چاہیں۔“

سل زہری اپنی کینز کی اس بے باکی پر اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ عبدالرحمن پر اس کی گستاخی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے نرمی سے کہا۔ ”سلامہ! میرا دامن خالی ہے اگر تمہیں کچھ نظر آتا ہے تو مانگ سکتی ہو۔“

”میں صرف ایک وعدہ مانگتی ہوں۔ صرف ایک وعدہ!“ سلامہ نے وعدے پر زور دیا۔

”میں وعدہ کر سکتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ میں اپنے پیدا کرنے والے کی نظر میں حقیر نہ ہو جاؤں۔“

سل زہری نے اقس کی طرف دیکھا۔ ”کیا پسند فرمائیں گے حضرت! سلامہ پسند سے آگاہ فرمائیے۔“

”اللہ افضل اور اول ہے۔ ہر کام اس کے نام سے شروع کیا جاتا ہے۔“ اس کو مدہوشی میں بھی اتنا ہوش تھا۔

سل زہری کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سلامہ کی ڈفلی کے گھٹرو بج اٹھے۔ شاید اسے خیال آیا اور اس نے ڈفلی فوراً فرش پر رکھ دی۔ اب سلامہ دھیمے میں حمد باری تعالیٰ سنا رہی تھی۔ اس ذوالجلال کی صفات پر شکوہ الفاظ کی بندش سلامہ کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز۔ ان سب نے مل کے ایسا نسل باندھا کہ فضا جھوم اٹھیں، ہوائیں ساکت ہو گئیں اور ہر طرف جیسے نور کی بارش ہونے لگی۔ اس کا عالم دیدنی تھا۔ وہ کبھی سر دھنتے، کبھی زانو پر ہاتھ مارتے تو کبھی ان کے ہاتھ گر تک پہنچ جاتے۔ یہ مشہور ہے کہ اوصاف خداوندی نظم، نثر یا دنیا کی کسی بھی زبان ادا کئے جائیں وہ ہر فرد بشر، دیندار اور بے دین سب پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ آپ کسی ایسے ملک میں جہاں کی زبان سے آپ واقف نہیں چلے جائیں اور آپ کی زبان میں مختلف قسم کے نغمے سنائے جائیں تو جس وقت بھی ”حمد“ شروع ہو گی فوراً ”سمجھ جائیں گے کہ یہ خدا کی تعریف ہو رہی ہے اور آپ کا دل مودب ہوئے مجبور ہو جائے گا۔“

سل زہری خالص دنیا دار آدمی تھا مگر سلامہ کی زبان سے حمد سن کے وہ بے خود سا ہو گیا تھا۔ اور اس کے سینے کے زیر و بم سے اس کے دل کی کیفیات کا اندازہ ہو رہا تھا۔ حمد کے بعد سلامہ نے نعت رسولؐ کے پھول برسائے جو سل زہری اقس کی روح کو معطر کرتے چلے گئے۔ حمد اور نعت سننے کے بعد دل اس قدر ہل جاتا ہے کہ پھر کوئی دوسرا نغمہ سننے کی خواہش نہیں رہتی۔ پس اقس فوراً ”کھڑے ہوئے۔“

”سل زہری! تمہارا شکریہ اب میں جا رہا ہوں۔“
”خادم کو شرمندہ نہ کیجئے اقس!“ سل زہری عاجزی سے بولا۔ ”میں تو خدا احسان مند ہوں۔“

”آپ وعدہ کیجئے۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں۔ بتاؤ کیا چاہتی ہو؟“

”وعدہ کیجئے کہ آپ کل پھر تشریف لائیں گے۔“

”کل —“ اور عبدالرحمن چپ ہو کے رہ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں

سل زہری کو دیکھا۔ ”سناتم نے سل! سلامہ کس بات کا وعدہ لے رہی ہے۔“

”حضور! مجھے دخل دینے سے آپ نے منع فرما دیا۔ ہے۔“ سل نے جواب

”پھر آپ تو پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں۔ سلامہ نے کسی ایسی بات کی خواہش نہیں

جس سے آپ کی ریاضت میں خلل پڑے۔“

”کل کی کسے خبر ہے سل۔ میں کس طرح وعدہ کر لوں۔“

”ہر وعدہ بشرط زندگی ہوا کرتا ہے حضور! آپ کہہ سکتے ہیں کہ کل زندہ رہ

آجاؤں گا۔“ سل زہری بھی عبدالرحمن سے انتقام لینے پر تل گیا تھا۔

”زندگی بٹائی دار ہے۔ میں اس کا سہارا نہیں لے سکتا۔“ عبدالرحمن نے پھر

انکار کیا۔

”تو پھر سنئے حضرت!“ اس دفعہ سل زہری کے بجائے سلامہ پردے کے پ

سے بولی۔ ”اگر آپ وعدہ نہیں کریں گے تو سلامہ بھی اپنا وعدہ توڑ دے گی۔ میں

آقا سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کا سامنا نہیں کروں گی۔ مگر اب میں پردہ کش لونڈی

حکم دے رہی ہوں کہ وہ میرے اور آپ کے درمیان سے پردہ ہٹا دے تاکہ میں آ

کے سامنے بے حجاب ہو کر آپ کے پندار کو توڑ دوں۔“

سلامہ نے ایک خنگ زاہد سے وعدہ چاہا بھی تو کس انداز میں۔ کیا دلربائی تھی

کتنا ٹیکھا پن تھا۔ اور کس قدر شاندار طرز گفتگو تھا۔ سل زہری تو ششدر رہ گئی

اس نے سوچا کہ سلامہ لاکھ نازنین اور پری پیکر سہی مگر عبدالرحمن اپنے پندار

شکست قبول نہ کریں گے بلکہ سلامہ کو پھٹکار دیں گے لیکن عبدالرحمن کو شاید سلامہ

یہ تلخ کلامی بھلی لگی۔ ان کی مخمور مخمور سی نظریں پردے کی طرف اٹھیں اور بولے

”سلامہ کو اطمینان رکھنا چاہئے۔ میرا پندار خودی تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب میں

پہلی بار تمہاری آواز سنی تھی۔“

سل زہری کمال حیرت و استعجاب سے عبدالرحمن کا منہ تک رہا تھا۔ اس کی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلامہ میں وہ کون سی کشش ہے جس نے عبدالرحمن کے

چہرے میں زنجیر ڈال دی تھی۔ کیا یہ وہی عبدالرحمن ہیں جن کی زبان سے ایک لفظ سننے

کے لئے لوگ گھنٹوں انتظار کرتے ہیں۔

”تو آپ کل تشریف لا رہے ہیں؟“ سلامہ کی آواز نے سل زہری کے خیالات

کا سلسلہ توڑ دیا۔

”ضرور —“ کتے ہوئے عبدالرحمن کے قدم متحرک ہو گئے — سل

زہری ان کے ساتھ چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد عبدالرحمن رکے۔ نظریں پردے پر

جہاں مگر مخاطب سل زہری سے ہوئے۔ ”شب بخیر سل زہری!“

سل زہری انہیں صدر دروازے تک پہنچانے کے لئے ان کے پیچھے ہو لیا مگر

عبدالرحمن نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ سل نے بھی ضد نہ کی اور سلامہ کے

پاس واپس آ گیا۔

”تم نے تو کمال کر دیا سلامہ!“ سل زہری بڑی مسرت سے بولا۔

”آقا! آپ دیکھتے جائیے۔ ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔“ سلامہ مسکرائی۔

”کس کا عشق، کس نے ابتدا کی؟“ سل زہری نے گھبرا کر سلامہ کو دیکھا۔

”آقا! مجھ پر اعتماد کیجئے۔ میں اپنی منزل کو جانتی ہوں۔ ابتدا آپ کے عبدالرحمن

نے کی ہے اور انتہا بھی انہی پر ہوگی۔ سلامہ اسی طرح سلامہ ہی رہے گی۔“

”ہونہ — تو یہ بات ہے۔“ سل زہری نے دانت نکال دیئے۔ ”یہ چوہے

لمی کا کھیل ہے۔“

”کوئی بھی کھیل سہی مگر آپ اس سے دور ہی رہئے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کل سے میں اس کمرے سے بھی دور رہوں گا۔“ اور

سل زہری ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

دوسری رات آئی۔ سلامہ تیار ہو کے عبدالرحمن کا انتظار کرنے لگی۔ عشاء کی

اذان وقت پر ہوئی مگر سلامہ کو محسوس ہوا جیسے موزن اذان دینا بھول گیا تھا۔ اذان کے

بعد انتظار کی گھڑیاں شروع ہوئیں۔ سلامہ نے سل زہری پر یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی تھی کہ وہ عبدالرحمن سے بالکل بے تعلق ہے مگر عجیب بات تھی کہ صبح کی مجلس کی بھی تربیت حاصل کی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اگر کسی سوال کا جواب سمجھ نہ اس کا دل بے چین ہونے لگا تھا۔ ایک غلط تھی۔ ایک کک تھی جو بار بار عبدالرحمن کی مجلس کی بھی تربیت حاصل کی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ اگر کسی سوال کا جواب سمجھ نہ کی صورت کو اس کے تصور میں کھینچ لاتی تھی۔ وہ متین چہرہ، روشن روشن آنکھیں تھیں تو اسے ہلنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خواہ مخواہ مسکرا دیا جائے۔ چنانچہ سلامہ عبدالرحمن کے چہرے پر داڑھی نے ابھی پوری طرح قدم بھی نہ جمائے تھے۔ اس نے اس طریقے کا سہارا لیا اور بڑے دلفریب انداز میں مسکرانے لگی۔

”شکر ہے۔ میں تو گھبرا گیا تھا سلامہ!“ سل زہری نے اس طرح کہا جیسے سلامہ بار اس تصوراتی پیکر سے منہ چھپاتی مگر وہ صورت تھی کہ کسی نہ کسی کو نے جھانکنے لگتی۔

دن تو اس نے کسی نہ کسی طرح کاٹ دیا حالانکہ وہ تمام دن کھوئی کھوئی تھی۔ پھر شام اور رات۔ اچھا ہوا کہ دن میں اس کا سل زہری سے سامنا نہ ہوا۔ اسے اپنی حالت چھپانے میں بڑی دقت ہوتی۔ عشاء کے بعد تو ایک ایک لمحہ ہلکا سا گھبراہٹ بار بار اپنی لونڈی کو باہر بھیجتی کہ باہر جا کے دیکھے کہیں عبدالرحمن آ تو نہیں۔ سل زہری بھی حویلی میں نہیں تھا۔ سلامہ کو فکر تھی کہ کہیں عبدالرحمن باہر سے واپس نہ چلے جائیں۔ ان کا استقبال کرنے اور اندر تک پہنچانے والا کوئی نہ تھا۔ کا دل دھڑک رہا تھا اور آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔ یکا یک رابداری میں کھٹکنا سلامہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ شاید عبدالرحمن آ گئے۔ اس کے دل نے کہا مگر دروازہ کھلا اور سل زہری اندر آیا تو سلامہ کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ سل زہری آخر اس کا آقا تھا۔ اس کا احترام سلامہ پر واجب تھا۔

”سلام عرض کرتی ہے کنیز۔ آج آپ دن بھر تشریف نہیں لائے۔“ سلامہ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

”کیا ہوا سلامہ! میری کیوں ضرورت پڑی، کوئی کام ہے؟“ سل زہری پریشان نظروں سے سلامہ کو دیکھا۔ وہ سلامہ کو پھول کی طرح رکھتا تھا۔ کئی کنیزیں غلام اس مغنیہ کنیز کی خدمت پر مامور کئے تھے۔

سلامہ نے تو بس یونہی کہہ دیا تھا۔ اسے کسی بات کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن کہہ کے وہ پھنس گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ سل زہری کو کیا چاہیے۔ دے اور اس کے چہرے سے ظاہر ہونے والی پریشانی کو کس طرح دور کرے۔ ایک کے لئے اس نے سوچا۔ سلامہ نے موسیقی کے علاوہ شعر و ادب، حسن کلام اور آواز

”میں بالکل ٹھیک ہوں آقا! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔“ سلامہ کو بات کرنے کا بیان مل گیا اور سل زہری کی رہی سہی پریشانی بھی ختم ہو گئی۔

”تمہیں یاد ہے سلامہ! عبدالرحمن نے آج آنے کا وعدہ کیا ہے؟“ سل زہری نے یونہی بات چھیڑ دی۔

”مگر ان کے آنے کا وقت تو گزر چکا ہے۔“ یہ سلامہ کے انتظار کا رد عمل تھا۔

”ابھی نہیں سلامہ! ابھی تو عشاء کی نماز بھی نہیں ہوئی۔“

”اچھا۔۔۔“ اور سلامہ کو جیسے سکون مل گیا۔ ”عشاء کی نماز کس وقت ہوتی ہے؟“

”عشاء کی نماز۔۔۔“ سل زہری نے گھبرا کر سلامہ کو دیکھا۔ ”عشاء کی نماز بس عشاء کے وقت ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے پہلے اذان ہوتی ہے پھر کچھ دیر بعد نماز ہوتی ہے۔“

سلامہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے بالکل غلط سوال کیا تھا۔

”آج عبدالرحمن نہ آئے تو کیا ہو گا؟“ سل زہری نے اسے چھیڑا۔

سلامہ فوراً ”سنبھلی۔ اسے شبہ ہوا کہ سل زہری اس پر شبہ کر رہا ہے۔ ایک نظر سل زہری پر ڈالتے ہوئے بولی۔ ”ہو گا کیا۔ میرے آقا کی حویلی سلامت رہے گی اور عبدالرحمن میرے نفوس سے محروم ہو جائیں گے۔“

”مرحبا! شاباش۔ جواب دینے میں تو تم ماہر ہو۔“ سل زہری نے اس کی تعریف

”آپ نے مجھے حسن کلام کی تعلیم دلائی ہے۔ آقا۔“ سلامہ مسکرائی۔ پھر ذرا رک کے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ میرے نئے عبدالرحمن کو چین سے نہ بیٹھنے دیں

اسی وقت کسی نے باہر سے دروازہ کھولا اور سلامہ کھلتے دروازوں کے پٹوں سے ٹکرا
مئی۔ یہ اس کی کنیر تھی جو دروازہ کھول کے اندر آرہی تھی۔

سلامہ اس پر برس پڑی۔ ”اندھی کیس کی۔ دیکھ کے دروازہ نہیں کھولتی۔“ اور
سلامہ پیشانی سہلانے لگی۔

”معاف کر دو سلامہ بی بی!“ کنیر نے معذرت کی حالانکہ سلامہ بھی اسی کی طرح
کنیر تھی مگر اس کے فن نے دونوں میں کتنا فرق کر دیا تھا۔

”کیا آفت آئی تھی۔ اتنی زور سے دروازہ کیوں کھولا تھا۔“ سلامہ اب بھی اس
پجاری کو ڈانٹ رہی تھی۔ حالانکہ غلطی خود اس کی اپنی ہی تھی۔

”بی بی! آفت تو نہیں آئی تھی۔ مگر حضرت جی آگئے ہیں۔ آپ کو اطلاع دینے
روڑ پڑی۔“ کنیر بتا رہی تھی اور سلامہ کھلی جا رہی تھی۔

”حضرت جی! ارے وہ — کہاں ہیں؟“ سلامہ پر سرشاری سی طاری ہو گئی۔
”آقا کے ساتھ آرہے ہیں۔ آپ تیار ہو جائیے۔“

سلامہ صبح ہی سے تیار تھی۔ جس کمرے میں بیٹھ کے گاتی تھی۔ وہ پہلے ہی سجا
ہوا تھا۔ سلامہ نے آج اسے اور سجا دیا تھا۔ اس نے دل کی بے چینیوں کو کمرے کی
جلوٹ میں بسلا دیا تھا۔ صرف لباس تبدیل کرنا تھا۔ وہ بھاگی ہوئی گئی اور دم کے دم میں
سرخ جوڑا پن کے دلہن بن گئی۔ سل زہری اور عبدالرحمن کمرے میں پہنچ چکے تھے۔
سلامہ نے عبدالرحمن کے لئے ایک زرنکار مسند لگا دی تھی۔ عبدالرحمن مسند کو دیکھ
کر چونکے اور اس سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔

”یہ کیا حضرت! مسند پر تشریف رکھئے۔“ سل زہری نے درخواست کی۔

”نہیں سل! یہ میرے مسلک کے خلاف ہے۔ مزید کچھ نہ کہنا۔“

”مگر جناب! یہ مسند سلامہ نے آپ کے لئے بڑے ارمانوں سے لگوائی ہے۔“

”سل زہری!“ عبدالرحمن کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”تم جانتے ہو“ میرے اور سلامہ
کے درمیان پردہ حائل ہے۔“ ٹھیک اس وقت پردہ کش لونڈی نے پردہ کی ڈوری کھینچ
کر کمرے کے درمیان میں پردہ ڈالی دیا۔ سلامہ چھم چھم کرتی آئی اور پردے کے
دوسری طرف بیٹھ گئی۔ باریک پردے سے آر پار نظر آتا تھا۔ سلامہ نے بیٹھتے ہی

گئے۔“

”ہاتھ نکلن کو آرسی کیا ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کے سل زہری
واپس جانے کے لئے اٹھا۔

”ارے آپ کہاں جا رہے ہیں۔ ابھی تو آئے ہیں۔“ سلامہ نے اسے روک دیا
”دیکھو سلامہ! عبدالرحمن آئیں یا نہ آئیں، یہ ان کا فعل ہے۔“ سل زہری
نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”مگر ہم اخلاق کا دامن کیوں چھوڑیں۔ تم نے انہی
آنے کی دعوت دی ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں دروازے پر ان کا انتظار
کروں۔ وہ ہمارے لئے بہت محترم ہیں۔ میں دروازے پر اس وقت تک موجود رہوں
جب تک مجھے ان کے آنے کی امید رہے گی۔“

”آپ کی مرضی آقا!“ سلامہ نے بڑی رکھائی سے کہا حالانکہ وہ خود بھی یہ
چاہتی تھی۔

سل زہری کے جانے کے بعد سلامہ پھر انتظار میں بیٹھا ہو گئی۔ انتظار اور
مسلل انتظار۔ سل زہری سے گفتگو کے دوران اس نے خود کو کس قدر سنبھالے رکھا
تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بولنے پر مجبور تھی۔ اور جن باتوں کا جواب نہ دینا چاہئے تھا
وہ جواب بھی اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ سلامہ کے لئے لذت سے بھرا یہ انتظار
کا کرب بالکل نیا تھا۔ اس کیفیت سے وہ پہلے نہ گزری تھی۔ اس کا دل دن میں بھی
بے چین رہا تھا۔ مگر اس طرح نہیں۔ دن تو رات کے انتظار میں کٹ گیا تھا مگر اس
رات نے بھی اسے اب تک وہ نہ دیا تھا جس کے لئے وہ بے چین اور مضطرب تھی۔
سل زہری کے خیال میں ابھی عبدالرحمن کے آنے کا وقت نہ ہوا تھا۔ لیکن سلامہ کے
لئے تو جیسے صدیاں بیت گئی تھیں۔

سل زہری کو باہر گئے نصف گھنٹے کے قریب ہو گیا تھا۔ اور سلامہ ماہی بے آب
کی طرح بستر پر ترپ رہی تھی۔ یا اللہ کیا عشق اسی کو کہتے ہیں۔ محبت کے یہی طور
طریقے ہوتے ہیں۔ دل یونہی گھٹتا، ڈوبتا اور مچلتا ہے۔ فراق کے انگارے یونہی سیلتے
ہیں۔ سلامہ آہیں بھر رہی تھی اور خود کو صواتیں بنا رہی تھی کہ راہداری سے سل
زہری کی آواز ابھری۔ سلامہ ترپ کے اٹھی اور بھاگتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی۔

پردے کے دوسری طرف دیکھا تو چونکی۔
 ”یہ کیا آقا! حضرت مسند سے ہٹ کے بیٹھے ہیں؟“ سلامہ نے جیتے ہوئے
 میں کہا۔

”ہاں سلامہ! حضرت کو اعتراض ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابھی میرے اور سلامہ
 درمیان پردہ حائل ہے۔“ سہل زہری نے لفظ ابھی پر زور دے کر کہا۔
 ”ابھی پردہ حائل ہے۔“ سلامہ نے زیر لب کہا پھر اونچی آواز میں بولی۔ ”
 — حضرت کی مرضی۔ حالانکہ ہمارے زبانی معاہدے میں ایسی کوئی بات موجود نہیں۔
 عبدالرحمن نے سر اٹھا کر کچھ کہنا چاہا مگر پھر سوچ کے سر جھکا لیا۔

سلامہ نے اپنی سریلی اور جادو بھری آواز سے جوت جگانا شروع کی۔ پہلے حمد،
 نعت۔ عبدالرحمن بے خودی کے عالم میں جھومتے رہے۔ سر دھنتے رہے۔ چند لمحو
 بعد سلامہ نے ایک درد بھری غزل چھیڑی۔ اس کے پہلے ہی مصرعے پر عبدالرحمن۔

چونک کر سامنے کی طرف دیکھا۔ اس وقت سلامہ نے پردہ کش لونڈی کو اشارہ کیا
 لونڈی نے پردے کی ڈوری کو کھینچنا شروع کیا۔ پردہ آہستہ آہستہ سرکتا رہا اور سلامہ
 کے لباس کے رنگ اور چہرے کے خطوط ایک کے بعد ایک نمایاں ہونے لگے
 عبدالرحمن نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ شاید منع کرنے کے لئے مگر ان کا ہاتھ شاید ہوا میں
 ہو گیا۔ عبدالرحمن کی نظریں سلامہ کے رخِ زیبا پر ٹھہر کے رہ گئیں۔ سلامہ بالکل۔
 تعلق بنی گاتی رہی۔ اپنے دل کا درد آواز میں گھولتی رہی۔ حمد و نعت سننے والے۔
 عبدالرحمن کو غزل کے اس درد کا پتہ نہ تھا۔ ان پر سرور طاری ہو گیا۔ ان کا ہاتھ زانہ
 پر واپس آ گیا۔ مگر بیاسی نظریں سلامہ کا طواف کرتی رہیں۔

سہل زہری گم صم بیٹھا کبھی عبدالرحمن اور کبھی سلامہ کو دیکھ رہا تھا۔ سلامہ
 چیز سے بے پرواہ گلے میں مست تھی اور عبدالرحمن اس کے کھڑے کے نقوش اور
 آواز کے تلاطم میں کھوئے ہوئے تھے۔ غزل کی حشر سلمانیاں سننے والوں کو مدہوش کر
 رہی تھیں۔ فضا ساکت و جاہد ہو کے رہ گئی تھی۔

غزل ختم ہوئی تو عبدالرحمن ہوش میں آئے۔ سلامہ مجسم ان کے سامنے موج
 تھی۔ اس کی برق پاش نظریں اور قیامت خیز مسکراہٹ غضب ڈھا رہی تھی۔
 ”میں اتنا طویل انتظار نہ کر سکوں گی حضور!“ حسن جھک کے قدموں میں آ گیا۔
 ”اچھا ہفتے بھر بعد آؤں گا۔“ عشق، حسن کو سہارا دینے پر مجبور ہو گیا۔
 سلامہ نے عبدالرحمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور عبدالرحمن تاب

عبدالرحمن نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر نظریں جھکالیں مگر نہ کوئی اعتراض اور نہ شکوہ
 شکایت۔

”توبہ لوٹ گئی حضور!“ سلامہ چنکی۔
 ”یہ تمہاری زیادتی ہے سلامہ!“ حضرت نے سر جھکائے جواب دیا۔ ”تمہیں بے
 حجاب نہیں ہونا تھا۔“
 ”میں بے حجاب نہیں ہوئی حضور! میں نے آپ کو بے حجاب کیا ہے۔“ سلامہ
 کے انداز میں کتنی دلیری تھی۔ ”میں آپ کو بھرپور نظروں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔“
 ”مگر کیوں۔ میں تماشہ تو نہیں؟“

”آپ اتنے خوبصورت کیوں ہیں؟“ سلامہ نے چٹکی لی اور اپنی جگہ سے ذرا
 آگے کھسک آئی۔

”درمیان میں فاصلہ رکھو سلامہ!“ عبدالرحمن کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔
 ”اطمینان رکھئے میں دور ہی رہوں گی۔ مگر اب پردہ تو حائل نہیں۔“
 عبدالرحمن اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔
 ”جا رہے ہیں آپ؟“

”ہاں، جا رہا ہوں اور پھر کبھی نہ آؤں گا۔“
 ”ٹھیک ہے مگر قیمت تو ادا کرتے جانیئے۔“
 ”قیمت — مگر میری تو جیب خالی ہے۔“
 ”جیب سے نہیں — منہ سے قیمت ادا کیجئے — صرف وعدہ کر لیجئے۔“
 ”قیمت ادا کرنے کا وعدہ!“ عبدالرحمن گھبرا گئے۔

”جی نہیں، کل آنے کا وعدہ کیجئے اور سمجھئے کہ قیمت ادا ہو گئی۔“
 عبدالرحمن کا بدن تھرا اٹھا۔ ”پندرہ دن بعد آؤں گا۔“ عبدالرحمن نے دل پر جبر
 کر کے کہا۔

نظارہ نہ لاسکے۔ ان کی نظریں جھک گئیں۔ سلامہ نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا انتظار کروں گی عبدالرحمن!“

سلامہ ایک ہی جست میں محبت کی تمام میڑھیاں طے کر گئی۔ عبدالرحمن وہ رہ گئے۔ سہل زہری مسکرایا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سلامہ نے آخر عبدالرحمن کو کھدے دے ہی دی۔ اب وہ بچ کے کہیں نہیں جاتے۔ آٹھویں دن چکر ضرور لگائیں گے۔ ”شب بخیر!“ کہتے ہوئے عبدالرحمن کمرے سے نکل گئے۔

سہل زہری نے سرگوشی کی۔ ”سلامہ! تم اپنے فن میں ماہر ہو گئی ہو۔“
”آپ کی شاگرد جو ہوں۔“ سلامہ نے دل سنبھال کے سہل زہری کو فریب دیا۔
سہل زہری جب باہر نکلا تو عبدالرحمن جا چکے تھے۔ وہ تیز قدموں سے ان پیچھے گیا مگر وہ نظر نہ آئے۔ سہل زہری نے خود کلامی کی۔ ”اب کہاں جاؤ گے عبدالرحمن!“

سہل زہری نوجوان زاہد عبدالرحمن کو آزما رہا تھا اور اس آزمائش میں اسے لطف آنے لگا تھا۔ اسے اپنی کثیر سلامہ پر پورا اعتماد تھا۔ سلامہ بھی دل کے داغوں چھپائے اپنے آقا کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر سہل زہری کو کیا معلوم تھا کہ سلامہ کے دل میں زاہد خشک کی محبت سرایت کرتی جا رہی ہے۔ سلامہ نے جبر آگ کا کھیل شروع کیا تھا وہ آگ کے دامن تک پہنچ گئی تھی۔ عبدالرحمن کے دل کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہ بھی اپنے دل کے نماں خانوں میں سلامہ کی محبت کی گرمی محسوس کرتے تھے مگر وہ بلا کے پرہیز گار اور پارسا تھے انہوں نے اب تک اپنا دامن واعدار نہ ہونے دیا تھا۔ سلامہ اور ان کے درمیان پردہ اٹھ جانے کے باوجود اب تک حجاب کا پردہ حائل تھا۔ اور یہی بات سہل زہری کے لئے اطمینان باعث تھی۔ اس نے اپنی کنیز کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ پہلے وہ دروازے پر عبدالرحمن کا استقبال کرتا تھا اور گانے کے اختتام پر انہیں کچھ دور چھوڑنے جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے یہ تکلف بھی چھوڑ دیا۔

عبدالرحمن اپنے وعدے کے مطابق آٹھویں دن سہل زہری کی حویلی پر جاتے تھے لیکن جب سلامہ کی بے تابی بڑھی اور اس نے عبدالرحمن کو روز آنے کی ضد کی

تو وہ انکار نہ کر سکے اور محبوبہ دلنواز کی خاطر انہوں نے کوئے جاناں کے روز چکر لگانے شروع کر دیئے۔ اب وہ ہوتے اور سلامہ اور حویلی کی تنہائی۔ سوائے سلامہ کی راز دار لونڈی کے انہیں دیکھنے والا کوئی نہ ہوتا تھا۔ سہل زہری کو عبدالرحمن کی آمد و رفت سے پہلے سلامہ کی بڑی حفاظت کرنا پڑتی تھی اور اسے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی اس سونے کی چڑیا کو اڑا نہ لے جائے کیونکہ لڑکی کی جوانی ہزاروں حادثوں کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جوانی سہارا ڈھونڈتی ہے۔ اور ذرا سا سہارا ملنے پر پکے ام کی طرح سہارا دینے والے کی گود میں گر جاتی ہے۔ عبدالرحمن کی طرف سے انہیں اس طرح کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ اسی لئے اس نے ان دونوں کو تنہائی میں ملنے کا موقع فراہم کیا تھا تا کہ سلامہ کی بھگتی ہوئی نظریں ایک مقام پر ٹھہر جائیں۔ یہ مقام اور بے ضرر مرکز عبدالرحمن سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس شب سلامہ کچھ زیادہ ہی بے چین تھی۔ سہل زہری اس کی طرف سے بے فکر ہو کر اپنے کام پر نکلا ہوا تھا۔ سلامہ کی لونڈی اسے تسلیاں دے کر بہلا رہی تھی۔ مگر عبدالرحمن کے نہ آنے سے سلامہ سخت مضطرب تھی۔
”آج وہ نہیں آئیں گے۔“ سلامہ نے شاید اپنے دل سے کہا۔ مگر اس کی آواز لونڈی کے کانوں تک پہنچ گئی۔

”بی بی! صبر کیجئے۔ وہ ضرور آئیں گے۔ بلکہ کچھ دھاگے میں بندھے آئیں گے۔“ لونڈی نے صبر کی تلقین کی۔

”یہ جھوٹی تسلیاں ہیں کنیز! مرد کا کیا اعتبار۔ جہاں خوش نما پھول دیکھا وہیں منورے کی طرح منزلانے لگے۔“ سلامہ نے ایک لمبی سانس لے کر سر پکڑ لیا۔

”لونڈی فوراً اس کا سر سسلانے اور دبانے لگی۔“ بی بی! آپ بہت دیر کر رہی ہیں۔ اس سے شک و شبہ پیدا ہوتا ہے۔“ لونڈی نے راز داری سے کہا۔

سلامہ نے سر اٹھا کر راز دار کو دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تیرا۔ کس بات میں دیر کر رہی ہوں؟“

”بی بی! آپ کی محبت ابھی تک دل میں ہے اور کیا پتہ کہ عبدالرحمن کے دل میں کیا ہے؟“

معتول رقم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہاں سہل زہری کی لونڈی ہے اور محل میں جا کر کسی خلیفہ یا خلیفہ زادے کی لونڈی ہو کر رہ جائے گی۔ وہ کبھی آزادی حاصل نہ کر سکے گی۔ غلامی کی زنجیریں اسے ہمیشہ جکڑے رکھیں گی۔ خواہ یہ زنجیریں سونے ہی کیوں نہ ہوں۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بہن!“ سلامہ کے دل میں لونڈی کی عزت بڑھ گئی۔ ”مجھے کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔“

لونڈی مسکرائی۔ ”بی بی عطلند وہی ہے جو ہلکی سی ٹھوکر پر سنبھل جائے۔ آقا نے تمہیں اس لئے ڈھیل دی ہے کہ اب تمہیں عبدالرحمن قس کے حوالے سے شرت حاصل ہو رہی ہے۔ تمہاری قیمت بڑھتی جا رہی ہے مگر تمہیں اس سے کیا حاصل ہو گا۔ یہی ناں کہ ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے میں۔ پنجرہ بدلنے سے آزادی تو نہیں ملتی۔“

”میری عطلند بہن! میں تمہارے کہنے پر عمل کروں گی۔“ سلامہ نے کہا۔ ”محبت اپنا اظہار چاہتی ہے۔ خواہ کسی انداز میں ہو۔“

”نہیں بی بی! انداز کا سارا اس وقت لیا جاتا ہے جب اظہار پر پابندی ہو۔“ لونڈی بے باک ہو گئی تھی۔ اس نے سلامہ کو فوراً ٹوکا۔ ”آپ کو کیا مجبوری ہے۔ کوئی پابندی نہیں آپ پر۔ سہل زہری مکان پر نہیں ہوتے۔ آپ دونوں تنہا ہوتے ہیں۔ صرف میں نکل رہتی ہوں۔ آپ حکم دیں، میں کسی اور طرف ٹل جاؤں گی۔“

”تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔“ سلامہ نے کھینچ کر لونڈی کو سینے سے لگا لیا۔ ”تم یہیں موجود رہو گی تاکہ حالات دیکھ کر مجھے مشورہ دے سکو۔ میں —“

اسی وقت کھٹکا ہوا۔ لونڈی جلدی سے خاموش ہو گئی۔ سلامہ نے جھانک کر راہداری میں دیکھا اور ایک سرد آہ کے ساتھ کہا۔ ”وہ آگئے مگر آقا ان کے ساتھ ہیں۔“

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بی بی! آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔ وقت آپ کے ساتھ ہے۔“ لونڈی نے سلامہ کو مطمئن کر دیا۔

”پھر میں کیا کروں۔ کس سے کہوں، آقا کو معلوم ہو گیا تو نہ معلوم کیا قیام ہو گی۔“

”اپنا دل کھولے بی بی!“ لونڈی نے مشورہ دیا۔ ”کس کے سامنے دل کھولوں۔ تجھے تو میرے دل کا حال معلوم ہی ہے۔ آ سے میں کہہ نہیں سکتی۔“

”بی بی! آپ تو بڑی عقل مند ہیں۔“ لونڈی نے ہلکا طنز کیا۔ ”آ سے دل کیر نہیں دکھاتیں جس نے آپ کو یہ مرض دیا ہے۔“

”تیرا مطلب ہے عبدالرحمن سے کہوں۔“

”اور کیا دیواروں سے کہئے گا۔ جس نے درد دیا ہے اس سے دوا کیوں نہیں طلب کرتیں۔“

”مگر عبدالرحمن تو جانتے ہیں۔“ سلامہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”محبت چھپی نہیں رہتی۔“

”آپ کو کس طرح معلوم ہوا بی بی؟“ لونڈی نے سوال کیا۔ ”آپ نے ار سے کہا ہے کبھی انہوں نے کبھی اظہار کیا ہے آپ سے؟“

”یہ بات تو نہیں سمجھ سکتی کینز!“ سلامہ نے منہ بتایا۔ ”محبت کی زبان نہیں ہوتی۔ محبت کا اظہار بھی الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کی زبان و بیان کا انداز ہوتا ہے۔“

”تو پھر تڑپتی رہے یونہی۔“ لونڈی جھلا گئی۔ ”بی بی! جب تک بچہ روتا نہیں ماں اسے دودھ نہیں پلاتی۔ جب تک آپ دونوں ایک دوسرے کے سامنے اپنے داکھول کے نہیں رکھیں گے اس وقت تک آئندہ کے لئے کوئی منصوبہ نہیں بنا جاسکتا۔ ہاں اگر آپ کی محبت وقتی ہے اور صرف عبدالرحمن کے یہاں آجانے۔ آپ کی تسلی ہو جاتی ہے تو پھر اسی طرح منہ میں پتھر بھرے بیٹھی رہے۔ اتنا بے چارہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

لونڈی نے جو کچھ کہا اس کا لفظ لفظ سلامہ کے دل میں اتر گیا۔ اس کی زندگی مقصد کیا ہے۔ سلامہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ سہل زہری اسے محل میں بھیج کے آکا

”تم پتھر کو کہہ رہی ہو، بڑے بڑے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔“
”پھر آپ پر کیوں اثر نہیں ہوتا؟“

”کیا اثر۔ کس کا اثر؟“ عبدالرحمن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
”سنئے عبدالرحمن۔۔۔۔۔!“ سلامہ ایک دم رک گئی۔

”بات ادھوری چھوڑنا اچھا نہیں ہوتا سلامہ! اس سے دل کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔“

”آپ کو میرا عبدالرحمن کہنا ناگوار نہیں گزر رہا۔“

”ناگوار کیوں گزرے۔۔۔۔۔ میرا نام عبدالرحمن ہی ہے۔“

سلامہ نے قریب بیٹھی ہوئی اپنی لونڈی کو دیکھا۔ جیسے اس سے اخلاقی مدد مانگ رہی ہو۔ لونڈی نے ایک خاص اشارے سے اس تک کمک پہنچا دی۔
”میں آپ کی محبت میں گرفتار ہوں عبدالرحمن!“ لونڈی کی کمک پا کے سلامہ نے راز دل اگل دیا۔

عبدالرحمن نے سراٹھا کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر دیر تک ملی رہیں۔
لہر ان پر کوئی بیجانی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ چہرہ تاثرات سے بالکل خالی تھا۔ سلامہ بے چین ہو گئی۔۔۔۔۔ اسے محبت کا جواب محبت سے نہیں ملا تھا۔ لونڈی کا منہ بھی اتر لیا تھا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔

آخر سلامہ چیخ سی پڑی۔ ”میں تمہارے لئے بے قرار ہوں عبدالرحمن! اب مجھ سے مبر کا دامن نہیں سنبھالا جاتا۔“

”میرا بھی یہی حال ہے سلامہ!“ عبدالرحمن نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔
”کیا، کیا کہا آپ نے؟“ سلامہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے اپنے نول پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”ایک بار پھر کہئے عبدالرحمن! میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟“

”کیا کبھی سلامہ! تم نے کیا پوچھا تھا مجھ سے؟“ عبدالرحمن جیسے انجان بن گئے۔

”میں نے۔۔۔۔۔ میں نے کہا تھا کہ اے سنگدل عبدالرحمن میں آپ کی محبت

عبدالرحمن اور سہل زہری باتیں کرتے ہوئے اس خاص کمرے میں چلے گئے جہاں وہ گانا سنتے تھے۔ کچھ دیر بعد سلامہ اپنی لونڈی کے ساتھ داخل ہوئی۔ آج وہ ہر جوڑے میں ملبوس تھی۔

”سلام پیش کرتی ہوں حضور کو“ سلامہ نے بڑے محبوب انداز میں عبدالرحمن کو سلام کیا۔

عبدالرحمن نے سر کے اشارے سے سلام قبول کیا اور نظریں نیچی کر لیں۔ سلامہ کی دف کے گھنگرو بجے اور نفے کی تانیں فضا کا سینہ چیرنے لگیں۔ جب سے سلامہ کی آواز میں سوز کی آمیزش ہوئی تھی اس وقت سے اس کی تانوں میں ایک عجیب طرح کی ترنگ پیدا ہو گئی تھی۔ عبدالرحمن بار بار جھوم جھوم اٹھتے۔ سہل زہری کو بھی سلامہ کے گانے میں لطف آنے لگا تھا۔ اس کی زبان سے بھی تعریفی کلمات بے ساختہ پھسل پڑتے تھے۔ رات گئے تک محفل جاگتی رہی پھر عبدالرحمن خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ سلامہ کے دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

دوسری شب سلامہ کو دل چیر کر دکھانے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ عبدالرحمن ٹہا آئے تھے۔ سہل زہری کسی کام سے باہر ہی رہ گیا تھا۔ اس شب سلامہ نے بہت لہک لہک کے گایا اور ہر ہر انداز سے عبدالرحمن کو لبھاتی رہی۔ عبدالرحمن بھی مسرور بنے اور ان پر سرور بھی غالب آگیا تھا۔ گانا ختم ہوا تو سلامہ کھٹکی باندھ کر عبدالرحمن کو دیکھنے لگی۔ عبدالرحمن نے بھی دو ایک بار نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب میں جا رہا ہوں سلامہ!“ عبدالرحمن نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

”ٹھہریے! ابھی مجھے دیکھنے دیجئے۔“ سلامہ نے جذبات سے پر آواز میں کہا۔

”کسے دیکھنا چاہتی ہو سلامہ؟“

”اس ہستی کو دیکھنا چاہتی ہوں جس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھا ہے۔“

”اگر یہ اشارہ میری طرف ہے تو میں اس کی تردید کرتا ہوں۔ میں ایک معمولی

انسان ہوں اور میرے سینے میں ایک انسان کا دل ہے۔“

”کیا پتھر موم ہو سکتا ہے حضرت؟“

”اس کا موقعہ نہیں آئے گا بی بی!“ تجربے کار کنیز نے سمجھایا۔
”عبدالرحمن کے عشق میں تمہیں پورے حجاز میں شہرت حاصل ہوگی اور یہی

آقا کی خواہش ہے۔“

”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“ سلامہ الجھ کے رہ گئی۔ ”اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہئے؟“
”آپ کو چاہئے کہ آپ فوراً آقا کو مطلع کریں کہ عبدالرحمن آپ کے عشق میں گرفتار ہیں اور انہوں نے صاف الفاظ میں آپ کی محبت کا اظہار کیا ہے۔“ کنیز نے بڑے خلوص سے رائے دی۔

”یعنی میں آقا کی ناراضگی مول لوں۔ اپنے پیروں میں خود کھانڈی ماروں۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہو گا۔“ سلامہ کو کنیز پر غصہ آگیا۔

”میں آپ کی دشمن نہیں ہوں بی بی! اگر آپ آقا سے بات نہیں کریں گی تو میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی کیونکہ اسی میں آپ کا فائدہ ہے۔“ کنیز نے سلامہ کے غصے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی نظریں وہاں تک نہیں پہنچ رہیں جہاں میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ کی شہرت ہی آپ کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ سکتی ہے۔“

سلامہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔ اپنی کنیز پر اسے بڑا اعتماد تھا۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ جس زنجیر سے بندھی ہے اسی سے کنیز کے پیروں بھی جکڑے ہوئے ہیں۔ اس کا مشورہ بظاہر سمجھ میں نہ آ رہا تھا مگر اس کے خلوص پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سلامہ انہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ باہر کسی کی باتوں کی آواز آئی۔

”شاید آقا آرہے ہیں۔“ کنیز نے خیال ظاہر کیا۔

سلامہ نے جھانک کے دیکھا۔ ”ہاں آقا آگئے۔ کیا میں ان سے سب کچھ کہہ دوں؟“

”مجھ پر اعتماد ہو تو کہہ دیجئے ورنہ آپ کی مرضی۔“ کنیز اکتائے لہجے میں بولی۔ ”اگر کہنے کا ارادہ ہو تو اپنی محبت اور بے تابی ان پر ظاہر نہ کیجئے گا۔“

سلامہ نے سر ہلا دیا۔

سل زہری خوش خوش بکمرے میں داخل ہوا۔ سلامہ گفتگو کے لئے جملہ

میں بے قرار ہوں اور دل ہے کہ بے صبر ہوا جاتا ہے۔“ سلامہ نے رک رک مدعا بیان کیا۔

”میرے دل کا بھی یہی حال ہے سلامہ!“ یہ کہتے ہوئے عبدالرحمن کمر ہوئے اور سلامہ اور اس کی لونڈی کو حیرت زدہ چھوڑ کر کمرے سے نکل گئے۔

عبدالرحمن کے جانے کے بعد سلامہ اور اس کی کنیز ایک دوسرے کو حیرت دیکھتی رہیں۔ پھر یہ تاثر کم ہوا اور حیرت کی لکیروں میں مسرت کی کرنیں بکھر گئیں کنیز نے مسکرا کے کہا۔ ”بی بی! مبارک ہو عبدالرحمن نے آپ کی محبت کا جواب دیا۔“

”ہن! کیا تم نے وہ الفاظ سنے تھے۔ مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا ہے سلامہ اب تک گھبرائی ہوئی تھی۔

”واہ بی بی! میں کیا بھری ہوں۔“ کنیز نے منہ بتایا۔ ”محبت کا اظہار اس زیادہ واضح الفاظ میں ہو ہی نہیں سکتا۔“

”کہیں انہوں نے مجھے خوش کرنے کو تو نہیں کہہ دیا؟“
”آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ عبدالرحمن جھوٹ نہیں بول سکتے۔ انہیں ہر گز رتا تو فوراً انکار کر دیتے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں یقین کر لوں۔ وہ بھی میرے لئے بے قرار ہیں۔“
”اس میں کیا شک ہے بی بی! مرد عورت سے زیادہ بے قرار ہوتا ہے۔“

”مگر ہن اب یہ نئی صورت حال پیدا ہو گئی ہے اسے کیسے سنبھالا جائے گا سلامہ ایک دم فکر مند ہو گئی۔

”کیا صورت حال پیدا ہوئی ہے بی بی آپ کو کس بات کا خطرہ ہے۔“
”خطرہ ہے مجھے اپنے آقا سے۔ انہیں معلوم ہو گا تو آفت کھڑی کر دیں گے۔“
”نہیں بی بی! وہ تو خوش ہوں گے۔ سل زہری ایک تاجر ہیں۔ آپ یہ کیا بھول رہی ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہو ہن! آقا یہ کس طرح گوارہ کریں گے کہ مجھے ایک ظالم زاہد کے حوالے کر دیں۔“

ڈھونڈنے لگی۔ وہ اس انداز سے بات چھیڑنا چاہتی تھی کہ سہل زہری کو اس پر شہ ہو مگر وہ سوچتی ہی رہ گئی اور سہل نے خود ہی بات شروع کر دی۔

”سلامہ! اس زاہد کا ہماری حویلی میں آنا بڑا مبارک ثابت ہوا۔“ سہل نے بڑی مسرت سے آغاز کیا۔

”وہ کس طرح آقا! مجھے بھی بتائیے؟“ سلامہ نے دل سنبھال کے پوچھا۔

سہل زہری نے مزے لے لے کے بیان کیا۔ ”عبدالرحمن کا لوگوں پر بڑا ہے۔ جب سے انہیں معلو ہوا کہ عبدالرحمن میری حویلی پر سلامہ کا گانا سننے آتے تو ان کی نظروں میں سلامہ کا وقار بہت بڑھ گیا ہے۔ رئیس زادوں نے ایک دوسر سے بڑھ کے قیمت لگانا شروع کر دی ہے۔ ایک رئیس نے تو ہزار اشرفیوں کی بخشش کی ہے۔“

سلامہ کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ مگر اس کے ساتھ وہ اپنی کنیز کی ذہانت قائل ہو گئی۔ اس نے دبی آواز میں کہا۔ ”آج عبدالرحمن نے اپنے عشق کا اظہار کر دیا ہے۔“

”بہت خوب! یہ تو بہت بڑی خوشخبری ہے۔“ سہل زہری کی باچھیں کھ گئیں۔ ”اب تک تو لوگوں میں تمہارے گانے کا چرچا تھا۔ اب تمہارے حسن و جمال کا بھی ڈنکا بجنے لگے گا۔ تم دیکھنا سلامہ چند ہی دنوں میں تمہاری قیمت دو ہزار اٹھ تک پہنچ جائے گی۔“ سلامہ کی نظریں ایک بار پھر اپنی کنیز کی طرف اٹھ گئیں۔

کچھ دن اور اسی طرح گزر گئے۔ عبدالرحمن قس کے معمول میں ذرا بھی فرق نہ پڑا۔ وہ ہر رات وقت مقررہ پر سہل زہری کی حویلی پر آتے اور سلامہ کے نغمہ سے مسرور ہوتے۔ سلامہ کی عشوہ طرازیں بڑھتی گئیں۔ سہل زہری نے اسے بالکل بے لگام چھوڑ دیا تھا۔ سلامہ اور القس کی محبت کے چرچے حویلی سے نکل کر آباد کے کوچہ و بازار تک پہنچ چکے تھے۔ عبدالرحمن کا شمار علمائے کرام میں بھی ہوتا تھا انہیں اپنے ایک فرد کی اس روش پر اعتراض تھا جو علماء محفل سماع کے قائل نہ تھے۔ انہیں عبدالرحمن سے زیادہ شکایت تھی۔ مگر عبدالرحمن نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ اس کے وعظ اور درس میں سامعین کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پیٹھ پیچھے لوگ

ہاتھیں بٹاتے مگر ان کے سامنے مودب ہو کر بیٹھتے تھے۔

کہتے ہیں کہ خالی برش زیادہ آواز دیتا ہے۔ اور کم ظرف انسان عطیہ خداوندی کی قدر نہیں کر سکتا۔ یہی حال سلامہ کا ہوا۔ اس کے عشق کی گرمی میں بوالوسی پیدا ہو گئی اور وہ عبدالرحمن کی سچی محبت کی قدر نہ کر سکی۔ پہلی شب جب سلامہ اور عبدالرحمن کے درمیان پردہ ڈالا گیا تھا تو دونوں کا درمیانی فاصلہ پندرہ فٹ سے بھی زیادہ تھا۔ پھر پردہ اٹھ گیا اور سلامہ کی طرف سے یہ فاصلہ کم ہونے لگا۔ عبدالرحمن بڑی استقامت کا ثبوت دے رہے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہ بڑھے تھے۔ مگر سلامہ ہر شب ایک دو انچ آگے بڑھ آتی تھی۔ پھر سلامہ نے اظہار محبت کیا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ۔

عشق اول در دل معشوق پیدا می شود

(عشق پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتا ہے)

عبدالرحمن اس مرحلے پر بھی ثابت قدم رہے اور انہوں نے بڑی سادگی سے سلامہ کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ مگر سلامہ اس خالی جواب پر مطمئن نہ ہو سکی۔ اس نے ایک قدم اور بڑھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی رازدار کنیز سے اس سلسلے میں مشورہ کیا مگر جہاندیدہ کنیز نے اسے منع کر دیا۔

”بی بی! آپ اتنا آگے نہ بڑھئے کہ یہ قوت دوری میں بدل جائے۔“ کنیز نے سمجھایا۔

”مگر میں اس خالی جواب کو کب تک چاہتی رہوں گی۔“ سلامہ نے غصے سے کہا۔

”اس وقت تک صبر کیجئے جب تک حالات کوئی بہتر رخ نہیں بدلتے۔“

کنیز کا مشورہ درست تھا مگر سلامہ کی امدنی جوانی تو جذبات کے سیلاب میں بہہ رہی تھی۔ وہ صبر نہ کر سکی اور کنیز کے منع کرنے کے باوجود ایک قدم اور آگے بڑھی۔ ایک شب جب گانا ختم ہوا اور کمرے میں سوائے عبدالرحمن کے اور کوئی نہ تھا تو سلامہ نے اپنی کنیز کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ کنیز کو یہ بات بری لگی اور اسے خطرہ

بھی محسوس ہوا مگر اسے سلامہ کا حکم ماننا پڑا۔ وہ اٹھ کے برابر کے کمرے میں چلی اور درمیانی کھڑکی سے لگ کے بیٹھ گئی۔ سلامہ دس فٹ سے کھسک کر عبدالرحمن کے چار فٹ کے فاصلے پر پہنچ گئی۔

”عبدالرحمن! آج میرا دل کچھ چاہ رہا ہے؟“ سلامہ بھرے جذبات سے بولی۔
”میرا دل بھی کچھ چاہ رہا ہے۔“ عبدالرحمن نے بڑی معصومیت سے سلامہ کے الفاظ اسے لوٹا دیئے۔

”آپ یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ میرا دل کیا چاہ رہا ہے؟“ سلامہ کے لہجے میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو گئی۔

”تمہیں کہنے سے کس نے روکا ہے؟“ عبدالرحمن کا لہجہ پہلے ہی کی طرح سناں اور پانی کے مانند شفاف تھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ آپ کی ہونٹوں کی شیرینی میرے لبوں میں منتقل ہو جائے۔“ سلامہ یہ کہہ کر عبدالرحمن کے چہرے پر رد عمل دیکھنے لگی۔

عبدالرحمن کا چہرہ ان کی گفتگو کی طرح بے تاثر رہا۔ وہاں کسی جذبے نے اسے نہیں اٹھایا۔ پھر ایک سادہ سا جواب عبدالرحمن کے منہ سے نکلا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں سلامہ!“

اور سلامہ حیران رہ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ خشک زاہد اس سے وضاحت اور تشریح طلب کرے گا مگر اس نے ایک بار پھر اسی کے الفاظ اسے لوٹا دیئے۔ یا اللہ یہ کیسا مرد ہے۔ چکنے گھڑے کی طرح۔ اس پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ پھر شاید سلامہ پر زاہد خشک کی پرہیزگاری کا رعب غالب آ گیا۔ وہ نہ کچھ بول سکی اور اور نہ مزید کوئی پیش قدمی کر سکی۔ اس عالم میں عبدالرحمن جانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ سلامہ کے اعضا کچھ ایسے مضطرب ہو گئے تھے کہ وہ انہیں روک بھی نہ سکی۔ انہیں الوداع بھی نہ کہہ سکی۔ آخر اس کی کنیز نے آکر اسے جھنجھوڑا۔

”آپ نے یہ اچھا نہیں کیا بی بی!“ کنیز نے سسے لہجے میں کہا۔
سلامہ حواس میں آچکی تھی۔ اس نے کنیز کو گھور کے دیکھا۔ ”تم غلط کہہ رہی ہو۔ میں نے جو کیا وہ اچھا ہی کیا۔ مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ان کے جذبے اور میرے

جذبے یکساں ہیں اور ہم دونوں ایک ہی بات سوچتے ہیں۔“
”میری دعا ہے کہ ایسا ہو جائے۔“ کنیز نے دعا دی۔ ”مگر جذبوں کے فرق کو آپ نہیں جانتیں۔ ایک عابد و زاہد اور ایک مغنیہ کی سوچ کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔ میں ان راہوں میں سے گزر چکی ہوں بی بی۔“
”تم آنکھیں بند کر کے گزری ہو بن! میں نے آنکھیں کھول رکھی ہیں۔ منزل میرے سامنے ہے۔ میں انتظار نہیں کر سکتی۔“ سلامہ اٹھ کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی کنیز بڑی حسرت سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

سلامہ کی شہرت میں دن دو گنی اور رات چو گنی ترقی ہو رہی تھی۔ سلامہ اور عبدالرحمن کی محبت کی داستانیں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ لوگوں نے افسانے تراش لئے تھے۔ وہ مزے مزے کی باتیں کرتے مگر کیا مجال کہ کوئی عبدالرحمن کی شان میں ایک لفظ بھی استعمال کرے۔ ان کے خیال میں یہ عشق حقیقی کا کھیل تھا اور عبدالرحمن مجاز کے پردے میں حقیقت کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ سہل زہری خوش تھا کہ اس کی کنیز کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ سلامہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ وہ مسرت سے پھولے نہ ساتی تھی۔ عبدالرحمن اس کی ہر بات کا مثبت میں جواب دیتے تھے۔ سلامہ کی طبیعت میں تمکنت کے ساتھ غرور پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ سہل زہری کی بھی پرواہ نہ کرتی تھی۔ اور انہیں سخت جواب دیتی تھی۔ سہل زہری ہنس کے ٹال جاتا تھا۔ سلامہ ایک ایسی دودھاری گائے تھی جس سے وہ زیادہ سے زیادہ دودھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اور پھر وہ وقت بھی آ گیا کہ سہل زہری کی کنیز سلامہ۔ سلامہ القس کے نام سے ابھر کر سامنے آئی۔ اب وہ راہب اور عابد و زاہد عبدالرحمن کی محبوبہ کلماتی تھی اور اس پر بجا طور پر فخر کرتی تھی مگر شیطان اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا۔ سلامہ کے دل میں جو فاسد خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ اس سے اس کی لونڈی سخت پریشان تھی۔ اس نے عبدالرحمن کی طبیعت کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ عبدالرحمن وہ نہیں ہیں جو ظاہر میں نظر آتے ہیں۔ سلامہ کے پر جوش جذبات پر انہوں نے اپنی سادگی کا مضبوط بند باندھ رکھا تھا۔ اور کنیز کو یہ خطرہ تھا کہ سلامہ نے

اس کی لونڈی دوسرے کمرے سے بھاگ کے آئی اور اس نے سلامہ کو سارا دیا ورنہ وہ سر کر بے ہوش ہو جاتی۔ کچھ دیر بعد سلامہ کے حواس درست ہوئے تو اس نے بڑی حسرت سے کہا۔ ”یہ کیا ہو گیا ہمن! وہ تو میری ہر بات پر یقین کی مر لگاتے تھے۔“

”بی بی! آپ نے عبدالرحمن کو کھو دیا۔ اللہ والے کی محبت کو آپ سمجھ ہی نہ سکیں۔ آپ نے انہیں دعوت گناہ دے کر ہمیشہ کے لئے اپنا راستہ بند کر لیا۔ اب وہ واپس نہ آئیں گے۔ کبھی نہیں آئیں گے۔“ کینز نے اور بہت کچھ کہا مگر سلامہ اس وقت تک بے ہوش ہو چکی تھی۔

دوسرے دن لونڈی نے سہل زہری کو رات کے واقعہ سے آگاہ کیا۔ وہ عبدالرحمن کی پرہیز گاری کا حال سن کر دنگ رہ گیا مگر اسے عبدالرحمن کے جانے کا کوئی افسوس نہ ہوا۔ عبدالرحمن سے اسے جو حاصل کرنا تھا وہ اسے حاصل ہو گیا تھا۔ سلامہ۔ سلامہ القس کے نام سے مشہور ہو کر بام عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کی قیمت بھی اتنی ہی اونچی ہو گئی تھی۔ عبدالرحمن نے پھر کبھی سہل زہری کی حویلی کا رخ نہ کیا۔ وہ حسب سابق اپنی عبادت و ریاضت اور وعظ و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ سلامہ کچھ دن روٹی پٹنی، پھر خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے عقل آئی مگر اس وقت جب وقت آگے نکل چکا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ سلامہ کی طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہوا اور شوخیوں میں پہلی جیسی گرمائش باقی نہ رہی۔

عبدالرحمن کے اس طرح دامن جھٹک کے چلے جانے کا سلامہ کو کتنا ہی ملال ہوا ہو مگر عبدالرحمن کے چند روزہ پاک تقرب نے سلامہ کو سلامہ القس بنا کر اس قدر شہرت دی کہ اسے حسن و جمال اور کمال فن کی آواز دار الخلافہ دمشق کے محلات سے ٹکرائے گئے۔ بنو امیہ کا جواں عمر شہزادہ اور ولی عہد خلافت یزید ثانی بن عبدالملک اس وقت اپنے دیہاتی محل میں ایک عشرت کدہ سجائے ہوئے تھا اور دربار خلافت کے خوشامدی اور ابن الوقت امراء مستقبل کے خلیفہ کی خوشنودی کے لئے عشرت کے تمام لوازمات میا کر رہے تھے۔ اس کے کان میں سلامہ القس کی گائیکی اور خوبصورتی کی آواز پہنچی تو اس کے حصول کے لئے بے چین ہو گیا۔ ایک روایت کے مطابق یزید ثانی بذات خود سہل زہری کے پاس گیا اور سلامہ القس کے لئے منہ مانگی

جس دن بھی اس بند کو توڑنے کی کوشش کی اس دن ایک ایسا سیلاب آئے گا جو کو پتہ نہیں کہاں بہا لے جائے گا۔

آخر سلامہ کی جوانی کے فاسد خیالوں نے ایک شب عبدالرحمن کے باندے پر کاری ضرب لگائی۔ اس رات جب نئے نئے سننے کے بعد عبدالرحمن رخصت ہوئے تو سلامہ کا صبر بھی رخصت ہو گیا۔ لونڈی کو وہ کمرے میں نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ دوسرے کمرے میں بیٹھ کے سلامہ کی باتیں سنتی اور حرکتیں دیکھتی رہتی تھی۔

سلامہ نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں عبدالرحمن کو مخاطب کیا۔ ”آج دل کچھ چاہ رہا ہے۔“

”دل کیا چاہ رہا ہے سلامہ؟“ عبدالرحمن نے سادگی سے پوچھا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے سینے کی دھڑکن سے اس قدر قریب ہو جاؤ کہ میرے سینے کی دھڑکن اس میں شامل ہو جائے۔“

عبدالرحمن کے چہرے پر کوئی کیفیت پیدا ہوئی اور نہ کسی طرح کا تاثر ابھرا۔ بڑی ہی سادگی سے بولے۔ ”سلامہ! میرا دل بھی یہی چاہ رہا ہے۔“

سلامہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ اس نے عالم مستی میں کہا۔ ”عبدالرحمن! میں کس قدر خوش نصیب ہوں۔ میرے دل کی صدا تمہارے دل نے سن لی۔ یہ؟ ہوئی چاندنی اور یہ مترنم فضاں بھی یہی چاہتی ہیں۔ جذبات بے چین ہیں اور ار دہائی دے رہے ہیں۔ وقت نے موقع دیا ہے۔ تمہیں کوئی چیز مانع نہیں۔ کون رو سکتا ہے تمہیں۔“

مجتہد، متقی، عابد و پرہیز گار عبدالرحمن القس نے پہلی بار سلامہ کو ایسی نظر سے دیکھا کہ وہ کانپ اٹھی۔

”سلامہ! تمہاری بینائی زائل ہو گئی ہے اور تمہارے کان بند ہیں۔ مجھے آواز مانع ہے۔ ایک آواز روکتی ہے۔ اور وہ چیز اور وہ آواز ارشاد خداوندی ہے۔“

حضرت عبدالرحمن نے کلام اللہ کی ایک آیت پڑھی اور وضاحت کرتے ہوئے کہ ”اور مجھے گوارہ نہیں کہ ہماری باہمی محبت کبھی دشمنی میں تبدیل ہو جائے۔“

عبدالرحمن نے یہ کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔ سلامہ ہکا بکا رہ گئی

(مسودی)

بزرگ پر عمر بن عبدالعزیز نے ولی عہد شہزادے یزید ثانی بن عبدالملک کو بلایا۔ بنو امیہ کے سابق خلیفہ سلمان بن عبدالملک نے اپنی وصیت میں لکھا تھا کہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد خلافت یزید ثانی کو دی جائے۔ اس لئے عمر بن عبدالعزیز اکثر یزید ثانی کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ مرتے وقت بھی انہوں نے یزید ثانی کو خدا یاد دلایا اور اپنے اعمال کو درست کرنے کی نصیحت فرمائی۔ یزید ثانی نے دل سے یا بے دلی سے اپنے گناہوں کی توبہ بھی کی مگر عمر بن عبدالعزیز کی آنکھ بند ہوتے ہی یزید ثانی نے رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ اور کچھ ہی دنوں بعد بنی امیہ کا پچھلا دور پھر واپس آ گیا۔

مشہور ہے کہ یزید ثانی بن عبدالملک نے خلیفہ ہونے پر عمر بن عبدالعزیز کا چالیس روز تک سوگ منانے کا حکم دیا تھا اور خود دنیا کے تمام کاموں کو چھوڑ کے ایوان خلافت کے ایک کونے میں گوشہ نشین ہو گیا تھا مگر بنی امیہ کے امراء اور یزید ثانی کی شہزادگی کے زمانے کے حواریوں کو اس کا یہ انداز کس طرح پسند آ سکتا تھا۔ چنانچہ اسے گوشے سے نکالنے کے لئے توڑ جوڑ شروع ہو گئے۔ حواریوں کو علم تھا کہ یزید ثانی حجاز کی مغنیہ سلامہ القس پر فریقہ ہے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش بھی کر چکا ہے۔ بس انہوں نے فوراً "حاکم حجاز سے رابطہ قائم کیا اور سہل زہری نے تین ہزار اشرفیوں میں سلامہ القس کو حاکم حجاز کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ سہل زہری نے اسی دن کے لئے سلامہ کی پرورش کی تھی۔ سلامہ بھی عبدالرحمن قس کو کھونے کے بعد اپنے غم کا مداوہ چاہتی تھی۔ اس نے کوئی احتجاج نہ کیا۔ وہ احتجاج کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی حیثیت ایک خوبصورت کنیر سے زیادہ نہ تھی۔

سلامہ القس کو بڑے اہتمام کے ساتھ دار الخلافہ دمشق پھر ایوان خلافت میں پہنچایا گیا۔ سلامہ کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ اپنی عشوہ طرازیوں اور نفوس کے زور سے خلیفہ کو ایوان کے کونے سے نکال کر دربار میں لے آئے۔ سلامہ کسی ایسے ہی دن کی فتنہ تھی۔ وہ منزل جس کی خواہش کبھی اس کے دل میں جاگی تھی وہ منزل اس کی نظروں کے سامنے تھی۔ اب یہ اس کی اہلیت تھی کہ وہ منزل تک کس طرح پہنچتی ہے۔ ایوان خلافت میں پہنچتے ہی سلامہ نے اپنی کوششیں شروع کر دیں۔ اسے ایوان

رقم ادا کرنے کی پیش کش کی۔ مگر سہل زہری موجودہ خلیفہ کی سخت گیر طبیعت اور اچھی طرح واقف تھا۔ اس پر خلیفہ کا خوف غالب آ گیا اور اس نے سلامہ القس کی ولی عہد خلافت کے ہاتھ فروخت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

پھر ماہ رجب ۱۱۱ ہجری (جنوری ۷۳۰ عیسوی) میں اسلام کا وہ خلیفہ اس دنیا سے اٹھ گیا جنہیں سفیان ثوری نے خلافت راشدہ کا پانچواں خلیفہ تسلیم کیا۔ یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے۔ آپ اموی خلیفہ مروان بن حکم کے پوتے تھے۔ اور آپ کی والدہ ام عاصم کو حضرت فاروق کی پوتی ہونے کا فخر حاصل تھا۔ عمر بن عبدالعزیز نے مرزا دو سال کے مختصر عرصے میں اموی خلافت کو خلافت راشدہ میں ڈھال کے رکھ دیا۔ ان کی اصلاحات اموی امیروں کو ناگوار گزریں۔ وہ خلافت کے بجائے بادشاہت کے عادی ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کے ملازم خاص کو ایک معقل رقم دے کر آپ کو زہر دلا دیا۔ اور آپ بیس دن تک زہر کی ہلاکت خیزیوں سے بے آزار ہو کر انتقال کر گئے۔

آپ کی بیماری کے دوران ہی یہ راز کھل گیا۔ غلام گرفتار ہو کر آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ اقبال جرم کر کے رونے لگا مگر اللہ اللہ کیا شان تھی اس مجاہد کی۔ غلام سے انتقام لینے یا سزا دینے کے بجائے اس سے اس رقم کے بارے میں دریافت فرمایا جو اس خوفناک جرم کے لئے امیروں نے اسے ادا کی تھی۔ غلام نے رپائی اور یہ بھی کہا کہ تمام رقم اب تک محفوظ ہے۔ آپ نے حکم دیا کہ غلام سے حاصل کر کے بیت المال میں داخل کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے غلام کو نہ صرف معاف کیا بلکہ آزاد بھی کر دیا۔

یہی وہ عمر بن عبدالعزیز ہیں جن کی وفات کی خبر جب عیسائی شہنشاہ روم کے دربار میں پہنچی تو اس نے گلو گیر آواز میں اپنے درباریوں سے کہا۔

"اگر عیسیٰ مسیح کے بعد کوئی شخص مردوں کو زندہ کر سکتا تو وہ عمر بن عبدالعزیز ہوتے۔ میں اس راہب کو پسند نہیں کرتا جو دنیا سے قطع تعلق کر کے عبادت خانے میں جا بیٹھے بلکہ میں اس راہب پر تعجب کرتا ہوں جو دنیا کو اپنے قدموں کے نیچے رکھتا تھا اور پھر بھی راہبانہ زندگی بسر کرتا تھا۔"

معرکہ چنی گوٹ

خلافت کی ایک اور پری جہاں کنیز ”حبابہ“ کا تعاون حاصل ہو گیا۔ وہ اگرچہ رقیب تھی مگر دونوں کا مفاد مشترک تھا۔ اس لئے دونوں گہری سیلیاں بن گئیں۔ کتے ہیں سوگ کے ان چالیس دن کے اندر ایک جمعہ کو خلیفہ یزیدؓ عبدالملک گھوڑے پر سوار ہو کے ایوان خلافت سے نماز کے لئے برآمد ہوا اور شدہ منصوبے کے مطابق سلامہ اور حبابہ نے اس کا راستہ روک لیا۔ دونوں شعلہ جوالہ اور فتنہ محشر بنی ہوئی تھیں۔ خوبصورت لباس میں جب دو خوبصورت منہلے خلیفہ کے سامنے نمودار ہوئیں تو اس کی توبہ پہلی ہی نظر میں ٹوٹ گئی مگر اس نے خود کو سنبھالے رکھا مگر سلامہ اور حبابہ اسے کب سنبھلنے کا موقعہ دیتی سلامہ نے دف کی گونج پر بہار کا نغمہ چھیڑا اور حبابہ نے کمر لپکا کر توڑا دیا تو قیام ہو گئی۔ خلیفہ اور اس کے ساتھیوں کی نظریں خیرہ ہو گئیں۔ خلیفہ گھوڑا روک ہو گیا اور سر راہے بزم عشرت جم گئی۔ سلامہ اور حبابہ نے اپنے فن کے تمام تر پر چلا دیئے۔ اور وہ مست و بے خود ہو گیا پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ خلیفہ گہ سے اتر پڑا۔ اس نے سلامہ اور حبابہ کے ہاتھ پکڑے اور مسجد سے منہ موڑ کے خلافت میں واپس چلا گیا۔

یزید ثانی بن عبدالملک بہت جلد دق اور سل کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ صرف چار سال بعد مر گیا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی سلامہ کا نام تاریخ کے سے مٹ گیا۔



ساجزادہ مبارک خان قتل کر دیا گیا۔ ریاست بہاول پور کا یہ امیر بڑا ہر و لعزز اور بجا تھا۔ سخی ایسا کہ کھڑے کھڑے ہزاروں لٹا دیتا۔ اس کی یہ سخاوت اور شہرت ہی سے لے ڈوبی۔ درباری خوشامدیوں نے نواب بہاول پور سے لگائی بجھائی شروع کر دی۔ نواب صادق محمد خاں ثانی اس وقت والی ریاست یا مطلق العنان بادشاہ تھے۔ نص درباریوں کا گزراہ اسی پر ہوتا ہے کہ نواب وقت کو الٹی سیدھی باتوں میں الجھا کر پناہ مطلب نکالیں۔

نواب کے کان میں پھونکا گیا۔ ”جہاں پناہ! ساجزادہ مبارک خاں کے تیور اچھے ہیں۔ وہ بغاوت پر آمادہ نظر آتے ہیں۔“

نواب نے کان کھڑے کئے۔ والیان ریاست ”بغاوت“ کا نام سن کر بھڑک اٹھے۔ خواہ یہ الزام ان کی اولاد پر ہی لگایا گیا ہو۔ نواب نے راز داری سے پوچھا۔ ”یا اس خبر کی تصدیق کر لی گئی ہے؟“

”عالی جاہ!“ دوسرے درباری نے کہا۔ ”میں حضور عالی بغیر تصدیق کئے ہوئے

”یہ تفصیل اپنے پاس رکھو۔ ہمیں نام چاہئیں؟“ نواب کا مزاج تلخ ہو گیا۔
”سرکار پہلا نام تو محمد علی خان ہے۔“ درباری نے نواب کا مزاج بگڑتے دیکھ کر

جلدی سے کہا۔

”یہ کون ہے؟ اس کا نام ہم نے پہلے نہیں سنا۔“ نواب نے ذہن پر زور دیا مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔

”خداوند نعمت! یہ ڈیر اور کے جنوبی حصے کا ایک بڑا زمیندار ہے۔“
”جنم میں جھوٹو اسے اور نام بتاؤ۔“ نواب کے مزاج میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو

گئی۔

”اور سرکار ایک علی محمد خان ہے۔ ترمذہ کا بلوچ سردار۔“
”محمد علی خان، علی محمد خان۔“ نواب چیخ پڑا۔ ”یہ دو دو کوڑی کے لوگ مبارک
خان کی کیا مدد کریں گے اور ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟“

محمد علی خان اور علی محمد خان دراصل وزیراعظم بہاول پور کے حلقہ اثر کے لوگ
تھے۔ درباریوں نے سازش وزیراعظم کے خلاف کی تھی۔ اور چاہتے تھے کہ وزیراعظم
سے اپنے احباب کے سازش میں ملوث ہو جائے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ نواب پر
ان چھوٹے لوگوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو انہوں نے براہ راست وزیراعظم کے کردار پر
غلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

”سرکار!“ چھ درباریوں میں سے ایک بولا جو اس خطرناک گردہ کا سرغنہ تھا۔
”جھوٹا منہ بڑی بات کہتے ہوئے شرم بھی آتی ہے اور خوف بھی مگر کہنا پڑتا ہے۔“
”بات کو طول مت دو۔ جو کہنا ہے بے خوف و خطر کہو۔“ نواب کا غصہ بڑھتا
بارہا تھا۔

”عالی جاہ! دراصل ہمارے وزیراعظم امیرالامرا محمد نصیر خان ———“
وزیراعظم کا نام سنتے ہی نواب صادق محمد خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔
”مردود تو کیا بک رہا ہے۔ تجھے یہ ہمت کیسے ہوئی کہ ہمارے وزیراعظم کا نام اپنی زبان
بالے۔ ان کی وفاداری اور تابعداری سے کیا تو واقف نہیں محمد نصیر خان اور اس
کے بلوچ جوان تو بہاول پور کی ناک ہیں۔ کیوں نہ اس گستاخی پر تیری زبان کھینچ لی

کوئی بات منہ سے نکالنا سب سے بڑا گناہ ہے۔ صاحبزادہ کی شہرت اور ستارہ
انہیں بے لگام کر دیا ہے۔“

”کون کون سے امیران کے ساتھ ہیں؟“ نواب کا دماغ گھومنے لگا۔
”سرکار! اس کا تو ابھی پتہ نہیں لگا۔ حضور کا حکم ہو تو ان کے نام معلوم
جائیں۔“ درباری نے مکاری سے کہا۔

”بہت جلد معلومات حاصل کر کے پوری سازش ہمارے سامنے پیش
جائے۔“ نواب نے حکم دیا۔

سازش کیا تھی بس خواہ مخواہ کا شوشہ تھا۔ انہی لوگوں نے بات کا بیٹگو بنایا
حکم شاہی پا کر وہ اٹھے اور مجرا کرتے ہوئے واپس ہوئے۔

”دیکھو!“ نواب نے انہیں روکا۔ وہ جہاں کے تہاں کھڑے ہو گئے۔ ”بہنا
کوئی معمولی جرم نہیں۔ مبارک خان کو ضرور بڑے بڑے امیروں کا تعاون حاصل
گا۔ ایک ایک نام ہمیں معلوم ہونا چاہئے۔ خواہ وہ کسی مرتبے کے بھی امیر ہوں۔“
خوشامدی اور زیادہ خوش ہوئے۔ وہ تو چاہتے ہی یہی تھے کہ اپنے تمام مخالفین
کسی معاملے میں الجھا دیں۔ وہ تو چلے گئے اور نواب صاحب کو پچھلے لگ گئے۔ مہا
خان کے وہ پہلے بھی کچھ مخالف تھے اور اسی بنیاد پر بدخواہوں نے یہ شوشہ چھوڑا
دو دن تک یہ لوگ دربار میں نہ آئے تو تیسرے دن نواب نے انہیں گھر سے بلو
انہیں معلومات کیا حاصل کرنا تھیں۔ دراصل وہ گھر میں گھسے اپنے مخالفین کی فہر
تیار کر رہے تھے۔

پہلے دن دو درباریوں نے بات چھیڑی تھی مگر جب نواب نے انہیں بلوایا تو
کی تعداد چھ ہو گئی۔ نواب نے سب کو خلوت میں بلوایا۔ سب نے سلام پیش کیا
سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

نواب کا چہرہ فکر مندی سے مرجھایا ہوا تھا۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔
”کامیابی ہوئی۔ نام معلوم کیے؟“

”سرکار کا اقبال بلند ہو۔“ ان میں سے ایک بولا۔ ”کچھ امیروں کے نام
ہو گئے ہیں۔ باقی کے ناموں کا پتہ بھی بہت جلد لگ جائے گا۔“

جائے؟“

درباری بوکھلا گیا۔ اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ اس کا خیال وزیراعظم کا نام سن کر نواب گھبرا جائے گا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا۔ ام ساتھی بھی تھر تھر کانپنے لگے۔ مگر درباری بڑا ذہین تھا۔ سازشیوں کا دماغ وقت کام دیتا ہے۔ اس نے فوراً پلٹا کھایا۔

”سرکار وزیراعظم پر میرے بچے قربان ہو جائیں۔“ اس نے بڑے ادب عاجزی سے کہا۔ ”امیر الامراء جیسا فرشتہ صفت انسان آج تک میری نظر سے گزرا۔ لوگ اس کی اعلیٰ طرفی کی قسم کھاتے ہیں۔ نہایت جماندیدہ، خوش کردار، گفتار، حکومت کا وفادار، رعیت کا ہمدرد، دل کا سخی، تلوار کا دھنی، عقل و دانہ کے قدموں میں لوٹتی ہے۔“

”تو بھی عجیب آدمی ہے؟“ نواب نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”ابھی ا برائی کر رہا تھا اب تعریفوں کے پل باندھ رہا ہے۔ تیری عقل بھی ٹھکانے ہے؟“

”عالی جاہ! یہ غلام سیدھا سادا اور بے عقل انسان ہے۔“ درباری نے سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اعلیٰ حضرت کے حضور بڑے بڑے چوکری بھول جاتے ہیں میری کیا حقیقت۔ میری کیا مجال کہ امیر الامراء کے بارے میں کوئی لفظ بد اپنی ن لاؤں۔ میں محمد نصیر خان کے حوالے سے ان کے بھائی کا ذکر کر رہا تھا۔“

”کون بھائی۔ تو بات کو اس قدر طول کیوں دے رہا ہے؟“ نواب کی سخت مکدر ہو گئی۔

”عالی جاہ! خان عثمان خان کو کون نہیں جانتا۔“ درباری کو اپنی جان بچتی آئی تو بے خوف ہو گیا۔ ”کہنے کو وہ امیر الامراء وزیراعظم بہاول پور کا چچا زاد بھائی مگر دونوں کے مزاجوں میں کس قدر فرق ہے۔ ایک فرشتہ، دوسرا شیطان۔ اب تلوار سلطنت کے سپر بنی ہے اور دوسرے کی تلوار سلطنت کی تیغ کشی پر آمادہ حضور والا نے اسے عزت اور شہرت عطا کی ہے مگر وہ روزی کی تھالی میں چھید ہے۔“

نواب کو فکر پڑ گئی۔ اسے عثمان پر بڑا اعتماد تھا۔ ایک تو وہ بڑا جی دار سرد

دوسرے وزیراعظم کا بھائی ہونے کی وجہ سے اس کا دوسرے امراء میں اثر اور وقار تھا۔ ایسے سردار کا باغی ہونا سلطنت کے لئے بڑا خطرناک تھا۔ نواب نے بغیر کسی تحقیق کے درباری کی زبان پر یقین کر لیا اور عثمان خان کے اعتماد کا محل ریت کی پیاروں کی طرح دم کے دم میں زمین پر آ رہا۔

ان بد بختوں کو نواب نے رخصت کیا اور اسی وقت عثمان خان کو تنگلے میں لے گیا۔ عثمان خان ہانپتا کانپتا حاضر ہوا۔ سلام پیش کیا مگر سخت پریشان تھا۔ نواب بغیر کسی اہم کام کے کسی امیر یا سردار کو طلب نہ کرتا تھا۔

”عثمان خان! تم ہمارے وفادار ہو؟“ نواب کے لہجے میں غصہ جھلک رہا تھا۔

عثمان خان نے سنبھل کے جواب دیا۔ ”عثمان خان عالی جاہ کا وفادار ہے اور ان کے آخری قطرے تک وفادار رہے گا۔“

”اور تمہاری تلوار کس کی وفادار ہے؟“

عثمان خان کو نواب کا یہ سوال عجیب سا لگا۔ ”عثمان خان کی تلوار اپنی وفاداری کے اظہار کے لئے ہر وقت نیام میں بے چین رہتی ہے عالی جاہ!“

”صاحبزادہ مبارک خان کو جانتے ہو؟“

”کیوں نہیں عالم پناہ!“ عثمان خان نے بے جھجک کہا۔ ”والا شاہی کے بعد لوگوں نے زبان پر صاحبزادہ مبارک کا نام آتا ہے۔“

”ہم چاہتے ہیں کہ یہ نام ہمارے نام سے الگ ہو جائے۔“ عثمان خان کے دل ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے بڑی حیرت سے نواب کو دیکھا۔

”تم حیران کیوں ہو رہے ہو عثمان خان؟“ نواب کے چہرے پر تلخ مسکراہٹ پیل گئی۔

”حیرانی کی بات ہے عالی جاہ۔“ عثمان خان کی زبان سے ایک دم نکل گیا۔

”کیا ہم یہ سمجھیں کہ ایک بلوچ سردار کی تلوار حکم شاہی کی تعمیل سے معذور ہے؟“ نواب نے چٹکی ہی نہیں لی بلکہ گوشت تک اتار لیا۔

”میری تلوار مزاج شاہی کی تابع ہے جہاں پناہ!“ عثمان خان سینہ تان کر بولا۔

”مگر تو اس تلوار سے میں اپنے بیٹے اکرم خان کی گردن بھی الگ کر سکتا ہوں۔“

”بس ہمیں یہی کہنا تھا۔ تم جا سکتے ہو۔“

”عثمان خان حضور کی نظروں میں سرخرو ہو گا عالی جاہ!“ عثمان خان سلام واپس ہوا۔

نواب بہاول پور نے صاحبزادہ مبارک خان کے قتل کا اشارہ ہی نہیں کیا۔ عثمان خان کو بڑی سختی سے اس کام کے انجام دینے کا حکم دیا تھا۔ عثمان خان، نواب طبعیت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے صاحبزادہ مبارک خان کے قتل ذرا بھی تاخیر کی تو خود اس کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ محل سے نکل کر وہ مبارک خان کی حویلی پہنچا۔ وہاں معلوم ہوا کہ صاحبزادہ ابھی ابھی سوار ہو کر قتل نکلا ہے۔ عثمان خان نے اپنا گھوڑا بازار کی طرف موڑ دیا۔

عثمان خان بھرے بازار میں بے تحاشہ گھوڑا بھگا رہا تھا۔ بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ آدمی گھوڑے سے ٹکرا کر زخمی ہو گئے۔ عثمان خان کو تقریباً ”سب لوگ ہاتھ“ ان کے خیال میں عثمان خان ایک بردبار اور بہادر سردار تھا مگر اس وقت جس انداز سے بازار میں گھوڑا بھگا رہا تھا اس سے لوگوں کو گمان ہوا کہ شاید وہ خان پاگل ہو گیا ہے۔

بازار کے بڑے چوراہے پر عثمان خان اور صاحبزادہ مبارک خان کا سامنا ہو گیا۔ عثمان خان نے تلوار کھینچتے ہوئے کہا۔ ”مبارک خان تلوار نکال لو تاکہ لوگ نہ کہہ سکیں کہ میں نے تمہیں غفلت میں قتل کیا ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو عثمان خان؟“ صاحبزادے نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم میری جان کے در پے ہو۔ میں تمہیں اپنا دوست ہوں۔“

”تم نے نہ تو میرا کوئی نقصان کیا ہے اور نہ میرے دشمن ہو۔“ عثمان خان جی کڑا کر کے کہا۔ ”مگر یہ ملکی مصلحت ہے، میں حکم حاکم بجالانے پر مجبور ہوں۔“

”عثمان خان!“ صاحبزادہ گھبرا گیا۔ تمہارا مطلب ہے کہ میرے قتل کا حکم نواب ———

”بس یہی سمجھ لو مگر دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً“ تلوار بلند کر دیا۔

سے مقابلہ کرو۔“ عثمان خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

”عثمان خان! اگر ایسا ہے تو مجھے نواب سے گفتگو کرنے کا وقت دو۔“ صاحبزادہ نے محل سے کہا۔ ”ممکن ہے کہ میں انہیں مطمئن کر سکوں۔ اور تم ایک بے گناہ کے قتل کے الزام سے محفوظ ہو جاؤ۔“

”صاحبزادہ!“ عثمان خان چیخ کر بولا۔ ”میرے پاس ایک لمحے کا بھی وقت نہیں۔ منہلو، میں حملہ کر رہا ہوں۔ تمہیں قسم ہے کہ مجھے مارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھنا۔“

صاحبزادہ کو مجبوراً ”مقابلہ کرنا پڑا۔ اگر وہ عثمان خان کا بھرپور وار نہ روکتا تو پہلے ہی حملے میں ختم ہو گیا تھا۔ بازار کے تمام لوگ سمٹ کر چوراہے پر آ گئے اور سہمی سہمی نظروں سے اس بے وقت کے مقابلے کو دیکھنے لگے۔ صاحبزادہ مبارک خان بھی ایک اچھا تلوار باز تھا مگر عثمان خان سے اس کا کیا مقابلہ۔ عثمان خان وہ بلوچ سردار تھا جس کی تلوار کی دھاک لوگوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔

یہ مقابلہ بہت مختصر تھا۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں عثمان خان نے نازوں کے پلے صاحبزادہ مبارک خان کو تھکا دیا۔ پھر ایک ایسا وار کیا کہ مبارک خان کی گردن کٹ کر زمین پر جاگری اور بدن زین سے لٹک گیا۔ عثمان خان نے خون آلود تلوار نیام میں ڈالی اور گھوڑا موڑ کر واپس ہوا۔ یہ سب اس قدر مختصر وقت میں ہوا کہ لوگ کچھ سمجھ ہی نہ سکے۔ ان پر ایک عجیب طرح کا سحر سا طاری ہو گیا پھر ان کا یہ سحر اس وقت ٹوٹا جب عثمان خان گھوڑا بھگاتا بازار سے نکل گیا۔ پورے بازار، محلے اور ٹر میں کھرام مچ گیا۔ بوڑھوں کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ بچوں اور عورتوں نے رونا شروع کر دیا اور گرم خون نوجوانوں کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

”قصاص ——— قصاص“ ایک نوجوان چیخا۔

”عثمان خان سے بدلہ لیں گے۔“ دوسرے نے کہا۔

”یہ قتل نواب بہاول پور کے حکم سے ہوا ہے۔“

”عثمان خان وزیر اعظم کا بھائی ہے۔“

”عثمان خان، نواب کا پروردہ ہے۔“

”محل چلو، ابھی اس کا فیصلہ ہو گا۔“

ہو عثمان خان کے گھر گیا مگر عثمان خان شاہی محل سے اپنے گھر واپس آنے کی بجائے مبارک خان کو ڈھونڈنے نکل گیا تھا۔ نصیر خان نے اس کے لئے پیغام چھوڑا کہ عثمان خان واپس آتے ہی فوراً اس سے ملاقات کرے مگر اس دوران میں صاحبزادہ مبارک خان، عثمان خان کے ہاتھوں بیچ بازار قتل ہو گیا۔

مبارک خان کے قتل کی خبر بجلی بن کر وزیراعظم پر گری۔ وہ اسی وقت شاہی محل پہنچا۔ شاہی محل کے سامنے ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ مبارک خان کی لاش ان کے درمیان رکھی تھی اور ہر طرف قصاص، قصاص کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ وزیراعظم کا سر گھونٹنے لگا۔ بلوائیوں نے اسے گھیر لیا۔

”یہ عثمان خان کا بھائی ہے۔ اصل قاتل یہی ہے۔“ کسی طرف سے آواز آئی۔

”قتل کا حکم نواب نے دیا ہے۔ محل میں آگ لگا دو۔“ کوئی دوسرا چیخا۔

وزیراعظم نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھوڑا بڑھایا۔ لوگ وزیراعظم سے اتنے مرعوب تھے کہ انہوں نے راستہ دے دیا۔ وزیراعظم میڑھیوں کے پاس گھوڑا چھوڑ کر محل میں چلا گیا۔ والی بہاول پور نواب صادق محمد خان بڑے ہال میں کھڑا بیٹھا رہا تھا۔ تمام عمائدین سلطنت دم بخود کھڑے تھے۔

وزیراعظم کو دیکھتے ہی نواب دھاڑا۔ ”محمد نصیر خان! آپ وزیراعظم ہیں، امیر الامراء ہیں۔ آپ کی وزارت میں دن دہاڑے قتل ہو رہے ہیں۔ بھرے بازار میں گردنیں اتاری جا رہی ہیں اور آپ کانوں میں تیل ڈالے گھر میں بیٹھے ہیں؟“

”عالی جاہ۔۔۔ میں۔۔۔“

ہم کچھ سننا نہیں چاہتے۔ نواب نے اسے روک دیا۔ ”ہماری پیاری رعایا ہم سے باغی ہو رہی ہے۔ ہم پر صاحبزادہ مبارک خان کے قتل کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ لوگ قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“

وزیراعظم کو نواب کے ان مگرچھ کے آنسوؤں پر بڑا غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ کے کہے کہ یہ قتل تو سیاسی قتل ہے۔ اور اس کا حکم آپ نے دیا تھا۔ مگر مصلحت نے اس کی زبان روک دی۔ وہ نواب کا نوکر تھا۔ اور بلوچوں کی ایک کثیر تعداد ریاست میں موجود تھی۔ اس کی ذرا سی غلطی یا جلد بازی سے سب کی گردنیں پھانسی

بھرے ہوئے شہریوں نے مبارک خان کی لاش زین سے نکالی۔ گردن زمین اٹھائی اور ان دونوں کو ایک چارپائی پر رکھ کر نعرے لگاتے جلوس کی صورت میں محل کی طرف چلے۔

☆☆☆

امیر الامراء محمد نصیر خان گورگچ ریاست بہاولپور کا وزیراعظم تھا۔ بڑا مدبر، اور انصاف پسند۔ بڑے چھوٹے، امیر غریب سب اس کے مداح تھے۔ اور خوف کھاتے تھے۔ ریاست کا سپہ سالار فتح محمد خان غوری تھا۔ وزیراعظم اور سپہ سالار دونوں ہی گورگچ قبیلے کے بلوچ تھے۔ ان دونوں کے حسن انتظام نے ریاست کے گمراہ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ چوں کر سکے یا حکومت کے معاملات میں دخل دے سکے۔ ان دونوں کی روش سے درباری، خوشامدی، رشوت خور بہت پریشان تھے۔ اور ہر وقت اس ناک میں رہتے تھے کہ کوئی موقع آئے اور وہ ان مضبوط ستونوں کو ڈھادیں۔

وزیراعظم کے خلاف آئے دن سازشیں ہوتیں مگر پروان نہ چڑھ پاتی تھیں۔ لیکن اس دفعہ صاحبزادہ مبارک خان کے قتل نے وزیراعظم کے مضبوط ستون کو ہلا رکھ دیا۔ عثمان خان وزیراعظم کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کے ہاتھ سے ایک عالی نہ شہزادے کا قتل وزیراعظم کے دامن پر ایک بدنما داغ بن کر ابھرا۔ وزیراعظم محمد خان کو نواب کے حکم اور عثمان خان کے ارادے کی خبر تو ہو گئی لیکن اس میں قدر تاخیر ہوئی تھی کہ معاملہ نصیر خان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

شاہی محافظ دستے میں ایک بلوچ جوان تھا۔ جس وقت نواب نے عثمان خان صاحبزادہ مبارک خان کے قتل کا حکم دیا۔ وہ جوان محل کے دروازے پر پہرہ دے تھا۔ عثمان خان کے محل سے واپس جاتے ہی پورے محل میں یہ بات پھیل گئی۔ عثمان خان کو مبارک خان کے قتل کا حکم دیا گیا ہے۔

وزیراعظم اس گھڑی اپنی حویلی میں تھا۔ بلوچ جوان اپنی ڈیوٹی ختم کرتے ہی اس کے پاس پہنچا اور اسے پورے حالات سے آگاہ کر دیا۔ وزیراعظم نصیر خان فوراً

کے پھندے میں الجھ سکتی تھیں۔

وزیراعظم بڑے تحمل سے بولا۔ ”غلام اپنی غفلت پر نادم ہے۔“ اس نے الزام اپنے سر لے لیا۔

”صرف ندامت سے کام نہیں چلے گا، وزیراعظم!“ نواب پیر شیخ کر۔

”پھرے ہوئے عوام کو کس طرح مطمئن کیا جائے؟“

”جہاں پناہ! اگر عوام میرے خون سے اپنا غصہ ٹھنڈا کر سکیں تو مجھے ان حوالے کر دیا جائے۔“ وزیراعظم نے اپنی اعلیٰ طرفی کا ثبوت پیش کر دیا۔

نواب نے ایک لمحے کے لئے وزیراعظم کو حیرت سے دیکھا۔ ”نہیں وزیراعظم! ہم نہیں چاہتے کہ آپ عوام کے ہاتھوں مارے جائیں۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ عثمان خان کا ذاتی فعل ہے۔“

وزیراعظم نے خدا کا شکر ادا کیا ورنہ نواب سب کے سامنے اس پر الزام اسے بدنام کر سکتا تھا۔ وزیراعظم متانت سے بولا۔

”عالم پناہ! عوام پھر کس طرح مطمئن ہو سکتے ہیں؟“

”امیر الامراء! آپ قاتل کے بھائی ہیں اور عوام قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“ نواب نے رک کر تمام امیروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ”ہم چاہتے ہیں عثمان خان کو آپ زندہ یا مردہ ہمارے سامنے پیش کریں۔ ہم عثمان خان کو اسی مت پھانسی پر لٹکائیں گے جہاں اس نے بے گناہ مبارک خان کو قتل کیا ہے۔“ نواب ایک بار پھر امیروں کو دیکھا۔

”غل اللہ کی رائے نہایت مناسب ہے۔“ ایک امیر نے تائید کی۔ ”عثمان کو اگر امیر الامراء نے گرفتار کر کے پیش کر دیا تو وہ قتل میں معاونت کے الزام بچ جائیں گے اور جب عثمان خان پھانسی پر چڑھایا جائے گا تو عوام حضور کے انہ کی تعریف کریں گے۔“

”میرے لئے کیا حکم ہے عالی جاہ؟“ گھبراہٹ میں وزیراعظم کے منہ سے گیا۔ حالانکہ اسے عثمان خان کی گرفتاری کا حکم پہلے دیا جا چکا تھا۔

”امیر الامراء آپ اس قدر بدحواس کیوں ہو رہے ہیں؟“ نواب نے منہ بنا

کہا۔ ”لوگوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے عثمان خان کی گرفتاری اور پھانسی ضروری ہے اور عثمان خان کو صرف آپ گرفتار کر سکتے ہیں۔“

”تجلیل حکم کی اجازت دی جائے عالی جاہ!“ وزیراعظم نے قدرے خم ہو کر کہا۔ ”عثمان خان اگر ہاتھ میں بھی چلا گیا تو میں اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ وہ حضور کے سامنے ضرور پیش ہو گا۔“

عثمان خان اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھا تھا۔ صاحبزادہ مبارک خان کو قتل کرنے کے بعد وہ نواب بہادر پور کے پاس گیا تھا اور اپنی کارگزاری بیان کر کے سرخروئی حاصل کی تھی۔ نواب نے اسے شاباش دی تھی۔ اور اسے اطمینان دلایا تھا کہ اس سے کوئی باز پرس نہ ہو گی۔ اس اطمینان کے ساتھ عثمان خان کو یہ بھی امید تھی کہ اس کا بھائی ریاست کا وزیراعظم ہے۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ اس نے یہ کام نواب کے حکم سے کیا ہے تو وہ بھی اس کا ساتھ دے گا۔

عثمان خان کے اندازے اپنی جگہ درست تھے مگر حالات نے اچانک ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔ عوام کو معلوم ہو گیا کہ صاحبزادہ نواب کے حکم سے قتل کیا گیا ہے اس لئے وہ بھڑک اٹھے اور اس خون ناحق کے قصاص کے علاوہ انہوں نے علی الاعلان نواب پر بھی قتل کا الزام دھر دیا۔ نواب کو شاید اس صورت حال کا خیال نہ تھا کیونکہ ریاستوں اور رجواڑوں میں اس قسم کے قتل ایک عام بات تھی۔ جن کے بارے میں عوام زبان کھولنے کی ہمت نہ کرتے تھے۔ جب پھرے ہوئے عوام شاہی محل پہنچ گئے تو وہ بہت پریشان ہوا اور اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ عثمان خان کو قصاص میں قتل کرا کے اس بھڑکتی ہوئی آگ سے اپنا دامن بچائے۔

امیر الامراء محمد نصیر خان شاہی دربار سے سیدھا عثمان خان کے گھر پہنچا۔ عثمان خان نے مسکرا کر برادر بزرگ کا استقبال کیا مگر جب اس کی نظر وزیراعظم کے چہرے پر پڑی تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وزیراعظم کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

”نواب کے حکم کی تعمیل ہو گئی؟“ وزیراعظم نے زہر خند کیا۔

”جی ہاں بھائی جان! میں نے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر دیا۔“ عثمان خان نے ذرا سنبھل کر کہا۔

سراٹھا کر حوصلے سے کہا۔ ”بھائی جان! میں نے صاحبزادہ کو قتل کیا ہے۔ مجھے اس کی سزا ملنی ہی چاہئے۔ مگر میرے دل میں ایک ارمان، ایک خواہش ہے، اگر آپ اسے قبول فرمائیں۔“

”عثمان خان! سوائے تمہاری جان بخشی کے، ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ مگر نصیر خان تم سے وعدہ کرتا ہے۔ جلد بیان کرو۔“ وزیراعظم نے بڑے وثوق سے کہا۔

”بھائی جان! میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد آپ میرے یتیم بچے اکرم خان کے سر پر ہاتھ رکھیں۔“ عثمان خان بڑی متانت سے بولا۔ ”آپ کی بچی سلیمہ ہے۔ میرے اکرم کو آپ اس کے لئے اپنی فرزندگی میں لے لیجئے۔ یہی میری آخری خواہش ہے۔ اگر آپ اسے پورا کر دیں تو میری روح کو سکون مل جائے گا۔“

”اطمینان رکھو میرے نادان بھائی۔“ وزیراعظم آبدیدہ ہو گیا۔ ”اکرم خان میرے بیٹوں کی طرح پرورش پائے گا۔ میں اسے اپنی فرزندگی میں لینے کا تمہارے سامنے عہد کرتا ہوں۔“

اسی وقت نو سالہ اکرم خان بھاگتا ہوا اندر آ گیا۔ عثمان خان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے۔ وزیراعظم نے فوراً ”اکرم خان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ”ادھر آؤ بیٹے اکرم!“

اکرم خان دوڑ کر وزیراعظم کے پاس چلا گیا۔

”مجھے جانتے بیٹے؟“ وزیراعظم دل پر جبر کر کے مسکرایا۔

”آپ میرے تایا جان ہیں۔“ اکرم خان بھی مسکرا دیا۔ ”آپ وزیراعظم ہیں

”ہاں“

”ہاں بیٹے۔“ پھر ٹھہر کر وزیراعظم نے کہا۔ ”ہمارے پاس رہو گے تم؟“

”ہاں تایا جان! میں آپ کے پاس رہوں گا۔“ اکرم خان نے معصومیت سے کہا۔ ”وہاں سلیمہ ہے میں اس کے ساتھ کھیلا کروں گا۔“

باوجود انتہائی ضبط کے وزیراعظم کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

عثمان خان نے بیٹے کو باہر بھیج دیا پھر بیوی سے رخصت ہوا اور وزیراعظم کے ساتھ محل کی طرف چلا۔ محل کے باہر اب تک شور و غل ہو رہا تھا۔ لوگوں نے

”مت کہو مجھے بھائی جان۔“ وزیراعظم غصے سے بولا۔ ”اگر تم مجھے بھائی سمجھتے تو صاحبزادے کے قتل سے پہلے مجھ سے مشورہ کرتے۔“

”مگر بھائی جان میں نے تو اعلیٰ حضرت کے حکم کی تعمیل کی۔“

”بکواس مت کرو۔“ وزیراعظم نے قطع کلام کیا۔ ”اگر نواب حکم دیں کہ نصیر خان کا سرا تار لاؤ تو کیا آنکھیں بند کر کے اس پر عمل کرو گے؟“

عثمان خان وزیراعظم کا منہ دیکھنے لگا۔

”تم نے نواب کے حکم کی تعمیل کی ہے، میں بھی اسی نواب کے حکم کی تعمیل رہا ہوں۔“ وزیراعظم نے فوراً ”تکوار کھینچ لی۔“

”نواب کا یہ حکم جائز بھی ہے۔ تمہیں صاحبزادہ مبارک خان کے قتل کے ا میں گرفتار کیا جاتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وزیراعظم نے عثمان خان کی کمر میں لٹکا ہر نکال لیا۔

”بھائی جان! میری بھی تو سنئے۔“ عثمان خان بے چارگی سے بولا۔ ”نواب نے تو مجھے اپنی حفاظت میں لیا ہے۔“

”کس نواب کا ذکر کر رہے ہو؟“ وزیراعظم نے جواب دیا۔

”صاحبزادہ کے بھرے بازار میں قتل نے عوام کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ شہریوں نے شاہی محل گھیر لیا ہے۔ اور نواب نے سارا الزام تم پر اور مجھ پر دم تمہارے قتل کا حکم دیا ہے۔“

”بھائی جان! کیا آپ مجھے قتل کر دیں گے؟“ عثمان خان گڑ گڑایا۔ ”میں ہا ہوں آپ کا بھائی ہوں۔“

”بے گناہ کا قتل رنگ لاتا ہے عثمان خان! میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں نواب کے سامنے پیش کروں گا۔“

وزیراعظم نے یہ الفاظ ادا کئے تھے کہ باہر سے کسی کے دوڑنے کی آواز آئی وزیراعظم نے جلدی سے تکوار نیام میں کر لی۔ ”عثمان خان! وقت کم ہے۔ اپنے بچوں سے مل لو اور اگر کوئی خواہش ہو تو بیان کر دو۔“

عثمان خان کا سر جھک گیا۔ موت اس کے سامنے کھڑی ہو گئی، پھر بھی اس-

وزیر اعظم کے ساتھ عثمان خان کو آتے دیکھا تو چیخ اٹھے۔

”یہی ہے صاحبزادہ کا قاتل۔“

”اسے یہیں مار دو اندر نہ جانے دو۔“

”خاموش ہو جاؤ۔“ وزیر اعظم نے اکڑ کر کہا۔

وزیر اعظم کی آواز میں ایک سحر تھا کہ پورے مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

وزیر اعظم کی آواز پھر گونجی۔ ”صاحبزادہ کا قاتل گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔ آپ لوگ محل سے کام لیجئے اور اعلیٰ حضرت کے فیصلے انتظار فرمائیے۔“

وزیر اعظم، عثمان خان کو اندر لے گیا۔ نواب نے عثمان کو دیکھتے ہی منہ مہما اور چیخ کر بولا۔ ”ہم قاتل کی صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔ عثمان سے دریافت کیا جا کہ کیا اس نے صاحبزادہ مبارک خان کو شر کے چوراہے پر قتل کیا ہے؟“

”میں نے صاحبزادہ کو قتل ضرور کیا ہے عالی جاہ! لیکن —“

نواب نے عثمان کو آگے بولنے نہ دیا۔ بات کاٹتے ہوئے حکم صادر کیا۔ ”مہم

نے قتل کا اقرار کیا۔ اسے اسی وقت اس جگہ سولی پر لٹکایا جائے جہاں اس۔

صاحبزادہ مبارک خان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے تھے۔ دربار برخواست۔ سب لوگ

گھروں کو واپس جاسکتے ہیں۔ وزیر اعظم ہمارے حکم کی تعمیل کی عمرانی کریں گے۔“

نواب بغیر منہ گھمائے فوراً ”محل میں چلا گیا۔ عثمان خان، بہت کچھ چیخا چلا

مگر کسی نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی، دربار کے محافظوں نے عثمان خان کو قابو

کر لیا، پھر اسی شام عثمان خان کو شر کے چوراہے پر اس جگہ سولی پر لٹکایا گیا جا

دوپہر کو صاحبزادہ مبارک خان قتل ہوا تھا۔ شر اور شہری دونوں پر سکون ہو

وزیر اعظم جب اس نا خوشگوار فرض کی ادائیگی کے بعد اپنی حویلی پر پہنچا تو اکرم

دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ اور عثمان خان کی بیوہ بال کھولے وزیر اعظم کے سامنے

گئی۔ وزیر اعظم نے ان بد نصیب ماں بیٹے کو اپنی حویلی میں منتقل کرنے کا حکم دے

تھا۔

”اکرم خان میرا بیٹا اور تم میری بہن ہو۔“ وزیر اعظم نے بھرائی آواز میں

دربار کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس واقعے کو سات سال گزر گئے۔ عثمان خان کے سولی پر چڑھ جانے کے بعد

ظاہر کوئی اور بات سننے یا دیکھنے میں نہیں آئی لیکن امیر الامرا محمد نصیر خان گورکھ

وزیر اعظم بہاول پور نے ان سازشی درباریوں کو ڈھونڈ نکالا جنہوں نے نواب کو ہکا کر

صاحبزادہ مبارک خان کو قتل کرایا تھا۔ انہیں اور ان کے شریک کاروں کو بڑی خاموشی

سے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

علاقائی سازشیں یا ریشہ دو انیاں دس بیس درباریوں کے ختم کر دینے سے کچھ

عرصے کے لئے دب جاتی ہیں اور پھر موقع پاتے ہی سر اٹھانے لگتی ہیں۔ وزیر اعظم کی

عمر اسی سال سے تجاوز کر رہی تھی۔ لیکن نہ تو اس کے اعضا میں اضطلال آیا تھا اور

نہ اس کی انصاف پسند طبیعت میں کوئی لوچ پیدا ہوا تھا۔ دربار کے تمام امیر اس سے

ڈرتے اور نواب صادق محمد خان کے تمام منہ چڑھے درباری وزیر اعظم کے نام سے

کاپتے تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر سازشیوں کا دور شروع ہوا۔ اور وزیر اعظم کو اس کے

مدد سے ہٹانے کے منصوبے تیار کیے جانے لگے۔

وزیر اعظم محمد نصیر خان نے ریاست کے کل پرزے ایسے درست کر دیئے تھے

کہ اسے کسی طرف سے کوئی خطرہ نہ رہ گیا تھا اور اگر کوئی خطرہ ہوتا بھی تو اسے فکر

نہ تھی۔ نواب کی خدمت میں اس نے ایک طویل عرصہ بڑے جاہ و جلال سے گزارا

تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بیٹوں کے حق میں ملازمت سے دست بردار ہو کر

بقیہ عمر عبادت الہی میں گزارے مگر نواب اسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا، پھر

جب سے بہاول پور کا سپہ سالار فتح محمد خان غوری کسی بات پر ناراض ہو کر خیر پور

اٹلٹ چلا گیا تھا۔ اس وقت سے نواب اپنے پوڑھے وزیر اعظم پر کچھ زیادہ ہی مہمان

ہو گیا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود وزیر اعظم ہر وقت کچھ فکر مند سا رہتا تھا۔ دراصل

اسے اپنی بیٹی کی فکر تھی۔ سلیمہ چودھویں برس میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور اس کی

الٹنی جوانی دیکھ کر وزیر اعظم پریشان ہو جاتا تھا۔ سلیمہ کی نسبت عثمان خان کے بیٹے

اکرم خان سے بچپن ہی میں ملے ہو چکی تھی۔ اکرم خان نے وزیر اعظم ہی کے گھر میں

پرورش پائی تھی۔ وہ قرآن کا حافظ اور فارسی زبان میں اچھی مہارت رکھتا تھا کے ساتھ ہی بڑا جوشیلا شہسوار اور شمشیر زن تھا۔ سپہ گری کی تربیت ام وزیراعظم کے بیٹوں افضل خان اور اجمل خان کے ساتھ حاصل کی تھی۔ وزیر کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ سلیمہ اور اکرم خان کو رشتہ ازدواج میں منسلک کرے مگر اس سلسلے میں اسے نواب بہادر پور سے اجازت حاصل کرنا تھی۔

وزیراعظم کی بیوی جو خان بیگم یا خان بی بی کے نام سے مشہور تھیں، اس کی طرح نیک طبیعت اور بردبار خاتون تھیں۔ انہیں شوہر کے سرکاری معاملات کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر شوہر کی صحت اور تندرستی کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ ادھر پرک سے انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ وزیراعظم کچھ پریشان اور بے چین ہیں۔ شوہر پریشانی ان کی اپنی پریشانی تھی۔

ایک دن وزیراعظم کو زیادہ فکر مند دیکھا اور محبت سے بولیں۔ ”خان اعظم کل پریشان نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی مصلحت نہ ہو تو مجھے بھی اپنے فکر سے کیجئے۔“

وزیراعظم ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ”خان بیگم! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اس نے ہمیں عزت و دولت اور شہرت سے نوازا ہے۔ ورنہ کسی ریاست کی اس طویل ملازمت کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ باہر کی تو مجھے کوئی فکر نہیں مگر زندگی کیا بھروسہ۔ غمناک چراغ کسی وقت بھی گل ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اپنی زندگی میں سلیمہ کو دلہن بنا کر رخصت کر دوں مگر۔۔۔“

خان بیگم نے کچھ تعجب سے وزیراعظم کو دیکھا پھر اپنے سر پر پلو ڈالتے ہو بولیں۔ ”خان اعظم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔ سلیمہ کے بارے میں میں آپ سے بات کرنا چاہتی تھی مگر میں نے آپ کا رخ کچھ اس طرف نہیں دیکھا لئے خاموش رہی۔ اگر سلیمہ کی شادی نے آپ کو فکر مند کیا ہے تو پھر بسم اللہ کیجئے اس کا دلہا گھر ہی میں موجود ہے۔ مجھے تو اکرم خان سے اپنے بیٹوں کی طرح ہے۔ ہے۔ ماشاء اللہ کتنا سعادت مند لڑکا ہے۔ بات کرتا ہے تو نظریں جھکا کر لیجے میں شیرینی کے دل کھینچنے لگتا ہے۔“

”خان بیگم! تم نے اکرم خان کے بارے میں جو کچھ کہا، اس سے مجھے پورا اتفاق ہے۔“ وزیراعظم نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس کے باپ جن خان سے وعدہ کیا تھا کہ میں اکرم خان کے جوان ہوتے ہی اسے اپنی فرزندگی میں لے لوں گا۔ مگر یہ کام اس قدر آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو۔“

”کیا فرما رہے ہیں؟ خان اعظم؟“ خان بیگم کی پیشانی پر ہلکے سے بل پڑ گئے۔ ”گھر کی لڑکی، گھر کا لڑکا، کس کی مجال ہے کہ دخل دے۔ میں اعتراض کرنے والے کے دانت تڑوا دوں گی۔ اکرم خان مجھے پسند ہے، آپ کو پسند ہے۔ میرے دونوں بیٹے تو روز مجھ پر زور دیتے ہیں کہ اکرم خان اور سلیمہ کی فورا شادی کر دی جائے۔ آخر آپ کو قناعت کیا ہے؟“

”خان بیگم! تمہیں شاید اس کا علم نہیں کہ جب کوئی امیر اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتا ہے تو اسے ملک کے بادشاہ سے اجازت حاصل کرنا پڑتی ہے۔“ وزیراعظم نے نرمی سے بتایا۔

”خان اعظم! یہ آپ نے کیا طریقہ نکالا ہے۔“ خان بیگم منہ بنا کر بولیں۔ ”بیٹی ہماری ہے۔ بادشاہ یا نواب بہادر کو اس معاملے میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ ہم اپنی بیٹی کسی کو دیں، کہیں بیابیں، جہنم میں جھونک دیں۔ ان کا کیا بگڑتا ہے اس سے؟“ وزیراعظم کو اپنی بیوی کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔ بولے ”خان بیگم بات حق اور نا حق کی نہیں۔ یہ رسم بغداد کے عباسی خلیفوں کے دربار میں رائج تھی۔ پھر ہمارے ملک میں مغل شہنشاہوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور بہادر پور کی عباسی ریاست میں بھی یہ رواج ہے کہ ہر امیر اپنی بیٹی کی شادی سے پہلے نواب سے اجازت حاصل کرتا ہے۔ خیر اس مسئلے کو تو میں حل کر لوں گا۔ نواب صاحب شکار پر جا رہے ہیں۔ میں دوران شکار یا واپسی پر ان سے گفتگو کروں گا۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ تو اپنے گھر کا ہے۔ میرا مطلب ہے اکرم خان اور سلیمہ کا معاملہ۔“

بیگم خان کے ماتھے پر پھر ناگواری کی سلوٹیں ابھریں۔ انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”خان اعظم! آپ کی ساری عمر میدان جنگ میں تلوار چلاتے گزری ہے۔ گھر کی فکر آپ نے کبھی کی ہے اور نہ میں نے ہونے دی ہے۔ اکرم اور سلیمہ کا تو کوئی

دونوں پر نظر رکھتی ہوں۔ محل کا کوئی کونا ہو یا باغ کا کوئی گوشہ۔ انہیں جہاں بھی ذرا
شائی ملتی ہے فوراً منہ سے منہ جوڑ کر باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اب پوچھیں گے کہ وہ
کیا باتیں کرتے ہیں تو خان اعظم! میں اس قدر بے شرم نہیں کہ جوان بچوں کی باتیں
آپ کے سامنے نمک مرچ لگا کر بیان کروں۔“

”بس بس! اتنا ہی کافی ہے خان بیگم۔“ وزیر اعظم کھڑے ہو گئے۔ ”میں شاہی
محل جا رہا ہوں۔ شکار کے انتظامات دیکھنا ہیں۔“

”جانے سے پہلے خان اعظم یہ تو فرمائیے کہ آپ کی فکر اور پریشانی دور ہوئی کہ
نہیں؟“ خان بیگم نے بڑے جھنجھٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

وزیر اعظم جواب دینے کی بجائے مسکرا دیئے اور اسی طرح کمرے سے نکل
گئے۔

نواب صادق محمد خان والی بہاول پور کا صدر مقام بہاول پور تھا مگر پوری
ریاست میں جگہ جگہ ان کے محلات اور قلعے تھے۔ ریاست میں امن و امان تھا۔
نواب صاحب کو صرف شکار کا شوق تھا۔ جب جی چاہتا پورے لاؤ لشکر کے ساتھ شکار
پر نکل پڑتے اور جس قلعے یا شہر میں جی چاہتا وہاں ڈیرے جما لیتے۔ اس طرح نواب
صاحب مہینوں اور برسوں ایک ہی جگہ مقیم رہتے۔ ان دنوں ان کا قیام احمد پور شرقیہ
میں تھا۔ یہاں ایک بڑا قلعہ اور کئی عالی شان محلات تھے جہاں شاہی بیگمات رہتی
تھیں۔

امیرالامراء محمد نصیر خان وزیر اعظم کا اصل قیام ترنڈہ گورگج میں تھا۔ ترنڈہ اور
احمد پور شرقیہ کا درمیانی فاصلہ صرف بیس میل ہے۔ وزیر اعظم کو نواب کے دربار میں
روز حاضری دینا پڑتی تھی۔ اس لئے انہوں نے بھی احمد پور شرقیہ میں اپنے لئے ایک
عالی شان محل تعمیر کرایا تھا۔ جس کے آگے ایک باغ تھا اور باغ کے درمیان انہوں
نے مسجد بنوائی تھی۔ جہاں وہ پانچ وقت نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ ترنڈہ کی تقریباً
تمام آبادی بلوچ قوم پر مشتمل ہے۔ جن میں وزیر اعظم کے قریبی عزیزوں کے علاوہ وہ
بلوچ بھی تھے جنہیں وزیر اعظم نے بلوچستان سے بلوا کر یہاں آباد کیا تھا۔
وزیر اعظم مسکراتے ہوئے بیوی کے پاس سے اٹھے تو خان بیگم بھی بڑبڑاتی باہر

مسئلہ نہیں۔ لڑکی دوسرے گھریاہ کر تو جائے گی نہیں۔ اکرم اور اسے ہمارے
ساتھ رہنا ہے۔ بس قاضی کو بلائیے اور دو بول نکاح کے پڑھوا دیجئے۔ اللہ اللہ!
صلہ۔ نہ کوئی فکر نہ فائدہ۔“

”خان بیگم! تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھیں۔“ وزیر اعظم کو شاید بیوی
بھولے پن پر غصہ آگیا۔

خان بیگم آخر خان بیگم تھیں۔ شوہر کا یہ لہجہ انہیں پسند نہ آیا۔ ذرا تنگ
بولیں۔ ”چلئے میں بے وقوف سی۔ سمجھائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

وزیر اعظم کو بیگم کی دل آزاری منظور نہ تھی۔ فوراً ”معذرت خواہانہ لہجہ اتار
کیا۔“ خان بیگم! تمہیں بے وقوف کہنے والا خود بے وقوف ہے۔ میرا مطلب یہ تھا
اکرم خان ماشاء اللہ جوان ہے، سمجھدار ہے، اس کی مرضی بھی تو معلوم ہونا چاہیے
سیلہ کے بارے میں اس نے کبھی تم سے کوئی بات کی ہے؟“

”خان اعظم!“ خان بیگم چڑ کر بولیں۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اکرم میر
سامنے بچے سے جوان ہوا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اسے معل
ہے کہ سیلہ اس کی منگیتر ہے، پھر اور آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایسا۔
غیرت تو نہیں کہ مجھ سے منہ پھاڑ کر کہے کہ میری شادی فوراً“ سیلہ سے کہہ
غریب کا باپ سولی چڑھ گیا۔ ماں بھی زیادہ دن زندہ نہ رہی۔ ان حالات میں اس
زبان کیسے کھل سکتی ہے۔ پھر اسے زبان کھولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ آخر ہم
آپ کس لئے ہیں؟“

وزیر اعظم بڑی توجہ سے خان بیگم کا ایک ایک لفظ سنتے رہے پھر اطمینان
سانس لیتے ہوئے بولے۔ ”ہونہ! تو تمہیں یقین ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے۔“

وزیر اعظم نے جان بوجھ کر جملہ مکمل نہ کیا اور زبان روک کر بیوی کو دیکھا
لگا۔

”آپ میری زبان کھلوانا چاہتے ہیں۔“ خان بیگم جیسے تنگ آ گئیں۔ ”اکرم!
سیلہ میں صرف محبت ہی نہیں بلکہ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں

نکلیں۔ انہوں نے دیکھا کہ سلیمہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہے۔
 ماتھا ٹھنکا۔ مسکرائیں پھر وہیں سے آواز دی۔
 ”سلیمہ!“ اور سلیمہ وہیں جم کر رہ گئی۔ اس کا ایک پیر کمرے کے اندر اور ایک
 باہر تھا۔

سلیمہ اٹے پیروں ماں کی طرف واپس ہوئی۔ اس کا کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔
 دراصل جب وزیر اعظم اور خان بیگم کمرے کے اندر باتیں کر رہے تھے تو سلیمہ
 دوسرے کمرے میں دروازے سے لگی ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ وزیر اعظم کے
 جاتے ہی وہ بھی دوسرے کمرے سے نکل بھاگی مگر ابھی وہ اپنے کمرے میں نہ پہنچی تھی
 کہ خان بیگم کی آواز سن کر اس کی توجہ جان ہی نکل گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ خان
 نے اسے باتیں سنتے دیکھ لیا ہے اور اب اس کی اچھی طرح مزاج پرسی کی جائے گی۔
 سلیمہ ماں کے سامنے چوروں کی طرح سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔
 ”کہاں جا رہی تھیں؟“ خان بیگم نے کراری آواز میں سوال کیا۔
 ”اپنے کمرے میں جا رہی تھی امی حضور!“ سلیمہ جیسے میٹھی
 ”بھاگ کیوں رہی تھیں؟“ خان بیگم نے دوسرا سوال کیا۔
 ”جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ بس یونہی۔“ سلیمہ کوئی معقول جواب نہ دے
 سکی۔

”جب میں خان اعظم سے باتیں کر رہی تھی تو تم برابر کے کمرے میں موجود
 تھیں؟“
 سلیمہ کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس کا سر کچھ اور جھک گیا۔ اور رخسار عرق
 ہو گئے۔
 ”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟“ خان بیگم کے لہجے کی تلخی میں جیسے رس بھر گیا۔
 سلیمہ نے ماں کی آواز کی اس فوری تبدیلی کو محسوس کر لیا۔ اسے کچھ ہوا
 ہوئی اور اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ خان بیگم کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔
 ”اچھا ہوا کہ تم وہاں موجود تھیں۔“ خان بیگم نے خود ہی سلیمہ کو معاف
 دیا۔ ”بیٹی! یہ تو اور اچھا ہوا کہ تم نے ہماری باتیں اپنے کانوں سے سن لیں۔ یہ بات

”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ امی حضور! میں کچھ نہیں جانتی۔“ سلیمہ نے پھر بچنے کی
 کوشش کی۔

خان بیگم نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ بولیں۔ ”اکرم خان نے اس گھر
 میں پرورش پائی ہے۔ مگر ہم نہیں چاہتے کہ اسے کسی وقت یہ محسوس ہو کہ ہم اس پر
 دباؤ ڈال رہے ہیں۔ تمہیں موقع ملے تو اس سے صاف صاف بات کر لینا۔“
 اس کے ساتھ ہی خان بیگم دوسری طرف چلی گئیں اور سلیمہ منہ پھاڑے
 انہیں دیکھتی رہ گئی۔ کچھ دیر وہیں کھڑے رہنے کے بعد سلیمہ نے پھر اپنے کمرے کا
 رخ کیا مگر اسی وقت اسے اکرم خان اندر آتا دکھائی دیا۔ اکرم خان سیدھا اسی کے
 پاس آگیا۔ سلیمہ نے چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا پھر اکرم خان کو جانے کیا اشارہ
 کیا کہ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے پائیں باغ کی طرف مڑ گیا۔

سلیمہ اپنے کمرے میں گئی پھر کچھ دیر بعد اس کے قدم بھی باغ کی طرف لگے۔ اس وقت اس کا انگ انگ خوشی سے پھڑک رہا تھا اور اس کی چال پر عجیب طرح کی خوشی پیدا ہو گئی۔ وہ باغ میں داخل ہوئی۔ اکرم خان ایک ہرے درخت کے نیچے کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سلیمہ کا چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تو اس نے فوراً اپنے اوپر سنجیدگی طاری کر لی۔

”اکرم! بڑا غضب ہو گیا آج۔“ سلیمہ کی غم میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔

”کیا ہوا سلیمہ؟“ اکرم خان نے پریشان نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ تم تصور میں معلوم نہیں کیسے کیسے حسین قلعے بنا رہا تھا۔ مگر سلیمہ کی اس غیر متوقع نے سارے قلعے سمار کر دیئے۔

”ابا حضور نے تمہاری اور میری نسبت ختم کر دی ہے۔ اب یہ شادی نہ سکے گی۔“ سلیمہ نے بڑے سوکھے منہ سے کہا۔

”چچا حضور نے! مگر کیوں؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔“ اکرم خان کا گلا خشک ہو گیا۔

”نواب بہاول پور نے میرا رشتہ مانگا ہے۔“ اور سلیمہ چور نظروں سے خان کو دیکھنے لگی۔

اکرم خان کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے چپ سی لگ گئی۔ چند لمحوں بعد سلیمہ کہا۔

”بولتے کیوں نہیں۔ تم بھی تو کچھ کہو؟“

اکرم خان نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں کیا بول سکتا ہوں سلیمہ۔ چچا تجربے کار آدمی ہیں۔ تم ان کی بیٹی ہو۔ انہوں نے تمہارے لئے کچھ بہتر ہی سوچا پھر میرا اور نواب کا مقابلہ ہی کیا۔ وہ ایک ریاست کے بادشاہ اور میں اس گمراہوں پر پلا ہوا ایک ادنیٰ انسان۔ نواب کے سامنے میری حقیقت ہی کیا ہے؟“

سلیمہ کو شاید اکرم خان کی حالت پر رحم آگیا۔ پہلے وہ مسکرائی پھر ہلکے سے دی۔ ”اکرم! خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آئے اور اگر خدا انخواستہ کوئی ایسا وقت آ گیا تم سمجھتے ہو کہ ابا حضور چپ چاپ مجھے دلہن بنا کر شاہی محل بھیج دیں گے۔“

اکرم خان سخت پریشان تھا۔ سلیمہ کی دی ہوئی اطلاع نے اس کا دماغ ماؤں

دیا تھا۔ حالانکہ سلیمہ نے مسکرا کر اور ہنس کر اپنی بات کی خود ہی تردید کر دی تھی لیکن اکرم خان اس کے مذاق کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کے ذہن میں صرف یہ بات پیشی تھی کہ وزیر اعظم نے اس کی نسبت ختم کر دی کیونکہ نواب نے سلیمہ کا رشتہ مانگا ہے۔

اکرم خان نے کرناک لہجے میں کہا۔ ”سلیمہ! تم نے ہی تو کہا ہے کہ تمہارے ابا حضور نے ہماری نسبت ختم کر دی ہے۔ پھر تمہیں نواب کی دلہن بنانے سے انہیں کون روکے گا؟“

سلیمہ کو اب ہوش آیا کہ اس نے بڑا خطرناک مذاق کیا ہے۔ اور اکرم خان بدحواس ہو گیا ہے۔ اس نے بڑے پیار سے کہا۔

”اکرم! میں نے تو یہ مذاق کیا تھا۔ تم تو واقعی سنبھلے ہو گئے۔ یقیناً کو نہ ابا حضور کبھی ہماری نسبت توڑ سکتے ہیں اور نہ نواب میرا رشتہ مانگنے کی ہمت کر سکتے ہیں۔“

”جج کو سلیمہ؟“ اکرم بے یقینی سے بولا۔ ”کیا یہ تمہارا مذاق تھا۔ ہماری نسبت ابھی قائم ہے؟“

سلیمہ نے ہنس کر کہا۔ ”اکرم! میں تو تمہیں خوشخبری سنانے آئی تھی مگر میں نے سوچا کہ پہلے تمہیں پریشان کیا جائے پھر کچھ بتاؤں۔“

”سلیمہ! اکرم نے لمبی سانس لی۔ ”میرے لئے صرف ایک ہی خوشخبری ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تم میری ہو جاؤ۔ اس کے سوا میرے دل میں کوئی اور آرزو نہیں۔“

”اکرم! اگر میں یہ کہوں کہ تمہاری آرزو بہت جلد پوری ہونے والی ہے تو کیا؟“

”تو میں سمجھوں گا کہ میری دنیا مجھے مل گئی۔“

سلیمہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”اکرم! میری اور تمہاری دنیا الگ الگ نہیں۔ جس دن تمہیں دنیا ملے گی وہ دن میری زندگی کا سب سے اہم دن ہو گا۔“

”ارے ہاں! وہ خوشخبری والی بات تو سناؤ نا؟“ اب اکرم نے اسے چھیڑا۔

☆☆☆

نواب بہاول پور نے وزیراعظم سے خوش ہو کر اس کے اختیارات میں اور

”اکرم!“ سلیسہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”قسم کھاتی ہوں کہ اب کبھی مذاق نہیں کرے گا۔“

اضافہ کر دیا تھا مگر کسی نے کہا ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

وزیر اعظم کے اختیارات میں اضافہ ہوا تو دربار کے بعض امیر حسد اٹھے۔ دربار کے دو امیر یعقوب خان اور قادر بخش گھمراہی پہلے ہی وزیر اعظم کے خلاف تھے مگر وہ صاحبزادہ مبارک خان کے قتل اور اس کے بعد وزیر اعظم کے سازشیوں کا جو انجام ہوا تھا اس سے واقف تھے۔ اس لئے بس دل ہی دل میں کرتے تھے۔ کوئی عملی قدم اٹھانے کی انہیں ہمت نہ ہوتی تھی۔

یعقوب خان اور قادر بخش گھمراہی میں بڑی گہری چھنتی تھی۔ انہیں دربار میں بڑا دخل تھا مگر وہ نواب کے صرف خلوت کے دوست تھے۔ ملکی امور میں ان کی کوئی آواز نہ تھی۔ نواب بہاول پور نے انہیں سختی سے منع کر دیا تھا کہ ان کا تعلق صرف نواب بہاول پور کی ذات سے ہے۔ حکومت کے کسی معاملے میں زبان نہ کھولیں مگر وہ تو فتنہ تھے۔ یعقوب خان سپہ سالاری اور قادر بخش وزیر اعظم کے خواب دیکھ رہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا خواب امیر الامراء خان کی زندگی میں پورا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ اس کانٹے کو ہٹانے کی سرگرداں رہتے تھے۔

نواب بہاول پور شکار سے واپسی پر قلعہ ڈیر اور میں ٹھہر گئے۔ یہاں نواب کئی محل تھے۔ ایک محل میں امراء کے لئے الگ الگ کمرے مخصوص تھے۔ خان اور قادر بخش گھمراہی کو الگ الگ کمرے ملے تھے مگر وہ ایک ہی کمرے میں مقیم ہوئے۔ سب لوگ تھکان سے چور تھے اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر آرام لگے۔ یعقوب خان پر پھر سپہ سالاری کا دورہ پڑا۔ قادر بخش گھمراہی سونے کی باتوں پر رہا تھا کہ یعقوب خان اس کے پاس جا پچھا۔

”خان گھمراہی!“ یعقوب خان نے بات چھیڑی۔ ”آخر ہم وزیر اعظم کی کب تک انتظار کرتے رہیں گے؟“

”چھوڑو یعقوب خان!“ گھمراہی نے بے دلی سے کہا۔ ”تم نے کس منوں چھیڑ دیا۔ بھوؤں کے بال تک سفید ہو گئے ہیں مگر یہ بڑھا مرنے کا نام نہیں

بھی اس سے دور دور بھاگتی ہے۔“

”خان گھمراہی! اگر یہ سوچتے رہو گے تو نہ تم وزیر اعظم ہو سکو گے اور نہ ”نوالا اس ہاتھ سپہ سالاری آئے گی۔“ یعقوب خان نے ذرا ہمت سے کہا۔ ”نوالا اس تک حلق میں نہیں جاتا جب تک ہاتھ نہ ہلائے جائیں۔“

”مگر ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟“ خان گھمراہی نے مایوسی سے کہا۔ ”اور بغیر ہاتھ پیر ہلائے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔“ یعقوب خان نے کہا۔ ”کوئی نہ کوئی خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ نواب سے وزیر اعظم کی شکایت کی جائے؟“

”ہرگز نہیں! نواب وزیر اعظم کے خلاف ایک لفظ نہ سنے گا۔“

”تو پھر وزیر اعظم کو کسی طرح قتل کرا دیا جائے۔“

یعقوب خان نے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کیا، بولا۔ ”بہاول پور میں کوئی کالال ایسا نہیں ہے جو وزیر اعظم پر تلوار اٹھانے کا تصور بھی کر سکے۔“

”تو پھر چپ چاپ سو جاؤ اور وقت کا انتظار کرو۔“ قادر بخش گھمراہی نے نکتے سر رکھ دیا۔

”ایک ترکیب میرے دماغ میں آئی ہے اگر وہ کامیاب ہو جائے تو بہاول پور کی وزارت سولہ آنے تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“

قادر بخش گھمراہی چونک کر بیٹھ گیا۔ ”سناؤ یا ر! کیا ترکیب ہے۔ میں اپنی جان

”خان گھمراہی! غور سے سنو۔“ یعقوب خان نے سنبھل کر کہا۔ ”اگر اپنا

نواب وزیر اعظم کی بیٹی سے شادی کرنے پر رضامند ہو جائے تو سمجھو کہ تم وزیر اعظم

میں سپہ سالار ہو گیا۔“

خان گھمراہی نے حیرانی سے آنکھیں جھپکائیں۔ ”کیا کہہ رہے ہو یا ر۔ نواب کی شادی اور میری وزیر اعظمی کا کیا تعلق؟“

”وزیر اعظم کی ایک بیٹی ہے۔ نہایت حسین اور خوبصورت۔“ یعقوب خان نے

کہا۔ ”اگر نواب کے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی جائے کہ وہ وزیر اعظم کی بیٹی سے

شادی کرے تو بس سمجھو کہ اپنا کام ہو گیا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو یعقوب خان؟“ خان گھمراہی پھر لیٹ گیا۔ ”وزیر اعظم انکار کر دے گا اور نواب اپنی توہین برداشت نہ کر سکے گا۔ اس طرح محمد نصیر خان گورکھچ کا پتہ صاف اور ہم دونوں کی چاندی ہو جائے گی مگر دیکھو خان اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ڈیر اور ہی میں یہ کام ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“

”یہ بکواس نہیں ہے گھمراہی خان! میں نے بہت سوچ کر کہا ہے۔“ وزیر اعظم نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”کیا تمہارا خیال ہے کہ وزیر اعظم نواب کا رشتہ کر لے گا۔ ہرگز نہیں گھمراہی۔ میں گورکھچ بلوچوں کو خوب جانتا ہوں۔ ان کی کے رشتے صرف خاندان میں ہوتے ہیں۔ وہ غیروں کو لڑکی نہیں دیا کرتے۔ خواہ کبھی کا بادشاہ ہی ہو۔“

قادر بخش گھمراہی آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا پھر بیٹھے ہوئے ”یعقوب خان! اگر تمہیں یقین ہے کہ وزیر اعظم انکار کر دے گا تو یہ بھی یقین کر میں نواب کو یہ رشتہ مانگنے پر مجبور کر دوں گا۔“ قادر بخش گھمراہی نے بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

”یعقوب خان“ گھمراہی کی اس بات پر زور سے ہنسا۔ ”خان گھمراہی! اگر تم نواب کو یہ رشتہ مانگنے کے لئے مجبور کیا تو اس کا انجام جو ہو گا وہ تو ایک الگ بات ہے مگر نواب تمہاری گردن ضرور اتروا دے گا اور تمہاری لاش پر سوائے میرے کوئی رونے والا نہ ہو گا۔“

”یعقوب خان اگر تم سوچ کر بات کرتے ہو تو میں بھی بے وقوف نہیں۔“ گھمراہی نے سینہ تان کر کہا۔ ”میں ایسا احمق نہیں کہ آگ میں ہاتھ ڈال دوں۔“

وزیر اعظم کی بیٹی کی بات میں مائی مراں کے ذریعے چلو اؤں گا۔ تم شاید مراں کو جانتے ہو وہ نواب سے تو تزاخ سے بات کرتی ہے۔ اس کا کہنا پھر کی لکیر ہوتا ہے۔“

”مائی مراں؟“ یعقوب خان کا چہرہ دک اٹھا۔ ”تم اسے جانتے ہو؟“

”جانتا ہوں اور اس کی کمزوری سے بھی واقف ہوں۔“ خان گھمراہی نے بولا۔ ”مراں بڑی لالچی ہے۔ میں اس کا منہ جواہرات سے بھر دوں گا۔“

”پھر تو اپنے پو بارہ ہیں خان گھمراہی!“ یعقوب خان چمک کر بولا۔ ”مجھے سنا

یعقوب خان نے حضور پہنچ گئی۔

نواب صادق محمد خان، تیس سال کے ایک خوبصورت جوان تھے۔ ان کے چہرے پر سیاہ خشخشی داڑھی بڑی بھلی لگتی تھی۔ سر کے ریشمی بال لائے تھے اور ہر وقت پشت اور شانوں پر بکھرے رہتے تھے۔ نواب اس وقت غسل کر کے بالوں میں لنگھی کر رہے تھے۔ مراں کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔

”اے حضور! یہ آپ کیا کرتے ہیں۔ لونڈی تو آپ کے پیروں کی خاک ہے۔“

”مائی مراں نے بڑے ٹھسے سے کہا۔ ”میری اتنی عزت افزائی نہ کیجئے کہ رقیب بد نصیب پیدا ہو جائیں۔“

”مائی مراں! جب تک تم مجھے لفظ تم سے مخاطب نہیں کرو گی میں بات نہیں کر سکتا۔“ نواب نے بیٹھے ہوئے کہا۔ ”جب تم مجھے تم کہہ کر مخاطب کرتی ہو تو مجھے تمہارے پیکر میں والدہ مرحومہ نظر آتی ہیں۔“

”جگ جگ جیو نواب بیٹے!“ مائی مراں نے فوراً تعریف کی۔ ”اللہ تمہاری اور

نواب کو محسوس ہوا جیسے یہ آواز اس کے دل سے نکلی ہے۔ اس نے بڑی

سرت سے کہا۔ ”کاش ہم اسے حاصل کر سکتے؟“

”نواب بیٹے! سوداوی ہو گئے کیا؟“ مائی مراں ترائی۔ ”تم جوان ہو، خوبصورت ہو۔ بادل پور کے بادشاہ ہو۔ وزیر اعظم کی کیا مجال ہے کہ انکار کر سکے۔ ابھی سلیمہ کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ کل میں ان کے گھر گئی تھی۔ وزیر اعظم کہہ رہے تھے کہ سلیمہ جوان ہو گئی ہے اب اس کی شادی کر دینا چاہئے۔ میں نہیں سمجھتی کہ وزیر اعظم انکار کیوں کریں گے۔“

”مراں! تم بلوچ قوم کے رسم و رواج سے واقف نہیں۔“ نواب نے افسردگی سے کہا۔ ”یہ لوگ اپنی بیٹی غیر خاندان میں نہیں دیتے۔ بڑا خون خرابہ ہوا ہے اس سلسلے میں۔ وزیر اعظم ہر گز نہیں مانے گا۔ ہم کہہ کر اپنی زبان نہیں خراب کرنا چاہتے۔“

”تو پھر یہ بادشاہی بھی چھوڑ دو اور ایک کوٹے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کرو۔“ مائی مراں نے منہ پھلایا۔

”مراں تمہیں معلوم نہیں ہے۔ وزیر اعظم انکار کرے گا تو خواہ مخواہ ناچاقی پیدا ہوگی۔“

”نواب بیٹے! کیا وزیر اعظم اتنا نمک حرام ہے کہ تمہاری بات ٹال دے؟“ نواب نے کوئی جواب نہ دیا۔ مائی مراں نے دیکھا کہ بات بگڑ رہی ہے تو پھر ایک لقمہ دیا۔

”تم وزیر اعظم سے بات تو کر کے دیکھو۔ میں بھی اس کی بیوی سے بات کروں گی۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ اتنا بڑا رشتہ کبھی نہ چھوڑیں گے۔“

نواب کو کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے کہا۔ ”اچھا تم کہتی ہو تو ہم بات کریں گے تم بھی کوشش کرنا۔ اس کے گھر ضرور جانا۔“

مائی مراں نے بی جالو کا کام کر دیا۔ اس نے بھس میں تیلی ڈال دی تھی اور اب تماشاً دیکھنے کے لئے تیار تھی۔ سلیمہ نے کسی وقت اکرم سے مذاق میں کہا تھا کہ نواب نے اس کا رشتہ مانگا ہے۔ مگر یہ مذاق اب حقیقت کا جامہ پہن رہا تھا۔ نواب

امیر الامراء محمد نصیر خان کی جوڑی سلامت رکھے۔ ریاست پر کیسی بہار ہے۔ ہر امن و امان۔ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ کیا وفادار اور جاں نثار ہے؟ وزیر اعظم۔ رات دن ریاست کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ اس کا پورا گھر ہی ایسا ہے۔ اللہ نے دو بیٹے دیئے ہیں۔ ایک سے ایک بہادر اور اس کی بیٹی تو بس — مائی مراں بات گھما کر مطلب پر آگئی۔ بیٹی کا ذکر اس نے ادھورا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ نواب وزیر اعظم کی بیٹی کے ذکر پر چونک پڑے تھے۔ مائی خاموش ہوئی تو نواب نے کہا۔

”مائی مراں! تم کچھ کہہ رہی تھیں۔ چپ کیوں ہو گئیں؟“

”ارے نواب بیٹے! بڑھاپا آگیا ہے اب عقل ٹھکانے نہیں رہی۔“ مائی نے مکاری دکھائی۔ ”میں بڑی بیگم کا پیغام لے کر آئی تھی۔ اور کیا ذکر لے بیٹھی۔ نواب کے دل میں گدگدی تو پیدا ہو گئی تھی۔ انہوں نے فوراً کہا۔“

”مائی مراں! پہلے اپنی بات پوری کر لو پھر بڑی بیگم کا پیغام بھی سن لیں گے مراں بہت خوش ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ لوہا گرم ہے فوراً چوٹ جائے۔ ذرا سنبھل کر بولی۔ ”اے ہاں نواب بیٹے! میں تمہارے وزیر اعظم کا ذکر رہی تھی۔ اور اس کی بیٹی، جواب نہیں زمانے میں اس کا۔ وہ شوخ و شنگ ادائیم لہرائی زلفیں، یا قوتی ہونٹوں سے چھلکتا تبسم، قدرت نے کیا جوانی دی ہے اسے بوڑھی آنکھوں نے بڑا حسن دیکھا ہے مگر اس ماہ پیکر اور پری جمال کی چھب کھ نظر نہیں آئی۔“

”کیا واقعی وہ اتنی حسین ہے؟“ نواب کی زبان سے بے خودی کے عالم نکلا۔

”میری سرکار! میرے جہاں پناہ! کیا کہہ رہے ہو تم؟“ مائی مراں نے آگھما کر کہا۔ ”تم حسین کہتے ہو، حسینوں کا قد تو اس کے قدموں تک بھی نہیں پریاں دیکھیں تو پرواز بھول جائیں۔ حوروں کی نظر پڑے تو نظریں چرائیں اور دیکھ پاؤ تو پھر کسی اور کو نہ دیکھو۔ میں تو کہتی ہوں تم اسے اپنے حرم میں لے جنت بن جائے گی حرم سرا۔“

نے فیملہ کر لیا کہ اس حور ارضی کو اپنے حرم میں ضرور داخل کرے گا۔ خواہ کے لئے اسے حد سے بھی گزرنا پڑے۔ وہ تمام دن اور رات بھر اس مسئلے کے غور پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔

دوسرے دن نواب کی سواری نوبت تاشوں کے ساتھ ڈیر اور سے احمد پور شہر روانہ ہوئی۔ وزیراعظم پورے فوجی لباس میں گھوڑے پر سوار نواب کے پہلو میں رہا تھا۔ دوسرے امیران سے کچھ پیچھے تھے۔ سب سے آخر میں دونوں فتنہ پرور باری یعقوب خان اور قادر بخش گھمراہی گھوڑے ملائے آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ خان گھمراہی نے یعقوب خان کو بتایا تھا کہ مائی مراں نے تیر پھینک دیا۔ اور نواب سلیمہ کا رشتہ مانگنے پر تیار ہو گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ نواب راستے میں وزیراعظم سے گفتگو کرے گا۔ اس لئے وہ کبھی اپنے گھوڑے بڑھا کر بالکل نواب کے قریب پہنچ جاتے تاکہ ان دونوں کے چہرے سے کچھ اندازہ کر سکیں۔

نواب کے دل میں کھلبلی مچی تھی۔ حرف مدعا بار بار اس کی زبان پر آتا۔ وزیراعظم کی بارعب شخصیت اس کی زبان پکڑ لیتی۔ وزیراعظم کے جسم پر فوجی وردہ اور اسلحہ دیکھ کر وہ فکر مند ہو جاتا۔ وہ اپنا مقصد بھی پورا کرنا چاہتا تھا اور وزیراعظم ناراض بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لے دے کر یہی ایک مدبر اس کے پاس ایسا تھا جس نے وہ کلی اعتماد کر سکتا تھا۔

آخر نواب جذبات سے مغلوب ہو گیا اور مسکرا کر بولا۔ ”وزیراعظم آپ پر فوجی وردی کتنی بھلی لگتی ہے۔ آپ کس قدر چاق و چوبند نظر آتے ہیں۔“

”سرکار کی ذرہ نوازی ہے۔“ وزیراعظم بھی مسکرایا۔ ”میری وردی ہموار اور کے لشکر کی نشانی ہے اور یہ تلوار حضور کی غلامی کی پہچان ہے۔ اس تلوار کے نڈھال میں اعلیٰ حضرت کے دشمنوں کی زبان بند رکھتا ہوں۔“

”ٹھیک فرمایا آپ نے۔“ نواب نے کہا مگر فوراً ”بات پلٹ دی۔“ درست ہے کہ فوجی پر فوجی وردی اور اسلحہ ہی اچھا معلوم ہوتا ہے مگر امیرالامراء یہ کیا ضرور ہے کہ آپ جلوت اور غلوت میں ہمہ وقت اپنے اوپر جنگی ماحول طاری رکھیں۔ آج ریاستی لباس کا بھی تو آپ پر حق ہے۔“

”آقا کا فرمانا بالکل درست ہے۔“ وزیراعظم جھرجھری لے کر بولا۔ ”آقا اپنے غلام کو جس روپ میں دیکھنا چاہے وہی بہتر اور مناسب ہے۔“

نواب پر شاہی سوار ہو گئی۔ اس نے بڑی تمکنت سے کہا۔ ”امیرالامراء ہم چاہتے ہیں کہ جب آپ ہماری سلامی کو حاضر ہوں تو ان فوجی تکلفات کو گھر پر ہی چھوڑ آیا کریں۔ ہم اپنے حضور میں آپ کو بے تکلف دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”سرکار کا حکم سر آنکھوں پر۔“ وزیراعظم نے جواب دیا۔ ”حضور آئندہ غلام کو اپنے مزاج کے مطابق پائیں گے۔“

بات کوئی ایسی اہم نہ تھی مگر جہانیدہ وزیراعظم کو کھٹکا پیدا ہو گیا۔ اس کے لئے نواب کا یہ حکم بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ احمد پور شرقیہ پہنچ کر اس کی فکر اور بڑھ گئی۔ وزیراعظم کا بڑا لڑکا افضل خان بڑا ذہین اور حساس تھا۔ اس نے باپ کی یہ حالت دیکھی تو سمجھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہوئی ہے مگر پاس ادب سے کچھ نہ پوچھ سکا۔

دوسرے دن دربار کے وقت امیرالامراء نے وردی کے بجائے ریاستی لباس پہنا اور جسم پر کوئی اسلحہ نہ لگایا۔ افضل خان اب تک تو صبر اور لحاظ کرتا رہا مگر اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ قریب آ کر بولا۔

”ابا حضور! آپ کل سے کچھ فکر مند ہیں۔ آج آپ نے وردی بھی نہیں پہنی۔ جسم پر کوئی اسلحہ بھی نہیں لگایا۔ کیا آپ اسی طرح دربار جائیں گے۔“

”افضل بیٹے!“ وزیراعظم نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”آقا کا یہی حکم ہے۔ وہ مجھے اپنے سامنے وردی اور اسلحہ میں نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں تعمیل حکم پر مجبور ہوں۔“

”ابا حضور! اگر یہ شاہی حکم ہے تو اس کے پیچھے ضرور کوئی سازش کام کر رہی ہے۔“ افضل خان نے بے دھڑک کہہ دیا۔ ”میں نے کل رات قادر بخش گھمراہی اور شاہی محلات کی کتنی آفت کی پرکالہ مائی مراں کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں آپ کو دربار میں نہتا نہیں جانے دوں گا۔“

”مجھے بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے، افضل!“ وزیراعظم محمد نصیر خان نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ ”مگر کیا کیا جائے نواب کا حکم ہے میں انکار نہیں کر سکتا۔“

”ابا حضور! آپ دربار ضرور جائیے۔“ افضل خان نے تائید کی۔ ”لیکن آج

چہ تک دیکھا اور یہ اطمینان کر کے کہ وزیراعظم کے جسم پر کوئی اسلحہ نہیں ہے، پہلے جسم کیا پھر بولے۔ ”تشریف رکھئے خان اعظم!“

وزیراعظم سامنے کی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

”خان اعظم ہم آپ کو ریاستی لباس میں دیکھ کر بہت مسرت محسوس کر رہے ہیں۔“ نواب نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ ”یہ ہلکا پھلکا لباس آپ کے بدن پر بجا بھی خوب ہے۔“

”سرکار کی بندہ نوازی ہے۔“ وزیراعظم نے ادب سے کہا۔

”نصیر خان! یہ حقیقت ہے کہ ہم آپ کو دل سے چاہتے ہیں۔“ نواب نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔

وزیراعظم نے چونک کر نواب کو دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نواب نے اسے نصیر خان کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور کہا۔ ”جہاں پناہ کی نوازش غلام کی جاں نثاری میں اضافہ کرتی ہے۔ میرے اور میرے خاندان پر حضور والا نے جو احسانات کئے ہیں ان کا صلہ میں جان دے کر بھی ادا نہیں کر سکتا۔“

”خان اعظم! کیا یہ غلط ہے کہ ہم نے ہمیشہ آپ کے مشورے پر عمل کیا؟“
 ”اب کالجہ اک دم تبدیل ہو گیا اور اس کے انداز میں شاہانہ تحملت پیدا ہو گئی۔“
 ”میں حضور کی عقل رسا کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ آپ میری بات پر کمال توجہ فرماتے ہیں۔“

”خان اعظم! اور کیا یہ غلط ہے کہ ہم تمہارے خداوند مجازی ہیں۔“ نواب کے لہجے میں حاکمانہ سختی آگئی۔

”اس خیال میں شبہ کرنا بھی میرے خیال میں کفر ہے سرکار۔“

”تو سنئے خان اعظم! ہم آپ کو اپنے اور زیادہ قریب لانا چاہتے ہیں۔“ نواب نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”غلام ہر چند کہ اس کا اہل نہیں مگر اس نوازش کے لئے شکر گزار ہے۔“

”ہم تم سے کچھ مانگتے ہیں امیر الامراء!“

”آقا اپنے غلام کو حکم دیتے ہیں یا طلب کرتے ہیں۔ مانگا نہیں کرتے عالی جاہ!“

میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ اگر دو مل جاتے ہیں پھاڑ بھی مل جاتے ہیں۔“

وزیراعظم نے بیٹے کا مشورہ فوراً مان لیا۔ وہ بولے۔ ”میں تمہاری ماں سے مل کر آتا ہوں۔ تم فوراً تیار ہو جاؤ۔ اجمل، اکرم اور سلیمہ کو بھی یہیں بلوا لیتا۔ میں انہیں ضروری ہدایات دوں گا۔“

وزیراعظم زنان خانے میں خان بیگم کے پاس چلے گئے۔ افضل جلدی جلدی کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ اس نے جسم پر پورا اسلحہ لگایا اور کچھ اسلحہ کپڑوں کے اندر بھی چھپا لیا۔ پھر اس نے چھوٹے بھائی اجمل وغیرہ کو بلایا۔ وہ سب گھبرائے ہوئے افضل کے پاس پہنچے۔ اسی وقت وزیراعظم اپنی بیگم سے مل کر واپس آ گئے۔

”اجمل اور اکرم تم دونوں گھر پر ذرا ہوشیار رہنا۔“ وزیراعظم نے بڑے تحمل سے کہا۔ ”بیٹی سلیمہ! تم اپنی ماں کا خیال رکھنا۔ وہ خان بیٹی ہے۔ پھر بھی اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو انہیں تم سنبھالنا۔ افضل میرے ساتھ شاہی محل جا رہا ہے۔“

وزیراعظم فوراً گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ دوسرے گھوڑے پر افضل خان بیٹھا اور ذرا دیر میں دونوں سوار محل شاہی کے سامنے پہنچ گئے۔ وزیراعظم نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا۔

”افضل تم میرا یہیں انتظار کرو۔ اگر میں دو ڈھائی گھنٹے تک واپس نہ آؤں تو سمجھ لینا کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں۔ تم فوراً گھر واپس جانا پھر تڑدہ گورگچ میں اپنے خاندان والوں کو خبر کر دینا۔ اچھا خدا حافظ۔“

وزیراعظم نے ایک پچھلتی نظر بیٹے پر ڈالی اور محل میں داخل ہو گئے۔ جس وقت وزیراعظم کی آمد کی اطلاع نواب کو پہنچائی گئی اس وقت بدطینت یعقوب خان بیٹھا نواب کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ نواب نے اپنے دل کا حال اس سے بیان کر دیا تھا۔ مائی مراں نے سلیمہ کی جس قدر تعریف کی تھی اس سے کہیں زیادہ سلیمہ کے حسن کے قصیدے یعقوب خان نے پڑھے تھے۔ نواب نے یعقوب خاں کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور وزیراعظم کو اذن باریابی دیا۔

وزیراعظم محمد نصیر خان نے حاضر ہو کر سلام پیش کیا۔ نواب نے اسے سرے

”تو سن لیجئے کہ آپ کا خداوند مجازی آپ سے آپ کی بیٹی سلیمہ کا رشتہ طہر کرتا ہے۔“ نواب نے پورے شاہانہ جلال سے کہا۔ ”ہم اس پاکباز کو حرم سلطانی میں داخل کر کے چاہتے ہیں کہ اس سے جو اولاد ہو اسے سلطنت عباسیہ بہاول پور کا کامل عہد مقرر کیا جائے۔“

وزیر اعظم کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے کچھ سنا اور کچھ نہیں سنا۔ اس کا جسم کانپنے لگا اور آنکھوں میں بلوچ غیرت سمٹ آئی۔ نواب خاموش ہوا اس نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”غلام کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا عزم ہو سکتی تھی کہ اس کی بیٹی حرم سرائے کی زینت بنے مگر افسوس کہ میری بیٹی سلیمہ پہلے ہی نسبت ہو چکی ہے اور ہم بلوچ بیٹی کا رشتہ زندگی میں صرف ایک بار کر رہے ہیں۔“

امیرالامراء کے اس دندان شکن جواب سے نواب بہاول پور کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے وزیر اعظم کو دیکھنے کی بجائے کچھ سوچنا شروع کر دیا۔ جیسے کسی خاص فیصلے پہنچنا چاہتا ہو۔

ملی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ وزیر اعظم بھی سر سے کفن باندھ کر نکلا تھا۔ اس نے نواب کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ”سرکار کو صاحبزادہ مبارک خان کے تقرر کا واقعہ ضرور یاد ہو گا۔ اور جہاں پناہ شاید اس سے بھی انکار نہ کر سکیں کہ صاحبزادہ قتل جہاں پناہ کے حکم سے ہی ہوا تھا مگر جب سرکار نے ملکی مصلحت کے تحت میرا بھائی عثمان خان کو قصاص میں سولی دینے کا حکم دیا تو میں نے پچشم نم اسے چوراہے مصلوب کر دیا۔ مقتول عثمان خان نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کے معصوم بچے اکرم خان کو اپنی فرزندگی میں قبول کر لوں۔ میں بھائی کی یہ آخری خواہش رو نہ کر سکا اور اپنی بیٹی سلیمہ کو اس سے منسوب کر دیا۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو مجھے حکم شاہی بجالانے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔“

نواب سر اٹھا کر بولا۔ ”نصیر خان! ہم آپ کی بے لاگ اور جرات مندانہ منہ سے بہت خوش ہوئے۔ عثمان خان کا بیٹا اکرم خان ہمیں آپ کے بیٹوں کی طرح عزیز ہے۔ ہم خود اکرم خان کی نہایت اعلیٰ خاندان میں شادی کریں گے مگر اس وقت آپ

اپنے خداوند مجازی کی خواہش کا احترام اور تکمیل فرض ہے۔“
”مورچ بلوچ اپنے آقا کی یہ بات برداشت نہ کر سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ نواب سے مزید متفقہ کرنا بیکار ہے۔ اس نے نواب کو کوئی جواب نہ دیا اور بڑی تیزی سے محل کے باہر آ گیا۔ افضل خان اس کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ باپ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ کچھ گڑ بڑ ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر باپ کو گھوڑا پیش کیا اور پھر دونوں گھوڑے تیزی سے بھاگنے لگے۔“

☆☆☆

امیرالامراء محمد نصیر خان اور افضل خان بھاگم بھاگ اپنے محل پہنچے۔ نصیر خان نے فوراً قاضی کو بلوایا اور سلیمہ اور اکرم خان کا اسی وقت نکاح پڑھوا دیا۔ پھر چار گھوڑے منگوا کر سلیمہ، اکرم خان، اجمل خان اور وفادار ملازم کو سوار کیا اور انہیں حکم دیا کہ محفوظ راستے سے فوراً ریاست خیرپور پہنچیں۔ افضل خان کو حکم ہوا کہ وہ اصل کے تمام جانور لے کر روانہ ہو۔ ان کی روانگی کے بعد محل کا ضروری سامان ملی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ وزیر اعظم بھی سر سے کفن باندھ کر نکلا تھا۔ اس نے نواب کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ”سرکار کو صاحبزادہ مبارک خان کے تقرر کا واقعہ ضرور یاد ہو گا۔ اور جہاں پناہ شاید اس سے بھی انکار نہ کر سکیں کہ صاحبزادہ قتل جہاں پناہ کے حکم سے ہی ہوا تھا مگر جب سرکار نے ملکی مصلحت کے تحت میرا بھائی عثمان خان کو قصاص میں سولی دینے کا حکم دیا تو میں نے پچشم نم اسے چوراہے مصلوب کر دیا۔ مقتول عثمان خان نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اس کے معصوم بچے اکرم خان کو اپنی فرزندگی میں قبول کر لوں۔ میں بھائی کی یہ آخری خواہش رو نہ کر سکا اور اپنی بیٹی سلیمہ کو اس سے منسوب کر دیا۔ اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو مجھے حکم شاہی بجالانے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔“

وزیر اعظم کا پورا گھرانہ بڑی آہا دھاپی اور بے سرو سامانی کے عالم میں روانہ ہوا تھا۔ عوام کو کسی بات کا علم نہ تھا۔ انہیں سخت تعجب تھا کہ وہ وزیر اعظم جس کے نام کا پوری ریاست میں ڈنکا بجتا تھا، اس قدر سرعت سے احمد پور شرقیہ کیوں چھوڑ رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے مگر کوئی راز نہ کھلتا۔

اور نواب کو اپنی غلطی پر افسوس اور وزیر اعظم محمد نصیر خان کی جرات پر حیرت ہو رہی تھی۔ یعقوب خان نے ان کے بہت کان بھرے اور وزیر اعظم کو اس گستاخی پر براہین کی درخواست دی مگر نواب اگر سزا دینے کا ارادہ بھی کرتا تو بھی یہ ممکن نہ تھا۔ وزیر اعظم ان کی پہنچ سے دور نکل چکا تھا۔

نواب کو جب وزیر اعظم کے معہ اہل و عیال فرار ہونے کی خبر ملی تو اس نے سر ہٹ لیا۔ اسے اپنی ریاست کی فکر پڑ گئی۔ وزیر اعظم کو واپس لانے کے لئے بہت تیز

رفتار سوار بھیجے مگر سب ناکام ہو کر واپس آ گئے۔

دربار خیرپور میں سب سے پہلے افضل خان حاضر ہوا۔ والی خیرپور میر تالپور (تالپر) اس کی آمد سے بہت خوش ہوا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بہادر امیر الامراء محمد نصیر خان گورکھ بھی خیرپور آ رہا ہے تو اس کی خوشی کی حد نہ نے فوراً ایک محل وزیر اعظم کے اہل خانہ کے لئے خالی کرا دیا۔ افضل خان سلیمہ اپنے شوہر اکرم خان اور بھائی اجمل خان کے ساتھ خیرپور میں داخل اسی محل میں ٹھہری۔

سب سے آخر میں امیر الامراء محمد نصیر خان، بیگم خان کے ساتھ خیرپور والی خیرپور نے اس کے استقبال کے لئے اپنے دو امیر، میر غلام حسین خان تا اسماعیل شاہ ابدالی کو بھیجا۔ امیروں نے والی خیرپور کی طرف سے وزیر اعظم آمدید کہا اور بڑے احترام سے دربار لے گئے۔ والی خیرپور میر غلام علی تالپور دربار کھڑے ہو کر محمد نصیر خان کا استقبال کیا اور اپنے برابر تخت شاہی پر بٹھایا۔ امیر الامراء محمد نصیر خان اگرچہ کافی ضعیف تھا اور اس قدر طویل اور سفر کی تکان نے اسے چور چور کر دیا تھا لیکن اس کے چہرے پر محنت کی قضا نہ تھی۔ وہ سب سے ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اور اپنے پورے وقار کو رکھے ہوئے تھا۔ والی خیرپور کے دریافت کرنے پر محمد نصیر خان نے مختصر طور پر پور میں رونما ہونے والے حالات سے انہیں آگاہ کیا۔ والی خیرپور نے بڑی تو حالات سننے پھر خلعت فاخرہ اور اشرفیوں کی کئی تھیلیاں عنایت کیں۔ محمد نصیر عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا۔

پھر والی خیرپور نے دہلی زبان میں پیش کش کی۔ ”وزیر اعظم! یہ ریاست کی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے مدبر اور کمنہ مشق سردار نے اس سرزمین آ بخشی۔ نواب بہاول پور نے آپ کی وفاداریوں کے جواب میں جس بے موتی کیا ہے اس کا تدارک یہاں ہو جائے گا۔ ہم ریاست خیرپور کا قلمدان وزارت کو پیش کرتے ہیں۔“

امیر الامراء اور بلوچوں کے سردار محمد نصیر خان نے یہاں بھی اپنی اعلیٰ

ثبوت دیا۔ اس نے کہا۔ ”اے سندھ کے تاجدار! میں اپنے اہل خانہ کے ساتھ اس ریاست میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ بلوچوں کے قدر دان اور قابل فخر سردار ہیں۔ میں فی الحال یہاں پر سکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ میرا تعلق بہاول پور سے ختم ہو گیا ہے پھر بھی میں آپ کی ریاست کا کوئی عہدہ اس وقت تک قبول کرنے سے معذور ہوں جب تک دونوں ریاستوں کے تعلقات خوشگوار نہیں ہو جاتے۔“

میر غلام علی تالپور نے محمد نصیر خان کی اس وفاداری اور اعلیٰ طرفی کی بہت تعریف کی۔

خیرپور میں آ کر اس خانماں برباد خاندان کو کچھ سکون ہوا تو سلیمہ کی شادی کی رسمیں پوری کی گئیں۔ سلیمہ اور اکرم خان کے ساتھ اجمل خان اور ایک ملازم تھا۔ اس لئے انہیں راہ میں وہ مشکل سے ایک دو باتیں کر پائے تھے۔ خیرپور میں ان کی شب عروسی ہوئی اور دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا گیا۔ محل کی بالائی منزل پر سلیمہ اور اکرم خان کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ بڑی پر سکون جگہ تھی اور نئے میاں بیوی دل کھول کر باتیں کرتے تھے۔

شب عروسی کے کئی دن بعد جب دونوں کا حجاب ٹوٹا تو اکرم خان نے ہنس کر کہا۔

”سلیمہ ہمارا خاندان جس کرب سے گزرا ہے مجھے تو اس کا تصور بھی نہ تھا لیکن میرا خیال ہے کہ تم ضرور ولی ہو۔ تمہیں ان حالات کا پہلے سے علم تھا۔“

”یہ میری کرامت نہیں اکرم!“ سلیمہ مسکرائی۔ ”یہ سب تمہارے محافظ ہونے کا فطیل ہے ورنہ نواب بہاول پور کے بچے سے بچ نکلتا قطعی ناممکن تھا۔“

”نہیں سلیمہ! میں نے تمہیں دلی مان لیا ہے۔“ اکرم خان شوخی سے بولا۔ ”تم نے ایک دن مجھے چڑانے کے لئے کہا تھا کہ نواب بہاول پور نے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا۔ تمہارا یہ مذاق کتنا سچا ثابت ہوا۔ نواب نے تمہارا رشتہ ہی نہیں مانگا بلکہ ہمارا خاندان اجاڑ کے رکھ دیا۔“

سلیمہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”سچ کہہ رہے ہو اکرم! میری زبان واقعی بڑی نگوں ہے۔ نہ معلوم وہ بات کس وقت زبان سے نکلی تھی کی سچ ہو گئی۔“

”اب کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالنا۔“ اکرم ہنسنے لگا۔

”اف میرے خدا!“ سلیمہ چونک کر بولی۔ ”بہاول پور سے خیر پور تک آتا ہے تو روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میری تو بھوک پیاس مٹ گئی تھی۔ پکڑے جانے کا ڈر۔ کسی طرف سے کوئی سوار آتا دکھائی دیتا تو یہی خیال ہوتا کہ لشکر آگیا۔ جان ہر وقت سولی پر چڑھی رہتی تھی۔“

”چھوڑو سلیمہ! تم بھی کیا فضول باتیں لے بیٹھیں۔“ اکرم خان نے مہ کو کہا۔ ”جو گزرنا تھا وہ گزر گیا۔ اب اس پر رونے سے کیا فائدہ؟“

سلیمہ اب تک سفر کے حالات میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ”اکرم فرض کرو کہ میں بہاول پور کے لشکریوں کے ہاتھوں پکڑی جاتی تو تم کیا کر“ دیکھو سلیمہ! تم نے پھر الٹی سیدھی باتیں شروع کر دیں۔“ اکرم نے پیار سے اسے تنبیہ کی۔ ”اس قسم کی باتیں فرض نہیں کی جاتیں۔“

سلیمہ کو جیسے ضد ہو گئی۔ ”فرض کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ اکرم! معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ تم اس صورت میں کیا قدم اٹھاتے؟“

”سننا چاہتی ہو سلیمہ؟“ اکرم نے اسے گھورتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں! سننا ہی تو چاہتی ہوں۔“

”میں بڑا خطرناک قدم اٹھاتا۔“

”بتاؤ بھی! میں یہی تو سننا چاہتی ہوں۔“

اکرم خان نے فوراً ”کمر سے خنجر کھینچ لیا۔“ سلیمہ! خدا کی قسم میں یہ تمہارے سینے میں اتار دیتا۔ اکرم خان بلوچ ہے اور ایک بلوچ یہ ہرگز برداشت کر سکتا کہ دشمن اس کے ناموس کو بے حرمت کرے۔ میں پہلے تمہیں مارتا پھر سے لڑکر بلوچوں کی آن پر قربان ہو جاتا۔“

سلیمہ کا دل مسرت سے بھر گیا۔ اس نے کہا۔ ”اکرم تم واقعی ایک بے کھرے بلوچ ہو۔ اگر تم اس جواب کے علاوہ کچھ اور کہتے تو میرا دل تمہاری سے کھٹا ہو جاتا مگر ایک بات میری بھی سن لو۔ تم نے خدا کی قسم کھا کر جواب ہے۔ اب میں بھی اپنے پیدا کرنے والے کے نام کو درمیان میں رکھ کر کہتی ہوں

اگر خدا خواست کبھی ایسا وقت آیا تو تم سلیمہ کو بھی ایک سچی اور کھری بلوچ عورت کے روپ میں دیکھو گے۔ میں تمہارے خنجر نکالنے سے پہلے ہی اپنی گردن تمہاری تلوار کے نیچے رکھ دوں گی تاکہ تم پہلے مجھے ختم کرو پھر بلوچ قوم کے لئے قربانی اور

سلیمہ اور اکرم خان کی گفتگو کا موضوع بہت پھیکا اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس لئے گفتگو زیادہ دیر نہ چل سکی اور دونوں خاموش ہو گئے مگر یہ کچھ عجیب بات تھی کہ سلیمہ کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ پر قدرت فوراً ”گرفت کرتی تھی۔ سلیمہ نے اکرم خان کی تلوار کے نیچے سر رکھنے کی قسم کھائی تو قدرت مسکرائی اور سلیمہ کا کہنا نوشتہ تقدیر ن آیا۔ اس نوشتہ تقدیر نے آہستہ آہستہ ایسے حالات پیدا کر دیئے جو سلیمہ اور اکرم خان کو اس خطرناک موڑ تک لے گئے جس کا خیال ان کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود نہ تھا۔

امیر الامرا محمد نصیر خان اور اس کے اہل خانہ کے دن خیر پور میں سکون سے گزر رہے تھے مگر نواب بہاول پور کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ سازشی یعقوب خان کو سپہ سالاری مل گئی تھی لیکن قادر بخش گھمراہی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا تھا۔ اس نے نواب پر بہت زور ڈلوایا کہ وزیراعظم کا عہدہ اسے مل جائے مگر نواب برابر ٹالتا رہا۔ شاید اسے محمد نصیر خان کی واپسی کی امید تھی اور شاید سلیمہ کا خوبصورت پیکر اب تک اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

نواب بہاول پور نے پہلے عمر خان کو محمد نصیر خان کے پاس بھیجا کہ وہ معذرت کر کے انہیں واپس لے آئے مگر یہ سفارت ناکام ہوئی۔ نواب نے پھر بھی امید کا دامن نہ چھوڑا۔ اس نے تیزدہ گورگج کے سب سے با اثر بلوچ سردار عزت خان پر جانی کو بلایا۔ نواب کا دماغ بلوچوں سے برہم تھا۔ عزت خان کو خطرہ محسوس ہوا مگر وہ نواب کو مزید ناراض کر کے پورے قبیلے کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

نواب، عزت خان پر جانی سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا مگر گفتگو کے دوران اس کا لہجہ درشت اور حاکیانہ رہا۔ آخر میں نواب نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔ ”عزت خان! ہم بلوچوں کی بہت قدر کرتے ہیں، وزیراعظم سے بھی ہمیں بہت

سرداروں کے اپنی ریاست میں آنے پر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔

عزت خان پر جانی نے چند جملوں میں اپنے آنے کا مدعا بیان کیا مگر یہ چند جملے نصیر خان پر اثر کر گئے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ محمد نصیر خان بہت دیر تک سوچ کر دوبارہ عزت خان نے اسے تذبذب میں دیکھا تو اپنے ترکش کا آخری تیر پھینکا۔

”اے بلوچ قوم کے قابل احترام سردار!“ عزت خان پر جانی نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ریاست بہاول پور چھوڑ کر اپنی اور اپنے گھروالوں کی جان اور

امداد محفوظ کر لی لیکن اس بات کا خیال رکھئے کہ اگر آپ واپس نہ گئے تو ترنڈہ گورگچ لاکر بلوچ جوان، بوڑھا، بچہ، عورت نواب کے غضب سے محفوظ نہیں رہیں گے اور آپ کو چن چن کر قتل کر دیا جائے گا اور یہ قتل عام آپ کی ضد کی وجہ سے ہو گا۔“

امیر الامرا محمد نصیر خان کانپ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

”ایسا نہ کہ عزت خان! میرے بال بچے اور ترنڈہ والوں کے بال بچے الگ الگ

تو نہیں۔ ان کی رگوں میں بھی تو یہی بلوچ خون دوڑ رہا ہے۔ میں انہیں بے سارا

نہیں چھوڑ سکتا۔ میں بہاول پور واپس جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا مگر تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا پڑے گا۔“

”میں ہر عہد اور ہر وعدے کے لئے تیار ہوں خان اعظم!“ عزت خان نے

بڑے صاف لہجے میں کہا۔

وزیر اعظم نے بیٹے کو کلام پاک لانے کو کہا اور سرداروں سے مخاطب ہوا۔

”اس کلام اللہ پر ہاتھ رکھ کر تم سب قسم کھاؤ کہ اگر نواب نے میری جان اور آبرو پر ہاتھ ڈالا تو میرا ساتھ دو گے۔“

کلام اللہ لایا گیا اور اس پر ہاتھ رکھ کر ہر سردار نے خلوص دل سے محمد نصیر

خان کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ پھر اسی شام محمد نصیر خان والی خیرپور سے اجازت حاصل

کر کے بمبہ اہل و عیال ریاست بہاول پور کی طرف روانہ ہوا۔

نواب بہاول پور نے اپنے روضے ہوئے وزیر اعظم کا پر تپاک استقبال کیا اور

اسے پھر سے وزیر اعظم کے عہدے پر سرفراز فرمایا۔ سب سے زیادہ خوشی سلیمہ اور

اکرم خان کو تھی۔ ان کا نکاح بڑی خاموشی سے ہوا تھا۔ احمد پور شرقیہ پہنچ کر سلیمہ نے

محبت ہے لیکن ہماری معذرت کے باوجود وہ ضد کر رہے ہیں۔ عمر خان کو ان کا صاف جواب دے دیا ہے۔ تم اپنی آخری کوشش کر لو۔ اگر تم محمد نصیر خان کو و عیال کے بہاول پور واپس لانے میں ناکام ہوئے تو ترنڈہ گورگچ ہماری عیال محروم ہو جائے گا اور ہم بلوچ آبادی کی حفاظت سے دست کش ہو جائیں گے۔ عزت خان پر جانی کا چہرہ فق ہو گیا۔ نواب نے اسے کھلا ہوا الٹی میٹم چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے ادب سے کہا۔

”اے بادشاہ! جس طرح محمد نصیر خان آپ کا احسان مند ہے اسی طرح

بلوچ آبادی بھی آپ کی عنایت، کی شکر گزار ہے۔ محمد نصیر خان کے انکار کا یہ

نہیں کہ وہ ضد کر رہے ہیں بلکہ انہیں اپنے اہل و عیال اور عزت و آبرو کا خطرہ

اگر آپ اپنی زبان مبارک سے ان کی اور ان کے گھروالوں کی حفاظت کا اعلان

دیں تو میں انشاء اللہ انہیں واپس لے آؤں گا۔“

”عزت خان تمہاری بات بہت معقول ہے۔“ نواب نے کہا۔ ”ہم تمہارا

طرح اطمینان کریں گے اور جب تک تم مطمئن نہیں ہو جاتے اس وقت تک

خیرپور نہیں بھیجیں گے۔“

روایت ہے کہ نواب نے اسی وقت دربار طلب کیا اور تمام عمائدین

کے سامنے اعلان کیا کہ وہ محمد نصیر خان کی واپسی پر انہیں پہلے جیسے تمام اعزازات

کریں گے اور ان کی اور ان کے اہل خانہ کی جان اور عزت و ناموس کی حفاظت

ذاتی فرض سمجھیں گے۔ عزت خاں کو اس سے زیادہ اور کیا چاہئے تھا۔ اس نے

کے چندہ بلوچ سرداروں کو اپنے ساتھ لیا اور خیرپور چل پڑا۔

والی خیرپور میر غلام علی تاپور کی یہ اعلیٰ طرفی تھی کہ اسے یہ معلوم

بعد کہ محمد نصیر خان اور نواب بہاول پور کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ جاری

مگر اس نے نہ تو کوئی اعتراض کیا اور نہ محمد نصیر خان کو دی ہوئی مراعات میں کوئی

آنے دیا۔ عزت خان پر جانی سرداروں کے ایک جم غفیر کو اپنے ساتھ لے کر

پہنچا تو وزیر اعظم پریشان ہو گیا۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کیس میر غلام علی تاپور

ہو کر اسے خیرپور چھوڑنے کا حکم نہ دے دے۔ مگر ایک مخالف ریاست کے

نواب جس میں خط چھپایا گیا تھا وزیراعظم نے اسے دی تھی۔ اور والی خیرپور کو
نواب نے اس کا حکم دیا تھا۔

سازش اس قدر مکمل تھی کہ نواب فریب میں آگیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ
بلکہ اکرم خان سے شادی ہو جانے کی وجہ سے نواب کے دل میں وزیراعظم کی طرف
عین میل پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ خود بھی محمد نصیر خان سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

غرض بات کچھ بھی ہو نواب نے وزیراعظم کو فوراً طلب کیا۔ دوپہر ڈھل چکی
تھی اور اس دن صبح سے سخت بارش ہو رہی تھی۔ وزیراعظم کچھ دنوں سے علیل تھا
اور اس دن دربار بھی نہیں گیا تھا۔ ان حالات میں نواب کا ہرکارہ آندھی پانی میں احمد
پور شرقہ سے بیس میل کا فاصلہ طے کر کے ترندہ گورگنج پہنچا۔ کچا راستہ سخت خراب
ہو گیا تھا۔ اور بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مگر وفادار وزیراعظم اپنے آقا
کے حکم کی بجا آوری کے لئے فوراً تیار ہو گیا۔ خان بیگم نے اسے روکا۔ دونوں بیٹوں
نے خدام میں کہیں۔ سلیمہ اور اکرم خان، وزیراعظم کے دامن سے لپٹ گئے مگر اس
نے نواب کے حکم کو ترجیح دی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

ادھر احمد پور شرقہ میں نواب کا دربار لگا تھا۔ اور قادر بخش گھمراہی نواب کو
بجور کر رہا تھا کہ وزیراعظم محمد نصیر خان کو شاہی قلعے میں داخل ہوتے وقت ختم کر دیا
جائے۔ نواب کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملزم کو صفائی کا موقع
دینے بغیر قتل کرنا جائز نہیں۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ شاہی قلعہ وزیراعظم کی قتل
گاہ بنے۔ یعقوب خان اور قادر بخش گھمراہی کے بہت زور دینے پر نواب نے وفادار
وزیراعظم کے قتل کا فرمان جاری کر دیا مگر یہ بھی حکم دیا کہ وزیراعظم کو قلعہ پہنچنے سے
پہلے ہی قتل کر دیا جائے۔

بوڑھا وزیراعظم اس طوفان باد و باران میں گھوڑا اڑائے احمد پور شرقہ کی طرف
بھاگا چلا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ صرف ایک نمک خوار ملازم تھا۔ شام ہوتے ہوتے
وزیراعظم احمد پور شرقہ کے مضافات میں پہنچ گیا۔ جب اس کی نظر قلعے پر پڑی تو اس
نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ یعقوب خان اور قادر بخش اس کے
غلاف سازش کا جال بچھا رہے ہیں مگر اس نے قطعاً پرواہ نہ کی اور اپنے آقا کے حکم

اپنی شادی کا جشن منایا جس میں اس کی تمام سیلیوں نے بھرپور حصہ لیا۔ مگر
دنوں بعد وزیراعظم نے گھر کے تمام افراد کو ترندہ گورگنج بھیج دیا اور خود بھی احمد
سکونت چھوڑ کر ترندہ میں رہنے لگا۔ ترندہ اگرچہ بیس میل کے فاصلے پر تھا مگر
خان روز گھوڑے پر سوار ہو کر وقت پر دربار میں حاضری دیتا اور شام کو خوش
واپس چلا جاتا۔

کچھ لوگوں کو اگر محمد نصیر خان کی واپسی اور دوبارہ وزیراعظم کا عہدہ سنبھالنا
خوشی تھی تو کچھ ایسے بھی تھے جن کی امیدوں پر وزیراعظم کے واپس آنے سے پانی
گیا تھا۔ ایسے بد طینت لوگوں میں یعقوب خان اور قادر بخش گھمراہی پیش پیش
یعقوب خان کو تو لشکر کی سپہ سالار مل گئی تھی لیکن وزیراعظم سے روز کسی نہ کسی
پر جج جج ہوتی تھی۔ مگر قادر بخش خان گھمراہی کا دامن اب تک خالی تھا۔ وزیر
کے آنے سے وزارت کے خواب بکھر کر رہ گئے تھے اور اسے اپنی سازش کا کوئی
نہ ملا تھا۔

یعقوب خان اور قادر بخش خان گھمراہی کی روز ملاقات ہوتی اور گھمراہی
وزیراعظم کے بارے میں گفتگو کی جاتی۔ ان دونوں نے کچھ اور امیروں کو اپنے
ملایا اور پھر ایسی سازش کا جال بچھایا کہ منصف مزاج اور دیانت دار وزیراعظم اس
پھنس کر رہ گیا۔ وزیراعظم محمد نصیر خان کا میرمنی نصرت خان تھا۔ اس کے قلم
وزیراعظم کے تمام احکامات جاری ہوتے تھے۔ قادر بخش گھمراہی نے تحریر کے ایک
جعل ساز کی خدمات حاصل کیں۔ اور اس سے نصرت خان سے ملتے جلتے خط میں
خیرپور کو ایک جعلی خط لکھا گیا۔ اس خط میں وزیراعظم محمد نصیر خان کی طرف سے
خیرپور کو لکھا گیا کہ وہ ریاست بہاول پور پر حملہ کر کے احمد پور شرقہ پر قبضہ کر لے۔

یہ زہر بھرا جعلی خط یعقوب کے ایک آدمی ملا کر علی کو دیا گیا اور پھر اس کی
جان کی ذمہ داری لے کر اسے گرفتار کیا گیا اور جعلی خط کو ایک کتاب کی جلد سے
برآمد کیا گیا۔ جس وقت یہ خط نواب بہاول پور کے حضور پیش کیا گیا تو اسے پڑھ کر
نواب کا دماغ گھومنے لگا۔ رہی سہی کسر قادر بخش گھمراہی اور یعقوب خان کی چرب
زبانی نے پوری کر دی۔ ملا کر علی نے نواب کے ردو پیش ہو کر یہ بیان دیا کہ

کی قیل میں قلعے کے قریب پہنچ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب نواب اسے دیکھیں اس کی وفاداری کی تعریف کریں گے اور دشمن کا منہ بند ہو جائے گا مگر دشمن کام پہلے ہی کر چکا تھا۔

وزیر اعظم کا گھوڑا ایک باغ کے قریب سے گزر رہا تھا کہ تڑا تڑگولیاں شروع ہو گئیں۔ محمد نصیر خان نے باگیں کھینچ لیں مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا۔ گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ اور وزیر اعظم کا جسم زین سے لٹک ملازم فوراً گھوڑے سے اترا اور وزیر اعظم کو زین سے علیحدہ کیا۔ وزیر اعظم کی جان باقی تھی۔ اس نے اکھڑی سانسوں کے درمیان ملازم سے کہا۔ ”ہمک دوست! تم نے میرا یہاں تک ساتھ دیا ہے۔ اب تم میرے پاس ہی رہو ورنہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کی بے حرمتی کریں گے۔ اور ایک بلوچ کی رو صدمہ ہو گا۔“

ملازم نے سر جھکا کر کہا۔ ”میرے آقا! میں آپ کو تھما نہ چھوڑوں گا۔ اور دشمن نے آپ کے بدن کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو میں آخری سانس تک مقابلہ کروں گا۔“

وزیر اعظم اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کی زبان سے صرف نصف کلمہ ہوا پھر ایک ہچکی آئی اور جان جان آفرین کے سپرد ہو گئی۔ بلوچوں کے اس عظیم نے بڑی بے کسی کے عالم میں جان دی مگر اس کا نام بلوچ تاریخ کا ایک سنہرا باب گیا۔ مرحوم وزیر اعظم کے ملازم نے ایک راہ گیر کو روک کر ترنڈہ والوں کو وزیر کے شہید ہونے کی اطلاع بھجوائی اور لاش کو کاندھے پر لا کر احمد پور شرقیہ والے میں لے گیا۔

ترنڈہ والوں کو اس جان کاہ حادثے کی کوئی اطلاع نہ تھی مگر سب ہی مظہ اور پریشان بیٹھے تھے۔ اسی وقت مکان کے باہر گھوڑے کے ہنسنے کی آواز ہوئی۔ افضل دوڑ کر باہر گیا۔ اسے اندھیرے میں وزیر اعظم کا گھوڑا دکھائی دیا۔ اس نے آواز دے کر روشنی منگوائی۔ اسی وقت گھوڑا کھڑے سے زمین پر گر گیا۔ مگر خون میں نہایا ہوا تھا۔ اور اس کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو رہا تھا۔

سلیم نے ”ہائے ابا حضور!“ کا نعرہ لگایا اور تیور کر گر پڑی۔ پورے محل اور بہتی میں کھرام مچ گیا۔ عورتوں کی آہ و زاری سے در و دیوار لرز اٹھے۔ پوری بستی محل میں جمع ہو گئی۔ ہر طرف چیخ پکار اور واہلا تھا۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہ تھا ہر کوئی رو رہا تھا اور پچھائیں کھا رہا تھا۔ اسی وقت خان بیگم کی گرج دار آواز سنائی دی۔

”رونا دھونا بند کرو اور فوراً احمد پور شرقیہ پہنچ کر اصل حالات معلوم کرو۔ اگر خان اعظم واقعی شہید کر دیئے گئے ہیں تو بلوچ خون کا انتقام لو۔“ پھر خان بیگم نے دونوں کو بیٹوں کو مخاطب کیا۔ ”اے خان اعظم کے سپوتو! میں نے تمہیں وضو کئے بغیر کبھی دودھ نہیں پلایا۔ اگر تمہارا باپ دشمن کی سازش کا شکار ہوا ہے تو اس سے انتقام لو ورنہ میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔“

خان بیگم کی بات ختم ہوئی تھی کہ وزیر اعظم کے ملازم کا بھیجا ہوا آدمی گھوڑا بھاگتا ترنڈہ گور گچ پہنچ گیا۔ اس نے وزیر اعظم کی شہادت کی تصدیق کرتے ہوئے ملازم کا پیغام پڑھ لیا۔ اب کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ ہر طرف سے انتقام انتقام کی آوازیں آنے لگیں۔ افضل خان، اجمل خان اور اکرم خان فوراً گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

افضل خان نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”اے مادر مہربان ہمیں اجازت دیجئے۔ ہم انتقام لینے جا رہے ہیں۔“

خان بیگم بڑے تحمل سے بولیں۔ ”تم انتقام لینے جا رہے ہو، مگر کس سے۔ نواب بہاول پور سے۔ جس کے پاس ایک بڑا لشکر ہے، توپ خانہ ہے، ظاہر ہے کہ تم میں سے کوئی بھی واپس نہ آ سکے گا۔ تمہارے بعد ہم بلوچ عورتوں کا کیا بنے گا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ دشمن کے سپاہی ہمارے سروں سے چادریں کھینچیں اور بلوچوں کی ہانسی پر ہاتھ ڈالا جائے؟“

خان بیگم نے بڑی معقول بات کہی تھی۔ عقل مند خان بیگم کی بات لوگوں نے بڑی توجہ سے سنی۔ افضل خان نے ادب سے کہا۔ ”اے مادر مہربان! انتقام تو ہمیں ضرور لینا ہے خواہ ہمیں پہاڑ سے بھی نکرانا پڑے۔ آپ اپنی حفاظت کا جو مناسب

سمجھے انتظام کر لیجئے۔

”ہاں میرے بیٹے! انتظام کر لیا گیا ہے۔“ خان بیگم نے متانت سے کہا۔ ”مگر نے خود تمہیں انتقام لینے کا حکم دیا ہے۔ مگر اپنے قتل میں جانے سے پہلے تم گھوڑوں سے اترو اور ہم سب کے سر قلم کر کے پھر گھوڑوں پر سوار ہونا کہ تمہیں اپنے گم والوں کا خیال پریشان نہ کرے۔ اگر تم میں اتنی جرات نہیں ہے تو پھر انتقام کا نام نہ لو اور گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جاؤ۔“

”جراک اللہ!“ کسی بزرگ کی زبان سے نکلا۔ ”جس قوم کی ایسی مائیں موجود ہوں وہ قوم کبھی نہیں مر سکتی۔ جوانو! اپنی ماں کا حکم مانو اور انہوں نے جس طرح کا ہے ویسا ہی کرو۔“

افضل خان گھوڑے سے چھلانگ لگا کر اترا اور ماں کے ہاتھ پکڑ کر چوم لے۔ ”اے قوم کی ماں! تم نے ہمارا مسئلہ خود ہی حل کر دیا۔“ پھر اس نے آواز لگائی۔ ”خواتین قربانی کے لئے تیار ہو جائیں۔“

کس کی مجال تھی کہ چوں کرتا۔ خواتین جوش و جذبے سے پہلے ہی بھری ہوئی تھیں۔ سلیمہ اپنے شوہر اکرم خان کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے سرگوشی کی۔ ”اکرم! ایک بار پھر میری بات سچ ہوئی، مگر میں نے کہا تھا کہ میں تمہاری تلوار کے نیچے اپنا سر رکھوں گی۔ اس لئے تم مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کرنا۔“

اکرم خان کے الفاظ حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ صرف آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ پھر اس کا چہرہ ساٹا ہو گیا۔

وہ منظر بڑا دل دوز تھا۔ افضل خان نے حکم دیا کہ ایک ایک عورت کنویں کے پاس آئے اور کنویں کے اندر اپنا سر جھکا دے۔ سب سے پہلے خان بیگم کنویں کے کنارے پہنچیں۔ افضل خان تنگی تلوار لئے کھڑا تھا۔ خان بیگم نے کہا۔

”افضل خان! تمہیں میرے دودھ کی قسم کہ میری گردن پر وار کرتے وقت تمہارے ہاتھ میں ذرا سی بھی لرزش پیدا نہ ہو۔“

افضل خان نے جواب دینے کی بجائے اپنی تلوار اور بلند کی اور قبضہ شمشیر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ خان بیگم نے بے خوف ہو کر گردن کنویں کی منڈیر پر لٹا

دی۔ افضل خان کی تلوار بجلی کی طرح چمکی اور خان بیگم کا سر جسم سے جدا ہو کر کنویں میں گر گیا۔ چند سسکیاں فضا میں ابھریں پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ اجمل خان نے ماں کا جسم اٹھا کر کنویں کے اندر پھینک دیا۔ پھر دوسری عورت بلوچ آن پر قربان ہوئی۔ اس کے بعد تو لائن لگ گئی۔ جرات مند خواتین کنویں میں سر جھکتیں اور سر سے محروم ہو جاتیں۔ اجمل خان سر بریدہ جسم اٹھا کر کنویں میں پھینکتا رہا۔

سب سے آخر میں سلیمہ کا نمبر تھا۔ بہن کو کنویں کی طرف آنا دیکھ کر افضل خان کا دل بھر آیا اور چنگاریاں برساتی آنکھوں میں بہن کی محبت کی پھوار پڑنے لگی۔ ”افضل بھائی!“ سلیمہ نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ ”میری گردن، میرے شوہر کے ہاتھ سے قلم ہو گی۔“

اس کے ساتھ ہی اکرم خان تلوار کھینچ کر کنویں پر پہنچ گیا۔ افضل خان کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ وہ بہن کی صورت دیکھنے لگا۔

”اکرم!“ سلیمہ نے شوہر کو مخاطب کیا۔ ”جس طرح زندگی میں وفادار رہے ہو۔ اسی طرح موت کے وقت بھی اپنی وفا کا اظہار کرو۔ اگر خدا خواستہ تمہارا ہاتھ ہل گیا تو میں پوری قوم میں بدنام ہو جاؤں گی اور میری روح کو کبھی سکون نہ ملے گا۔“ سلیمہ نے گردن کنویں میں جھکا دی اور اکرم خان کے بھرپور وار نے اس کا سر قلم کر دیا۔

خواتین سے فارغ ہونے کے بعد وزیراعظم کے تمام مکانات اور قیمتی سامان پر تل چمک کر آگ لگا دی گئی۔ یہ مکانات نہیں بلکہ شاہی محلات تھے۔ وزیراعظم نے سکھ اور حیدر آباد سے پتھر منگا کر ان کی تعمیر کرائی تھی۔ ان تمام کاموں میں رات گزر گئی اور دن نکل آیا پھر افضل خان نے بلوچ جوانوں کو لٹکارا۔ ”وہ بلوچ جوان گھوڑوں پر سوار ہو جائیں جو اپنی موت سے لڑنے احمد پور شرقیہ جانا چاہتے ہوں۔“

کتے ہیں کہ اس وقت بستی میں صرف اکیس جوان موجود تھے۔ وہ سب کے سب راکبوں میں پیر ڈال کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ وزیراعظم کے مکانات اب تک تل رہے تھے اور ان سے بلند ہونے والے شعلوں کی لپک ترمذہ سے احمد پور شرقیہ

کو قتل کیا۔ یاد رکھو کہ بلوچ کے ہتھیار اس کی موت سے پہلے جسم سے الگ نہیں ہوا کرتے۔“

یہ کہتے ہوئے افضل خان گھوڑے کو ایڑ دے کر سیدھا قادر بخش گھمائی پر جا پڑا۔ قادر بخش نے بندوق کا فائر کیا مگر نشانہ خطا ہوا اور افضل کی تلوار اس کا شانہ کاٹی نکل گئی۔ پھر ہر طرف سے فائر ہونے لگے۔ تلواریں چلنے لگیں۔ یہ پہاڑ اور چوٹی کا مقابلہ تھا۔ مگر بلوچوں کو فتح و شکست کا خیال ہی نہ تھا۔ وہ تو لڑ رہے تھے اور دشمن کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھا رہے تھے۔ مگر کہاں تک، اکیس جوان کب تک مقابلہ کرتے۔ وہ ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ افضل خان صفیں چرتا ہوا توپ خانے تک پہنچ گیا۔ اسی وقت توپ کا ایک گولہ اس کے جسم سے لگا۔ اور جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہوا میں بکھر گیا۔ اجمل خان اور اکرم خان نے کئی سواروں کو قتل کیا مگر تلواروں اور گولیوں سے چھلنی ہو کر زمین پر آ رہے۔ ایک گھنٹے کی اس خوفناک جنگ میں بلوچوں نے حق شجاعت ادا کر کے موت کو لبیک کہا۔ یعقوب خان ان کے ہاتھ سے بچ گیا تھا مگر قادر بخش گھمائی کو ایسا زخم لگا تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکا۔

ترنہ کا خونی کنواں مٹی ڈال کر پاٹ دیا گیا مگر چنی گوٹ کا خونی میدان آج بھی اس جنگ کی یاد تازہ کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں اکثر اس میدان کی طرف سے گولیوں کی سنناہٹ اور تلوار کی جھنجھناہٹ کی آوازیں آتی محسوس ہوتی ہیں اور ۲۷ مفر ۱۲۲ھ کے اس خونی معرکے کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

☆☆☆

وزیر اعظم کے قتل کی خبر پورے احمد پور شرقیہ میں پھیل گئی تھی اور لوگ مرحوم وزیر اعظم کے محل پر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ نواب صادق محمد خان اپنے محل میں گھبرایا گھبرایا گھوم رہا تھا۔ دربار میں اس کے تمام عمائدین موجود تھے۔ چڑھے خبر آئی کہ ترنہ کے بلوچوں نے اپنی عورتوں کو قتل کر کے مکانات میں آگ دی ہے اور اکیس جوان بندوق اور تلوار سے مسلح ہو کر انتقام، انتقام چلاتے احمد پور شرقیہ کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ نواب کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

نواب نے چیخ کر کہا۔ ”نورا“ توپ خانہ اور فوجی دستے لے کر آگے بڑھو اور ان سر پھرے بلوچوں کو روکو۔ خبردار یہ احمد پور شرقیہ میں داخل نہ ہونے پائیں ورنہ یہاں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھیں گے۔“

نواب کے حکم پر سپہ سالار یعقوب خان اور خدا بخش گھمائی نے نواب کو سلام کیا اور محل سے نکل آئے۔ ترنہ گورگج کے بلوچ جوانوں کا آتشیں گولہ چنی گوٹ کی بستی تک پہنچ گیا تھا۔ جوانوں کی تعداد تیس ہو گئی تھی۔ چنی گوٹ پر سرک کو لشکر شاہی نے گھیر رکھا تھا۔ آگے سپہ سالار یعقوب خان اور قادر بخش گھمائی کھڑے تھے۔ انہوں نے توپ خانے کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔ اور کچھ دور پیچے توپیں نصب تھیں۔

قادر بخش گھمائی نے دور ہی سے آواز دی۔ ”اے بھتیجو! ٹھہر جاؤ اور میرا بات سنو۔“

پھرے ہوئے بلوچوں نے ایک لمحے کے لئے پائیں کھینچیں۔

قادر بخش نے کہا۔ ”نواب عالی مقام کو وزیر اعظم کے قتل کا بہت افسوس ہے۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ وزیر اعظم کے دونوں بیٹوں کو شاہی محل میں لایا جائے تاکہ ہم سب مل کر وزیر اعظم کی تجیز و تکفین کریں۔ قاتلوں کا پتہ لگا لیا گیا ہے۔ اور انہما پر سرعام پھانسی دی جائے گی۔ تم دونوں اپنے ہتھیار میرے حوالے کر دو اور میرے ساتھ شاہی محل چلو۔“

افضل خان بے قابو ہو گیا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”او! نابکار! اصل قاتل تو تم دونوں ہو۔ تم نے ایک بار ہمیں ریاست سے نکلوایا، پھر فریب سے بلوا کر میرے ہاتھ

نبی ایب کے کوچہ و بازار کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ تقدیر پر شاکر ہو کر بیٹھنے والے مصلحت کی چادر چاک کر کے گھروں سے نکل پڑے۔ گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کے ٹھٹ لگ گئے۔ اس جلتی اور سلگتی تحریر کو پڑھنے کے لئے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے۔ کیا مرد کیا عورت، بچے تک آنکھیں ملتے باہر نکل آئے تھے۔ ہجوم بڑھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جوش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر نعرے بلند ہوئے استحصالی طاقتوں کے خلاف پر جوش اور دل ہلا دینے والے نعرے۔ پورا شہر لرز اٹھا۔ ایوان حکومت میں ہلکے مچ گیا۔ اجل کے فرشتوں نے رانفلیں سنبھال لیں۔ منتوں کا سیلاب سڑکوں پر رواں ہو گیا۔

زرقا

منتشر ہونے کا حکم دیا گیا۔ فلسطینی جیلے دیوار بن کے کھڑے ہو گئے۔ رانفلوں نے نشانہ باندھا تو سرفروش زقندیں بھرتے ان کے سروں پر جا بچنے لگیں۔ کی باڑھ پڑی اور گیارہ سینے خون سے شفق رنگ ہو گئے۔ مجمع بھر گیا۔ جو جس کے ہاتھ میں آیا وہ رانفل برداروں پر کھینچ مارا۔ کچھ بہادروں نے رانفلیں چھین لیں اور ہتھیاروں کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ پورا شہر میدان جنگ بن گیا۔ لوگوں نے آڑ پکڑی اور گلیوں میں چھپ کر جوابی کارروائی کرنے لگے۔ اس عرصے میں کئی سرکاری دفاتر نذر آتش کر دیئے گئے۔

۱۹۴۸ء کی ایک خونی صبح تھی۔ فلسطینی عوام کا یہ ہجوم بظاہر بے قابو نظر آتا تھا لیکن ایسا نہ تھا۔ جان دینے اور جا لینے کا یہ منصوبہ بہت سوچ سمجھ کے بنایا گیا تھا۔ منتشر ہونے والا ہجوم گروہوں میں بٹ کے گلیوں سے ہوتا ہوا اہم سرکاری مراکز کی طرف بڑھنے لگا۔ چودہ آدمیوں کا ایک گروہ جن کے چہرے رنگین رومالوں میں پوشیدہ تھے پولیس ہیڈ کوارٹر کے سامنے نمودار ہوا۔ یہ مقامی پولیس کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی۔ پولیس تیار ہو کر گاڑیوں میں سوار ہو رہی تھی۔ پولیس کمشنر جانے والوں کو روک دے رہا تھا۔ چھاؤنی کے گرد فوٹ بلند دیوار اور اس پر نوکدار تاروں کا جنگل تھا۔ یہ چودہ جانباز، چھاؤنی کے گرد پھیل گئے۔ چھاؤنی کے اندر سینکڑوں پولیس والے موجود تھے۔ لیکن شہادت کے شیدائی جان کی کب پرواہ کرتے ہیں۔ وہ تو موت کو موندتے ہیں۔ اور موت ان سے دور بھاگتی ہے۔

تل ایب کی دیواروں پر اشتہار چسپاں تھے۔ ہاتھ کے لکھے ہوئے اشتہار، میزے جلی حروف میں جیسے بہت جلدی میں لکھے گئے ہوں۔ اشتہار کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

”اے عربوں کی سرزمین کے عرب پاسانوا! تمہارے مقدس وطن کو غاصب اور مکار انگریزوں نے یہودیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ وہ مردود یہودی جو ہمیشہ اپنے پیغمبروں کو جھٹلاتے رہے۔ قتل کرتے اور سولی پر چڑھاتے رہے۔ آج وہی یہودی نصرانیوں کے گٹھ جوڑ سے اس خطہ ارض پر صیہونی حکومت قائم کر رہے ہیں۔ آنکھیں کھولو۔ مصلحتوں کو تہہ کر کے رکھ دو۔ کمر ہمت باندھو اور طاغوتی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ۔ وطن عزیز کا ذرہ ذرہ تمہیں آواز دے رہا ہے۔ فریاد کر رہا ہے۔ حق مانگ رہا ہے۔ اٹھو اور اپنے گرم خون سے یہ حق ادا کر دو۔ یاد رکھو خدا ان کی مدد کبھی نہیں کرتا جو آپ اپنی مدد نہیں کرتے۔“

اشتہار کے الفاظ کیا تھے جیسے انگارے یا بھڑکتے ہوئے شعلے۔ ان شعلوں نے

انگریزوں کی بچاس ہزار فوج یہودیوں کی پشت پناہی کے لئے فلسطین میں موجود تھی۔ اس نے فلسطینیوں پر نئے ظلم توڑنا شروع کر دیئے۔ مجاہدوں کی گرفتاری کے بہانے وہ عربوں کے گھروں میں گھس گئے۔ جس کو چاہا پکڑا، جسے چاہا گولی مار دی۔ کوئی قانون کوئی اخلاقی ضابطہ باقی نہ رہا۔ دن بھر گرفتاریاں ہوتی رہیں۔ فوج انگریزوں کی اور پولیس یہودیوں کی۔ کہاں فریاد ہوتی اور کون شنوائی کرتا۔ کالا قانون چل رہا تھا۔ فلسطین میں عرصے سے مارشل لاء لگا ہوا تھا۔

رات ہوئی تو پورا شہر قبرستان بن گیا۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پانچ سرکاری دفاتر اور چھ تھانوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ دوسو آدمی گرفتار، مرنے والوں کی کوئی تعداد نہیں بتائی گئی۔ پورا شہر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ فوج نے جگہ جگہ نئے مورچے قائم کر لئے لیکن جوانوں کی خفیہ تنظیم ”آزاد فلسطین“ اس وقت بھی سرگرم عمل تھی۔ شہر کے غیر آباد علاقے میں ایک ویران سی حویلی میں تنظیم کے کارکن رات کے اندھیروں میں بھوتوں اور آسمیوں کی طرح ایک ایک کر کے داخل ہو رہے تھے اس حویلی میں ایک تہہ خانہ تھا جس میں اس تنظیم کے اکثر جملے ہوا کرتے تھے۔ اس طرح کے تنظیم کے شہر میں کئی اور بھی ٹھکانے تھے۔ جہاں یہ لوگ جمع ہو کر منصوبہ بندی کرتے تھے۔

”آزاد فلسطین تنظیم“ کوئی بڑی تنظیم نہ تھی۔ اس کے ممبران کی تعداد بھی اس وقت ڈیڑھ سو سرفروش ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ طاقت رکھتے تھے کیونکہ ان میں اکثریت نوجوان طلبا اور طالبات کی تھی جنہوں نے آزادی کی جدوجہد کے لئے اپنے خون سے شہیدوں کے محضر پر دستخط کئے تھے۔ یہ سب جوان مسلمان عرب گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور پڑھائی کو تھک کر جنگ آزادی میں حصہ لے رہے تھے۔ تنظیم کی سب سے پر جوش کارکن کا نام زر تھا۔ تنظیم کی اصل روح رواں یہی لڑکی تھی۔ تنظیم کا مرکزی دفتری اس حویلی میں قائم تھا۔ یہ محض نام کا دفتر تھا۔ اس میں نہ تو فرنیچر تھا اور نہ کوئی سامان۔ چند ٹوٹی پھوٹی سی کرسیاں اور ایک پرانا قالین فرش پر بچھا تھا۔ روشنی کے لئے موم بتیوں کا انتظام تھا اور دفتر کا نمبر سو تھا۔ دفتری کی نگرانی کے علاوہ یہ نگران رابطے کا کام بھی کرتا تھا۔ تل ابیب اور اس کے باہر کے

ایک ایک چار دھماکے ہوئے اور چھاؤنی کی دیوار میں چار شکاف ہو گئے۔ مرا رات گلیوں پر سنگینیں چڑھائے تیزی سے ان شکافوں کے ذریعے چھاؤنی میں داخل ہو گئے۔ گرد اور دھوئیں کی دیوار تہ صاف ہوتے ہی دونوں طرف سے گولیاں لگیں۔ سرفروشوں نے ستونوں کی آڑ لے کر اس قدر گولیاں چلائیں کہ پولیس بھری ہوئی چھاؤنی میں کھرام مچ گیا۔ پولیس کمشنر چیخ چیخ کر آگے بڑھنے اور سرفروش گرفتار کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ سرفروش چھلاوے کی طرح اپنی پوزیشن تبدیل رہے تھے۔ اس دوران ایک سرفروش بجلی کی طرح لپک کر پولیس کمشنر کے قریب گیا۔ اس نے رات گلی اٹھا کر کمشنر کا نشانہ لیا۔ گولی چلائی لیکن رات گلی نہ چل سکتی تھی۔ کمشنر نے پستول نکال کر سرفروش پر دو گنا کر دیئے لیکن وہ کھجے کی آڑ میں ہو دوسرے سرفروشوں نے اس کی مجبوری بھانپ لی۔

”نمبر ایک کو بچاؤ۔“ اس نے زور سے آواز لگائی اور دوڑ کر نمبر ایک قریب پہنچ گیا۔

اس آواز کے ساتھ ہی دوسرے سرفروش بھی گولیاں برساتے نمبر ایک کی پہنچ گئے۔ پولیس کمشنر کی تیسری گولی چلی اور نمبر ایک بال بال بچا لیکن اس نے بچتے کمشنر پر سنگین کا وار کر دیا۔ یہ وار ایسا اچانک تھا کہ کمشنر خود کو محفوظ نہ رہا اور سنگین کی نوک اس کے جڑے سے گزر کر حلق تک پہنچ گئی۔ پولیس کمشنر نے گرا۔ سرفروشوں نے واپسی کا نعرہ لگایا اور چشم زدن میں دیوار کے انہی شکافوں باہر نکل گئے۔ سینکڑوں پولیس والے گولیاں برساتے ان کے پیچھے دوڑے مگر کوئی ہاتھ نہ آیا۔ باہر طوفان برپا تھا۔ پولیس اور عوام میں دست بدست لڑائی ہو رہی تھی ایک گھنٹے کے اس ہنگامے کے بعد فوج کو بیرکوں سے طلب کر لیا گیا۔ اور میں ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا گیا۔ فوج کے آجانے سے وقتی طور پر سکون ہو گیا۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور گھر گھر تلاشی ہونے لگی۔ بے شمار لوگ شبہ میں گرفتار کر جیلوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ پست ہمت اور محتاط لوگوں نے اسے طفلانہ حرکت لیکن جوانوں نے سراہا کہ اس خاستر میں ابھی کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔ مٹی ذرا اٹ جائے تو بہت زرخیز ہو سکتی ہے۔ اور غم ہونے کے لئے خون کی ضرورت ہے۔

”جی نہیں۔ سوائے مجبوروں کے اور کوئی نہیں آیا۔“ نگران نے ادب سے جواب دیا۔

”باہر سے کوئی خاص خبر آئی؟“

”بہت سی خبریں ہیں نمبر ایک۔“ نگران نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کئے تو بیان کروں۔“

”ابھی نہیں۔“ زرقا فرش پر بیٹھ گئی۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ ”باقی ممبر آجائیں تو بیان کرتا۔“

”پھر مجھے اجازت ہے۔ میں اوپر جاؤں۔“ نگران نے پوچھا۔

”ہاں، تم جا سکتے ہو۔ آج زیادہ احتیاط کرنا۔ بڑا ہنگامہ ہوا ہے شہر میں۔“ زرقا نے اسے مطلع کیا۔

”مجھے علم ہے نمبر ایک!“ نگران زینے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”خصوصاً“

”آپ کا پولیس چھاؤنی والا حملہ۔ پوری تفصیل پہنچ چکی ہے مجھ تک۔“

زرقا نے کوئی جواب نہ دیا۔ نگران سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا اور پھر اندھیروں میں گم ہو گیا۔

زرقا کو دیر تک تھنا نہ بیٹھنا پڑا۔ سپریم باڈی کے ممبر ایک ایک کر کے آنے لگے۔ چار ممبر زرقا کی طرح معمولی طور پر زخمی ہوئے تھے۔ چار کچھ زیادہ زخمی تھے۔ ممبران حویلی میں پہنچ چکے تھے۔ دسویں کا انتظار تھا۔ ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے گزر گئے مگر ایک ممبر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نگران حویلی میں چھپا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سپریم باڈی کے دس ممبر تھے۔ انہیں ایک سے دس نمبر تک الاٹ کئے گئے تھے گیارہ سے ایک سو پچاس تک کے اعداد عام ممبروں کو دیئے گئے تھے۔ نگران اور تنظیم کے مجبوروں کو یہ نمبر زبانی یاد تھے۔ انہیں یہ بھی علم رہتا تھا کہ کس کو کس کام پر مامور کیا گیا ہے۔ جس وقت دشمن کے خلاف کارروائی کے لئے کوئی مہم ترتیب دی جاتی تو تنظیم کے جاسوس اس مہم کے ساتھ جاتے۔ انہیں مہم میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ ان کا کام صرف مہم کی کامیابی یا ناکامی کی رپورٹ تیار کرنا ہوتی تھی۔ رپورٹ وہ ذہن میں ترتیب دیتے اور اسے فوری طور پر یا موقع ملتے ہی نگران تک

تمام سرفروشوں سے اس کا رابطہ قائم رہتا تھا۔ اور ہر روز کی خبریں اس تک پہنچ جاتی تھیں۔ یہ تمام خبریں تنظیم کی سپریم کونسل میں پیش کی جاتیں۔ اور ان پر فوجداری احکامات جاری ہوتے۔ کسی بات یا حکم کو قلم بند کرنے کی قطعی اجازت نہ تھی۔ ممبران کا کوئی رجسٹر بھی نہ تھا۔ اور نہ وہ ایک دوسرے کے نام سے واقف تھے۔ ہر ممبر کو ایک نمبر دیا جاتا تھا جسے وہ اپنے نام کے طور پر استعمال کرتا۔ زرقا کا نمبر ۱ تھا۔ وہ جنرل باڈی اور سپریم باڈی دونوں کی صدر تھی۔ کم عمر ہونے کے باوجود ممبران اس کی عزت کرتے اور اس کے حکم پر جان دینے پر فوراً آمادہ ہو جاتے۔ حکومت کے خلاف ہر کارروائی کے لئے زرقا سب سے پہلے اپنا نام پیش کرتی۔ انتہائی خطرناک مہم کے سرانجام دینے کے لئے وہ ممبروں سے ضد تک کرتی تھی۔ پوری تنظیم کو پندرہ پندرہ کی دس کمیٹیوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر کمیٹی کا ایک مرکزی کمیٹی میں شامل تھا۔ یہ دس ممبر ہر وقت آپس میں رابطہ رکھتے تھے اور روز شام یا رات کے وقت اس حویلی میں صلاح اور مشورے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ حویلی میں سب سے پہلے داخل ہونے والی ہستی زرقا تھی۔ زرقا گشت سپاہیوں کی نظرسنجائی ہوئی تیرہ و تارک حویلی میں ایک آسیب کی طرح داخل ہوئی۔ حویلی کا نگران ممبر اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے قدموں کی چاپ سے زرقا پہچان لیا۔ پھر احتیاط کے طور پر اس نے زرقا کی پشت پر پستول کی نوک لگاتے ہوئے سرکوشی کی۔

”کون ہے؟“

”نمبر ایک۔“ زرقا نے جواب دیا۔

”مرحبا“ نگران نے پستول ہٹاتے ہوئے زرقا کو خوش آمدید کہا۔

تہ خانے کی سیڑھیاں طے کرتے وقت نگران نے جیبی ٹارچ روشن کر لی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر یہ خانے کا بڑا ہال تھا۔ ہال تقریباً خالی تھا۔ صرف ایک طرف فوری ضرورت کے لئے تھوڑا سا اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ ہال میں موم بتیوں کی لمبی لمبی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

”کوئی اور ممبر ابھی تک نہیں آیا؟“ زرقا نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔

والے جنم رسید ہوئے۔ ان میں چھاؤنی کا پولیس کمشنر بھی شامل ہے۔ جسے ہمارے کسی ممبر نے سنگین مار کر زخمی کیا تھا۔ زخم اتنا کاری تھا کہ کمشنر ختم ہو گیا۔“
 زرقا کا سر فخر سے خود بخود اونچا ہو گیا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ اس نے یہ بتانا ضروری نہ سمجھا کہ پولیس کمشنر کو اس نے سنگین مار کر ختم کیا تھا۔
 ”ہگانہ بھیجے جانے والوں میں ہمارا نمبر سات بھی ہو گا؟“ زرقا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔

”جی نہیں۔ نمبر سات کو مزید تفتیش کے لئے پولیس چھاؤنی میں روک لیا گیا ہے۔“ نگران نے جواب دیا۔ ”نمبر سات کو پولیس چھاؤنی کی مہم کے دوران شناخت کر لیا گیا تھا۔ اس کامیاب مہم کے بعد جب نمبر سات باہر آیا تو تعاقب کرنے والی ایک پارٹی نے اسے دور تک پیچھا کر کے پکڑ لیا۔ اسے گرفتار کر کے جب پولیس چھاؤنی لایا گیا تو پولیس کمشنر نے بھی اسے شناخت کیا۔ پولیس کو یہ بھی مخبری کی گئی ہے کہ نمبر سات ہماری تنظیم کی مرکزی کمیٹی کا ممبر اور ایک اہم رکن ہے۔ اس وقت اس سے پولیس چھاؤنی میں مختلف طریقوں سے مرکزی کمیٹی کے ممبروں کے نام اور پتے حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پولیس اس وقت تک اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ امکان ہے کہ رات کے کسی وقت اسے ہگانہ والوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

زرقا اور دوسرے ممبران نگران کی رپورٹ کو بغور سنتے رہے۔ اس کے خاموش ہوتے ہی زرقا بولی۔
 ”دوستو! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ایک بار پھر پولیس چھاؤنی پر دھاوا بول کر نمبر سات کو چھڑا لائیں۔“

کمیٹی کے تمام ممبران زرقا کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ نمبر تین بولا۔ ”اگر یہ نمبر ایک کا حکم ہے تو ہمیں اس کی تعمیل میں کوئی عذر پیش نہیں کرنا۔ لیکن اگر یہ بات شورے کے لئے پیش کی گئی ہے تو میں اس ارادے کی تائید نہیں کرتا۔“
 ”مجھے بھی اس منصوبے سے اختلاف ہے۔“ نمبر چھ نے دخل دیا۔ ”صبح کی مہم میں پولیس چھاؤنی کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ انہوں نے اور زیادہ سخت انتظامات کئے

پہنچا دیتے تھے۔

ممبران کا انتظار کرتے ہوئے جب بہت دیر ہو گئی تو زرقا نے کہا۔ ”کیا خیال ہے آپ لوگوں کا۔ وقت گزر چکا ہے۔ سب کی رائے ہو تو خبریں سنی جائیں اور ہم آئندہ کے لئے کوئی فیصلہ کیا جائے؟“

”جی ہاں نمبر ایک!“ ایک ممبر نے زرقا کی تائید کی۔ ”مزید انتظار کی اب ضرورت نہیں ہے۔ کارروائی شروع ہونا چاہئے۔ غیر حاضر ممبر کو اس سے باخبر کر دیا جائے گا۔“

زرقا نے ممبروں کے چہرے غور سے دیکھے۔ ”شاید نمبر سات ہم میں موجود نہیں۔ اگر وہ موجود ہیں تو آواز دیں۔“ کسی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔ زرقا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”جہاں تک میرا خیال ہے نمبر سات ہم چودہ ممبروں کے ساتھ پولیس چھاؤنی کی مہم میں موجود تھے۔“

”آپ کا خیال بالکل درست ہے نمبر ایک۔“ یہ آواز حویلی کے نگران کی تھی۔ جو تہ خانے کی بیڑھیاں اتر رہا تھا۔

”نمبر سات آپ کے ساتھ گئے تھے اور پولیس چھاؤنی کے باہر گرفتار ہوئے ہیں۔ اس کی اطلاع اسی وقت مخبر نے دی ہے۔“

”ہمارے اور ممبر تو گرفتار نہیں ہوئے؟“ زرقا نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”نمبر سات کے علاوہ پانچ ممبر بھی پولیس کے قابو میں آ گئے ہیں۔“ نگران نے فرش پر بیٹھ کے بتانا شروع کیا۔ یہ پانچوں عام ممبر ہیں۔ اور ان کے نمبر بالترتیب ۵۷، ۷۲ اور ۱۳۰ ہیں۔“ نگران نے یہ نمبراتی روانی سے بتائے جیسے اس کے سامنے کوئی رجسٹر کھلا ہو۔

”کل گرفتاریاں کتنی ہوئیں؟“ زرقا نے دریافت کیا۔

”آج ایک ہزار سے زیادہ فلسطینی پکڑے گئے۔“ نگران نے زبانی رپورٹ دینا شروع کر دی۔ وہ شام تک پچاس آدمیوں کو معمولی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑا جا چکا تھا۔ تقریباً اتنی ہی تعداد کو ”ہگانہ“ کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ باقی پولیس کی حراست میں ہیں۔ ان کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ تیرہ فلسطینی شہید اور پانچ پولیس

ہوں گے۔ ہم کی کامیابی کا ایک فیصد بھی امکان نہیں۔“

”ہم ہم پر جاتے وقت اپنی کامیابی کے تمام امکانات رد کر دیا کرتے ہیں! چھ!“ زر قہ کی آواز میں گونج پیدا ہو گئی۔ ”ہمارا مقصد دشمن کا زیادہ نقصان کرنا ہے۔ اگر ہم پولیس چھاؤنی پر دوبارہ حملہ کریں اور نمبر سات کو آزاد کرانے میں ناکام رہیں تو اس سے یہ فائدہ ضرور ہو گا کہ پولیس کو ہماری بے پناہ طاقت کا اندازہ جائے گا۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اگر انہوں نے فلسطینیوں پر بے ظلم و ستم جاری رکھا تو ہماری خفیہ تنظیم ان سے زبردست انتقام لیتی رہے گی۔“

”اس فائدے کا امکان ضرور ہے۔ اور یہودی پولیس کو مرعوب کرنے کا یہ طریقہ ہے لیکن —“ نمبر چھ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن ہمارے دوسرے سے پولیس کو یہ یقین بھی ہو جائے گا کہ ان کے ہاتھوں گرفتار ہونے والا یقیناً ہمارا مرکزی کمیٹی کا اہم رکن ہے۔ حالانکہ ابھی تک وہ صرف اس پر شبہ کر رہے ہیں۔“

زر قہ سوچ میں پڑ گئی۔ نمبر چھ کی اس دلیل میں کافی وزن تھا۔ ذرا دیر غور کرنے کے بعد بولی۔ ”نمبر چھ! تمہارا شکریہ۔ تمہاری بات قابل غور ہے۔ ہمارے غور کا وقت نہیں اور نہ ہم غور و فکر میں اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں وقت حرکت میں اور ہر دم جدوجہد میں مصروف رہنا ہے۔ پولیس چھاؤنی پر حملے ارادہ فی الحال ملتوی کیا جاتا ہے۔ اس کے بجائے ایک اور منصوبہ ہے۔ وہ یہ کہ کچھ ممبروں کے ساتھ پولیس چھاؤنی اور ہنگامہ کے دفتر کے درمیانے راستے پر بم لگائیں۔ جس وقت پولیس نمبر سات کو لے کر اس راستے سے گزرے ہم حملہ کر کے اسے چھڑالیں۔“

اس منصوبے کی تقریباً سب نے تائید کی صرف ایک ممبر نے خدشے کا اظہار کیا اور بولا ”یہ بھی تو —“ ہو سکتا ہے کہ پولیس والے نمبر سات کو رات کے وقت ہنگامہ کے دفتر نہ بھیجیں۔“

زر قہ نے جواب دینے کے بجائے نگران کو دیکھا جس نے یہ خبر دی تھی کہ نمبر سات کو رات کے کسی حصے میں ہنگامہ بھیجا جائے گا۔ نگران نے زر قہ کا اشارہ پا کر کہا

”یہ بات پولیس کی تفتیش پر منحصر ہے۔ پولیس پوری کوشش کر رہی ہے کہ نمبر سات سے مرکزی کمیٹی کے ممبروں کی فہرست حاصل کرنے کا اعزاز وہ خود حاصل کرے۔ کیونکہ پولیس کا خیال ہے کہ اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئی تو صبح کو پولیس چھاؤنی پر چھاپے کے دوران ان کا جو نقصان ہوا ہے اور اسے حریت پسندوں کے ہاتھوں جو زلت اٹھانا پڑی ہے، اس کا کچھ نہ کچھ تدارک ہو جائے گا۔“

زر قہ کا جوش، جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ اگرچہ اس کے اس جوش نے بعض اوقات اسے اور اس کے ساتھیوں کو کافی نقصان پہنچایا لیکن اسی جوش کی وجہ سے انگریزوں اور یہودیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ یہودیوں کو یہ معلوم تھا کہ ”آزاد فلسطین تنظیم“ کے نام سے تل ابیب میں ایک عرب دہشت پسند جماعت سرگرم عمل ہے۔ لیکن انہیں اب تک ان کی صحیح تعداد اور اس کے سرغنہ کا نام معلوم نہیں تھا۔ صبح کو پولیس چھاؤنی پر جو حملہ ہوا وہ اس قدر شدت کا تھا کہ یہودی کرتا دھرتا چونک پڑے۔ فلسطین میں اسرائیل کی نئی حکومت کے قیام کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ ایسے موقع پر فلسطینیوں کے اس جرات مندانہ اقدام نے انہیں بوکھلا کے رکھ دیا۔ تمام اداروں اور خصوصاً پولیس کو حکم دیا گیا کہ آزاد تنظیم کے ممبران کا پتہ لگا کر انہیں زندہ یا مردہ گرفتار کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی حکم ہوا کہ تمام سرکاری اداروں پر حفاظتی انتظامات میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔ یہ احکامات ہنگامہ کی طرف سے جاری ہوئے۔

ہنگامہ تل ابیب میں یہودیوں کی آزاد عدالت کا نام تھا۔ یہودیوں کو ابھی تک باقاعدہ حکومت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود خود کو فلسطین کا حاکم سمجھتے تھے۔ یہ عدالت دراصل حکومتی ٹولہ تھا۔ اس کی اپنی پولیس تھی۔ اپنی فوج تھی۔ اپنا قانون تھا۔ تمام انتظامات اسی ٹولے کے پاس تھے۔ ہنگامہ کی ایک اپنی دہشت پسند تنظیم بھی تھی جسے عرب فلسطینیوں پر ہر قسم کے ظلم کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔ ”یہودی دہشت پسند“ عربوں کے مکانات، دکانوں اور زمینوں پر بزور قبضہ کرتے تھے۔ جو ان کی مخالفت کرتا اسے گرفتار کر لیا جاتا اور کوئی نہ کوئی الزام لگا کر قید خانے میں ٹھونس دیا جاتا۔ ہنگامہ کا دفتر، ایوان حکومت کھلاتا تھا۔ جو ملزم ہنگامہ کے حوالے کیا جاتا تھا اس کا

اعزاز کو جلد از جلد حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ کیونکہ اعتراض زر قہ کی پر تھا۔ اس کا جواب اس نے خود دیا۔

”دوستو! آپ کا یہ جوش دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ جس میں آپ جیسے جاں باز، سرفروش اور شہادت کے شیدائی موجود ہوں وہ قوم غلامی نہیں کر سکتی۔ ہم جلد یا بدیر خدا اور پیغمبروں کے ان نافرمان بندوں کو اپنی سرزمین سے نکال کے رہیں گے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنے ساتھ نمبر آٹھ نو اور دس کو نامزد کیا ہے۔ اگر ان کے بجائے میں نمبر دو اور پانچ کو موقع تو ان پہلے نامزد کئے جانے والوں کو ضرور صدمہ ہو گا۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔ میں اپنا نام واپس نہیں ہونے دوں گا۔“

”میں بھی نام واپس نہیں لیتا۔“

”میں پہلے نامزد ہوا ہوں۔ میں اپنا حق نمبر دو یا پانچ کو نہیں دے سکتا۔“

نامزد ہونے والے چاروں ممبروں نے اپنے نام واپس لئے جانے سے صاف کر دیا۔

”آپ الیمنان رکھیں۔ کسی کا نام واپس نہیں ہو گا۔“ زر قہ نے کہا۔

”خدا نہ کرے کہ آج کی مہم ناکام ہو پھر بھی اگر ایسا ہوا تو میں وعدہ کرتی ہوں مہم میں نمبر دو اور نمبر پانچ کو ضرور شامل کیا جائے گا۔“

نمبر پانچ تو مطمئن ہو گیا لیکن نمبر دو اپنی جگہ جما رہا۔ اس نے کہا۔ ”میرا اصل اصولی ہے۔ ایک دن میں ایک ممبر دو ممبروں پر نہیں بھیجا جاسکتا۔ اس لئے ایک کو آج آرام کرنا چاہئے اور مجھے موقع ملنا چاہئے۔“

زر قہ بڑی ملامت سے بولی۔ ”تمہاری ضد میں کس قدر خلوص اور حب قومی کا جذبہ موجود ہے۔ اس کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میں اس مہم سے راز نہیں ہو سکتی۔ میں مرکزی کمیٹی کی صدر بھی ہوں۔ مجھے خاص اختیارات بھی دیئے گئے ہیں۔ اگر نمبر دو اپنی بات پر اڑے رہے تو مجبور ہو کر اپنے خاص اختیارات تحت اس مہم میں خود کو شامل کر لوں گی۔“

”میں اپنی نامزدگی کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔“ نمبر دو ٹس سے مس نہ ہوا۔

وہاں سے چھوٹنا ناممکن تھا۔ ہنگامہ کے کارکن اسے طرح طرح کی تکلیفیں دیتے۔ اس سے اپنی مرضی کے بیانات حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر ملزم انکار کرتا تو اس اس قدر ظلم کئے جاتے کہ غریب اپنی جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔ زر قہ کی مرکزی کمیٹی کا نمبر سات ہنگامہ کے حوالے کیا جانے والا تھا۔ اس لئے وہ بے چین ہو گئی اور ہنگامہ کے دفتر میں پہنچنے سے پہلے اسے چھڑانے کی فکر کرنے لگی۔

اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ نمبر سات کو پولیس چھاؤنی اور ہنگامہ کے دفتر کے درمیانی راستے میں حملہ کر کے آزاد کرا لیا جائے۔ اس فیصلے میں یہ اضافہ کیا گیا کہ اگر نمبر سات کو رات کے بجائے دن میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جائے تو یہ مہم ملتوی سمجھی جائے کیونکہ پورے شہر میں فوج کی گشت ہو رہی تھی۔ دن کے وقت حملہ مناسب نہ تھا۔ اس لئے زر قہ نے مرکزی جماعت کے چار ممبروں کے ساتھ خود اس مہم پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس پر ممبران میں ایک بار پھر بحث و مباحثہ شروع ہو گیا۔ تمام ممبر اصولی طور پر اس مہم کی تائید کر چکے تھے۔ اس لئے اب وہ اس سے انکار تو نہ کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس مہم میں زر قہ کی شرکت کی شدید مخالفت کی۔

نمبر تین جسے اس مہم میں زر قہ نے شامل کیا تھا، نے ایک اصولی اعتراض کیا، ”نمبر تین جسے اس مہم میں زر قہ نے شامل کیا تھا، نے ایک اصولی اعتراض کیا“۔

”چونکہ نمبر ایک (زر قہ) آج ایک مہم میں حصہ لے چکی ہیں۔ اس لئے انہیں دوسری مہم میں شریک نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے بجائے کسی اور ممبر کو نامزد کیا جانا چاہئے؟“

”مجھے اس مہم کے لئے نامزد کرنا چاہئے۔“ یہ آواز نمبر دو کی تھی۔ ”مجھے پچھلے ہفتے کسی اہم مہم میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس لئے یہ موقع مجھے ملنا چاہئے۔“

”میرے سپرد بھی چھ دنوں سے کوئی اہم کام نہیں کیا گیا۔ اس لئے مجھے بھی اس مہم میں شرکت کا اعزاز ملنا چاہئے۔“ یہ بات نمبر پانچ نے بڑے جوش سے کہی۔

نمبر ایک یعنی زر قہ کو ممبران کے اس جوش و خروش سے بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ کسی بھی مہم پر جانے کا مطلب شہادت کو گلے لگانے سے تھا۔ اس لئے ہر ممبر

ہرک پہنچ گئی۔ جو چھاؤنی سے ہنگانہ کے دفتر جاتی تھی۔

مہم کا ہر ممبر، خنجر، پستول، رائفل اور دستی بموں سے مسلح تھا۔ چھاؤنی اور ہنگانہ کے دفتر کا درمیانی فاصلہ ایک میل سے زیادہ نہ تھا۔ ان لوگوں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مناسب جگہ پر اپنی کمین گاہ بنالی اور پولیس کی اس گاڑی کا انتظار کرنے لگے جو نمبر سات کو لے جانے والی تھی۔ شناخت سے بچنے کے لئے سب نے اپنے چہرے چوڑے رومالوں میں چھپا رکھے تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ سڑک تاحد نظر ویران پڑی تھی۔ زر قاتا رات کے باقی حصے میں اپنے ساتھیوں کو لئے ہوئے کمین گاہ میں چھپی قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی کا انتظار کرتی رہی لیکن ان کی امید پوری نہ ہوئی۔ سوائے گشت کے سپاہیوں کے انہیں کوئی گاڑی نظر نہ آئی۔ جب صبح ہونے کے قریب ہوئی اور تمام امیدیں ختم ہو گئیں تو زر قاتا نے گشتی پارٹی پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ دس سپاہیوں کی ایک گشتی پارٹی سڑک سے گزر رہی تھی کہ زر قاتا نے کمین گاہ سے نکل کر ان پر حملہ کر دیا اور سب کو وہیں ڈھیر کر دیا۔ اس طرح زر قاتا نے اپنی ناکامی کا بدلہ ان دس سپاہیوں کو ختم کر کے لے لیا۔

☆☆☆

فلسطین کی کہانی جس قدر دردناک ہے۔ اس سے کہیں زیادہ عبرت انگیز بھی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے فلسطین کے عربوں کو یہ فریب دیا کہ اگر ترکوں کے خلاف عرب، انگریزوں کا ساتھ دیں تو فتح کی صورت میں عربوں کو آزادی دے دی جائے گی۔ عرب اس دھوکے میں آ گئے اور اپنے ترک بھائیوں کے خلاف انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔ مکار انگریزوں نے ایک طرف عربوں کو دھوکہ دے کر اپنے ساتھ ملا دیا۔ دوسری طرف انہوں نے یہودیوں سے بھی ایک معاہدہ کیا جس میں یہ طے پایا کہ یہودی داسے درے انگریزوں کی مدد کریں گے۔ جس کے صلے میں فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے گا۔

۱۹۱۷ء میں فلسطین، عربوں کی مدد سے فتح ہو گیا لیکن بجائے عربوں کو آزادی ملنے

صدر اپنے اختیارات کے تحت جو فیصلہ کریں گے وہ میرے لئے قابل قبول ہے۔
”میں اپنے خصوصی اختیارات کے تحت خود کو اس مہم میں شامل کرنا زر قاتا نے کہا۔“ مجھے افسوس ہے کہ میں نمبر دو کے ایک اصولی اعتراض کو مجبور ہوں۔ میں نمبر ایک ہوں۔ میری گرفتاری یا موت کے بعد صدارت کی نمبر دو کو قبول کرنا ہوگی۔ اس لئے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ایک مہم ایک اور نمبر دو، دونوں شامل ہوں۔ میں نمبر دو سے معذرت خواہ ہوں۔ صدمہ ہو گا اس صدمے میں وہ مجھے برابر کا شریک سمجھیں۔ تمام ممبران کا خلوص پر فخر کرنا چاہئے۔“

آزاد تنظیم دیکھنے میں تو نو عمر طالب علموں کی جماعت تھی لیکن اپنے طور پر جو اصول و قواعد مرتب کئے تھے۔ ان میں بھی بڑی گہرائی اور گیرا تھی۔ مرکزی کمیٹی کی نامزدگی کے وقت زر قاتا کو نمبر ایک دے کر اسے منتخب کیا گیا تھا۔ صدر کے بعد نمبر دو سے نمبر دس تک ممبران کو اس طرح گئے تھے کہ نمبر ایک کی گرفتاری کے بعد نمبر دو خود بخود صدر کا عہدہ سنبھالتا۔ بعد نمبر تین اور اسی ترتیب سے ایک کے بعد دوسرا بغیر کسی نامزدگی یا انتخاب صدر ہوتا تھا۔ یہ ترتیب اس لئے قائم کی گئی تھی کہ ایک کے بعد دوسرے انتخاب یا نامزدگی کا جھگڑا نہ اٹھے۔ مرکزی کمیٹی کے خاص ممبر یا عام ممبروں کے لازمی قرار دیا گیا تھا کہ وہ مہم کے بعد فوراً دوسری مہم میں حصہ نہ لیں دوسرے ممبروں کو بھی اپنی کارکردگی دکھانے کا موقع مل سکے۔

چونکہ آج کے اشتہار نے لوگوں کے خفتہ جذبات کو بیدار کر دیا تھا اور انگریزوں کے خلاف نفرت کا پکٹا ہوا لاوا ایک دم پھٹ پڑا تھا اس لئے مزید اشتہار لکھے جائیں۔ اور انہیں صبح ہونے سے پہلے پہلے تل ابیب کے کوچہ میں چسپاں کر دیا جائے۔ اشتہار لکھنے کا سامان حویلی کے تہ خانے میں موجود تھا۔ اشتہار لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زر قاتا خود بھی اپنے ہاتھ سے اشتہار لکھتی لیکن اس وقت پولیس چھاؤنی اور ہنگانہ کے دفتر کے راستہ میں مورچہ لگانا تھا۔ ساتھیوں کو لے کر تہ خانے سے باہر آئی اور محفوظ راستوں سے گزرتی ہوئی

کے برطانوی وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کا اعلان دیا۔ اس اعلان نے عربوں کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں اپنی غلطی کا احساس دیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اعلان بالفور کو عربوں نے مسترد کر دیا۔ اور از سر نو

کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ لیکن یہودیوں کی آبادی فلسطین میں روز بروز بڑھتی رہی۔ دنیا سے یہودی سمٹ کر فلسطین میں جمع ہوتے رہے۔ عربوں نے بے شمار قربانیاں دیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور انجمن اقوام کی سفارش پر فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ نومبر ۱۹۴۷ء ہوا۔ یہودی تو اسی انتظار میں تھے اور عملاً ان کی ریاست پہلے ہی قائم ہو چکی تھی۔ انہوں نے اقوام متحدہ کے فیصلے کو تسلیم کر لیا لیکن عربوں کے لئے یہ فیصلہ قابلِ اعتراض تھا۔ ہنگاموں اور فسادات میں اضافہ ہو گیا اور عربوں کو بے پناہ جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ فلسطینیوں کی جدوجہد میں دوسرے عرب ممالک نے بھی مدد کی لیکن باہمی نا اتفاقی کی وجہ سے یہ مددگار ثابت نہ ہوئی۔

آخر برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین سے اپنی فوجیں لے گا اور اسی دن اسرائیل کی نئی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اس اعلان فلسطینیوں کی رگوں میں جھتے ہوئے خون میں ایک بار پھر گرمی پیدا ہو گئی۔ اب تحریک شروع ہوئی اس کی باگ ڈور اعتدال پسند سیاست دانوں اور مجاہدوں نے سنبھال لی۔ جن کا مقصد زندگی یہودیوں کو ہر صورت میں اور جگہ نقصان پہنچانا، چھاپے مارنے تھا۔ اس نئی تنظیم کی روح رواں زرقا تھی۔ جدوجہد وراثت میں ملی تھی۔

زرقا بڑی خوبصورت دوشیزہ تھی لیکن اس کے حسن کی صفات عام دوشیزوں سے مختلف تھیں۔ اس کے شہابی چہرے پر جمال کے بجائے ہر وقت ایک خاص جلال چھایا رہتا۔ خوبصورت کلاسیوں پر چڑے کے دستانے چڑھے ہوتے۔ جھیل

گہری آنکھوں میں فکر و تردد کے مرغولے گھومتے رہتے۔ سینے کے مدوجزر میں جلال انگوں کی بجائے طوفانوں کے ہچکولے ہوتے۔ نسیم سحر کے سب جھونکوں سے زرقا زلفیں لہراتیں لیکن ان ابھی زلفوں سے پیشک و عنبر کی خوشبو کی بجائے بارود کی

ایک ہفتے بعد تنظیم آزادی کے نمبر سات کو پولیس نے ہگانہ کے حوالے کر دیا۔ پولیس، نمبر سات سے تنظیم کے ممبروں کے نام اور پتے معلوم کرنے میں ناکام ہو گیا۔ اور زرقا کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اور ایک ہفتے میں اس نے پندرہ قانون پر حملہ کر کے بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اس وجہ سے ایوان ہگانہ نے نمبر سات کو

زرقا خالد الحسینی کی اکلوتی اولاد تھی۔ خالد کے والد کی بجلی کے سامان کی دکان تھی۔ جس سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی، جس سے اس مختصر گھرانے کو زندگی کی تمام ضروریات میسر ہو جاتی تھیں لیکن زرقا کی ماں اور باپ دونوں ہی تحریک آزادی فلسطین کے پرانے کارکن تھے۔ ان کی دکان کئی بار لٹ چکی تھی۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں لیکن ان کا جذبہ حریت سرد نہ پڑا تھا۔ زرقا نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور اس جذبے کو وراثت میں پایا۔ جب وہ ننھی سی بچی تھی تو والدین کی باتوں کو غور سے سنتی اور سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تیس سال کی مسلسل جدوجہد نے زرقا کے والدین کے اعضا مضحل کر دیئے تھے اور وہ تقدیر پر قانع ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ لیکن جب زرقا نے ہوش سنبھالا اور تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا تو انہیں اپنی بیٹی میں اپنی جوانی جھلکتی دکھائی دی۔

پولیس کی حراست سے اپنے یہاں بلوا لیا۔

ہنگانہ کے عقوبت خانے میں اقبال جرم کے لئے بڑے ہیمنہ طریقے اختیار جاتے تھے۔ نمبر سات کو جب اس قید خانے میں پہنچایا گیا تو پولیس کی ضربات پہلے ہی بے جان ہو رہا تھا۔ پولیس نے نمبر سات کو اندرونی مار ماری تھی۔ اس جسم پر بظاہر چوٹ یا ضرب کا کوئی نشان نہ تھا۔ مگر اس کے گوشت کو دھنک کر گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں یہاں لایا گیا تھا۔ اور دو دن تک اسی قید کی کوٹھڑی کے پتھرے فرش پر پڑا رہا۔ تیسرے دن اسے ہوش آیا تو نقاہر اس کی آنکھیں بمشکل کھلتی تھیں۔ جسم بالکل بے جان ہو رہا تھا۔ بھوک سے پیٹ پیلوں سے لگ گیا تھا۔ اور پیاس کی وجہ سے ہونٹوں پر پٹریاں جم گئی تھیں۔ نمبر سات کو اسی حال میں کوٹھڑی سے کھینچ کر باہر میدان میں لایا گیا۔ جہاں یسودی افسر پوچھ گچھ کا عمل شروع کرنے کے لئے برابر برابر کرسیوں پر بیٹھے۔ لوگ ہنگانہ کی دہشت پسند تنظیم کے رکن تھے۔ یہ تنظیم اور اس کے کارکن قہ ظلم و ستم کے نئے نئے تجربے کرتے۔ نمبر سات کو ان کے سامنے ایک کرسی لگایا گیا۔ پھر اس کے سامنے میز رکھ کر اس پر کھانا لگایا گیا۔ نمبر سات کو اس بات تعجب ہوا۔ اسے پچھلے تین دن سے کھانا یا تو ملا نہ تھا یا وہ درد کی وجہ سے کہ تھا۔ اس نے پہلے کھانے کو دیکھا پھر نظریں افسروں پر ڈالیں۔

”کھانا کھا لو نوجوان!“ ایک افسر نے بڑے پیار اور محبت بھرے لہجے میں نمبر سات کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”شکریہ“ کہہ کر اس نے سے بسم اللہ کہا اور کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”تم طالب علم ہو؟“ دوسرے افسر نے سوال کیا۔

نمبر سات نے اثبات میں سر ہلا کر ایک لقمہ منہ میں رکھا۔ حلق خشک لئے نوالہ انک گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا گلاس اٹھایا لیکن گلاس کو تیز منہ تک پہنچنے سے پہلے ہی اچک لیا۔

”تمہارے ساتھ کتنے اور طالب علم ہیں؟“ افسر نے گلاس کو اس کے قریب کرتے ہوئے پوچھا۔ نمبر سات کے گلے میں نوالہ اٹکا ہوا تھا۔ اس نے نوالہ

اور افسر کو گھورنے لگا۔

”ہاں“ ہاں بتاؤ! کون کون طالب علم ہیں تمہارے ساتھ؟“ افسر نے گلاس اس اور قریب کر دیا۔ نمبر سات نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ہاں بتاؤ نوجوان!“ افسر نے اسی نرمی سے کہا۔ ”ہم تمہیں اور تمہارے بول کو محض تنبیہ کر کے چھوڑ دیں گے۔“

”میں نہ کسی کے ساتھ ہوں اور نہ کوئی میرا ساتھی ہے۔“ نمبر سات مختصر بڑے کر خاموش ہو گیا۔

”خیر چھوڑو اس بات کو۔ ہم طالب علموں کو معاف کرتے ہیں۔“ افسر نے بات ”صرف یہ بتا دو کہ پولیس چھاؤنی پر حملہ کرنے والے کون لوگ تھے ہم تمہیں

دیں گے؟“

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

”چھاؤنی پر حملے کے وقت تم وہاں موجود تھے؟“

”ہاں“ میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھا تو کھڑا ہو گیا۔“

”پھر تم نے حملہ آوروں میں سے کسی کو تو دیکھا ہو گا؟“

”میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔“ نمبر سات نے گردن جھکا لی۔ اس کے پیچھے بے ہوئے سپاہی نے بال پکڑ کر اس کی گردن اوپر کر دی۔

”صرف ایک کا نام بتا دو اور اپنی جان چھڑاؤ۔“ پولیس افسر نے پانی کا گلاس کے ہاتھوں میں دے دیا۔

نمبر سات نے گلاس جلدی سے منہ سے لگا لیا لیکن وہ گھونٹ نہ بھر سکا۔ افسر ہاتھ مار کر گلاس گرا دیا۔ گلاس فرش پر گر کر چٹکنا چور ہو گیا۔ پانی خشک زمین میں بہ ہو گیا۔

”گھبراؤ نہیں۔ کھانا پانی موجود ہے۔“ افسر مسکرایا۔ ”آزادی حاصل کر سکتے ہو۔ ایک نام بتا کر۔“

”میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں نے کسی کو نہیں پہچانا۔“ نمبر سات نے بڑے غصے سے جواب دیا۔

ٹھوکر میں مارنا شروع کر دیں۔ صبر کا پیکر مجاہد گیند کی طرح زمین پر ادھر سے ادھر لڑھکتا رہا۔ اس طرف سے ٹھوکر پڑتی تو دوسری طرف لڑھک جاتا۔ دوسرا ٹھوکر مارتا تو لڑھکتا ہوا ادھر آ جاتا۔ اس کے جسم کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی اور زخموں سے خون رینے لگا۔ ظالموں نے بیسوں پر بس نہ کیا بلکہ ان تازہ زخموں میں نمک بھر دیا۔ تکلیف کی شدت سے مجاہد تڑپ اٹھا۔ لیکن اس نے زبان نہ کھولی۔ وہ اپنے ملک اور قوم سے غداری نہ کر سکا اور اس تکلیف اور ظلم کو بھی سہ گیا۔ تفتیش کرنے والے اس کی سخت جانی کو دیکھ کر اور زیادہ جھلا جاتے اور ظلم میں اضافہ کر دیتے۔

نمبر سات کے علاوہ ہنگانہ کے قید خانے میں اور بھی قیدی تھے۔ ان پر بغاوت کا الزام تھا۔ انہیں بھی مختلف قسم کی سزائیں دی جاتیں لیکن نمبر سات کی طرح ان پر نقد نہ ہوتا۔ ان میں جو کم ہمت ہوتے وہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ کے چھوٹ جاتے۔ ایسے لوگوں کا تعلق تنظیم سے نہ تھا۔ وہ وقتی جذبے کے تحت ہنگامہ آرائی کرتے تھے اور جوش کم ہوتے ہی معافی مانگ کر رہا ہو جاتے تھے۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے نمبر سات پر ظلم میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کی سختی میں اس دن اور زیادہ اضافہ ہو جاتا جس دن ہنگانہ والوں کو معلوم ہوتا کہ ”تنظیم“ نے کوئی اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ چاروں افسر، نمبر سات پر اس طرح پل پڑتے جیسے اس قیدی نے ان کے کسی دفتر یا تھانے کو برباد کیا ہے۔ ایک دن ایک تھانے میں آگ لگنے کی خبر آئی جس میں گیارہ یہودی زندہ جل کر مر گئے۔ اس دن نمبر سات پر زیادہ آفت پڑی۔ اس کے جسم کو کند چھریوں سے چھیدا گیا۔ چہرے کو جلتے سگریٹوں سے داغا گیا۔ نمبر سات کے ہاتھ کی انگلیاں دروازوں میں دبا کر پھل دی گئیں۔ انگلیوں کی نازک ہڈیاں تک سرمہ ہو گئیں۔ اور ناخن جدا ہو گئے۔ یہ تکلیف نمبر سات کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ کئی دن تک وہ بھوکا، ننگا بے ہوش پڑا رہا اور اس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔

ایک دن نمبر سات کو پھر افسروں کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس کی حالت اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا۔ اسے اس کی تنگ و تنگ کوٹھڑی سے گھسیٹ کر افسروں کے سامنے لایا گیا۔

”تم کسی کو نہیں پہچانتے۔ لیکن تم کو پہچانا گیا ہے۔“ افسر کا لہجہ ذرا نرم تھا۔
”تمہاری شناخت ہو چکی ہے۔ تم حملہ آوروں میں شامل تھے۔“
”یہ غلط ہے۔ میں نے کسی حملے میں حصہ نہیں لیا۔“ نمبر سات نے مدافعت کر دیا۔
”تمہارا نام کیا ہے۔ کہاں پڑھتے ہو۔ کس جگہ رہتے ہو؟“ چوتھے افسر نے لہجے میں پوچھا۔

”میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“ نمبر سات بڑی جرات سے بولا۔ ”میں اپنے کر اپنے عزیزوں کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔“
”یوں نہیں بتائے گا یہ!“ ایک افسر چیخا۔ ”لنکا دو اسے۔“

نمبر سات کو ایک کھبے کے سارے الٹا لٹکا دیا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کا سر زمین سے چار فٹ بلند تھا۔ پھر اس کے نیچے اسٹول پر پانی کا بھرا ہوا ایک ٹب رکھا گیا۔ نمبر سات کا سر گردن تک ڈوب گیا۔ سانس رکنے لگی۔ اور وہ سر کو جھٹکے دینے لگا۔ اس دلدوز نظارے، محفوظ ہو رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے اور انسانیت رو رہی تھی۔ آنسو بہا رہا ہنگانہ کے شقی القلب افسر دیر تک اس جاں گداز کھیل سے فرحت حاصل رہے۔ پھر نمبر سات کو کھبے سے اتار کر دوبارہ کرسی پر بٹھایا گیا۔ یہودی افسر نے شراب آگنی۔ انہوں نے شغل سے نوشی شروع کر دیا۔ نمبر سات کے کرسی کے ساتھ بندھے تھے۔ اور اس کے سامنے کھانے کی میز رکھی تھی۔ اس میں پانی بھرا تھا۔ جس کی سطح پر سورج کی کرنیں منعکس تھیں۔

اگلے تین دن تک نمبر سات کو اسی طرح الٹا لٹکا کر پانی میں غوطے دیا۔ اب اس نے چپ سادھ لی تھی۔ وہ افسروں کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا تھا۔ بہت کھانا ضرور دیا جاتا تاکہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رہے۔ نمبر سات کو سینے کا عادی ہو گیا تو ان ظالموں نے ایک دوسرا ظلم آزمایا۔ نمبر سات کو میں لاکر برہنہ کر دیا گیا۔ پھر اسے زمین پر گرا کر دو سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ برہنہ جسم پر ٹھوکر ماریں۔ سپاہیوں نے اس کے جسم کو بھاری بوٹوں سے

الوفی کی بہت تعریف کی ہے۔ ہمارے نمبر سات کے بارے میں تم نے جو تفصیل بیان کی اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تم تنظیم کے لئے بڑے خلوص سے کام کر رہے ہو مگر تمہارے بارے میں ہمارے بعض ممبروں کو شبہ ہے کہ تم "نلا" یہودی ہو اور یہودی ہمارے لئے سب سے بڑی گالی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم اس شبہ کو دور کر دو تاکہ ہم تمہاری درخواست پر غور کر کے کچھ فیصلہ کر سکیں۔"

"محترمہ صدر صاحبہ!" مخبر نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "دنیا کی نظروں میں، میں یہودی ہوں اور ایوان ہنگانہ کا ہر چھوٹا بڑا مجھے شامل کے نام سے جانتا ہے لیکن حقیقت میں میرا نام عبداللہ ہے اور میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ میرے ماں باپ بھی آپ کی طرح بڑے پر جوش مجاہد تھے۔ میری عمر اس وقت مشکل سے چار یا پانچ سال ہو گی جب میں اپنے گھر میں یہودیوں کے بارے میں باتیں سنا کرتا تھا۔ مجھ میں اتنی سمجھ تو نہ تھی مگر مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہودی ہمارے دشمن ہیں۔ پھر ایک دن ہمارے گھر کو پولیس نے گھیر لیا۔ اس وقت میرے گھر میں میرے ماں باپ کے علاوہ دس بارہ آدمی بھی موجود تھے۔ جو یہودیوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ان سب نے ایک زبان ہو کر کہا۔ "یہودی پولیس نے ہمیں گھیر لیا ہے۔" اسی وقت کمرے میں بندوقین لئے پولیس والے گھس آئے اور اندھا دھند گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ میں ڈر کے مارے پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ پولیس والوں نے تمام آدمیوں کو مار ڈالا۔ ایک پولیس والے نے میری ٹانگ پکڑ کر پلنگ کے نیچے سے کھینچ لیا اور اپنے گھر لے آیا۔ مجھ پر ایسی دہشت سوار ہوئی کہ اس کے گھر پہنچتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنے دن بے ہوش رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو پولیس والا اور اس کی بیوی مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں دیکھتے ہی چیخا شروع کر دیا۔ پولیس والے کی بیوی نے مجھے چکارا اور گود میں اٹھا لیا۔ اس سے میرا ڈر دور ہو گیا اور میں اس کے گھر میں رہنے لگا۔"

شائل کہتے کہتے رکا۔ شاید وہ کچھ بھول رہا تھا اور پچھلے واقعات کو ذہن میں ترتیب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ تمام ممبران سر جھکائے خاموشی سے شائل کی زندگی کے حالات سن رہے تھے۔ زر قانے سے زیادہ متوجہ تھی۔ اسے اپنے اور شائل کے

"تم اب بھی اپنی جان بچا سکتے ہو نوجوان!" ایک افسر نے نرمی سے کہا۔ نقاہت کی وجہ سے نمبر کی سات کی آنکھیں نہ کھلتی تھیں۔ اس نے بڑی نظر سے آنکھیں کھول کر سوال کرنے والے کو دیکھا۔

"دیکھو جوان! تمہارے زخم جلد بھر جائیں گے۔ ہم خود تمہاری مرہم بن کر دیں گے۔" افسر نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "ایک صرف ایک بات بتا دو۔ تمہارا گروہ میں جو لڑکی شامل ہے وہ کون ہے اس کا نام کیا ہے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں فوراً چھوڑ دیں گے۔"

نمبر سات کے ڈوبتے دل کو جیسے سارا سا مل گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ زر قانے ضرور کوئی ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے انہیں اس کی تلاش ہے۔ وہ تھوڑی دیر تک اس کو خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس کا سر پکڑا اور اس نے گردن ڈال دی۔ پندرہ دن کی شدید تکلیف کے بعد اس مجاہد نے موت کو گلے لگا کر شہیدوں میں اپنا نام لکھوا لیا۔ جس وقت نمبر سات کی لاش افسروں کے سامنے پیش کی گئی تو ان کے چہرے اپنی ناکامی کی وجہ سے سیاہ پڑ گئے تھے لیکن مرنے والے کا چہرہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح تروتازہ تھا۔

مخبر نے نمبر سات پر پندرہ دن میں توڑے جانے والے ظلم و ستم کی داستان اتنے پر درد انداز میں بیان کی کہ سننے والے تڑپ تڑپ اٹھے۔ زر قانے غم اور کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی انگلیاں بھیجنے لیں۔ "اے شہید! تیرا انتقام لیا جا گا۔" زر قانے جیسے خود کلامی کی۔

"ہم ضرور شہید کا انتقام لیں گے۔" زر قانے کے ساتھیوں نے اس کی تائید کی۔ اس وقت مرکزی کمیٹی کے نو کے نمبر تہ خانے میں بیٹھے نمبر سات کے ظلم و ستم اور شہادت کے واقعات، مخبر کی زبان سے سن رہے تھے۔ مخبر سترہ اٹھارہ سال ایک خوبصورت جوان تھا۔ اور چہرے مہرے سے یہودی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے پر اس وقت بھی ایوان ہنگانہ کے باورچی کے سرکاری کپڑے تھے اور قمیض کی جیب یہودیوں کا بیج لگا تھا۔

"معتبر مخبر!" زر قانے مخبر کو مخاطب کیا۔ "تنظیم کے مگران نے تمہاری"

حالات میں بڑی مطابقت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ؛
شائل اپنی زندگی کے بجائے اس کی زندگی کے اوراق الٹ رہا ہے۔ وہ بھی ا۔
والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ بھی تین سال کی عمر سے اپنے گھر میں آزاد فلسطین
نعرے سنتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے گھر میں بھی حریت پسندوں کا اجتماع ہوا کرتا
شائل کی زندگی اور اس کی زندگی میں صرف یہ فرق تھا کہ شائل کے والدین شہداء
چکے تھے اور زر قاق کے ماں باپ اب تک حیات تھے۔ اور گوشہ نشینی کی زندگی گزار
رہے تھے۔ انہوں نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لیکن انہوں۔
زر قاق پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ زر قاق نے ہوش سنبھالتے ہی تحریک آزادی
حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اور تنظیم کی صدر ہونے کے بعد تو وہ تنظیم کی ہی ہو کر
گئی تھی۔ وہ ہفتوں اور مہینوں اپنی گونہ گون مصروفیتوں کی وجہ سے گھر بھی نہ جاتا
مگر جب وہ گھر جاتی تو والدین اس سے اسی محبت سے پیش آتے۔ اس کے کارناموں
حال سن کر خوش ہوتے۔ وہ مشورے بھی دیتے اور اس کی سلامتی اور کامیابی کی
بھی مانگتے۔ حالات کی اس مطابقت نے زر قاق کے دل میں شائل کے لئے ہمدردی۔
جذبات پیدا کر دیئے۔

۱ شائل نے واقعات کو مرتب کرنے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔ ”میں یہودیوں
میں رہ کے یہودی ہو گیا۔ انہی کے ساتھ اور ان کی طرح عبادت کرتا۔ پولیس وا۔
نے مجھے گھر کے کام میں لگا لیا تھا۔ اور اس کی بیوی مجھے کھانا پکانے کی تربیت دے
تھی۔ اس طرح میں بہت جلد ایک ماہر باورچی بن گیا۔ پھر تین سال پہلے جب ابوا
ہنگانہ کے افسروں کو ایک اچھے باورچی کی تلاش ہوئی تو مجھے پرورش کرنے والے سپاہی
نے مجھے ایوان میں بھیج دیا۔ جب سے میں وہاں مقیم ہوں اور ہر شخص مجھے عزت
دیکھتا اور مجھ پر اعتبار کرتا ہے۔“

اس وقت نمبر تین زور سے کھنکارا اور مخبر شائل کا سلسلہ کلام رک گیا۔ زر
نے نمبر تین کو چونک کے دیکھا، پوچھا۔ ”نمبر تین! شاید تم کچھ کہنا یا پوچھنا چاہتے ہو۔
تم ہر قسم کا سوال کر سکتے ہو۔ ہمیں شائل کے بارے میں بڑا اہم فیصلہ کرنا ہے بشرطیکہ
ان کی ذات شک و شبہ سے پاک اور بالا تر ہو جائے۔“

”مجھے شائل کی باتوں پر کوئی شبہ نہیں۔ نمبر ایک!“ نمبر تین نے کہا۔ ”میں تو یہ
سوچ رہا تھا کہ شاید شائل کو اس تمام عرصے کے دوران یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ
مسلمان ہے اور اس کے والدین کو یہودیوں نے اس کی نظروں کے سامنے قتل کیا
ہے۔“

”نمبر تین نے جو بات کسی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔“ شائل بولا۔ ”میں خود یہی
کہنا چاہتا تھا۔ جس سپاہی کے گھر میں پرورش پا رہا تھا ان کا رویہ میرے ساتھ اس قدر
مشفقانہ تھا کہ میں اپنے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ میرے ذہن میں کبھی یہ خیال
ہی نہیں آیا کہ میری اصلیت کیا ہے۔ اور مجھ پر کیا جاتی ہے۔ میں خود کو شائل یہودی
سمجھتا تھا۔ اور سپاہی اور اسکی بیوی کو اپنے ماں باپ جانتا تھا۔“

”اور پھر کسی حادثہ نے تمہیں اپنا ماضی یاد دلایا۔“ زر قاق نے دخل دیا۔
”جی ہاں صدر!“ شائل نے چونک کر زر قاق کا منہ حیرت سے دیکھا۔ ”مگر آپ کو
یہ کیسے معلوم ہوا میں نے یہ بات اب تک کسی کو نہیں بتائی۔“

”شائل! تم نے مجھے نہیں بتایا لیکن میں نے باتوں سے اندازہ لگا لیا۔“ زر قاق
نے اسے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بات کوئی عجیب یا انہونی نہیں ہے۔ میں نے
بہت سے واقعات پڑھے اور سنے ہیں جن میں لوگ کسی صدمے کے تحت اپنی
یادداشت کھو بیٹھتے ہیں۔ اور اپنا ماضی بالکل بھول جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح کسی حادثے
سے دوچار ہونے پر ان کی یادداشت ایک دم واپس آ جاتی ہے۔ تم تو ایک دوہرے
حادثے سے گزرے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ ایک تو تمہارے والدین کو تمہاری نظروں
کے سامنے شہید کیا گیا دوسرے یہ کہ اس واقعے کے وقت تم بہت کم عمر تھے۔ تمہاری
یادداشت کھونے کا سبب یہ دونوں باتیں ہو سکتی ہیں، خیر یہ تو میرا اندازہ ہے۔ تم یہ
بتاؤ کہ تمہیں کب اور کس طرح اپنی شخصیت کا احساس ہوا؟“

شائل نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس دن کو میں نہیں بھول سکتا۔ وہ
دن میری زندگی میں ایک ایسا انقلاب لے آیا جس نے میری کایا پلٹ کے رکھ دی۔
اس روز میں کسی کام سے بازار گیا ہوا تھا۔ میری قمیض پر ہنگانہ کا بچ لگا ہوا تھا۔ عرب
عوام ہنگانہ والوں سے بہت خوفزدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ ان پر جتنے ستم توڑے جاتے ہیں

چھاپا۔ تلاش لے کے اطمینان کر لو۔ یہ کمرہ تو تیرہ سال سے اسی طرح خالی پڑا ہے۔“
میں اسے بغیر جواب دیئے کمرے میں داخل ہو گیا کمرے کے پتھوں بیچ ایک چارپائی پڑی تھی۔ جس پر میری ماں اور باپ بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑے خون میں تر تھے۔ اور تازہ تازہ خون زخموں سے ابل رہا تھا۔ لیکن ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”عبداللہ۔۔۔“ میری ماں نے مجھے مخاطب کیا۔ ”بیٹا! تو ہم کو بالکل ہی بھول گیا۔ تو نے اپنا دین بھی چھوڑ دیا۔ یہودی تجھے کچھ نہ دیں گے۔ یہ تو عربوں سے ان کے گھبراہٹنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“

میں دو قدم ان کی طرف بڑھا۔ پشت سے بڑھیا کی آواز سنائی دی۔ ”دیکھ لیا۔۔۔ میں نہ کہتی تھی کہ کمرہ بالکل خالی ہے۔ اس میں کوئی نہیں رہتا۔۔۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

میرا جی چاہا کہ میں پلٹ کر کہوں کہ تو کمرے کو خالی کہتی ہے۔ یہاں میرے ماں باپ موجود ہیں۔ میری جنت تو اسی گھر میں ہے۔ لیکن میں جواب دینے کے بجائے دو قدم اور آگے بڑھ گیا۔

”بس بیٹے عبداللہ!۔۔۔“ میرے باپ نے مجھے اشارے سے روکا۔ ”اب آگے نہ بڑھنا۔ ہمارے میل کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ہماری طرح تم بھی شہادت پاؤ گے لیکن ابھی نہیں۔ تمہیں کچھ دن اور انتظار کرنا ہو گا۔“

میں نے چاہا کہ دوڑ کر اپنے باپ سے پلٹ جاؤں لیکن اسی وقت بڑی بی میرے پیروں سے پلٹ گئیں۔ ”میں جھوٹ نہیں کہتی، یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے کسی کو اس کمرے میں نہیں چھاپا۔ یہ کمرہ تو تیرہ سال سے خالی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔“

میں نے جھک کر بڑی بی کو پیروں سے اٹھایا تاکہ انہیں پتاؤں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ کمرہ خالی نہیں ہے یہاں میرے ماں باپ رہتے بستے ہیں۔ لیکن جب میں نے سیدھے ہو کر چارپائی کی طرف دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ بے ساختہ میری زبان سے ”ماں“ نکلا اور میں گھبرا کر خالی کمرے میں نظریں دوڑانے لگا۔

ان میں ہگانہ والوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہگانہ کا بیج لگائے ہوئے اگر کوئی بازار میں پھٹ جائے تو لوگ اسے سلام کرتے اور بڑی عزت سے پیش آتے ہیں۔ حالانکہ ان کے دلوں میں اس کے لئے نفرت ہوتی ہے۔ بازار میں اپنا کام ختم کر کے اور کچھ سالان لے کر میں محلہ کی ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ اس وقت میں اپنی ترقی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایوان ہگانہ کا ہر افسر مجھ سے خوش تھا۔ اور مجھے باورچی کے کام سے ہا کے دہشت پسند جماعت میں شمولیت کی سفارش کر رہا تھا۔ یہ میرے لئے ایک بہت بڑا اعزاز تھا کیونکہ دہشت پسند تنظیم کے ہر رکن کو معقول تنخواہ کے علاوہ لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ انہیں عربوں کو قتل بلکہ قتل عام کرنے کی پوری اجازت تھی۔ وہ ہر جگہ اور ہر معاملے میں دخل دے سکتے تھے۔ میں ان ہی خیالات میں گم تھا۔ مجھے یہ قطعی ہوش نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں اور کہاں سے گزر رہا ہوں کہ ایک دم میرے قدم ایک مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے۔ ڈیوڑھی میں قدم پڑتے ہی میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میں نے ڈیوڑھی میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور خود پر تعجب کرنے لگا کہ میں آخر یہاں کیوں آ گیا اور یہ کون سی جگہ ہے کس کا گھر ہے میں ڈیوڑھی سے نکلنے کے لئے گھوما تو جیسے زمین نے میرے قدم پکڑ لئے اور غیبی آواز نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔

”عبداللہ کہاں جا رہا ہے یہ تیرا گھر ہے، تیرا عبداللہ؟“

اس آواز نے مجھ پر سحر سا کر دیا اور میں جیسے خود کو بھول گیا۔ میں آہستہ آہستہ ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا مکان کے آگن میں پہنچ گیا۔ آگن کے دائیں بائیں دو کمرے تھے۔ اور سامنے والا کمرہ بڑا تھا۔ بڑے کمرے میں کنڈی لگی ہوئی تھی۔ کوئی غیر مرئی طاقت مجھے کھینچ کر اس کمرے تک لے گئی۔ اسی وقت ایک بوڑھی عورت چھوٹے کمرے سے نکل کر میرے پاس آئی۔ اور ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے بولی۔ ”ہم نے کچھ نہیں کیا۔ ہم بے قصور ہیں۔ ہمیں معاف کر دو؟“

مجھے بوڑھی عورت کی آواز کہیں دور سے آتی معلوم ہوئی۔ میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ہاتھ بڑھا کر کمرے کی کنڈی کھول دی۔ ”اس میں کوئی نہیں۔“ بڑھیا گڑگڑائی۔ ”میں نے کسی کو اپنے گھر میں نہیں

”بڑی بی تم ٹھیک کہتی ہو۔ کمرہ خالی ہے۔“ اور میں تھکا تھکا سا خالی چارپائی بیٹھ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دائیں بائیں میرے ماں باپ بیٹھے ہیں۔ اور ان کی سانس میرے رخساروں سے ٹکرا رہی ہے۔

”اس وقت گھر کے دروازے پر لوگوں کے بولنے کی آواز آئی۔ میں گھر سے باہر نکل آیا تو دیکھا کہ تمام محلہ دروازے پر اکٹھا ہے۔ ایک بڑے میاں جن کی کمر مستقل رکوع تک خنیدہ تھی۔ لکڑی ٹیکتے میرے قریب آ کے بولے ”جناب اس بوڑھی خاتون کی شرافت کا پورا محلہ گواہ ہے۔ ہم لوگ امن پسند ہیں۔ آپ کو ضرور کسی نے ہکا کر یہاں بھیجا ہے۔ آپ اسے معاف کر دیجئے۔“

میں عجب شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک دل کتنا کہ انہیں بتا دوں کہ میں کون ہوں اور اس گھر سے میرا کیا تعلق ہے مگر مصلحت میری زبان روک رہی تھی۔ آخر میں نے انہیں مطمئن کرنے کے لئے کہا ”آپ لوگ مطمئن ہو کر اپنے گھروں کو جائیے۔ میں یہاں کسی برے ارادے سے نہیں آیا۔ بڑی بی نے ایک بار مجھ پر احسان کیا تھا۔ میں اس سلسلے میں یہاں آیا ہوں تاکہ ان کا شکریہ ادا کروں اور ان کے احسان کا کچھ صلہ دوں۔“

”محلے والے میرے جواب سے خوش ہو گئے اور ایک ایک کر کے واپس ہو گئے۔ واپس کمرے میں آیا تو دیکھا بڑی بی ایک کونے میں دبکی کھڑی ہیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بددا رہی ہیں۔ میں نے ان کا نام پوچھا تو انہوں نے ”سکینہ“ بتایا۔ میرے ذہن میں ماضی کے تمام درجے کھل چکے تھے اور پورا بچپن نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ میں نے انہیں فوراً پہچان لیا۔ وہ میری خالہ تھیں جو مجھے اکثر گود میں لے کر مجھے زور زور سے پیار کرتی تھیں۔ وہ مجھے ہمیشہ عبدل کے نام سے پکارتی تھیں۔ میں نے بڑھ کر زبردستی ان کے ہاتھ چوم لئے اور کہا۔ ”سکینہ خالہ! مجھے پہچانو میں تمہارا عبدل ہوں۔ تمہارا بھانجا۔ مجھے آج اس گھر میں آکر میرا ماضی مل گیا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ماں باپ کو ظالم یہودیوں نے اسی کمرے میں گولیاں مار کر ختم کیا تھا۔“

”سکینہ خالہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ انہیں کسی طرح میری باتوں کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ پھر میں نے انہیں

اپنے بچپن کے بعض حالات بتائے اور اپنے ماں باپ پر گزرنے والے خونی حادثے کی تفصیل سنائی۔ میری باتوں میں صداقت تھی۔ آخر میری خالہ کو میری باتوں پر اعتبار آ گیا۔ اور وہ اتنی خوش ہوئیں کہ مجھ سے لپٹ کر دیر تک روتی رہیں۔ میں نے اپنے رے میں انہیں سب کچھ بتا دیا اور تاکید کی کہ یہ باتیں ابھی کسی اور کو نہ بتائی جائیں۔

”اب میں اوپر سے شامل اور اندر سے عبد اللہ تھا۔ میرے اندر ایک نئی نصیت نے جنم لیا تھا۔ میں بظاہر یہودیوں کی خدمت کرتا رہتا لیکن دل میں یہ ٹھان لیا تھا کہ ان سے انتقام لوں گا۔ اسی جذبے کے تحت میں نے تنظیم آزادی سے رابطہ قائم کیا اور بڑی مشکل سے یہ یقین دلا سکا کہ میں اصل میں مسلمان عرب ہوں۔ اسی طرح میں مخبری کرتے کرتے آج آپ لوگوں تک پہنچ گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے قاعدہ تنظیم کا رکن بنا لیا جائے اور دوسرے ممبروں کی طرح میرے سپرد بھی کوئی اہم کام کیا جائے۔“

شامل کی درد اور حیرت انگیز داستان نے ہر ایک کو متاثر کیا۔ حقیقت یوں بھی ہوا اثر دکھاتی ہے۔ شامل کو تنظیم کا ممبر بنا لیا گیا۔ اور اسے مرکزی کمیٹی میں آخری برہمنی دس نمبر کا نام دیا گیا۔ شامل کو کوئی نیا کام سپرد کرنے کے بجائے زر قانے سے حکم دیا کہ وہ حسب معمول ہنگامہ میں شامل بن کر کام کرتا رہے کیونکہ یہودیوں کی فحری ہی ایک بہت بڑا کام ہے۔

شامل کے مرکزی کمیٹی میں شامل ہونے سے حریت پسندوں کو بڑا فائدہ ہوا۔ ناکل دوسرے تیسرے دن موقع نکال کر ان کی مجلس میں شرکت کرتا اور یہودیوں کے فوجی ٹھکانوں اور منصوبوں سے انہیں آگاہ کرتا۔ زر قانے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان ٹھکانوں کو نشانہ بناتی۔ یہودیوں کو تعجب تھا کہ ان کے اہم فوجی ٹھکانوں کی خبر حریت پسندوں کو کس طرح ہو جاتی ہے۔ انہیں یہ گمان تو ضرور ہوا کہ تنظیم کا کوئی آدمی ان میں شامل ہے لیکن وہ اسے تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ زر قانے کسی نہ کسی جگہ ہنگامہ بپا کرتی اور یہودیوں کا جانی اور مالی نقصان کرتی رہی۔

۱۹۴۸ء کا دن بڑی تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ اس دن انگریز فوج کو

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”اس مدد کے بدلے ہی میں ہمیں حکومت کا اہل سمجھا جائے۔ لیکن اسرائیل کی حکومت کا اس فارمولے سے کوئی تعلق نہیں۔“

”پھر آپ اپنی قوم کے لئے اور کیا چاہتے ہیں؟“ برطانوی گورنر نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم نے فارمولے کے حصول کے لئے آپ کو منہ مانگی رقم کی پیش کش پہلے ہی کی تھی۔ وہ اب تک قائم ہے۔ فرمائیے آپ اس کی کیا قیمت چاہتے ہیں۔ تاج برطانیہ نے مجھے اس سلسلے میں پورے اختیارات دیئے ہیں۔“

”مجھے نقد رقم نہیں چاہئے، گورنر صاحب!“ ویزمن رکھائی سے بولا۔

”پھر آپ کو کیا چاہئے؟“ گورنر جھلا گیا۔ ”گفتگو کی تحریک آپ کی طرف سے ہوئی ہے۔ اگر آپ فارمولے کی قیمت نہیں لے سکتے تو پھر آپ اور کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب سے بڑی قیمت تو آپ کو اس نئی حکومت کی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ اسرائیلیوں اور آپ کو تاج برطانیہ کا احسان مند ہونا چاہئے۔ تمام دنیا بھاری ہمارے خلاف ہو رہی ہے۔ لیکن ہم اپنے وعدے کے مطابق ۱۵ فروری کو نوٹی اختیارات منتقل کر دیں گے۔“

”آپ ہمیں احسان کا طعنہ نہ دیجئے گورنر صاحب!“ ویزمن ترشی سے بولا۔

”اسرائیلی حکومت کا قیام آپ کا احسان نہیں۔ یہ تو ہماری فوجی مدد اور اس دولت کا راز ہے جو ہم جنگوں میں خرچ کرتے رہے ہیں۔ میرا فارمولا اس سے بالکل الگ سلسلہ ہے۔ اس کی گفتگو آپ کو الگ کرنا ہو گی۔“ ویزمن نے رک کر انگریز گورنر کو دیکھا۔ گورنر اس کی گفتگو پر برا فروخت ہو گیا تھا اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ویزمن نے فوراً اپنا لہجہ بدلا اور نرمی سے کہا۔ ”انگریز گورنر کو اہم معاملات میں غمیدہ ہونا چاہئے لیکن میں گورنر کے چہرہ پر غصے کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ عجیب بات ہے کہ میں تو الکوحل کا فارمولا آپ کو دینے آیا ہوں اور آپ کا غصہ اس سودے کی بات لگائے بغیر اسے مسترد کر دینا چاہتا ہے۔ بتائیے تاج برطانیہ اس فارمولے کی کیا بات ادا کرے گا؟“

”منہ مانگی رقم۔“ گورنر نے جزبہ ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔ گورنر!“ ویزمن نے فوراً جواب دیا۔

فلسطین سے رخصت ہونا تھا۔ اور فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اسرائیلی حکومت قائم ہونا تھی۔ کہتے ہیں کہ ویزمن نامی ایک یہودی سائنس دان شراب کو صاف کر کے الکوحل تیار کرنے کا فارمولا تیار کیا تھا۔ انگریز اس فارمولے سے بہت متاثر تھے۔ اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ویزمن نے موقع پر اپنی قوم کے لئے زبردست سودے بازی کی اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ ویزمن نے فلسطین کے انگریز گورنر اور کمانڈر کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اس کے فارمولے کے سلسلے میں اس سے گفتگو کرنا چاہتا ہے۔ گورنر پہلے بھی کم ویزمن کو اس فارمولے کے لئے بڑی سے بڑی رقم ادا کرنے کی پیش کش کر چکا لیکن ویزمن نے انکار کر دیا تھا۔ اب جو ویزمن کی طرف سے گفتگو کی تحریک ہو رہی ہے وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ویزمن کو فوراً ”گفتگو کے لئے بلوا لیا۔ تاج برطانیہ فلسطین کے لئے یہ طے کیا تھا کہ ۱۵ فروری کو اسرائیل کی حکومت تو قائم کر دی گئی اور تمام اختیارات یہودیوں کو منتقل ہو جائیں گے۔ لیکن اسرائیل کا پہلا برطانیہ کا نمائندہ ہو گا۔ یہ صدر گورنر جنرل کہلائے گا۔ اس کے ماتحت نائب جنرل یا صدر یہودی ہو گا۔ جسے چھ ماہ یا ایک سال کے اندر اندر تربیت دے کر اختیارات منتقل کر دیئے جائیں گے۔ یہودیوں نے پہلے اس کی مخالفت کی تھی مصلحتاً وہ اسے برداشت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ ویزمن نے ان کی یہ مشکل آسان کر دی۔

ویزمن نے بڑے سکون اور اطمینان سے برطانوی فوجی گورنر سے کہا۔ ”الکوحل کا فارمولا میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کا فائدہ میری (یہودی) کو پہنچے۔“

”ہم تمہاری قوم کے ہمدرد ہیں ویزمن!“ برطانوی گورنر بولا۔ ”ہماری کوششوں سے اسرائیل کی نئی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ ہم یہ کب چاہتے ہیں اس فارمولے سے تمہاری قوم کو فائدہ نہ پہنچے۔ فارمولے کے مالک تو تم ہی ہو۔ تاج برطانیہ تمہارے اس فارمولے میں شریک ہونا چاہتا ہے۔“

”میری قوم نے جنگ کے دوران حسب وعدہ تاج برطانیہ کی مدد کی ہے۔“

”یہ کام اتنا مشکل نہیں گورنر صاحب!“ ویزمن نے پلٹ کر جواب دیا۔
”اسرائیل اور برطانیہ کے اس خفیہ معاہدے کی خبر ابھی نہ تو برطانوی عوام کو ہے اور
نہ عام اسرائیلیوں کو۔ دنیا کو بھی نہیں معلوم کہ اسرائیل کا پہلا صدر کون ہو گا۔ مجھے
امید ہے کہ تاج برطانیہ کو میرا فارمولا اس قیمت پر منگنا نہ پڑے گا۔“

ویزمن اپنی کمان کا سب سے ملک تیر چلا کر باہر نکل گیا۔ برطانوی گورنر پھٹی
پہلی نظروں سے اس عجیب سائنس دان کو دیکھتا رہ گیا۔

یہودی سائنس دان ویزمن کا مطالبہ، برطانیہ بھیجا گیا۔ برطانیہ کی کینٹ میں
اس پر خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ کینٹ کے ممبر دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک
گروہ اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ اسرائیل کو ایک دم آزاد نہ کیا جائے اور گورنر جنرل
کی شکل میں انگریزوں کے مفادات وہاں محفوظ رہیں۔ دوسرا گروہ اس بات پر متفق تھا
کہ اسرائیل کو جلد یا بدیر پورے اختیارات منتقل کرنا ہیں پھر اس میں تاخیر کیوں ہو۔
ارمولا مفت حاصل ہو رہا ہے۔ اس لئے ویزمن کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے آخر خفیہ
لئے شہری کی گئی جس کے نتیجے میں اسرائیل کی نئی حکومت کو اختیار دیا گیا کہ وہ
نے چاہیں اپنا صدر منتخب کر لیں۔ تاج برطانیہ کی اس منظوری سے اسرائیل کو آگاہ کر
دیا گیا۔

ویزمن نے اپنی اور برطانوی فوجی گورنر کے درمیان ہونے والی گفتگو سے
اسرائیل کی مجوزہ کینٹ کو مطلع کر دیا تھا۔ جس وقت اسرائیلی کینٹ کو حکومت
برطانیہ کی رضامندی کی خبر ملی تو ویزمن ایک قوی ہیرو کی طرح ابھر کر سامنے آ گیا۔
یزمن کو متفقہ طور پر پہلا صدر منتخب کر لیا گیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔
اسرائیل اور برطانیہ میں اندرون خانہ اور کیا گٹھ جوڑ ہوئے اور دنیا کی دوسری طاقتوں
نے اس معاملے میں کیا کردار ادا کیا اس پر اب تک پردہ پڑا ہے لیکن اس بات نے
فرور شہرت پائی کہ اسرائیل کو الکوحل کے فارمولے کے بدلے میں حکومت حاصل
ہوئی۔

ویزمن کی صدارت کے اعلان سے فلسطین میں حریت پسندوں کی سرگرمیاں
اور تیز ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی فلسطین عربوں پر اسرائیلی ظلم و ستم میں بھی اضافہ

انگریز گورنر نے چونک کے دیکھا۔ ”آپ کو منظور ہے؟“ جیسے اسے ویزمن
جواب پر یقین نہ آرہا ہو۔ یقین کرنے کی بات بھی نہ تھی۔ ویزمن کو رقم کی ہڈ
کئی بار کی جا چکی تھی۔ لیکن اس نے ہر بار انکار کیا تھا اور اس وقت وہ یہ سودا
خود چل کر گورنر کے پاس آیا تھا۔

”ہاں مجھے منظور ہے، گورنر صاحب!“ ویزمن نے اسی اطمینان سے کہا۔
گورنر صاحب! اس بات کا خیال رکھئے کہ اس سودے سے جتنا فائدہ انگریز قوم کو
اتنا ہی فائدہ آپ کی ذات کو بھی ہو گا۔ اس کارنامے کے سلسلے میں آپ کی قوم
کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی اور آپ کی حکومت آپ کا مرتبہ بلند کر کے آپ کو
خطاب سے بھی نوازے گی۔ اس طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ میرے اس سودے
مجھے اور میری قوم کو یکساں طور پر فائدہ پہنچے۔ میں نے اپنے فارمولے کی قیمت
خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے طے کی ہے۔“

”فرمائیے، ویزمن!“ گورنر خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”ہم منہ مانگی قیمت ادا
کے۔“

”سنئے گورنر صاحب!“ ویزمن نے گورنر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے۔
”میں اس فارمولے کے بدلے میں ۱۵ فروری کو قائم ہونے والی اسرائیلی حکو
کے لئے ایک اسرائیلی گورنر جنرل اور صدر کا عہدہ طلب کرتا ہوں۔“ یہ کہتے
ویزمن اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے چلتے چلتے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس کے لئے آ
اختیار نہیں۔ آپ اپنی حکومت سے گفتگو کیجئے۔ اگر یہ شرط منظور ہے تو فارمولا
فروری کو آپ کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

”لیکن یہ — یہ میں —“ گورنر کو اس بات کا گمان بھی نہ تھا۔
نے حیران نظروں سے ویزمن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”انتہائی کوشش کروں گا کہ میری حکومت یہ سودا منظور کر لے۔ میں
بارے میں خود بھی زیادہ پر امید نہیں۔ اور نہ آپ کو امید دلا سکتا ہوں کہ
اسرائیل کے تمام دانشور اور حکومت کے متوقع کارندے اس بات پر اپنی رضا
ظاہر کر چکے ہیں کہ اسرائیل کا پہلا گورنر جنرل انگریز ہو گا۔“

”پھر کہتے کیوں نہیں شامل؟“ زرقا اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تمام مہران تم سے خوش ہیں۔ تمہیں پسند کرتے ہیں۔ مجھے بھی تم پسند ہو۔“ زرقا ایک دم رکی۔ ”ہاں شامل! تمہاری بے پناہ صلاحیتیں اور کارگزاریاں ایسی ہیں جو ہر ایک کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ تم کو پسند کرے۔ تم اس لئے مجھے دوسروں کی نسبت زیادہ عزیز ہو۔“ زرقا کی زبان سے بھی شاید اتفاقہ ایک جملہ نکل گیا تھا۔ جس کی وضاحت میں اسے اتنی بہت سی باتیں کرنا پڑیں۔

”میں صدر کا شکر گزار ہوں۔“ شامل محتاط لہجے میں بولا۔ ”دراصل اس مہم میں میں صدر کے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں۔“

”مگر کیوں شامل!“ زرقا نے ملائمت سے پوچھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس مہم میں میں گرفتار ہو جاؤں۔ تم بھی گرفتار ہو سکتے ہو۔ اس صورت میں ہماری تنظیم کو بہت نقصان پہنچے گا۔ تنظیم کو ایوان ہنگامہ کی جو اطلاعات ملتی ہیں اس سے وہ محروم ہو جائے گی۔ فی الحال تمہارا ہنگامہ میں رہنا ضروری ہے۔“

”لیکن میں اب اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔“ شامل نے بے چینی کا اظہار کیا۔ ”میں کوئی اہم کام کر کے شہادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے شامل!“ زرقا نے کہا۔ ”میں جلد ہی تمہیں کوئی اہم کام سپرد کروں گی۔“

”صدر“ مجھے اس مہم میں اپنے ساتھ رکھے۔“ شامل جیسے روہانسا ہو گیا۔ اس نے بڑے درد سے کہا۔

”دیکھو شامل!“ زرقا نے اسے سمجھانے کے لئے کہا۔ ”اگر تمہاری قسمت میں شہادت لکھی ہے تو وہ کسی وقت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس مہم یا کسی دوسری مہم سے شہادت کے درجے میں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں شہادت حاصل نہ ہو اور تمہارا راز بھی کھل جائے۔ اس سے فائدے کے بجائے تنظیم کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔“

”میرا دل کہتا ہے کہ مجھے شہادت حاصل ہوگی۔ آپ مجھے ———“

”شامل ———“ زرقا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تنظیم کا پہلا اصول یہ ہے

ہو گیا۔ زرقا اپنے سرفروش ساتھیوں کی مدد سے روز کسی اہم مقام پر چھاپے مارا اسرائیلیوں کا نقصان کرتی۔ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ برسوں ظلم کی چکی میں پے ہوئے عوام زرقا کی امکانی مدد کرتے لیکن ان کی ہمتیں پست تھیں اور کسی مسلح بغاوت کی ان میں طاقت نہ تھی۔ زرقا اپنے چھاپوں اور پورے کے ذریعے ان میں نیا جوش اور نیا عزم پیدا کرنے کی کوشش کرتی لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہوتی مگر وہ عوام کی بے حسی کو ان کی مجبوری پر محمول کرتی اور نہ ہارتی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے اپنی زندگی کا یہ مشن بنا لیا کہ یہودیہ زیادہ سے زیادہ نقصان کیا جائے۔ اس کوشش میں اس کے ساتھی گرفتار ہوتے یا کر دیئے جاتے مگر وہ حریت کی شمع کو بجھنے نہ دیتی اور ہر بار ایک نئے عزم کے مصروف ہو جاتی۔

ایک دن شامل نے اس سے یہودیوں کے تیل کے ایک اہم ڈپو کا ذکر ”اگر یہ ڈپو تباہ ہو جائے تو یہودیوں کو ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔“

”شامل ———!“ زرقا بے چینی سے بولی۔ ”اس خوشخبری کے لئے تمہاری شکر گزار ہوں فوراً“ اس مقام کی نشاندہی کرو۔ میں آج ہی اسے تباہ کرنا کوشش کروں گی۔“

”زرقا! ———“ ایک دم شامل کے منہ سے نکل گیا۔ پھر فوراً ”سنجھل بولا۔ ”صدر ——— میں ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اسے توجہ فرمائیں گی؟“

”درخواست ———“ زرقا نے اسے گھورا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو شامل! اہم آپس میں برابر ہیں۔ ایک دوسرے کے ہمدرد اور دوست ہیں۔ پھر تمہاری درخواست ہماری تنظیم ہی سے متعلق ہوگی۔ پھر اس کے کہنے میں کیا جھجک ہے۔ اس تنظیم کے لئے مرنا جینا تو ہمارا کام ہی ہے۔“ پھر زرقا نے شامل کو کچھ مشکوک نظروں سے دیکھا کیونکہ شامل نے آج پہلی مرتبہ اسے بے ساختگی میں ”زرقا“ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ”مجھے غلط نہ سمجھا جائے صدر!“ شامل نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔ ”ہر بات تنظیم کے لئے ہے۔ میری درخواست بھی تنظیم ہی کے سلسلے میں ہے۔“

کہ جسے ایک بار صدر تسلیم کر لیا جائے پھر اس کا حکم ماننا چاہئے۔ صدر کی عمر کسی طرح قابل برداشت نہیں۔“

”میں حکم عدولی نہیں کر رہا صدر!“ شامل نے بچوں کی طرح ضد کی۔ مگر آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ میں تو آپ کے ساتھ مہم میں شہادت حاصل چاہتا ہوں۔“

زر قانے شامل کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ پھر کچھ سوچنے لگی۔ ذرا دیر بولی۔ ”تم ایک پر جوش کارکن ہو شامل۔ میں تمہیں پسند کرتی ہوں، تمہاری سرگرمی تمہارے جذبہ حریت کی وجہ سے۔ مجھے تمہاری زندگی بھی اسی وجہ سے عزیز ہے۔ یہ چاہتی ہوں کہ میرے بعد میرے زیادہ سے زیادہ ساتھی زندہ رہیں۔ اور اپنے خون۔ آزادی کے شجر کو سینچتے رہیں۔ میں تمہیں اتنی جلدی اپنے سے الگ نہیں کر سکتی۔ اس وقت تک ایوان ہنگامہ میں کام کرتے رہو جب تک تم پر شبہ نہیں کیا جاتا۔ ام میں ہم سب کا مفاد ہے۔“

شامل نے مایوس ہو کر زر قانے کو سلام کیا اور تھکے تھکے قدموں سے واپس جا لگا۔

”ہاں شامل! تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔“ زر قانے اسے ٹوکا۔ شامل کے قدم رک گئے۔

”حکم دیجئے! آپ صدر ہیں۔ میں تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔“ شامل نے واپس آتے ہوئے کہا۔

”میں یہی چاہتی ہوں شامل!“ زر قانے بولی۔ ”تمہیں اور مرکزی کمیٹی کے ہر ممبر کو اپنے صدر کا کما ماننا چاہئے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے بعد بھی تم ہر صدر کا اٹا طرح احترام کرو گے۔ ان کا حکم مانو گے؟“

”میں وعدہ کرتا ہوں صدر!“ شامل جواب دے کر پھر مضحل مضحل قدم اٹھانے لگا۔

”شامل کہاں جا رہے ہو؟“ زر قانے اسے چونکا دیا۔ ”تم ایک خبر لے کر آئے تھے۔ پوری خبر سنائے بغیر تم واپس جا رہے ہو۔ وہ تیل کا ڈپو کہاں ہے۔ اس کا

نشاندہی تو کرتے جاؤ؟“

”میں معافی کا خواستگار ہوں، صدر!“ شامل نے شرمندگی سے کہا۔ ”وہ بات میرے ذہن سے بالکل نکل گئی تھی۔ ڈپو دکھانے کے لئے میں آپ کو کل اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”مجھے، اپنے ساتھ۔۔۔ ہوش میں بھی ہو تم شامل!“ زر قانے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ ”تم ایوان ہنگامہ کی وردی میں ہو گے۔ میں تمہارے ساتھ کس طرح جا سکتی گی۔“

”آپ مزدور لڑکے کی طرح سامان لے کر میرے ساتھ چلیں گی۔“ شامل کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ”جب سامان زیادہ ہو تو میں بازار سے مزدور لے لیتا ہوں۔ آپ پر کوئی شبہ نہ کر سکے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں تیار رہوں گی۔“ زر قانے بھی مسکرائی۔ ”کل کس وقت آؤ گے؟“

”سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے۔“ شامل نے جواب دیا۔ ”آپ اکیلی جائیں گی یا کوئی اور بھی ہو گا؟“

”جگہ دیکھنے میں اکیلی ہی جاؤں گی۔“ زر قانے سوچتے ہوئے بولی۔ ”کارروائی کے وقت ایک اور ممبر میرے ساتھ ہو گا۔“

اس دن شامل اور زر قانے معمول سے پہلے آگئے تھے۔ شامل، تیل کے ڈپو کی خبر دینے کے لئے بے چین تھا، اس لئے جلدی پہنچ گیا۔ اور زر قانے دن کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔ عربوں پر یہودیوں کی غلامی کا جو مستقل جوا رکھا جانے والا تھا اس کا شمار دنوں کے بجائے گھنٹوں میں ہو رہا تھا۔ اسی الجھن میں زر قانے بھی وقت سے پہلے ہی آ گئی تھی۔ شامل کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ممبروں کی آمد شروع ہو گئی۔ زر قانے اسے روک لیا تا کہ ممبروں کو بھی یہ خوشخبری سنا دی جائے کہ یہودیوں کے عظیم ڈپو کی نشاندہی ہوئی ہے اور وہ مرغ گرفتار کی آخری تڑپ کی طرح تیل کے اس ڈپو کو تباہ کر کے آزادی کے دینے کو روشن کرنے کی کوشش کریں گے۔

م کے لئے پیش کر دیا۔ زر قانے ان میں سے ایک ممبر کو منتخب کر لیا۔ کچھ دیر اور منگھوتی رہی پھر یہ محفل برخاست ہو گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن ایک خوبصورت عرب لڑکا، دونوں ہاتھوں میں سامان سے بھرے ٹیلے لٹکائے بازار سے باہر نکلا۔ وہ منگھوتی پیر تھا۔ جسم پر مزدوروں جیسے معمولی کپڑے اور سر پر کٹھپ تھا۔ اس کے آگے آگے ہگانہ کا شٹائل چل رہا تھا۔ وہ دونوں کئی سڑکیں پار کر کے ایک خستہ سی عمارت کے پاس پہنچے۔ عمارت کے گرد معمولی سی چار دیواری تھی۔ لوہے کا گیٹ کھلا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ عمارت برسوں سے ویران پڑی ہے۔ عمارت کے قریب پہنچ کر شٹائل زور سے کھٹکرا۔ مزدور لڑکے نے منگھوتیوں سے غارت کو دیکھا پھر اس نے سامان کا ایک تھیلا زمین پر گرا دیا۔ تھیلے کا سامان دور دور تک بکھر گیا۔ شٹائل نے زور سے لڑکے کو ڈانٹا پھر سامان اکٹھا کرنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ اس دوران شٹائل لڑکے سے آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ جب کوئی راہ گیر قریب سے گزرتا تو شٹائل، لڑکے کو برا بھلا کہنے لگتا اور اس کے سر یا پیٹھ پر غصے سے ایک دھول بھی لگا دیتا۔ لڑکا بظاہر سامان اکٹھا کر رہا تھا لیکن اس کے کان شٹائل کی باتوں پر اور نظریں عمارت پر لگی تھیں۔ سامان تھیلے میں بھر گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہو کر آگے پیچھے چلنے لگے۔

یہ دراصل ریسرسل تھی اس ڈرامے کی جو شام کو اس عمارت میں کھیلا جانے والا تھا۔ شٹائل، زر قان کو مزدور کے بھیس میں اس عمارت تک لے گیا۔ جہاں تیل کا بت بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ زر قانے ایک ہی نظر میں پوری عمارت کا جائزہ لے کر اپنے لئے راستہ بھی متعین کر لیا۔ تیل کے اس ذخیرے کی سخت حفاظت کی جاتی تھی لیکن حیرت پسندوں کو دھوکہ دینے کے لئے اس کے باہر کوئی پہرہ نہیں لگایا گیا تھا۔ عمارت کے اندر بھی بظاہر کوئی سپاہی یا پیریدار نظر نہ آتا تھا۔ شٹائل کو اس ذخیرے کے بارے میں اس وقت معلوم ہوا جب ہگانہ کے دو افسر اس حفاظتی انتظام پر منگھوتی کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عمارت کے باہر زبردست پہرہ لگا دیا جائے تاکہ اگر حیرت پسند

زر قان کی طرح اس دن ہر آنے والا ممبر پریشان اور اداس اداس تھا۔ زر قان فوراً اپنی حالت سنبھال لی تھی تاکہ انہیں تسلی دے سکے۔ ممبران کے جمع ہونے اس نے کہا۔

”میرے وطن پرست دوستو! شاید تم اس لئے پریشان ہو کہ تمہاری سرزمین اسرائیلی حکومت قائم ہو رہی ہے اور تم اسے روکنے میں ناکام رہے۔ ایسا تم میرے دوستو! اسرائیلی حکومت کی داغ بیل تو اعلان بالفور کے ساتھ ہی پڑ گئی تھی۔ تو ہماری اور ہمارے بیٹوں کی کوشش تھی کہ ہم مدافعت کرتے رہے۔ دو ظالم اور مظلوموں سے لڑتے رہے۔ اپنا اور ان کا خون بہاتے رہے۔ ہماری تحریک وقتی تو کمزور نہیں ہے جو اسرائیلی حکومت قائم ہوتے ہی ختم ہو جائے گی۔ عربوں کی تیس ما مسلسل جدوجہد، جنگ آزادی کا پہلا قدم ہے۔ یاد رکھو قوموں کی تاریخ میں تیس ما کیا۔ صدیاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔ یہ جنگ تو صدیوں پر محیط ہوتی ہے۔ ہم جو کام شروع کیا ہے وہ اسرائیلی حکومت قائم ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح جاری رہے گا۔ آج کے جوان کل بوڑھے ہوں گے اور آج کے بچے کل جوان ہو کر ان کے جگہ لے لیں گے۔ یہ جنگ یونہی چلتی رہے گی۔ اس وقت تک جب تک فلسطین کی سرزمین، یہودیوں کے ناپاک قدموں سے پاک نہیں ہو جاتی۔“

زر قان کی مختصر تقریر سے ممبران کے پشمرہ اور مرجھائے چہروں پر رونق آ گئی۔

”میرے دوستو!“ زر قانے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ”شٹائل نے یہودیوں کے بڑے غلے کے ڈپو کی خبر دی ہے۔ شاید یہ ڈپو سب سے بڑا ہے۔ میں کل اسے تباہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس مہم میں شٹائل میرے ساتھ شرکت کرنے کا خواہش مند تھا لیکن میں اس کی درخواست قبول نہ کر سکی۔ شٹائل ہماری تنظیم کے لئے اہم کام انجام دے رہا ہے۔ اسے ہم فی الحال کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ میں سے ایک میرے ساتھ اس اہم اور خوفناک مہم پر جانا ہے۔ بتائیے کون میرے ساتھ جائے گا؟“

جتنے ممبر وہاں موجود تھے، سب نے بیک وقت اور بیک زبان اپنے آپ کو اٹھ

پہل مٹی۔ اور گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کئی پیریداروں نے ہال میں داخل ہو کر ڈرموں کی ٹوٹیاں بند کرنے کی کوشش کی لیکن تیل بڑی تیزی سے نکل رہا تھا۔ وہ ڈرموں تک پہنچنے میں ناکام رہے۔

زرقا ہال کا زینہ چڑھ کر اوپر پہنچی اور باہر والے زینے سے نیچے اتر کر چھپ مٹی۔ اب زرقا دیا سلائی لئے اس انتظار میں تھی کہ پیریداروں کی نظریں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف سے ہٹیں تو دیا سلائی جلا کر تیل پر پھینک دے۔ پیریدار پہنچنے چاہتے، گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ تیل کی پتلی سی لکیر زینے کے نیچے تک پہنچ چکی تھی۔ زرقا بڑی آسانی سے آگ لگا سکتی تھی۔ لیکن وہ آگ لگا کے خود بھی محفوظ طریقے سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی جان کی کوئی پروا نہ تھی۔ اسے تو تیل کے ڈبو کو ہر صورت میں آگ لگانا تھی۔ خواہ وہ بچ سکے یا خود بھی اس کے ساتھ جل کر راکھ ہو جائے۔ لیکن ابھی پہنچنے کا وقت تھا۔ اگر پیریداروں کی اس کی طرف پینہ ہو جائے تو وہ نکلنے بھاگنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔

قدرت کو زرقا کی کامیابی منظور تھی۔ غیب سے خود اس کا سامان ہو گیا۔ پیریدار ایک دم شور کرتے عمارت کے گیٹ کی طرف بھاگے۔ زرقا کو اسی لمحے کا انتظار تھا۔ اس نے ماچس جلائی اور تیل کی لکیر میں لگا دی۔ تیل نے آگ پکڑ لی اور لکیر جلتی ہوئی ہال کی طرف تیزی سے بڑھی۔ زرقا کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اور اس کا خون جیسے رگوں میں جم کے رہ گیا۔ زرقا کا ساتھی گیٹ پار کر کے اندر آ رہا تھا۔ اور پیریدار اسے پکڑنے کے لئے بڑھ رہے تھے۔ زرقا نے بڑے کرب کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ پھر فوراً ہی سنبھل کے دیوار کے دوسری طرف اتر گئی۔ شام کی سیاہی دور تک پھیل رہی تھی۔ علاقہ ویران تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتی عمارت سے کافی دور نکل گئی۔

زرقا نے پلٹ کر دیکھا۔ پوری عمارت شعلوں کی لپیٹ میں تھی۔ اور نیلگوں دھواں آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ زرقا کا دل خوشی سے جھوم اٹھا لیکن اس خوشی میں ایک بہترین ساتھی کی قربانی کا درد بھی شامل تھا۔ اس کا ساتھی پیریداروں کو اندر باہر بھاگتا دیکھ کر گھبرا گیا۔ اسے خیال ہوا کہ زرقا پکڑی گئی۔ جذبات کے جوش میں

وہاں تک پہنچ بھی جائیں تو انہیں کامیابی حاصل نہ ہو۔ انہیں افسروں کی منتظر شائل کو اس عمارت کا جائے وقوع بھی معلوم ہو گیا۔ عمارت کے اندر کا حال بھی نے کوشش کر کے معلوم کر لیا۔ اب تو اس عمارت کے اندر ایک دیا سلائی جلنے کی تھی۔ بس کی ریسرسل زرقا نے دوسرے وقت کر لی تھی۔

شام ہوتے ہوتے زرقا اپنے ایک ساتھی کو لے کر اس علاقے میں پہنچ کر زرقا نے اپنے ساتھی کو تاکید کر دی کہ وہ عمارت کے اندر آنے کی کوشش نہ کر اور دور چھپ کر عمارت پر نظر رکھے۔ اگر زرقا کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو مخصوص اشارے سے اسے اندر بلائے گی۔ اس ہدایت کے بعد جانباڑ زرقا، راہ گیر کی نظر بچاتی بڑی پھرتی سے عمارت میں داخل ہوئی۔ اسے ایک زینہ اوپر کی طرف ہوا دکھا دیا۔ زینے کے برابر کے کمرے میں بہت سے مسلح یہودی سپاہی بیٹھے ہو گئیں کر رہے تھے۔ زرقا زینے کے نیچے پہنچی اور زینے پر پیٹ کے بل چڑھتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ اوپر کے تمام کمرے اور گیلریاں خالی تھیں۔ زرقا ایک گیلری۔ دوسری گیلری اور دوسری سے تیسری گیلری میں پہنچی۔ وہاں ایک زینہ نیچے کی طرف رہا تھا۔ زینے سے آہستہ آہستہ اتر کر وہ نیچے پہنچی۔ یہ زینہ ایک بڑے ہال میں آ رہا تھا۔ پورا ہال تیل کے ڈرموں سے بھرا ہوا تھا۔ فرش سے چھت تک تیل کے پیارے ڈرم اوپر تلے رکھے تھے۔

شاید اس کے پیروں کی چاپ ہوئی تھی۔ اس ہال کے چاروں طرف کمرے۔ تھے جن میں پیریدار بیٹھے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور چار پیریدار اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ یہ وقت زرقا کے لئے بڑا نازک تھا۔ اس نے خود ڈرموں کے پیچھے چھپا لیا۔ پیریدار ادھر ادھر دیکھ کر واپس چلے گئے۔ زرقا نے اطمینان کرنے کے بعد کہ پیریدار اب واپس نہیں آئیں گے۔ اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ اس نے ہال کی سیڑھیاں اترتے وقت اپنی واپسی کا راستہ متعین کر لیا تھا۔ زرقا نے آہستہ آہستہ ڈرموں کی ٹوٹیاں کھولنا شروع کر دیں۔ تیل تیزی سے ہال کے فرش پر بننے لگا۔ زرقا دیا سلائی نکال کر وقت کا انتظار کرنے لگی۔ ڈرموں کا ہال کے فرش سے برابر کے کمروں میں پہنچنے لگا۔ اس وقت پیریداروں میں سراپا

لوئی کے ساتھ ڈپو والی سڑک پر جا رہا تھا۔
 ”ہوں۔۔۔ تو انہیں آخر شبہ ہو ہی گیا۔“ زرقا نے آہستہ سے کہا۔
 ”نمبر آٹھ نے ڈپو اڑانے کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔“ شامل نے بتایا۔
 ”لیکن وہ کہہ رہا ہے کہ یہ اس کا انفرادی فعل ہے اس کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں
 نمی۔“
 زرقا سر جھکا کر سوچنے لگی۔

”مدر!“ شامل نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ اپنے والدین کو مطلع کر دیں کہ وہ
 فی ایب کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔“
 ”مگر کیوں۔۔۔“
 ”نمبر آٹھ نے میرا نام تو نہیں بتایا۔“ زرقا بولی۔ ”اگر میں ماں باپ
 پر زور بھی دوں تو شاید وہ اپنا گھر چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوں۔ انہوں نے آزادی کی
 تحریک میں حصہ لیا ہے۔ بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا چکے ہیں لیکن فی ایب کو چھوڑنے کا
 انہوں نے کبھی ارادہ نہیں کیا۔ وہ فرار سے نفرت کرتے ہیں۔“

”ایوان ہگنہ نے تمام مشکوک طلباء اور طالبات کی فہرستیں طلب کر لی ہیں۔
 ”شامل بتانے لگا۔ ”ہو سکتا ہے کہ کسی خفیہ فائل میں آپ کا نام ہو کیونکہ آپ کے
 والدین کا نام وہاں موجود ہے۔ اگرچہ ان کے نام کے سامنے ”خاموش اور بے اثر“
 لکھا ہے۔ گھر گھر تلاشی کا حکم ہو چکا ہے۔ ممکن ہے دہشت پسند آپ کے گھر تک پہنچ
 جائیں۔“

”خیر اللہ مالک ہے۔“ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”میں گھر اطلاع دینے کی
 کوشش کروں گی۔ تم نمبر آٹھ کے بارے میں برابر خبر دیتے رہنا۔“ پھر کچھ سوچتے
 ہوئے بولی۔ ”احتیاط ضروری ہے۔ یہ جگہ ہمیں آج ہی چھوڑ دینا چاہئے۔“

”دوسرے ممبروں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ تنظیم نے کئی ٹھکانے بنا رکھے
 تھے۔ اسی رات انہوں نے اپنا مرکز دوسری جگہ تبدیل کر لیا اور تمام ممبروں کو اس کی
 خبر دے دی گئی۔“

تمام رات یہودی سپاہیوں پر گولیاں برساتی رہی۔ تیل کے جلتے ہوئے ڈپو کو
 دیکھنے کے لئے لوگ دور دور سے آکر جمع ہو گئے تھے۔ یہودیوں نے ان پر اندھا دھند

اس کی عقل کام نہ کر سکی اور وہ زرقا کی مدد کے لئے عمارت میں داخل ہو گیا۔
 اس کا ساتھی یہ غلطی نہ کرتا۔ زرقا اس کے آگے کچھ اور سوچ نہ سکی۔ اسی در
 عمارت کے اندر سے زور دار دھماکوں کی آوازیں آنے لگیں۔ تیل کے ڈرم پور
 رہے تھے۔ اور جلتا ہوا تیل ہوا میں چنگاریوں کی صورت میں رقص ایلےس کا نر
 پیش کر رہا تھا۔ فوجی گاڑیاں سڑک پر بھاگ رہی تھیں۔

زرقا تھکی تھکی سی اپنی جائے پناہ پر پہنچی۔ اس کے ساتھیوں کو تیل کا ڈنڈ
 اڑنے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ اسے مبارک باد دینے کے لئے جمع تھے۔ زرقا کو دیکھتے
 انہوں نے بڑے پر جوش طریقے سے اسے مبارک باد دی لیکن زرقا خاموش رہی
 ان کے بہت پوچھنے پر زرقا نے کہا۔ ”ہمارا ایک اور ساتھی قربان ہو گیا۔“
 ”اس میں افسوس کی کیا بات ہے صدر!“ ایک ممبر نے کہا۔ ”ہم نے تو مزید
 سے بیان باندھا ہے۔ اتنے بڑے کام کے سرانجام دینے میں اگر ہم سب کام آجائے
 تو بھی کچھ مذا لکھ نہ تھا۔“

”ہم اس کی تائید کرتے ہیں صدر!“ دوسرا ممبر بولا۔ ”میں نے سنا ہے کہ
 ذخیرہ یہودیوں کا سب سے بڑا ڈپو تھا۔ اس کی کمی برسوں میں نہ پوری ہو سکے گی۔“
 اسی وقت شامل مبارک دینے آیا۔

”نمبر آٹھ پر کیا گزری شامل؟“ زرقا نے بے چینی سے پوچھا۔
 ”وہ گرفتار ہو گیا ہے صدر!“ شامل نے بتایا۔ ”نمبر آٹھ کو ہگنہ کی عدالت کے
 حوالے کر دیا گیا ہے۔ جہاں اس سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ ابھی تک اس نے آپ کا
 نام نہیں بتایا۔“

”کیا ہگنہ کو مجھ پر شبہ ہے؟“ زرقا نے سوال کیا۔ ”مجھے کسی نے پہچان لیا ہے
 کیا؟“

”آپ کو تو کسی نے موقع پر نہیں دیکھا۔“ شامل نے تفصیل بتانا شروع کی۔
 ”لیکن آپ جس وقت نمبر آٹھ کے ساتھ عمارت کی طرف جا رہی تھیں تو ہگنہ کے
 دہشت پسند گروہ کے ایک آدمی نے آپ دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے نمبر
 آٹھ کو فوراً شناخت کر لیا اور بیان دیا ہے کہ ڈپو جلنے سے دو گھنٹے پہلے نمبر آٹھ ایک

شاہدہ کروں گی۔“
 ”زرقا! اب اس جدوجہد سے کیا حاصل؟“ ماں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
 بت سے سمجھایا۔ ”صبح ۱۵ مئی ہے۔ عربوں کا یوم سیاہ، اسرائیلی اس خطہ ارض کے
 قانونی وارث ہو جائیں گے۔ تم اس دن کو ٹال تو نہیں سکیں۔ نظر اٹھا کے دیکھو۔
 یودیوں کے محلے چراغوں سے جگمگا رہے ہیں۔“

”اور عربوں کے گھر تاریک ہیں ماں۔“ زرقا بڑے استقلال سے بولی۔ ”ماں یہ
 گمراہ وقت تک تاریک رہیں گے جب تک ہمارے جوان، یودی محلوں سے چراغ
 جھین کر لے آتے۔ ہم ان چراغوں کو حاصل کرنے ہی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔
 ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔“

”بیٹی! زرقا کی ماں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔“ میں تجھے منع نہیں کرتی۔ لیکن یہ
 ضرور کہوں گی کہ جب تک تمام دنیائے عرب بلکہ پورا عالم اسلام ہماری مدد پر آمادہ
 نہیں ہوتا، ہم کامیاب نہیں ہوں گے۔ ہمارے اپنوں میں اتفاق نہیں۔ تمام فلسطینی
 بھی جنگ آزادی میں حصہ لینے سے گریز کر رہے ہیں۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں
 نے اپنے مفاد پر ملک اور قوم کے مفاد کو قربان کر دیا ہے۔ وہ ہماری مخبری کرتے ہیں۔
 ان حالات میں تیرے چند ساتھی برطانیہ جیسی بڑی اور مکار طاقت کا کیسے مقابلہ کر سکتے
 ہیں۔ برطانوی فوج اب تک یہاں مقیم ہے۔ یودیوں کی دہشت پسند تنظیم ایک منظم
 فوج کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ وقت نکل چکا ہے۔ بہت دیر ہو چکی ہے، زرقا!“

”یہ وقت مصلحت بینوں نے ضائع کیا ہے ماں!“ زرقا نے چیختے ہوئے کہا۔
 ”ہمارے چراغ جلتا ہے۔ اگر حریت پسند مسلسل کوشش کرتے اور قربانیاں دیتے
 رہتے تو یودیوں کا سیلاب یہاں نہ آتا۔ خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ میں جا رہی ہوں۔
 ابو دکان سے جیسے ہی واپس آئیں آپ انہیں لے کر تل ابیب سے کہیں اور چلی
 جائیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ پر بھی کوئی مصیبت نازل ہو جائے۔“

زرقا نے باپ کی واپسی کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اس کے دل میں آگ سی گئی
 تھی۔ صبح کو اسرائیلی حکومت قائم ہونا تھی اور یودی گلی کوچوں میں جشن منا رہے
 تھے وہ دروازے کے پاس پہنچی کہ باہر سے کسی نے دستک دی۔ زرقا کی ماں نے دوڑ

فارینگ شروع کر دی۔ مجمع پھر پھر گیا۔ اور دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ یودیوں
 نے انتقاماً عربوں کے بہت سے مکانوں میں آگ لگا دی۔ مسلمانوں نے مداخلت کی
 رات بھر جگہ جگہ مسلح تصادم ہوتے رہے۔ زرقا اور اس کے ساتھیوں نے بھی فوج
 خوب دل کے ارمان نکالے اور جس قدر نقصان پہنچا سکتے تھے وہ پہنچایا۔

تل ابیب کا انگریز گورنر اس صورتحال سے بہت پریشان تھا۔ اس نے یودیوں
 کو تصادم سے روکا۔ جب وہ نہ رکے تو اس نے اعلان کر دیا کہ اگر شہر میں امر
 امان نہ ہوا تو انتقال اقتدار کا مسئلہ التواء میں پڑ جائے گا۔ یودیوں نے سنا تو ان
 ہوش اڑ گئے۔ انہوں نے ظلم و ستم سے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ ریاست کے قیام کی
 انہوں نے اپنے مظالم کو دو روز کے لئے ملتوی کر دیا۔ شہر میں بظاہر امن ہو گیا۔
 کھنچاؤ باقی رہا اور دو دن کے درمیانی عرصے میں بھی فساد کے چھوٹے واقعات ہو
 رہے۔ آزاد تنظیم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور کتنے ہی دفاتر پھونک ڈالے۔

یودیوں کے جشن کی رات آگئی۔ صبح کو ان کی نئی اسرائیلی حکومت قائم
 تھی۔ ایسی حکومت کے لئے وہ دو ہزار سال سے کوشاں تھے۔ زرقا، ماں کی گود میں
 رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔

”زرقا بیٹی! یقین کر تیرے اندر میں اپنی جوانی دیکھتی ہوں۔ وہی عزم
 ارادے، ویسا ہی جوش و خروش۔ میں اور خالد اسی طرح دن رات سرگرداں رہے۔
 سرکاری دفاتروں کو تاکتے۔ تھانوں کو گھیرتے، چھاؤنیوں اور ڈپوؤں کو تلاش کرتے
 بیٹی! ہماری ان کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہمارے تمام ساتھی ایک ایک کر
 مارے گئے یا گرفتار ہو کر پھانسی پر چڑھ گئے۔ میں تجھے کسی کام سے نہیں روکتی
 اکیلا چنا، بھاڑ کو نہیں توڑ سکتا۔ تمہارے ساتھی ایک ایک کر کے قربان ہوتے جا
 رہے ہیں۔ تین سال میں تم نے کیا کھویا، کیا پایا؟“

”ماں ——— خدا کے لئے مجھے بزدلی کا سبق نہ دو۔“ زرقا ٹپ کر
 بیٹھی۔ ”تمہارا جوش، تمہاری عمر کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا۔ تم نے مصلحت کا
 اوڈھ لیا۔ تم مقدر پر صابر و شاکر ہو کر بیٹھ رہیں۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتی۔
 یودیوں کو چپن سے نہ بیٹھنے دوں گی۔ میں اپنے خون کے آخری قطرے تک

کے آرزومند ہیں۔ فی الحال ایوان ہگانہ میں ملازم ہیں اور ہمارے لئے مخبری کرتے ہیں
ان کی کارکردگی مجھے پسند ہے۔“

”شاباش بیٹا!“ ماں نے دعا دی۔ ”خدا تم لوگوں کو اپنے مقصد میں کامیاب
کرے۔ تمہارے جیسے جوان اس قوم میں پیدا ہوتے رہے تو ظالم یہودیوں کو ایک دن
پنہروں کی اس سرزمین سے نکلنا پڑے گا۔ میں تمہاری زندگی اور سلامتی کی دعا مانگتی
رہوں گی۔“

”نہیں مہربان ماں!“ شائل قدرے مسکرایا۔ ”شہادت کی دعا کیجئے۔ میرے ماں
باپ مجھے روز خواب میں نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عبد اللہ اب تو ہمارے پاس
آنے والا ہے۔ میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں۔“

”شائل ———“ زرقا ایک دم بولی۔ ”پہلے میں یہ رتبہ عظیم حاصل کروں گی۔
تمہارا نمبر بعد میں ہے۔“

اور زرقا کی ماں کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپک پڑے۔
”تیل کے ڈپو والی مہم کا ہمارا ساتھی شاید آج یہ مرتبہ حاصل کرے گا۔“
شائل نے بڑے درد سے کہا۔

”کیوں ——— کیا ہوا اسے؟“ زرقا نے چونک کے پوچھا۔
”اس کی حالت بہت نازک ہو چکی ہے۔ زرقا!“ پھر جلدی سے سنبھل کے
والا۔ ”معاف کیجئے صدر! میری زبان کئی بار آپ کا نام لے گستاخی کر چکی ہے۔“
”زبان پر پابندی کون لگا سکتا ہے۔“ زرقا نے عجیب نظروں سے شائل کو دیکھتے
دئے کہا۔ ”مجھے تمہاری زبان کی یہ گستاخی ناگوار نہیں گزرتی۔“ اور پھر زرقا نظریں
نہا کر ماں کو دیکھنے لگی۔

”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے ساتھی کی حالت بہت نازک ہے۔“ شائل
نے اپنی بات کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ”یہودیوں نے مار مار کے اس کے پورے
ہیک سے کھال ادھیڑ ڈالی ہے۔ اس کے زخموں میں نمک بھرا جا رہا ہے۔ کچے زخموں کو
ٹال دکھائی جاتی ہے۔ خدا اس پر رحم کرے۔ وہ اب تک انکار کر رہا ہے۔ میں کسی
لنگی کو نہیں جانتا۔ اس کی زبان سے بس یہی جواب نکلتا ہے۔“

کر زرقا کو پکڑا اور اسے ایک طرف دھکیل دیا اور خود دروازے کے پاس پہنچا۔
”کون ہے؟“ زرقا کی ماں نے آہستہ سے پوچھا۔
”شائل“ باہر سے آواز آئی۔

زرقا کی ماں کا بدن ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ یہودی اس کے گھر تک پہنچ کر
دروازہ کھولنے کے بجائے وہ بھاگ کے زرقا کے پاس آئی اور گھبرائے لہجے میں
”زرقا! پچھلے دروازے سے نکل جا۔ یہودی آپہنچے۔“

”میں شائل ہوں۔ تنظیم کا ممبر۔“ شائل نے باہر سے ذرا زور سے کہا۔
”سمجھ گیا تھا کہ اس کے یہودی نام سے گھروالے پریشان ہو گئے۔“
”دروازہ کھول دو ماں۔“ زرقا نے اطمینان سے کہا۔ ”شائل ہمارا آدمی ہے
زرقا کی ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن انہوں نے واپس جا کر دروازہ ک
دیا۔ ہگانہ کے سرکاری کپڑوں میں ملبوس ایک خوبصورت جوان اندر داخل ہوا اور
نے بڑے ادب سے زرقا کی ماں کو سلام کیا۔ زرقا کی ماں شائل کو حیران نظروں
دیکھنے لگیں۔

”کوئی خاص خبر ہے شائل؟“ زرقا نے نرمی سے پوچھا۔
شائل بوکھلا گیا۔ بات بناتے ہوئے بولا۔ ”یہودیوں نے پورے شہر میں اوم
رکھا ہے۔ شراب میں مست ہو کے سڑکوں پر دندناتے پھر رہے ہیں۔ جگہ جگہ ٹرا
کے اسٹال لگا رکھے ہیں۔ مفت شراب تقسیم ہو رہی ہے۔“
زرقا نے انگلیاں بھیجنے لیں۔ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ”او خدا یا! کب
تک ذلیل ہوتے رہیں گے؟“
زرقا کی ماں اس کے پاس آگئی تھیں۔ اور شائل کو غور اور دلچسپی سے
دیکھ رہی تھیں۔

”مہربان ماں!“ شائل نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔ ”میں یہودی نہیں
ہوں۔ میرا نام ———!“
”ماں! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ زرقا دخل دیتے ہوئے بولی۔
عبد اللہ ہیں۔ ان کے ماں باپ یہودیوں کے ہاتھوں شہید ہوئے تھے۔ یہ بھی شائل

کرنی اور کمال بے شرمی سے دریدہ اور نیم دریدہ لباس میں ان کے ساتھ ناپے تھیں۔ حیا کو حیا آ رہی تھی۔ مگر یہودی عورتیں حیا و شرم کو بالائے طاق رکھ کر بے جانی کا مظاہرہ کرنے میں فخر محسوس کر رہی تھیں۔

ٹھیک اس عالم میں آزادی کے متوالے رائفلیں سنبھالے، یہودی آبادیوں میں مہم مئے اور ان بے حیاؤں کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ ان کے اسٹال الٹ دیے۔ جگہ جگہوں کو پھونک ڈالا۔ یہودی پولیس حرکت میں آ گئی۔ بکتر بند گاڑیاں دوڑنے لگیں۔ لیکن حریت کے متوالے اس وقت تک گولیاں چلاتے رہے جب تک ان کی پیٹیاں خالی نہیں ہو گئیں۔ یہودیوں کا جشن درہم برہم ہو گیا۔ ان کی فرستوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دہک کر گھروں میں بیٹھ گئے۔ نصف رات کے بعد پورے شہر میں موت جیسا سناٹا چھا گیا۔

صبح — ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کی صبح ہوئی۔ پورے شہر میں فوج نے مورچے سنبھال لئے۔ کسی عرب کو اپنے محلے سے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ فوج نے پورے مسلم علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہر جگہ فوج ہی فوج تھی۔ اسی فوج کی طاقت پر دہمن کو پہلے صدر کی حیثیت سے اسرائیلی حکومت کا سربراہ بنایا گیا۔ اسرائیلیوں کو ”کچھ حاصل ہو گیا جس کے لئے وہ دو ہزار سال سے کوشش کر رہے تھے۔“

انتقال اقتدار کی رسم کے بعد دہمن کا جلوس نکالا گیا۔ فلسطینی عربوں کو یہ باور کرانے کے لئے کہ ان کی کوششیں بیکار ہو چکی ہیں۔ انہیں یہودیوں کی حکومت اور برزی تسلیم کر لیتا چاہئے۔ لیکن عربوں کی ہمت نہ اس وقت پست ہوئی تھی اور نہ وہ آج خاموش ہیں۔ ان کی جدوجہد جاری ہے۔ زرقا کی جلائی ہوئی شمع روشن ہے۔ اسی شام زرقا کے مکان کو یہودی پولیس نے گھیرے میں لے لیا۔ زرقا وہاں موجود نہ تھی۔ ممکن ہے کہ انہیں زرقا کی تلاش ہو۔ گھر پر زرقا کی ماں اور باپ موجود تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ زرقا کے والد خالد الحسینی باہر آئے۔ انہوں نے دیکھا کہ تاحہ نظر پولیس ہی پولیس ہے۔ ایک آدمی نے رائفل ان کے سینے پر رکھ دی۔ اور بڑی بدتمیزی سے پوچھا۔ ”تیرا نام خالد الحسینی ہے؟“

”ہاں — خالد الحسینی میں ہی ہوں لیکن میرا جرم؟“ خالد نے جرات سے

”اف میرے خدایا!“ زرقا ماں کے کاندھے سے لگ گئی۔

”زرقا! تیری اور تیرے ساتھیوں کی قربانیاں ضرور رنگ لائیں گی۔“ ماں اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ”ممکن ہے کہ اس وقت میں زندہ نہ رہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سنہرا وقت دیکھنے کے لئے ہم میں بھی موجود نہ ہو لیکن وہ وقت آئے گا۔ ضرور آئے گا وہ وقت۔ میرا دل کہتا۔ فلسطین آزاد ہو گا۔ ہماری سرزمین ظالموں کے نقش قدم مٹا ڈالے گی۔ ار زرقا — تیرے گیت گائے جائیں گے۔ ہر ایک کی زبان پر تیرے ترانے گے۔ تیری اس تنظیم نے فلسطینیوں کے مردہ ہوتے ہوئے جسموں میں ایک ایسے پھونک دی ہے جو آگے بڑھ کر ایک شعلہ بن جائے گا۔ اور یہ شعلہ، فریب کی بنیادوں پر قائم ہونے والی اس ریاست کو پھونک کے رکھ دے گا۔“

”آمین!“ زرقا نے ماں کے کاندھے سے سر ہٹاتے ہوئے کہا۔

”ثم آمین!“ شامل نے زرقا کی آواز میں آواز ملائی۔

”رخصت ماں!“ زرقا نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ ”خدا! پھر ملیں گے۔ ورنہ میری غلطیوں کو معاف کر دینا۔ ابو کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ میرا سلام کہنا۔ شاید یہ میرا آخری سلام ہو۔“

زرقا اور شامل آگے پیچھے دروازے سے نکل کر اندھیری گلیوں میں گئے۔

ان اندھیری گلیوں کے اس طرف یہودی آبادی چراغوں کی کھشائیں والی صبح کی خوشی میں جشن منا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شراب کی کما بوتلیں تھیں۔ وہ شراب پی رہے تھے اور وحشیوں کی طرح بدست ہو کر گھومتے۔ کچھ لوگ اپنا قومی ترانہ گا رہے تھے اور حقارت سے عرب آبادی کی گلیوں کی طرف دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے۔ ہر طرف ایک شور تھا، ادھم تھا، اور مرد سڑکوں اور گلیوں میں ناپتے پھر رہے تھے۔ بد قسمتی کا یہ عالم تھا کہ یہ ساتھ گھومنے والی عورتوں کو پکڑ لیتے اور ان کے کپڑے پھاڑ ڈالتے۔ تماشائی ذلیل حرکت پر خوشی سے مسکراتے، قہقہے لگاتے۔ عورتیں ان سے کوئی گھ

پوچھا۔

”یہی جرم ہے کہ تو خالد الحسینی ہے۔“ دوسرے نے ہنستے ہوئے کہا۔
تیسرے نے بڑھ کر خالد الحسینی کا گریبان پکڑ لیا اور کھینچنا شروع کیا۔ ز
ماں، خالد کے پیچھے پیچھے آئی تھیں۔ انہوں نے شوہر کو اس طرح گھسنے دیکھا تو برا
نہ کر سکیں۔ اور بڑھ کر انہیں کھینچنے والے کو پکڑ لیا۔
”انسان بنو ظالمو!“ وہ شیرینی کی طرح گریں۔ ”کیا جرم کیا ہے میرے
لئے؟“

”پیچھے ہٹ شیطان کی خالہ۔“ اور سپاہی نے زرقا کی ماں کے منہ پر تھوک
بوڑھی رگوں میں جتا ہوا خون کھول اٹھا۔ جیسے باسی کڑھائی میں ایک دم ابا
جائے۔ زرقا کی ماں نے مٹھی بند کر کے یہودی کے منہ پر اس زور سے کھ مارا
چکرا گیا۔ اور دوسرے سپاہی سے جا نکر آیا۔ بوڑھا ہاتھ دوبارہ بلند ہوا تھا کہ
سپاہی کی رائفل نے موت اگل دی۔ گولی زرقا کی ماں کے سینے میں پیوست ہو
خالد بیوی کو سارا دینے کو دوڑے لیکن سپاہیوں نے انہیں پکڑ لیا۔ زرقا کی ماں
پر گرنے سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔ یہودی لاش وہیں چھوڑ گئے اور خالد الحسینی
گرفتار کر لیا۔

اسی رات ہنگامہ کی عدالت بیٹھی۔ خالد الحسینی پر بغاوت کا جرم عائد کیا گیا
بغیر کسی گواہ یا شہادت کے خالد کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ خالد نے اپنی صفائی پیش
چاہی لیکن کون سنتا۔ انہیں گھسیٹ کر کوٹھری میں بند کر دیا گیا اور صبح دم پھانسی
دی گئی۔ زرقا اڑتا لیس گھنٹے کے اندر یتیم اور یرس ہو گئی۔ ماں کی ہلاکت کی خبر
رات میں ملی اور صبح کو شامل نے اسے باپ کو پھانسی دیئے جانے کی خبر سنائی۔
کے آنسو خشک ہو گئے لیکن جسم میں بجلیاں بھر گئیں۔ اس نے آخری قدم اٹھا۔
فیصلہ کر لیا۔

”اب کیا کرنا ہے زرقا؟“ شامل نے درد میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔
”کل تک اور انتظار کرو شامل۔“ زرقا نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا۔
”کل — شامل بے چینی سے بولا۔ ”اب میں برداشت نہیں کرتا

مجھے اپنے حکم سے آزاد کر دو زرقا۔“ شامل نے بڑی امید سے زرقا کے چہرے پر
نظر جمادیں۔
”شامل تمہیں زندہ رہنا ہے۔“ زرقا کھوکھلی آواز میں بولی۔ ”اس شمع کو روشن
رکنا ہے جو میں نے، میرے ساتھیوں نے اپنے خون سے جلائی ہے۔“
”لیکن تم نے اپنے لئے کیا فیصلہ کیا ہے؟“ شامل کی بے تابی بڑھ گئی۔ ”کچھ
فیصلہ کر لیا ہے تو خدا کے لئے مجھے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دو۔“

”کل کا انتظار کرو شامل!“ اور زرقا شامل کو چھوڑ کر ایک طرف چل پڑی۔
شامل اسے بے بسی کے عالم میں دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

زرقا دیوانگی کے عالم میں دیر تک ادھر ادھر پھرتی رہی۔ پھر اس کے قدم ایوان
کنہ کی طرف اٹھنے لگے۔ شام کے وقت وہ ایوان ہنگامہ کی منحوس عمارت کے سامنے
لڑائی تھی۔ ”اسی ایوان میں میرے باپ کو پھانسی دینے کا اعلان ہوا تھا۔ اور اسی
ایوان میں میرے باپ نے آخری سانس لی تھی۔“

زرقا نے بڑی حقارت سے ایوان ہنگامہ کو دیکھا۔ ایوان کے گیٹ پر مسلح سپاہی
دبے رہے تھے۔ اسلحہ سے بھرے ٹرک اندر جا رہے تھے۔ اس عمارت کے اندر
تو بڑا اسلحہ خانہ تھا۔

”میں اسے تباہ کر دوں گی۔ ظلم اور نا انصافی کی نشانی مٹا دوں گی۔“ زرقا نے
اٹس سوچا اور پھر عمارت کا چکر کاٹا اور پشت کی دیوار پھانڈ کر اندر پہنچ گئی۔ عمارت
’آمدوں میں اسلحہ کا ڈھیر لگا تھا۔ ٹرک اسلحہ اتار کے واپس جا رہے تھے۔ زرقا
بلو سے قدم اٹھاتی ایک برآمدے کے پاس پہنچ گئی۔ اندھیرا بھیل رہا تھا۔ برآمدوں
’آمدوں روشنی تھی۔ سپاہی آہستہ آہستہ اسلحہ اٹھا کر اندر بڑے کمرے میں لے جا
ہے تھے۔ زرقا نے چار دستی بم اٹھا لئے۔ دو جیبوں میں ٹھونے اور دو ہاتھ میں پکڑ
لے۔ پھر پچھلے زینے سے چڑھ کر اوپر پہنچی۔

اوپر ہی گیلری کے دائیں جانب عدالت کا کمرہ تھا۔ ظالم عدالت۔ زرقا کا خون
ل اٹھا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ گئی۔ گیلری کے سرے پر پہنچ کر
یک کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے کی کھڑکی سے اس نے نیچے جھانک کے دیکھا۔

تمام قوت اور پورے حواس دواؤں کے زور پر کچھ دیر کے لئے واپس آ گئے۔
ہگانہ کی عدالت کے ارکان کو اطلاع دی گئی۔ پوری جیوری جیل کی کوٹھڑی میں
اکٹھا ہو گئی۔ 'جج' زرقا کا بیان قلمبند کرنے کے لئے اس پر جھک گئے۔ زرقا کی آنکھیں
کلی تھیں۔ وہ اپنے دشمنوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا رہی تھی۔ اس کا جسم ساکت
نامرغ آنکھوں کی پتلیاں گردش کر رہی تھیں۔ وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے چہروں میں
ناپید کسی کا چہرہ تلاش کر رہی تھی۔ کسی شناسا کا چہرہ، کسی دوست کا چہرہ۔

پھر اس کی آنکھوں میں یاس کی لہریں پیدا ہوئیں۔ نظروں کے آگے اندھیرا سا
آگیا۔ اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ جیوری کے ارکان اس سے کوئی بیان نہ لے سکے۔
اکڑوں نے زرقا کی زندگی سے ناامیدی کا اعلان کر دیا۔ ارکان اسے یوں مرنے نہیں
بنا چاہتے تھے۔ وہ اسے سزا دینا چاہتے تھے۔ اس کی تشہیر کرنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹروں
نے ایک بار پھر زرقا کو ہوش میں لانے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں نہ کھلیں
رف سانس کا رشتہ باقی تھا۔ نبض ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ جیوری کے ارکان سر جوڑ
کے بیٹھے اور انہوں نے زرقا کو موت کی سزا دی۔ اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا
کہ زرقا کو زندہ یا مردہ حالت میں کل صبح برسر عام سولی پر چڑھا دیا جائے گا۔

اسی رات پورے شہر میں ڈھنڈورا بڑایا گیا کہ کل صبح شہر کے بڑے چوراہے پر
ایک خطرناک سیاسی مجرم کو عوام کے سامنے سولی پر چڑھایا جائے گا۔ فلسطینی عرب یہ
ناکیر حیران رہ گئے۔ وہ کون مجرم ہے جسے سرعام سزا دی جائے گی۔ سولی پر چڑھایا
لئے گا۔ فلسطینی ایک دوسرے سے سوال کرتے لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہ
تھا۔ ہاں صبح کا سب کو انتظار تھا۔

وہ رات بڑے کرب کی رات تھی۔ وہ رات خوفناک بھی تھی، اور خونی بھی۔
وہ رات ختم نہ ہوئی تھی۔ اور آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ اس کی رفتار سست ہو
گئی۔ اسے ابھی ایک اور خونی منظر دیکھنا تھا۔ نصف شب کے بعد زرقا کی کوٹھڑی کے
انے ایک شخص نمودار ہوا۔ ایوان ہگانہ کا کارندہ شامل۔ شامل کے ہاتھ میں ایک
دان تھا جس پر خوان پوش ڈھکا تھا۔ پیریداروں نے شامل کو فوراً پہچان لیا لیکن اس
وقت اسے وہاں دیکھ کر حیران ہو گئے۔

دائیں جانب کا بڑا کمرہ اسلحے سے بھرا ہوا تھا۔ زرقا کی دیوانگی بڑھ گئی۔ عقل
رہی اور عشق نے آتش نمود کا رخ کیا۔ زرقا نے ہاتھوں کے ہم اسلحہ خانے
مارے اور بھاگ کر گیلری میں آ گئی۔ اسی وقت ایک دھماکہ ہوا اور پھر پوری
ڈمگھانے لگی۔ جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ زرقا زینے کی طرف بھاگنے لگی۔ ایک
دوسرا دھماکہ پھر مسلسل دھماکے ہونے لگے اور ایوان ہگانہ کے درودیوار ٹوٹ
میں بکھرنے لگے۔ زرقا بھاگتی ہوئی عدالت کے کمرے کے پاس سے گزری تو
قدم جیسے فرش نے پکڑ لئے۔ "عدالت" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ اور جب کے
نکال کر عدالت کے کمرے میں کھینچ مارے۔ ایک زبردست دھماکہ سے عدالت
اڑ گیا۔ اس کے ساتھ ہی پوری گیلری کانپی اور چھت لرز کر گری۔ زرقا نے
پہنچنے کی کوشش کی مگر چھت اس کے اوپر آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے
ہوش ہو گئی۔

اسلحہ خانہ تباہ ہو گیا۔ ایوان ہگانہ کی چھتیں اور دیواریں بیٹھ گئیں۔ عمار
محافظ اور پیریدار لمبے لمبے دب گئے۔ پورے قتل ایب میں کھرا مچ گیا۔ فوج
علاقے کو گھیرے میں لے لیا۔ لمبے کے نیچے سے لاشیں نکالی گئیں۔ اس عمار
علاوہ پاس کی بھی کئی عمارتیں بیٹھ گئی تھیں۔ اسلحے کے علاوہ بھاری جانی نقصان
ایوان ہگانہ کے بالائی زینے کا لمبہ ہٹایا گیا تو اس کے نیچے سے زرقا کا نیم
نکلا۔ زرقا کا بدن جھلس گیا تھا۔ ہاتھ پیر جل گئے تھے اور بالکل مجبول ہو
چرے کا ایک حصہ بھی جھلسا ہوا تھا۔ زرقا بے ہوش تھی۔ فوجی اس لڑکی کو
حیران رہ گیا۔ اعلیٰ افسران کو اطلاع دی گئی۔ مخبروں نے بتایا کہ یہی زرقا
الحسینی کی بیٹی! جسے ایک دن پہلے اسی عدالت کے حکم سے پھانسی دی گئی تھی
خانے کے تباہ ہونے کا معمہ حل ہو گیا۔ زرقا کو اسی حالت میں جیل کوٹھڑی
جا کے ڈال دیا گیا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر زرقا کو ہوش میں لانے کی کوشش میں آ
انہیں زرقا سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ تو اسے ہوش میں لا کر آزاد
جیالوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ زرقا میں سوائے
کے اور کچھ نہ تھا لیکن ڈاکٹروں کی کوشش سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔

شمال کے اعضاء جواب دینے لگے۔ وہ گھسٹتا ہوا زرقا کی طرف بڑھا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”دیکھو زرقا! میں نے اپنی قسم پوری کر دی۔ میں نے تمہارے

ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔
 ”زرقا —!“ شماکل زور سے چیخا اس نے دیوانگی میں زرقا کا سر

پورے عالم اسلام میں گونج رہا ہے۔

زرقا نے جان دے کر ہزاروں زرقائیں پیدا کر دیں۔

زرقا کی آواز شیلہ اور صابرہ کے کیمپوں میں گونجی۔

زرقا کی آواز، بیس لاکھ فلسطین مہاجرین کی آواز ہے۔

اور آج زرقا کی آواز، اس کی لگن، اس کا جذبہ حریت ایک نئے روپ میں

جل گیا ہے۔ اس نے ایک نیا پیکر اختیار کیا ہے۔

اس روپ، اس پیکر کا نام ہے یا سر عرفات، یا سر عرفات۔

☆☆☆

سامنے شہادت پانے کی آرزو کی تھی۔ میری آرزو پوری ہو گئی میں نے ماں باپ کا برا لے لیا۔ میں نے تمہارا بدلہ لے لیا۔ کاش کچھ اور گولیاں ہوتیں۔ میں، میں۔

شمال کی گویائی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ زرقا کے قریب بھی نہ پہنچ سکا اس سے چار فٹ کے فاصلے پر پہنچ کے جان، جان، آفرین کے حوالے کر دی۔ زرقا روح، عالم بالا سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔

شمال کی طرف سے گولیوں کی آواز بند ہوتے ہی فوجی بڑھتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔ "شمال" ایک یہودی کے منہ سے نکلا اور تمام فوجی جھک کر شمال کی لاش کو دیکھنے لگے۔ وہ سخت حیران تھے کہ شمال نے ایسا کیوں کیا۔ ایک یہودی کا آواز فلسطین کے نمائندوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ وہ کچھ نہ سمجھ سکے اور یہ راز ایک زمانے تک راز ہی رہا۔

صبح کو میدان میں تل ابیب کی تمام عرب آبادی جمع ہو گئی۔ وہ اس حریت پسند کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے جس کو سولی چڑھانے کے لئے اسرائیلی حکومت نے الزامیہ لگا کر تھام لیا تھا۔ واصل یہودی زرقا کو سرعام پھانسی دے کر حریت پسندوں کے حوصلے پست کرنا چاہتے تھے۔

زرقا کے مردہ جسم کو اسٹریچر پر ڈال کے پھانسی کے تختے پر لایا گیا۔ پھر وہ آدمیوں نے اسے اٹھا کر پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیا۔ لاش پھندے میں جھول گئی۔

"زرقا۔۔۔۔ ایک آواز ابھری۔

"زرقا۔۔۔۔ حریت پسند زرقا!"

"فلسطینیوں کی آن زرقا!"

"آزادی کی شمع زرقا!"

زرقا، زرقا کی آوازوں سے پورا میدان گونج اٹھا۔

آج زرقا ہم میں موجود نہیں لیکن ۱۸ مئی ۱۹۴۸ء کو اس نے جان دے کر دھت، استقلال و پامردی اور آزادی کا جو چراغ جلایا تھا۔ جس ترانے کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ چراغ باد مخالف کے جھونکوں میں آج بھی روشن ہے۔ وہ ترانہ آج بھی

حضور میں۔ حکم تو صرف آپ دے سکتے ہیں۔“

”درخواست یوں پیش کی جاتی ہے مادر مہریان!“ مقتدی اور بھر گیا۔ ”ملک شاہ کسی امیر کو بھیج سکتا تھا۔ لشکر لے کر بغداد کیوں آیا ہے۔ ہم ہارون رشید اور مامون رشید کی اولاد ہیں۔ خدا کی قسم ہم ملک شاہ کا مقابلہ کریں گے۔ ہماری تلواریں ابھی زنگ آلود نہیں ہوئیں۔“

”صلحت بھی تو کوئی چیز ہے خلیفہ بیٹے!“ مادر ملکہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بریکارق اور محمود‘ دونوں ہی ملک شاہ کے بیٹے ہیں۔ وہ باپ ہے جس کو چاہے اپنا ولی عہد مقرر کرے۔ خلافت کا یہ منصب نہیں کہ وہ دوسروں کی آگ میں ہاتھ ڈال دے۔ تخت و تاج کے لئے شجاعت اور طاقت چاہئے۔ ولی عہدی کا اعلان کوئی وقت نہیں رکھتا۔ جو زیادہ طاقتور ہو گا وہ آپ ہی ملک شاہ کا جانشین بن جائے گا۔ آپ ان کے جھگڑوں میں نہ الجھئے۔“ ملکہ مادر کے لہجے میں کافی ترشی آگئی۔

خلیفہ مقتدی ماں کی بہت عزت کرتا تھا۔ اس نے ماں کا لہجہ بگڑا ہوا دیکھا تو خود نرم پڑ گیا۔ ”مادر مہریان! یہ ایک بہت بڑی سیاسی چال ہے۔ آپ اس پر کیوں غور نہیں فرماتیں۔ یہ مطالبہ ملک شاہ کا نہیں اس کی بیوی ترکان خاتون کا ہے۔ وہ سوتیلے بیٹے بریکارق کو اس کے حق سے محروم کر کے سلجوقی تخت و تاج اپنے بیٹے محمود کے نام کرانا چاہتی ہے۔ محمود کی عمر ابھی مشکل سے چار سال ہے۔“

”مگر اس سے بغداد کی خلافت کو کیا نقصان پہنچا ہے۔“ ملکہ مادر کا لہجہ زیادہ تلخ ہو گیا۔ ”ملک شاہ جس کو ولی عہد بنانا چاہتا ہے۔ آپ اس کا پروانہ جاری کر دیں۔ دردمرمول لینے سے کیا فائدہ؟“

”اور ملک شاہ کے دوسرے مطالبے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“ خلیفہ نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔

”کیا اس کا اثر بھی بغداد کی خلافت پر نہ پڑے گا؟“

”دوسرا مطالبہ۔ اور کون سا مطالبہ کیا ہے ملک شاہ نے؟“ مادر ملکہ قدرے حیرت سے بولیں۔

خلیفہ مقتدی نے قرآلوں نظروں سے ابو شجاع اور عبد الملک کو دیکھا اور چیخ کر

سلجوقی ساحرہ

عباسی خلیفہ کی غضب ناک آواز سے قصر خلافت کے در و دیوار لرز رہے تھے۔

”کیا ہم خلیفہ نہیں۔ ملک شاہ کو حکمت کا پروانہ ہم نے عطا کیا ہے۔ وہ ہم حکم دینے والا کون ہوتا ہے۔“ خلیفہ مقتدی کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ ”ابو شجاع“ عہد الملک تم بھی ڈر رہے ہو اور آپ مادر مہریان! آپ کیوں خاموش ہیں کیا ہم ملک شاہ کا مطالبہ تسلیم کر لیں؟“

خلیفہ مقتدی کا وزیر دولت ابو شجاع اور وزیر مملکت عبد الملک دم بخود ساٹے کھڑے تھے۔ پس پردہ خلیفہ کی والدہ ارجون خاتون اور بڑی ملکہ سغری خاتون خاموش بیٹھی تھیں۔ کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ خلیفہ کے غصے کو کس طرح ٹھنڈا کیا جائے۔

”خلیفہ بیٹے!“ آخر مادر ملکہ ارجون خاتون نے خاموشی کا قفل توڑا۔ ”سلجوقی سلطان ملک شاہ نے کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ اس نے تو درخواست پیش کی ہے خلیفہ

خلفہ مقتدی سے ہوئی تھی۔ اس کا انتقال ہو چکا تھا لیکن اس کا بھی ایک چار سالہ لڑکا بچہ تھا جسے ترکان خاتون اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ ترکان خاتون اپنے اس نواسے جعفر کو بھی خلافت عباسیہ کا ولی عہد مقرر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن مقتدی کا بڑا بیٹا ابو العباس امین مقتدی جوان تھا۔ اس کی ماں سفری خاتون بھی زندہ تھی۔

عباسی خلافت اور سلجوقی سلطنت کی ولی عہدی کا مسئلہ پچھلے دو سال سے سنگین مورت اختیار کر گیا تھا۔ ترکان خاتون بڑی با اثر ملکہ تھی۔ اس نے تمام امیروں، وزیروں کو دولت اور عہدوں کے لالچ دے کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ ملک شاہ پہلے ہی اس کے قابو میں تھا چنانچہ ۵۸۰ھ میں ترکان خاتون سلطان ملک شاہ کو ساتھ لے کر بغداد پہنچ گئی۔ اس نے پانچ ہزار سلجوقی سواروں کا ایک لشکر بھی ساتھ لے لیا۔ بغداد پہنچی اس نے ملک شاہ کے ذریعے خلفہ مقتدی سے مطالبہ کیا کہ وہ سلجوقی سلطنت کے لئے ترکان خاتون کے بیٹے محمود کی ولی عہدی کا پروانہ جاری کرے اور دوسری طرف خلفہ اپنے بڑے بیٹے کو حق سے محروم کر کے ترکان خاتون کے نواسے جعفر کو خلافت عباسیہ کا ولی عہد مقرر کرنے کا اعلان کرے۔ خلفہ مقتدی اگرچہ ملک شاہ کا احسان مند تھا لیکن عالی ہمت اور سمجھ بوجھ کا مالک بھی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ترکان خاتون، دونوں حق داروں کو محروم کر کے سلجوقی سلطنت اور عباسی خلافت پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔

خلفہ مقتدی کی والدہ ارجون خاتون اور بڑی بیگم سفری خاتون دونوں ہی انتہائی عمل مند خواتین تھیں۔ اور خلفہ ان کے مشورے کے بغیر کوئی اہم قدم نہ اٹھاتا تھا۔ ترکان خاتون کے دونوں مطالبے ماننے پر جب اسے مجبور کیا گیا تو وہ بھڑک اٹھا۔ یہ دونوں مطالبے خلافت کے وقار کے خلاف اور عدل و انصاف سے گئے ہوئے تھے۔ اس لئے خلفہ نے اپنے وزیروں کے ذریعے یہ مطالبے اپنی والدہ اور بیوی تک پہنچائے۔ کیونکہ خلفہ کے سامنے تذکرہ کرنا بھی خلافت کی توہین کے مترادف تھا۔ ابو شجاع اور عمید الملک چاہتے تھے کہ خلفہ، سلجوقی ولی عہدی کا مطالبہ مان کے ترکان خاتون کے شر سے محفوظ ہو جائے۔ رہا عباسی خلافت کی ولی عہدی کا سوال تو وہ اس مسئلے کو کسی نہ کسی طرح التوا میں ڈال کر طول دیں گے۔ تاکہ کوئی بہتر صورت نکل

بولے۔ ”تم خلافت سے وفاداری کا دم بھرتے ہو۔ ہم نے تمہیں مادر مہربان اور سزا خاتون کے پاس کیا پیغام دے کے بھیجا تھا۔ تم نے انہیں پوری باتوں سے آگاہ کیا نہیں کیا؟“

”خلفہ معظم!“ وزیر دولت ابو شجاع نے پہلی بار زبان کھولی اور حوصلہ بولا۔ ”ہم وفادار ہیں لیکن ہمیں یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ جو بات خلفہ بغداد جیسا عالی ہمت انسان، مادر ملکہ اور ملکہ بیگم کے سامنے بیان نہ کر سکا اس بات کو جیسے کمزور انسان اپنی زبان سے کیے ادا کر سکتے تھے۔ ہم نے پورا پیغام پہنچانے کی کوتاہی کی ہے۔ ہم سزا کے لئے تیار ہیں۔“

خلفہ کو ابو شجاع کی اس صاف گوئی پر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ سلجوقی سلطان ملک شاہ اپنی ملکہ ترکان خاتون کے ساتھ بغداد میں ایک ہفتے سے ٹھہرا ہوا تھا بغداد کی عباسی خلافت برائے نام تھی۔

عباسی خلافت کا زوال خلفہ معظم کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ شہزادہ اوسط، مصر، ایران اور غزنی میں مختلف امیروں کے تحت الگ الگ اسلامی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ جو حکومت طاقتور ہو جاتی وہاں کا حاکم سلطان کا لقب اختیار کر کے اپنے بادشاہت کا پروانہ حاصل کر لیتا۔ اور بغداد کا خلفہ بھی اس کا ماتحت ہو جاتا۔ جب سلجوقیوں کا زور ہوا تو انہوں نے بغداد سے وہیلیوں کا اثر ختم کر دیا۔ سلجوقیوں نے بغداد پر قبضہ تو نہ کیا لیکن انتظامی معاملات کے لئے وہاں اپنا ایک نائب السلطنت مقرر کر دیا۔ پانچویں صدی ہجری میں ملک شاہ سلجوق کی حکومت طول میں چین سے بیت المقدس اور عرض میں قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک پھیلی ہوئی تھی۔ ملک شاہ بڑا عادل شجاع اور نڈر حکمران تھا۔ اس میں ملک گیری اور ملک داری کے اعلیٰ صفات موجود تھے۔ لیکن مطلق العنان سلطان ہونے کی وجہ سے اس میں خود سری اور تکبر بھی تھا۔

ملک شاہ پر اس کی چھوٹی بیگم ترکان خاتون کا اتنا اثر تھا کہ وہ ترکان خاتون کی کسی بات سے انکار نہ کرتا تھا۔ ملک شاہ کی بڑی بیگم زبیدہ خاتون کے بطن سے ایک لڑکا برکیار تھا۔ اس کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ لیکن ترکان خاتون اپنے چار سالہ لڑکے محمود کو ولی عہد بنانا چاہتی تھی۔ اسی طرح ترکان خاتون کی ایک لڑکی تھی۔ جس کی شادی

”جئے اور اگر ضرورت پڑے تو فوجی تیاری کی جائے۔“

”عید الملک! تم کیوں خاموش ہو؟“ خلیفہ کے ذہن کا بوجھ اب کچھ ہلکا ہوا

خلیفہ المسلمین!“ عید الملک بولا۔ ”ہم وفاداران خلافت نے یہ طے کیا تھا کہ اگر خلیفہ محترم کی برہمی دور ہو جائے اور وہ ترکان خاتون کے بیٹے کی ولی عہدی کے لئے رضامند ہو جائیں تو پھر یہ ہماری ذمہ داری ہوگی کہ ہم اپنی کوشش سے ترکان خاتون کو دوسرے مطالبے سے فی الحال باز رکھیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم اس کوشش میں کامیاب بھی ہوں گے۔“

خلیفہ کی بڑی بیگم ملکہ سفری خاتون شروع سے اب تک بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ بات جب اس نکتے پر پہنچی تو انہوں نے بڑی فراخ دل کا ثبوت دیا۔ بولیں۔ ”عید الملک! اگر ہمارے بیٹے شہزادہ ابوالعباس احمد کی وجہ سے خلافت عباسیہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے تو ہم خوشی سے جعفر کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہیں۔ ترکان خاتون ہماری بھانجی ہے۔ ہم اس کی فطرت اور چالبازیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ اپنے نواسے کو بغداد کا ولی عہد بنانے سے کسی طرح باز نہ آئے گی۔ ہم صرف شہزادے کی زندگی چاہتے۔“

سفری خاتون، ملکہ شاہ کی سوتیلی بہن تھی اور اس کی شادی خلیفہ مقتدی سے کم عمری ہی میں ہو گئی تھی۔ سفری خاتون نے اپنے اس رشتے کی طرف اشارہ کیا ”ملکہ عالیہ! ہمیں اس بات کا علم ہے۔“ عید الملک نے کہا۔ ”ترکان خاتون کے اثر و رسوخ سے بھی ہم واقف ہیں۔ اس لئے ہم نے شہزادے کی حفاظت کا بھی انتظام کر لیا ہے۔“

”شہزادہ ابوالعباس احمد اس وقت کہاں ہے؟“ عید الملک؟“ خلیفہ نے گھبرا کر پوچھا۔

”خلیفہ المسلمین بے فکر رہیں۔“ عید الملک نے فوراً جواب دیا۔ ”شہزادے کا مقام کو ہم نے بغداد سے باہر بھیج دیا ہے۔ وہ اس وقت وفاداران خلافت کی

آئے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں وزیروں نے دوسرے مطالبے کا ارجون خاتون اور ترکان خاتون سے قطعی ذکر نہیں کیا تھا۔

خلیفہ بہت دیر تک غور و فکر میں مبتلا رہا۔ اس کا غصہ تو ختم ہو گیا لیکن اس سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ ترکان خاتون جیسی با اثر ملکہ کی چالبازیوں سے خود کو کم طرح محفوظ رکھے۔ خلیفہ کو خاموش دیکھ کر ارجون خاتون اور سفری خاتون بھی خاموش بیٹھی تھیں حالانکہ وہ ترکان خاتون کا دوسرا مطالبہ سننے کے لئے بے چین تھیں۔ اشجاع نے اب یہی مناسب جانا کہ اس کا اظہار کر کے دونوں خواتین کو اپنے اعتماد لے۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”مادر ملکہ۔ ترکان خاتون کا دوسرا مطالبہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔“

”کیا کہہ رہے ہو ابو اشجاع؟“ خلیفہ نے چونک کر وزیر کی بات کاٹ دی ”ترکان خاتون ہمارے بیٹے ابوالعباس احمد کو محروم کر کے اپنے نواسے جعفر کو بغداد کا ولی عہد بنانا چاہتی ہے۔ کیا یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی؟“

ارجون خاتون اور سفری خاتون نے گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ ارجون خاتون نے کہا۔ ”ابو اشجاع! یہ تو واقعی بہت اہم بات ہے۔ اگر ہم نے بیٹوں کو محروم کے چھوٹوں کو نوازنے کی رسم ڈالی تو پھر عباسی امراء اور عام مسلمانوں میں خلافت کیا وقار رہ جائے گا؟“

”مادر ملکہ کا ارشاد عالی بالکل درست ہے۔“ ابو اشجاع نے ادب سے جواب دیا۔ ”لیکن اس غلام نے اس معاملے کو اس لئے اہمیت نہیں دی کہ یہ خلافت عباسی کا اپنا ذاتی مسئلہ ہے۔ اس گفت و شنید کو ہم طول دے سکتے ہیں۔ اسے ٹال بھی سکتے ہیں یا اس کے لئے مزید وقت حاصل کر سکتے ہیں۔“

”ابو اشجاع! کیا تمہیں امید ہے کہ ترکان خاتون اس مطالبے سے دست بردار جائے گی؟“ خلیفہ نے بڑی دلچسپی اور امید سے سوال کیا۔

”خلیفہ معظم!“ ابو اشجاع نے سر جھکا کر کہا۔ ”اگر ترکان خاتون کو اس کے بیٹے محمود کی ولی عہدی کا پروانہ دے دیا جائے تو شاید وہ دوسرے مطالبے پر اس وقت رضامند نہ دے۔ ہم کسی نہ کسی طرح کچھ وقت حاصل کر لیں گے تاکہ اس مسئلہ پر مزید غور

لفی بھول گئے تھے۔ تم ہماری طرف سے انہیں مدعو کر سکتے ہو۔ ہم انہیں بڑے اعلیٰ پائے کی ضیافت دیں گے۔“

”امیر المومنین جس وقت ہم سے ملک شاہ نے شکوہ کیا تو ہم نے مصلحتاً کہہ دیا کہ نصیب دشمنان امیر المومنین کی طبیعت ناساز ہے ورنہ دعوت کا تو انتظام کیا جا چکا ہے۔“

”بہت خوب تم نے بہت اچھا کیا۔“ خلیفہ مقتدی خوش ہو گیا۔ اس نے متشکر نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”یہی مصلحت اب بھی برقرار رہے گی۔ امیر المومنین! ابو شجاع نے خلیفہ کو قبی نظروں سے دیکھا۔ ”اگر ملک شاہ کو اصفہان جانے کی جلدی ہوگی تو ہم اسے محمود کی ولی عہدی کا پروانہ دے کر رخصت کر دیں گے اور اگر ترکان خاتون ضد پر اڑی رہی تو ہم امیر المومنین کی ناسازی طبع کے پردے میں وقت طلب کریں گے۔ اس طرح ہمیں کچھ نہ کچھ وقت حاصل ہو جائے گا۔“

”ہمیں تم دونوں پر فخر ہے۔“ خلیفہ مسرت سے بولا۔ ”جب تک خلافت عباسیہ کو تم جیسے وفادار اور دور اندیش وزیر میسر ہیں اس پر کوئی زوال نہیں آسکتا۔“

خلیفہ مسند سے اٹھنے لگا تو سفری خاتون کی آواز آئی۔ ”ابو شجاع اور عمید الملک خدا کے بعد ہم نے شہزادے ابو العباس احمد کو تمہاری امان میں دیا ہے۔ اس کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔“

”ہم ملکہ بیگم کے اعتماد کو مجروح نہ ہونے دیں گے۔“ ابو شجاع نے بڑے انتظار سے جواب دیا۔



سلطان ملک شاہ سلجوقی، قصر سلطان میں قیام پذیر تھا۔ یہ قصر آل بویہ کے جلیل القدر حاکم عضد الدولہ نے تعمیر کرایا تھا۔ آل بویہ وہ ایرانی شہزادے تھے جو ایک سو سال تک بغداد پر قابض رہے۔ اور عباسی خلافت ان کے رحم و کرم پر رہی۔ قصر سلطان کی شان و شوکت خلیفہ مقتدی کے محل قصر الذہب سے جسے حریم خلافت کہا

حفاظت میں ہیں۔ ملک شاہ یا ترکان خاتون ان کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔“

ابو شجاع اور عمید الملک کی پرورش ملکہ مادر نے قصر خلافت میں کی تھی۔ خلیفہ کے ہم عمر تھے اور خلیفہ کے لئے ہر وقت اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان کی وفاداری شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ اس لئے جب عمید الملک نے یہ کہ شہزادے ابو العباس احمد کو بغداد سے باہر بھیج دیا گیا ہے تو ملکہ مادر اور سفری خاتون کو بڑا اطمینان ہوا۔

”ہم تمہاری دانش مندی کے شکر گزار ہیں۔“ متا کی ماری سفری خاتون۔
دونوں کو مخاطب کیا۔ ”تم نے بہت اچھا کیا کہ شہزادے کو بغداد سے ہٹا دیا۔“

خلیفہ کو بھی اپنے وفاداروں کے اس مصلحت اندیش اقدام سے بڑی خوش ہوئی۔ بولا ”اگر سب کی یہی رائے ہے تو ہم محمود کی ولی عہدی کا پروانہ جاری دیتے ہیں۔“

”خلیفہ معظم!“ ابو شجاع نے کہا۔ ”فی الحال صرف خلیفہ کی زبانی رضامندی کافی ہے۔ ہم ملک شاہ کو اس سے مطلع کر کے دوسرے مطالبے کے وقت مانگیں گے۔ اگر وہ راضی ہو گیا تو پھر محمود کی ولی عہدی کا پروانہ جاری کر دیا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے عمید الملک۔ تم ہمارا یہ پیغام ملک شاہ کو پہنچا دو۔“ خلیفہ مطمئن ہو کر کہا۔ ”اگر ترکان خاتون اس پر رضامند ہو جائے تو ہم سمجھیں گے کہ لوگوں نے عباسی خلافت کو ایک بڑے جھگڑے سے بچا لیا۔“

”امیر المومنین۔۔۔۔۔“ ابو شجاع نے پہلے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے کہا۔ ”ملک شاہ اور ترکان خاتون اس ایک ہفتے میں صرف ایک بار خلافت میں قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ انہیں امید تھی عباسی مہمان نوا کے پیش نظر خلیفہ معظم انہیں ضیافت پر مدعو کریں گے۔ ملک شاہ نے ہم اشارتاً اس کا شکوہ بھی کیا تھا۔“ ابو شجاع کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ خلیفہ بیچ میں پڑا۔

”تم نے ٹھیک یاد دلایا ابو شجاع“ خلیفہ پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ”ترکان خا کے ان بیجا مطالبوں نے ہمارا مزاج درہم برہم کر دیا تھا۔ ہم مہمانوں کو دعوت

جاتا تھا، کسی طرح کم نہ تھی۔ قصر سلطان کے آس پاس اور بہت سے محلات تھے جہاں ملک شاہ کے ساتھ آنے والے امرا ٹھہرے ہوئے تھے۔ امراء کے علاوہ ملک کے ایک ہزار سے زیادہ وہ وفادار غلام تھے جن کی وفاداری پر ملک شاہ کو بڑا ناز تھا یہی غلام ملک شاہ کے محافظ دستوں میں شامل تھا۔

جب سے ملکہ ترکان خاتون نے اپنے صغیر اسن بیٹے محمود کی دلی عمدی کا شروع کیا تھا، یہ غلام ترکان خاتون کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان کی تمام ہمدردیاں ملک شاہ کے بڑے بیٹے برکیارق کے ساتھ تھیں لیکن ملکہ کا اثر ملک شاہ پر اس قدر تھا کہ ان وفاداروں کی ایک نہ چلتی تھی۔ ان غلاموں نے محلاتی سازشوں میں دخل نہ دیا لیکن یہ ضرور کیا کہ وہ برکیارق کی ہر وقت حفاظت کرتے اور اسے تنہا اور آزاد نہ جانے دیتے۔ ملکہ بھی بڑی چالاک تھی۔ جب وہ اپنے دار السلطنت اصفہان۔

ملک شاہ کے ساتھ بغداد چلی تو اس نے ان تمام غلاموں کو ملک شاہ سے کہہ کر اسے ساتھ لے لیا۔ اس طرح قلعہ اصفہان میں برکیارق تنہا رہ گیا۔

ملک شاہ میں جمائگیری اور جہانداری کی تمام خوبیوں کے باوجود دو بری عادتیں تھیں۔ ایک تو حد سے بڑھا ہوا شکار کا شوق۔ دوسرے رقص و سرود کی محفلوں کا ہوا بغداد میں آئے ہوئے اسے ایک ہفتہ ہو گیا تھا لیکن اسے ان دونوں چیزوں سے لگا اٹھانے کا موقع نہ ملا تھا۔ شکار کے لئے وہ اس لئے نہ جاسکتا تھا کہ ابھی تک عہدی کے متعلق خلیفہ مقتدی نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اور وہ برابر ٹال مٹول کرتا تھا۔ محل میں رقص و سرود کا انعقاد بھی بغداد میں ممکن نہ تھا۔ خلیفہ مقتدی کا دانا یوں تو برائیوں سے بالکل پاک نہ تھا لیکن اس نے عوام کی اخلاقی حالت درست کر کے لئے بعض بڑے سخت قسم کے فرمان جاری کئے تھے۔ اس نے تمام ناچنے والی عورتوں اور طوائفوں کو بغداد سے نکال باہر کیا تھا۔ حماموں میں برہنہ داخل ہونے کی ممانعت تھی اور کشتی میں سیر کے وقت کوئی عورت کسی نا محرم کے ساتھ نہ سکتی تھی۔ یہاں تک کہ چھتوں پر کبوتر کی چھتریاں لگانے کی اجازت بھی نہ تھی۔

سے بے پردگی ہوتی تھی۔

ان پابندیوں سے ملک شاہ چڑا ہوا تھا۔ ترکان خاتون الگ خلیفہ کے خلاف

حکام ہر وقت بھرتی رہتی تھی۔ چنانچہ جب ابو شجاع اور عمید الملک جواب لے کر ملک شاہ کے پاس آئے تو وہ پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔ اس نے جواب سننے سے پہلے ہی خلیفہ کے دونوں وزیروں کو پھنکارنا شروع کر دیا۔ ”تم اور تمہارا خلیفہ دونوں احسان زاموش ہیں۔ اگر سلجوقی خاندان بغداد کی حفاظت نہ کرتا تو آج اس شہر کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ ہم خلیفہ کے غلام نہیں کہ یہاں پڑے ان کے جواب کا انتظار کرتے رہیں۔“

سلطان خاموش ہوا تو ابو شجاع ہمت کر کے بولا۔ ”شاہ معظم! اراکین و مائیدین خلافت سخت شرمندہ اور معذرت خواہ ہیں۔ اگر امیر المومنین کی طبیعت ناساز نہ ہو جاتی تو شاہ عالی کو اس قدر زحمت نہ ہوتی۔“

”ہم جانتے ہیں۔ ہمیں خواہ مخواہ پریشان کیا جا رہا ہے۔“ ملک شاہ تلخی سے بولا۔ ”بیاری ایسی تو نہیں کہ مقتدی ہاتھ پیر ہلانے سے بھی معذور ہو۔ دلی عمدی کے

بانے پر دستخط کرنے سے اس کی بیاری بڑھ تو نہ جائے گی۔ یہ سب انکار کی باتیں ہیں اور ہم انکار برداشت نہیں کر سکتے۔“

”شاہ عالی مقام۔ خلیفہ محترم کے انکار کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ملائین سلجوقیہ نے باب خلافت میں جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان سے خلافت عباسیہ

بچہ بچہ واقف ہے۔ اگر خلیفہ کی طبیعت ناساز نہ ہوتی تو ———“ عمید الملک کی

تائید پر ملک شاہ نے کاٹ دی۔

”تو پھر زبان ہلانے میں کیا ہرج ہے۔“ ملک شاہ کی زبان پہلے سے بھی زیادہ تلخ

”زبان سے تو خلیفہ محترم پہلے ہی اقرار کر چکے ہیں۔“ ابو شجاع نے فوراً لقمہ

”جس دن شاہ تشریف لائے تھے اور خلیفہ المسلمین کو شاہ اور شاہ بیگم کا عندیہ

معلوم ہوا تھا تو انہوں نے بستر پر لیٹے لیٹے فرمایا تھا کہ سلجوقی سلطان مالک و مختار اور

السلطان ہیں۔ وہ جس کو چاہیں اپنا دلی عہد مقرر کر سکتے ہیں۔ خلافت کو اعتراض

لے کی کیا ضرورت ہے۔“

”ہوں ———“ ملک شاہ نے ابو شجاع کو گھور کر دیکھا۔ ”مقتدی نے زبانی

فلنہ بنا کر جائیں گے۔ وہ دفع ہو جائے بغداد سے — فوراً! ابھی حکم کی تعمیل ہو۔“

ملک شاہ کی گرجدار آواز سے قصر سلطان کانپ اٹھا۔ دربار پر مکمل سکوت ماری تھا۔ سلطان ملک شاہ کے جلال سے سب واقف تھے۔ بڑے سے بڑا سردار اس سے آنکھ ملاتے گھبراتا تھا۔

ابو شجاع جیسے ہتھیلی پر سر رکھ کر آیا تھا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔ ”سلطان معظم! کے حکم کی تعمیل ابھی کر دی جائے گی۔ خلیفہ کو بغداد سے نکال دیا جائے گا لیکن — سب سے بڑا بادشاہ، دولت سلجوقیہ کا عظیم ترین حکمران ”سلطان العادل“ کے قب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کیا اہل بغداد اور دنیا والے یہ نہ کہیں گے کہ سلطان العادل نے خلیفہ بغداد کے ساتھ یہ انصاف کیا کہ بیمار اور صاحب فراش خلیفہ کو بغداد سے باہر نکال کر ایک بچے کو تخت خلافت پر بٹھا دیا۔ یوں شاہ، مالک و مختار بھی ہیں، ان کی کم عددی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صرف چند ساعتوں بعد شاہ کو اطلاع مل جائے گی کہ ان کے حکم کی تعمیل ہو گئی اور خلیفہ کو اسی حالت میں بغداد بدر کر دیا گیا۔“ پھر ابو شجاع نے سر جھکا کر اجازت مانگی۔ ”وزیر دولت کو اجازت دی جائے کہ سلطان معظم کے حکم کو پایہ تکمیل تک پہنچائے۔“

ابو شجاع نے شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملک شاہ کو ایسی کھری کھری مائیں کہ اس کے مزاج بھی ٹھکانے آ گئے۔ نرم ہوتے ہوئے بولا۔ ”ابو شجاع! تم نے مقتدی کی وکالت تو خوب کی لیکن ہمارا خیال نہ کیا۔ ہم صاحب اقتدار ہیں۔ ہم شہزادہ محمود کو سلجوقی سلطنت کا اور شہزادہ جعفر کو بغداد کی خلافت کا ولی عہد اپنے طور پر بھی مقرر کر سکتے ہیں لیکن ہم نے تمہارے خلیفہ کی عزت ملحوظ رکھی اور ان سے ولی عہد کے پروانے مانگے۔ کیا یہ مقتدی کی ہٹ دھرمی نہیں۔ ہم کہاں تک انتظار کر سکتے ہیں۔ مقتدی شاید ہمیں با اختیار نہیں سمجھتا۔ جہی وہ آنا کالی کر رہا ہے۔“

”سلطان عالی مقام!“ ابو شجاع نے مدبرانہ انداز اختیار کیا۔ ”خلیفہ محترم کے لڑکے عالی سے یہ خادم پوری طرح واقف ہے۔ وہ سلطان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ یہ میری ذمہ داری ہے سلطان معظم! ذرا طبیعت سنبھلی اور

اقرار کر لیا ہے؟“

”یہ اقرار تو پہلے ہی دن کر لیا گیا تھا حضور والا۔“ ابو شجاع نے کہا۔

”خلیفہ محترم کی طبیعت جیسے ہی سنبھلی۔ ولی عہد کا پروانہ تیار کر کر شاہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

ملک شاہ کا غصہ کچھ کم ہوا تھا۔ لیکن شاہ بیگم ملکہ ترکان خاتون دوسرے کمر میں بیٹھی ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔ اس نے فوراً ”اپنی کنیز کے کان میں کچھ کہہ“ سلطان کے پاس بھیجا۔ کنیز کمرے میں داخل ہو کر ملک شاہ کے پاس پہنچی اور آہ آہستہ ملک شاہ کو ترکان خاتون کا پیغام پہنچایا۔

ملک شاہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ابو شجاع! تمہارے خلیفہ نے ہمارے عہد کے لئے تو اقرار کر لیا ہے لیکن ہمارے نواسے جعفر کے بارے میں کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا وہ شہزادہ جعفر کو اپنا ولی عہد بنانے کے لئے تیار نہیں؟“

”ایسی بات نہیں ہے شاہ معظم!“ ابو شجاع نے سنبھل کر کہا۔ ”انہوں۔ انکار ہرگز نہیں کیا تھا۔ بلکہ یہ کہا تھا کہ وہ صحت یاب ہوتے ہی اپنے عمائدین اور سرداروں کو اعتماد میں لے کر شاہ معظم کی خواہش پوری کر دیں گے۔“

”کیا بغداد کے سرداروں اور امیروں میں اتنی جرات ہے کہ وہ ہمارے حکم تعمیل سے انکار کر سکیں؟“ ملک شاہ کو پھر غصہ آ گیا۔ ”مقتدی سے کہو کہ کسی مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”بہتر ہے شہنشاہ معظم! حکم کی تعمیل ہوگی۔“ ابو شجاع نے سر تسلیم خم کر ہوئے کہا۔ ”میر المومنین کی بھی یہی خواہش ہے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ یہ فیصلہ تندرست ہونے کے بعد کریں تاکہ کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے کہ خلیفہ نے بیماری زمانے میں شہزادہ ابوالعباس احمد کے بجائے شہزادہ جعفر کو ولی عہد بنا دیا ہے۔ اس لئے انہوں نے ایک ماہ کی مہلت کی خواہش کی ہے۔“

”کس قدر بے ہودہ خواہش ہے مقتدی کی۔“ ملک شاہ چیخ پڑا۔ ”بغداد۔ مالک ہم ہیں، مقتدی نہیں۔ ہم ایک دن کی بھی مہلت نہیں دے سکتے۔ جاؤ! مقتدی سے کہہ دو کہ وہ بغداد سے نکل جائے۔ بغداد کا ولی عہد جعفر ہے۔ ہم۔“

خلیفہ کے یہ دونوں وزیر آئندہ منصوبے کے بارے میں گفتگو کرتے حرم خلافت جا رہے تھے اور ادھر قصر سلطان میں ترکان خاتون نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ابو شجاع اور عمید الملک کے رخصت ہوتے ہی ترکان خاتون نے ملک شاہ کو اندر بلایا اور منہ پھلا کر بولی۔ ”یہ کیا کیا آپ نے سلطان۔ مقتدی نے میری بیٹی کو جلا جلا کر مار ڈالا۔ وہ کسی رعایت کا مستحق نہیں۔ اسے تو ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں ملنا چاہئے۔“

”ترکان خاتون! فکر کیوں کرتی ہو۔“ ملک شاہ نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”تم جو چاہتی ہو“ وہی ہو گا۔ صرف دس دن کی تو بات ہے۔ اگر ہماری واپسی پر بھی مقتدی نے انکار کیا تو ہم خود شہزادے جعفر کی ولی عہدی کا اعلان کر دیں گے۔ مقتدی نے مخالفت کی تو اسے بغداد سے نکال باہر کیا جائے گا۔“

”سلطان! مستقبل پر اعتبار کرنا غلطی ہے۔“ ترکان خاتون بے چینی سے بولی۔ ”کیا پتہ کل کیا ہو جائے۔ میرے دل میں طرح طرح کے دوسرے پیدا ہو رہے ہیں۔ بغداد کے لوگ ہمیں پسند نہیں کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بغاوت کر بیٹھیں۔“

”بغاوت۔۔۔۔۔“ ملک شاہ چیخ پڑا۔ ”ملک شاہ سے بغاوت کرنے والا اب تک پیدا نہیں ہوا۔ بغدادیوں نے بغاوت کی تو اس شہر کی ایک اینٹ بھی سلامت نہ رہے گی۔ تم ہمارے قہر کو آنکھوں سے دیکھ لو گی۔“

”مقتدی اس وقت رضا مند تھا۔ آپ نے کم از کم شہزادے محمود کی ولی عہدی کا پروانہ تو منگا لیا ہوتا۔“ ترکان خاتون پریشانی سے بولی۔ تاکہ ”اصفہان کی ولی عہدی کا تو فیصلہ ہو ہی جاتا۔“

”کیوں پریشان ہو رہی ہو ترکان!“ ملک شاہ اس کے برابر بیٹھ گیا اور زلفوں کو پھیرتے ہوئے بولا۔ ”ہم تو تمہاری زلفوں کی پریشانی بھی نہیں برداشت کر سکتے۔“

”آپ سلطان ہیں لیکن۔۔۔۔۔“ ترکان خاتون رکتے ہوئے بولی۔ ”لیکن معاف کیجئے! مہلت دے کر آپ نے سخت غلطی کی۔“

”پھر تم کیا چاہتی ہو؟“ ملک شاہ چڑ کر بولا۔

”میں چاہتی ہوں‘ آپ محمود کی ولی عہدی کا پروانہ ابھی منگوا لیجئے۔“ ملکہ کے

پروانے تیار۔ سلطان عالم مقام سے امید ہے کہ خلیفہ کو مہلت دی جائے گی۔ سلطان عادل کی یہ نوازش خسروانہ ہو گی؟“

”ابو شجاع! تمہاری سفارش پر ہم مقتدی کو صرف دس دن کی مہلت دیں ہیں۔“ ملک شاہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”ہم شکار پر جا رہے ہیں۔ واپسی پر کرا عذر قابل قبول نہ ہو گا۔ مقتدی کو اگر تحت خلافت پر رہنا ہے تو اسے حکم کی تعمیل کر ہو گی ورنہ نہ خلافت نہ بغداد۔“

ابو شجاع اور عمید الملک تعظیم بجالائے اور فوراً محل سے نکل آئے۔ باہر نکل کر ابو شجاع نے کہا۔ ”دیکھا تم نے عمید الملک! کس قدر مغرور ہے ملک شاہ۔ امیر المومنین کو تو اپنا غلام سمجھتا ہے۔“

”ہاں ابو شجاع!“ عمید الملک نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ایک امیر المومنین ہاروا الرشید اور مامون رشید تھے اور ایک یہ بے چارے امیر المومنین مقتدی ہیں۔ مگر سب ہمارے خلیفہاؤں کا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ وہ عدل و شجاعت کو چھوڑ کر عیش عشرت اختیار کرتے، نہ یہ دن دیکھنا پڑتے۔ ہمارے امیر المومنین تو پھر بھی غنیمت پر کم از کم بغداد میں تو ان کی عزت ہے لیکن ملک شاہ کا یہی رویہ رہا تو خلیفہ کا دقا بغداد میں بھی ختم ہو جائے گا۔“

”مجبوری ہے عمید الملک! ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟“ ابو شجاع تاسف سے بولا۔ ”ترکان خاتون تو اصفہان اور بغداد دونوں پر دانت لگائے ہوئے ہے۔ بڑی مشکل۔ دس دن کی مہلت دی ہے، اس مغرور نے۔ اس کے بعد کیا کریں گے ہم۔ کیا ہم شہزادے ابو العباس احمد کے بجائے ترکان خاتون کے نواسے جعفر کو خلافت کا ولی عہد تسلیم کرنا پڑے گا؟“

”ہرگز نہیں ابو شجاع!“ عمید الملک نے پر زور الفاظ میں اس کی تردید کی۔ ”جعفر‘ امیر المومنین کا بیٹا ضرور ہے لیکن شہزادہ ابو العباس کی موجودگی میں ہم اسے عہد نہیں بننے دیں گے۔ دس دن کی مہلت بہت ہوتی ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو ہم اس عرصہ میں کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکال لیں گے۔ ملک شاہ کو بغداد سے باہر جانے دو، پھر ہم کچھ طے کریں گے۔“

دل کی بات الفاظ میں ڈھل گئی۔

”مگر — مگر —“ ملک شاہ ذرا ترشی سے بولا۔ ”یہ ہمارے وقار کے خلاف ہے۔ ہم نے مقتدی کو مہلت دی ہے۔ دس دن سے پہلے ہم دوسرا حکم دے کر بغدادی امیروں کی نظر میں نہیں گر سکتے۔ آخر وہ لوگ کیا سوچیں گے ہمارے متعلق؟“

”دس دن کی مہلت تو آپ نے بغداد کی ولی عہدی کے فیصلے کے لئے دی ہے۔“ ترکان خاتون نے زور دے کر کہا۔ ”شہزادے محمود کے لئے تو وہ رضامند ہے۔“

”نہیں ترکان خاتون، ہم اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتے۔“ ملک شاہ کچھ آزرده اور کچھ بگڑا ہوا وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ملک شاہ اور ترکان خاتون میں اس قسم کے جھگڑے ہوا ہی کرتے تھے۔ یہ محبت بھرے جھگڑے ہوتے۔ گھنٹے دو گھنٹے وہ ایک دوسرے سے بگڑے رہتے۔ پھر دو میں سے ایک ملاپ کے لئے ہاتھ بڑھاتا اور ملکہ اور سلطان میں میل ہو جاتا۔ ملاپ کے لئے پیش قدمی عام طور سے ملک شاہ کی طرف سے ہوتی لیکن اس اختلاف نے کچھ طول کھینچا۔ صبح کو جب ملک شاہ شکار کے لئے تیار ہوا تو ملکہ کو ساتھ چلنے کے لئے بلوایا لیکن ترکان خاتون اٹھ واٹ، کھٹ واٹ لے کر پڑ رہی اور بیماری کا بہانہ کر کے ساتھ جانے سے معذرت کی۔ ملک شاہ کو بھی شاید کچھ زیادہ تاؤ آ گیا۔ اس نے ملکہ کی زیادہ پروا نہ کی اور اسے بغداد ہی میں چھوڑ کر وزیروں اور امیروں کے ساتھ شکار کے لئے چل پڑا۔

قیاس ہے کہ ملکہ ترکان خاتون مصلحتاً بغداد میں رک گئی تھی کیونکہ ملک شاہ کے بغداد سے نکلنے ہی ترکان خاتون نے ایک ایسی زبردست چال چلی کہ خلیفہ مقتدی اس کے سامنے بے بس ہو گیا۔ ترکان خاتون کی مرحومہ بیٹی کا بیٹا شہزادہ جعفر، ملکہ کے ساتھ تھا۔ جعفر کی ماں مقتدی کی بیوی تھی۔ مقتدی کو اپنی بیوی سے تو کوئی انسیت نہ تھی لیکن جعفر اس کا بیٹا تھا۔ جب اس نے سنا کہ جعفر، ملکہ کے ساتھ آیا ہوا ہے تو وہ اس سے ملنے کے لئے بے چین ہو گیا۔ لیکن اپنی طرف سے خواہش کا اظہار نہ

ہونے دیتا تھا۔ ترکان خاتون انتہا کی شاطر عورت تھی۔ اسے یہ یقین تھا کہ مقتدی اپنے بیٹے سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ پس اس نے مقتدی کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی ایک عجیب تدبیر سوچی۔

ملک شاہ کے شکار پر جانے کے دوسرے دن ترکان خاتون نے خلیفہ مقتدی کو پیغام بھیجا کہ اس کا بیٹا شہزادہ جعفر اس سے ملنا چاہتا ہے۔ مقتدی یہ پیغام سن کر جعفر سے ملنے کے لئے اور زیادہ بے چین ہو گیا۔ ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور ترکان خاتون نے شہزادے جعفر کو سکھا پڑھا کر قصر الذہب بھیج دیا۔ شفقت پداری نے کچھ ایسا زور مارا کہ خلیفہ مقتدی خود شہزادے کے استقبال کے لئے قصر خلافت کے صدر دروازے تک گیا۔ استقبال کے وقت ملکہ مادر، شاہ بیگم سفری خاتون اور تمام عمائدین سلطنت موجود تھے۔ وزیر ابو شجاع اور عمید الملک نے خلیفہ سے بڑی منتیں کیں کہ وہ حرم سرا سے باہر نہ جائے ورنہ اس کی بیماری کا حال کھل جائے گا لیکن خلیفہ نے ان کی ایک نہ سنی۔

جعفر کو دیکھتے ہی خلیفہ نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور جعفر کو سینے سے چمٹا لیا۔ جعفر کی ماں، خلیفہ سے لڑ کر ملک شاہ کے پاس اصفہان چلی گئی تھی۔ اصفہان میں جعفر پیدا ہوا تھا۔ اور اس کی پیدائش کے فوراً بعد جعفر کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس طرح خلیفہ مقتدی کو اپنے بیٹے سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ جعفر کے ساتھ ترکان خاتون نے بہت سی کنیزیں بھیجی تھیں تاکہ وہ حرم خلافت کا حال چال معلوم کریں۔ شہزادے جعفر کو ایک جلوس کی شکل میں صدر دروازے سے حرم سرا تک لایا گیا۔ تمام راستے اس پر زور و جواہر نچھاور کئے گئے۔

حرم سرا میں جعفر کے لئے ایک زر نگار مسند لگائی گئی۔ بیگمات اور شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی تمام خواتین نے شہزادے کو تحفے تحائف اور نذریں پیش کیں۔ پھر باپ بیٹے میں گفتگو شروع ہوئی۔ مقتدی بڑی محبت سے شہزادے سے باتیں کرتا رہا۔ جعفر کی عمر چار سال تھی لیکن ترکان خاتون نے اسے پکا کر کے بھیجا تھا۔ اس لئے وہ بھی خوب پڑ پڑ باتیں کرتا رہا۔ ترکان خاتون نے جعفر کو قصر خلافت میں صرف چار گھنٹے ٹھہرنے کی اجازت دی تھی۔ ملکہ کی کنیزوں نے یہ بات پہلے ہی خلیفہ

ترکان خاتون نے جعفر کو یہاں کیوں بھیجا ہے۔ مقتدی کو طیش تو بہت آیا مگر ضبط کا کام لیا۔

ترکان خاتون نے کنیزوں اور شہزادے کو تو بھیجا ہی اسی مقصد کے لئے تھا۔ کنیزیں انتظار کرنے کے لئے آمادہ ہو گئیں۔ خلیفہ نے اسی وقت محمود بن ملک شاہ کی مدد کا پروانہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ پروانہ لکھ کر پیش ہوا۔ خلیفہ نے اس پر غصہ کیا۔ پھر مہر خلافت ثبت کرنے کا حکم ہوا۔ خلیفہ مقتدی کا دل کچھ اس قدر مکدر اور کٹھا ہو گیا تھا کہ اس نے پھر نہ تو شہزادے کی طرف توجہ کی اور نہ اس کی کسی بات کا جواب دیا۔ شہزادے جعفر نے باپ سے بولنے کی کوشش کی لیکن خلیفہ منہ گھمائے لکھ باور اور بادشاہ بیگم سے باتیں کرتا رہا۔

جب پروانہ ولی عہدی ہر طرح سے مکمل ہو کر آگیا تو مقتدی نے وہ پروانہ شہزادے جعفر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کنیزوں سے کہا۔ ”ملکہ سلجوق ترکان خاتون کو بتا دینا کہ امیر المومنین کے دروازے سے تو سائل خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا پھر بھلا شہزادے جعفر کو کس طرح خالی ہاتھ بھیجا جاسکتا تھا۔“

☆☆☆

سلطنت سلجوقیہ کے لئے ۳۸۵ھ کے ماہ رمضان اور ماہ شوال بڑے منحوس ثابت ہوئے ان دو مہینوں میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے سلجوق سلطنت کو ایسا دھچکا پہنچایا کہ یہ سنبھالا بھی نہ لے سکی۔ اسی رمضان میں ملک شاہ سلجوقی نے قندار کا آخری سفر کیا۔ جس میں ملک شاہ اور عباسی خلیفہ مقتدی کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ اور ملک شاہ، خلیفہ کو دس دن کی مہلت دے کر شکار پر روانہ ہو گیا لیکن اسی سفر میں ملک شاہ کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی کے قتل کا واقعہ بھی پیش آیا۔ نظام الملک کے قتل کے بارے میں مورخین میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ قتل کا خیال ہے کہ نظام الملک کے قتل میں خود سلطان ملک شاہ اور اس کی ملکہ کا ہاتھ تھا۔ ملکہ ترکان خاتون ہر اس شخص کی دشمن تھی جو اس کے بیٹے شہزادہ محمود کو سلطنت سلجوقیہ کا ولی عہد بنانے کا مخالف تھا۔ نظام الملک نہایت دور اندیش اور وفادار

کے کان میں ڈال دی تھی۔ جب تین گھنٹے گزر گئے تو ایک کنیز نے دست بستہ عرض کیا۔

”امیر المومنین! اب شہزادے کو واپس جانے کی اجازت دی جائے۔“

خلیفہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ملک شاہ اور ترکان خاتون کے رعب کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے سے بھی دل بھر کے نہ مل سکتا تھا۔ اس نے سر دھڑکے ہوئے کہا۔ ”اچھا شہزادے! آپ واپس جائیے۔ اگر دل چاہے تو کل پھر آجائیے گا۔ ہم آپ کا انتظار کریں گے۔“

ترکان خاتون کی ایک چالاک کنیز فوراً ”آگے بڑھی اور سر جھکا کر بولی۔ ”یا امیر المومنین! تمام خواتین نے شہزادے بہادر کو تحفے دیئے ہیں۔ کیا آپ شہزادے کو خالی ہاتھ واپس کریں گے؟“

”اوہ! خوب یاد دلایا۔“ خلیفہ چونک کر بولا۔ ”ہم باتوں میں اپنے شہزادے کو تحفہ دینا بالکل ہی بھول گئے تھے۔ تم نے تحفے کا نام لیا ہے تو تم خود ہی بتاؤ۔ ہم شہزادے کو تحفے میں کیا چیز دیں؟“ خلیفہ مقتدی کو یہ گمان ہوا کہ شاید ترکان خاتون کی طرف سے کوئی فرمائش ہو اور وہ خلیفہ کی دولت کا اندازہ کرنا چاہتی ہو۔ اس لئے اس نے تحفے کا فیصلہ کنیز پر چھوڑ دیا۔

کنیز بھی ترکان خاتون کی سکھائی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔ ”یا امیر المومنین! مجھ کنیز کو کیا معلوم کہ شہزادے بہادر تحفے میں کیا چیز لینا پسند کریں گے۔ یہ تو شہزادے خود ہی بتائیں گے۔“

”ہاں شہزادے!“ مقتدی نے جعفر کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ ”آپ فرمائیے۔ ہم آپ کو تحفے میں کیا چیز دیں؟“

شہزادے جعفر نے کنیز کی طرف دیکھا۔ وہ بولی ”ماں گئے شہزادے آپ کیا چاہتے ہیں؟“

جعفر نے کچھ سوچتے یا یاد کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ محمود ماموں کو اصفہان دے دیجئے۔“

خلیفہ، جعفر کی زبان سے یہ جملہ سن کر حیران رہ گیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا

وزیر تھا۔ اس نے ملکہ ترکان کی کوئی پروا نہ کی اور ملک شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بڑے لڑکے برکیارق کو ولی عہد مقرر کرے جو اس کا حقدار بھی تھا اور اہل بھی۔ ملکہ ترکان خاتون کو جب اس کا علم ہوا تو وہ نظام الملک کے خون کی پیاسی ہو گئی۔ ترکان خاتون کا وزیر مملکت تاج الدین ابو قاسم (تاج الملک) تھا۔ تاج الملک بڑا با اثر و زور تھا۔ اس کے پاس شہزادوں کی وزارت خزانہ، محلات سلطانی کی داروغہ اور دیوان طغرا اور انشا کی افسری جیسے جلیل القدر عہدے تھے۔

نظام الملک اور تاج الملک میں سخت اختلاف تھا۔ محلات سلطانی کی داروغہ کی وجہ سے وہ ملکہ ترکان خاتون کا بہت منہ چڑھا تھا۔ ملکہ بھی اس میں دلچسپی لیتی تھی اور نظام الملک کے بجائے تاج الملک کو وزیر اعظم بنانا چاہتی تھی۔ ملکہ نے امیر محمد الملک اور میر سدید الملک وغیرہ کو ملا کر نظام الملک کے خلاف سازش کی اور کئی بار کی کوشش کے بعد نظام الملک کو معزول کر کے تاج الملک کو وزیر اعظم بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ نظام الملک کی معزولی کے چند ہی دن بعد اسے قتل کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ ترکان خاتون نے شہزادہ محمود کو ولی عہد بنانے کے لئے نظام الملک کو قتل کرا دیا۔ ترکان خاتون پر اس شبہ کو اس خیال سے زیادہ تقویت ملتی ہے کہ ترکان خاتون نے بغداد میں خلیفہ مقتدی کو مجبور کر دیا کہ وہ شہزادہ محمود کو ولی عہد تسلیم کرے۔ اگر خلیفہ مقتدی انکار کرتا تو شاید اس کا حشر بھی نظام الملک جیسا ہوتا لیکن خلیفہ مقتدی اور اس کے وزیروں نے کمال عقل مندی کا ثبوت دیا اور خلیفہ کو ترکان خاتون کے شر سے محفوظ کر دیا۔

لیکن نظام الملک کو جس عالم میں اور جس جگہ قتل کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکان خاتون کی مخالفت اپنی جگہ مگر قتل ایک ذمائی کے ہاتھ سے ہوا جو حسن بن صباح کے فرقہ شیشیہ کا رکن تھا۔ چنانچہ جن مورخوں نے اس قتل کا الزام حسن بن صباح کے سر دھرا ہے اس میں کافی وزن موجود ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ اٹا طرح بیان کی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کے وسط میں مدینہ منشا پور میں تین طالب علم ہم جماعت تھے۔ ایک کا نام عمر خیام، دوسرا حسن بن

صباح اور تیسرا نظام الملک طوسی تھا۔ یہ آپس میں گہرے دوست تھے اور سب کے سب نہایت ذہین اور عقل مند تھے۔ ان کے استاد امام موفق نے پیش گوئی کی تھی کہ مستقبل میں یہ تینوں طالب علم دین و دنیا کے لئے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیں گے جن کا ذکر تاریخوں میں محفوظ کیا جائے گا۔ ان طالب علموں نے آپس میں عہد کیا کہ جو بھی پہلے کوئی اعلیٰ مقام حاصل کرے، وہ باقی دو دوستوں کو بھی اس میں شریک کرے۔ تحصیل علم کے بعد سب سے پہلے نظام الملک طوسی کو اعلیٰ مقام حاصل ہوا اور اسے ملک شاہ کے باپ الپ ارسلان کے عہد میں وزارت کا عہدہ ملا۔

عمر خیام کو جب علم ہوا تو نظام الملک سے ملاقات کے لئے پہنچا۔ نظام الملک نے عہد کے مطابق عمر خیام کو شاہی منجم کے عہدے پر سرفراز کرا دیا۔ عمر خیام، فلسفہ اور علم ہیئت کا ماہر ہونے کے علاوہ ایک نازک خیال شاعر اور رباعیات کا بادشاہ تھا۔ حسن بن صباح کو بھی نظام الملک کے عہدہ وزارت کی خبر ملی۔ وہ انتظار کرتا رہا کہ نظام الملک خود اسے بلا کر اپنا عہد پورا کرے گا۔ حسن بن صباح طالب علمی کے زمانے میں ہی نہایت چالاک تھا۔ پھر نظام الملک اور حسن کے خیالات میں بھی بڑا اختلاف تھا۔ اس لئے نظام الملک نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ حسن بن صباح بھی خاموش بیٹھا وقت کا انتظار کرتا رہا۔

ملک شاہ سلجوقی کے دور میں حسن اور نظام الملک کی اتفاقہ طور پر نیشاپور میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت حسن نے نظام الملک کو اس کا عہد یاد دلا کر شرمندہ کیا۔ نظام الملک نے بادل غماز حسن کی ملاقات ملک شاہ سے کرا دی لیکن ملک شاہ کی قربت حاصل ہوتے ہی حسن کی بد طینتی اور کینہ پروری عود کر آئی اور اس نے اپنے محسن نظام الملک کی جڑیں کاٹنا شروع کر دیں۔ نظام الملک نے ناراض ہو کر حسن بن صباح کو بڑی ذلت کے ساتھ دربار شاہی سے نکلوا دیا۔

حسن بن صباح، نظام الملک سے انتقام لینے کی تدبیریں کرنے لگا۔ پھر حسن بن صباح نے حشاشین نام کی ایک جماعت قائم کی۔ حشیش بھنگ کو کہتے ہیں۔ بھنگ کو کھن بن صباح نے ہی دریافت کیا تھا۔ کاش یہ نشہ دریافت نہ ہوا ہوتا۔ اس کے غالب سے ایک عالم پریشان ہے۔ اس جماعت کے لوگ ذمائی کہلاتے تھے۔ جنہیں

بھگ پلا کر حسن بن صباح اپنی بنائی ہوئی جنت کے نظارے دکھاتا اور پھر ان سے اپنے دشمنوں کو قتل کراتا۔ اس طرح رمضان ۳۸۵ ہجری میں جب ملک شاہ بغداد کے سفر روانہ ہوا تو نظام الملک اس سفر میں اس کے ساتھ تھا۔ حسن بن صباح نے اپنے ایک فدائی کو نظام الملک کے قتل پر مامور کیا۔ جس نے نمادند کے قریب نظام الملک کے خیمے میں گھس کر اسے خنجر سے قتل کر دیا۔

ایک بیان یہ بھی ہے کہ نظام الملک کو اس وقت قتل کیا گیا جب وہ ملک شاہ کے ساتھ شکار کو گیا ہوا تھا۔ بہر حال نظام الملک کے قتل پر کسی کو کوئی افسوس نہ ہوا۔ ملک شاہ کے تمام امیر و وزیر نظام الملک کے خلاف تھے۔ کیونکہ اس کے سامنے کسی اور کا چراغ نہ جلتا تھا۔ نظام الملک کے قتل کی اطلاع ملک شاہ نے ملکہ ترکان خاتون کو بغداد اس طرح بھجوائی جیسے وہ کوئی نوید مسرت ہو۔ ملکہ ترکان خاتون نے اس شب قصر سلطان میں چراغاں کرایا۔ خلیفہ مقتدی اور اہل بغداد کو اس قتل کا بہرہ صدمہ ہوا کیونکہ نظام الملک خلافت کا طرف دار تھا اور ہر اہم موقعہ پر خلیفہ اور اہل بغداد کی مدد کرتا تھا۔

ملک شاہ، سیر و شکار کا شائق ہی نہ تھا بلکہ اسے فریضہ کی طرح ادا کرنا تھا۔ کہتے ہیں اس نے اپنی زندگی میں دس ہزار جانور شکار کئے۔ اس کا باقاعدہ شکار بار لکھا جاتا تھا۔ عرب، عراق، خراسان، ماوراءالنہر، خوزستان اور اصفہان میں بھی بڑی بڑی شکار گاہیں تھیں۔ جہاں ملک شاہ نے شکار کی یادگاریں قائم کی تھیں۔ ملک شاہ رمضان المبارک کے آخری ہفتے میں بغداد سے شکار کے لئے روانہ ہوا تھا۔ رمضان کے مہینے میں مسلمان عام طور پر شکار سے پرہیز کرتے تھے لیکن ملک شاہ اس ماہ بھی شکار کھیلتا تھا۔ اور ہر شکار کے کفارے کے طور پر ایک دینار خیرات کرتا تھا۔ عید کا ہوا دکھائی دیا تو ملک شاہ کے دوسرے شوق نے انگڑائی لی۔ بغداد میں تو رقص و سرود کی محفلوں کی ممانعت تھی۔ خلیفہ مقتدی نے تمام گانے والیوں کو بغداد سے نکلوا دیا تھا۔ ملک شاہ کو خلیفہ کے حکم کی تو پروا نہ تھی۔ وہ چاہتا تو اس حکم کو نظر انداز کرتا۔ سلطان میں محفل عیش برپا کر سکتا تھا لیکن ایک تو رمضان کا مہینہ دوسرے بغداد میں امام الحرمین، شیخ ابو اسحاق شیرازی، ابوالقاسم قشیری اور ابو علی فارسی جیسے

ملک شاہ کو بہت دنوں کے بعد اپنے ذوق کی تسکین کا موقع ملا تھا۔ اس لئے دل کھول کے گانے اور ناچنے والیوں کو داد دینا اور انعامات سے نوازنا شروع کئے اور رقص کرنے والیاں ایک ایک کر کے آتی رہیں اور اپنے فن کے ساتھ ناز نخرے اور اداؤں سے بھی محفل کو گرماتی رہیں۔ لیکن جب گل رخ، ہم کرتی محفل میں آئی تو دیکھنے والے کلیجہ حمام کے رہ گئے۔ گل رخ نے گانے گانے سے پہلے ہی لوگوں کے دل موہ لئے۔ وہ بغداد کی سب سے زیادہ اور دلنواز مغنیہ اور رقاصہ تھی۔ بغداد سے نکالے جانے سے پہلے وہ شوقین کے دلوں پر راج کرتی تھی۔ بغداد کے بڑے بڑے رؤسا اور ثقہ قسم کے لوگ اس کا ہنسا کر اس کے ڈیرے پر پہنچ جاتے۔ دلدادگان رقص و موسیقی کا گل رخ کے ہر وقت مجمع لگا رہتا۔ اس نے صورت بھی ایسی پیاری اور موہنی پائی تھی کہ صرف اس جمال جہاں آراء کے دیدار کے لئے دن میں کئی بار اس کے گھر کے آگے پھر بھی آنکھوں کی تشنگی دور نہ ہوتی۔

ملک شاہ کے محلات میں حسن کی کمی نہ تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر کنیز تھی۔ لیکن گل رخ جاتی رہتی۔ لیکن گل رخ میں کچھ ایسی نزاکت اور چہرے پر طراوت تھی کہ ملک شاہ اسے پہلی بار دیکھ کر اس کے چہرے سے نظریں نہ ہٹا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی صورت بھی ایسی پیاری اور موہنی پائی تھی کہ صرف اس جمال جہاں آراء کے دیدار کے لئے دن میں کئی بار اس کے گھر کے آگے پھر بھی آنکھوں کی تشنگی دور نہ ہوتی۔

”بہتر ہے۔“

”کنیز اس خوبصورت خطاب کے لئے سلطان العادل کا تہہ دل سے شکریہ ادا ہے۔“ گل رخ نے آداب شاہی اور اپنی حاضر جوابی کا ثبوت دیا۔

”ہمیں تمہاری یہ ادا پسند آئی۔“

”شاہ کے اظہار پسندیدگی سے کنیز کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔“

”ہمیں تمہارا گانا بھی پسند آیا۔“

”کنیز نے اپنی فنکاری کا صلہ پالیا۔“

”شاہ رخ! تمہاری صورت اور تمہارا پیکر بھی ہمیں پسند آیا۔“

مغنیہ نے چونک کر ملک شاہ کو دیکھا۔ ملک شاہ بڑے وجیہ اور کلیل انسان اس کے چہرے سے شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ مردانگی اور وجاہت بھی چمکتی گل رخ کی جگہ اور کوئی گانے والی ہوتی تو شاہ کے منہ سے اپنی تعریف سن کر نہ ساتی اور خود کو بخوشی ملک شاہ کے قدموں میں ڈال دیتی لیکن گل رخ ایک دار مغنیہ تھی۔ وہ ملک شاہ کی تعریف کا مقصد سمجھ گئی۔ ملک شاہ کے سامنے دم پٹے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا تھا۔ محفل میں بھی خاموشی چھا گئی تھی اور ہر شخص غار میں تھا کہ دیکھیں گل رخ اب ملک شاہ کے ”حسن طلب“ کا کیا جواب دیتی

گل رخ نے جواب دیا۔ ایسا جواب کہ تمام حاضرین دنگ رہ گئے۔ وہ بولی جس صورت اور جس پیکر کو آپ نے پسند فرمایا۔ اس کا خالق، خالق دو جہاں کی آنکھیں نہیں، لیکن وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ جس کے کان نہیں لیکن وہ سنتا ہے۔ پس میں اس سمیع و بصیر کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے اس قابل سلطانوں کے سلطان نے میری تعریف کی۔“

حاضرین محفل نے گہرا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ گل رخ کا جواب، تھا لیکن اس میں ملک شاہ کے لئے نصیحت اور گوشاکی کا پہلو بھی موجود تھا۔ یہ بھی گل رخ کے تلخ مگر مہذب جواب کو سمجھ گیا لیکن شاید اس پر وحیانیہ نظر پانچے تھے اس لئے وہ گل رخ کا جواب نظر انداز کر گیا اور بولا۔ ”شاہ

تھی۔ اس کی نظریں دیکھنے والوں کی نظروں سے ٹکرا کر اس کے دل میں از تھیں۔ گل رخ نے پہلی ہی نظریں ملک شاہ کی نیت بھانپ لی اور پھر ناز و انداز تیر چھوڑتے ہوئے جب اس نے اپنی سریلی اور رسیلی آواز میں نغمہ چھیڑا تو ملک ہی نہیں پوری محفل جھوم اٹھی۔

گل رخ کی آواز شعلہ بن کر لپکتی اور سننے والوں کے خرمین دل کو جلا جاتی۔ اس نے ایک ہی گانے سے محفل کو بے خود و دیوانہ بنا دیا۔ گل رخ گد ساتھ رقص بھی جانتی تھی۔ ایک نغمے کے بعد اس نے رقص کا ارادہ کیا لیکن شاہ کو اس کی آواز مسور کر چکی تھی۔ اس نے دوسرے نغمے کی فرمائش کی۔ ”نغمے کے بعد تیسرے نغمے کی فرمائش۔۔۔ اس طرح گل رخ مسلسل ڈھائی گھنٹے لاپتی اور محفل میں جادو چمکتی رہی۔ لیکن نہ تو اس کی آواز کی شیرینی میں آ ہوئی اور نہ تکلیف کے آثار پیدا ہوئے۔ ملک شاہ اس کے نغموں پر سردھن اور گل رخ پر انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی۔

گل رخ نے کچھ ایسا سا باندھا کہ آدھی رات سے زیادہ گزر گئی اور آ کو خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ گل رخ کی آواز کے زیر و بم میں الجھا ہوا داد و تحسین د گانے کے دوران گل رخ ہاتھوں اور چوتھوں کی جنبش سے کچھ ایسے زاویے دیکھنے والے تڑپ اٹھتے۔ ملک شاہ اس کے گانے کے علاوہ اس کی چوتھوں کا گیا۔ ملک شاہ کی عمر ۳۸ سال تھی۔ شاہوں کی یہ عمر جوانی میں شمار ہوتی ہے شاہ کے جذبات کو بھڑک اٹھے اور اس کی آنکھوں میں حیوانی سائے لرزے لگے ”کیا نام ہے تیرا؟“ ملک شاہ نے گانے کے اختتام پر خوابیدہ نظروں سے دیکھا۔ گل رخ کے لئے یہ بڑا اعزاز تھا کہ وقت کا ایک عظیم سلطان اس سے آمادہ تھا لیکن گل رخ بھی اپنی اقلیم کی ملکہ تھی۔ اس نے ملک شاہ کے سوال اہمیت نہ دی۔

”کنیز کو گل رخ کہتے ہیں۔“ گل رخ نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کیا۔

”گل رخ“ ملک شاہ زیر لب بڑبڑایا۔ ”گل رخ اچھا نام ہے۔ لیکن

ہیں برائیوں کا بدلہ اسے اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔
ملکہ ترکان خاتون کو صرف یہی غم برداشت نہیں کرنا پڑا بلکہ یوں محسوس ہوتا
تھا کہ اس کے عشرت کا دور اب ختم ہو چکا ہے اور قدرت اس سے ان تمام اعمال کا
انجام لینے پر آمادہ ہے جو اس نے دوسروں کا حق مارنے اور ان پر ظلم کرنے کے لئے
برائے کار لائے تھے۔ ابھی خلیفہ کی دس دن کی مہلت ختم نہ ہوئی تھی کہ ملک شاہ
بن پیار پڑا۔ ملکہ اسے بغداد واپس لے آئی۔ بغداد کے تمام اطباء علاج میں لگ
ئے۔ خلیفہ مقتدی، مادر ملکہ اور بادشاہ بیگم بھی سلطان کی عیادت کو آئے۔ ملک شاہ کو
دن کی تے اور دست آرہے تھے۔ وہ کسی طرح بند نہ ہوئے۔

آخر چھ شوال ۳۸۵ھ کو ملک العادل سلطان ملک شاہ نے بیس سال حکومت
کرنے کے بعد اڑتیس سال کی عمر میں وادی اصفہان سے کوسوں دور غریب الوطنی کے
ہالم میں بغداد میں انتقال کیا۔ اس طرح خلیفہ المسلمین، امیر المومنین مقتدی کو دس
دن کی مہلت دینے والا، موت کے ہاتھوں سے دس دن کی بھی مہلت نہ پاسکا۔ پھر
ان کا یہ انکشاف بڑا عبرت انگیز ہے کہ ملک شاہ کا انتقال کسی مرض سے نہیں ہوا
بلکہ فرقہ شیشیہ کے بانی حسن بن صباح کے جس فدائی نے نظام الملک کو خنجر مار کر
قتل کیا تھا۔ اسی فدائی نے ملک شاہ کے کھانے میں زہر ملا کر اسے ختم کر دیا۔ حسن
بن صباح کو نظام الملک کے کہنے پر ملک شاہ نے دربار سے نکلوا دیا تھا۔ اس لئے اس
نے ایک کو قتل کرا کے اور دوسرے کو زہر دلو کر اپنا انتقام لے لیا۔

جس رات ملک شاہ نے آخری ہچکی لے کر جان، جان آفرین کے سپرد کی، اس
کے کمرے میں نیا وزیر اعظم تاج الملک، امیر مستوفی اور امیر ابوالمعالی موجود تھے۔ یہ
تین امیر، ملکہ ترکان کے ہمدرد اور وفادار تھے۔ تاج الملک کو تو خود ملکہ نے وزیر اعظم
بنایا تھا۔ ملکہ ترکان خاتون بھی دوسرے کمرے میں موجود تھی۔ تاج الملک کا ہاتھ
بغض پر تھا اور ابوالمعالی سینے پر ہاتھ رکھے دل کی حرکت تلاش کر رہا تھا۔ جب بغض
اور دل کی حرکت اور دھڑکنیں معدوم ہو گئیں تو ابوالمعالی نے سلطان ملک شاہ کی
موت کا اعلان کیا۔ ملکہ ترکان خاتون پہلے ہی ملک شاہ کی زندگی سے ناامید ہو چکی
تھا۔ اس نے یہ اعلان بڑے صبر و سکون سے سنا، پھر کمرے میں پڑا ہوا حریری پردہ

رخ! تم نے اپنے نعروں سے مزاج شاہی کو فرحت بخشی ہے۔ ہم تمہیں اپنا
بخشا چاہتے ہیں۔ اور تمہیں آج شاہی خیمہ کی مہمان نوازی کا شرف عطا کرتے
ہیں۔ گل رخ کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا۔ وہ سنبھلی اور بولی۔ ”کنیز سلطان
رعیت ہے۔ لیکن اسے یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ اس کے سلطان کا
و جمیل چہرہ آتش دوزخ کا ایندھن بنے۔ حلال اور حرام میں صرف ایک
فاصلہ ہے۔ فیصلہ خود سلطان کے ہاتھ میں ہے۔“

گل رخ کا جواب ملک شاہ کے دل میں تیر کی طرح اتر گیا۔ حاضرین
لیا کہ گل رخ کی قضا آگئی اور کوئی دم میں اس کی گردن، تن سے جدا ہو کر
آئے گی لیکن ان کا اندازہ غلط ہو گیا۔

سلطان ایک لمحہ توقف کے بعد نرم آواز میں بولا۔ ”شاہ رخ تم سچ کہتی
اس کے ساتھ ہی سلطان ملک شاہ نے قاضی کو حاضر ہونے کا حکم دیا
صاحب تشریف لائے اور اسی محفل رقص و سرود میں ملک شاہ نے گل رخ
نکاح کر لیا۔ پھر ملک شاہ کے عظیم الشان خیمے کو آراستہ کیا گیا اور تاروں کی
میں گل رخ عجلہ عروسی میں داخل ہوئی۔ صبح کو باد صبح گاہی کے جھونکھوں نے
کو شاہ رخ اور ملک شاہ کی تیسری بیگم ہونے کا پیغام دیا۔

اس شادی کی سب سے زیادہ خوشی ملک شاہ کے وفادار غلاموں کو
غلام ملکہ ترکان خاتون کی زیادتیوں سے بہت نالاں تھے اور انہیں ملکہ کا
اقتدار پسند نہ تھا لیکن ملک شاہ کے ان امیروں اور وزیروں پر اوس پڑ گئی
خاتون کے طرفدار تھے۔ وہ سخت پریشان تھے کہ ملکہ ترکان کو کیا جواب دیں
اس کا سامنا کس طرح کریں گے۔ ان امراء نے فوراً ”ایک قاصد کے ذریعے
اس شادی اور اپنی بے بسی کی تفصیل لکھ بھیجی۔ ملکہ ترکان خاتون پر اس خبر
نوٹ پڑا۔ وہ فوراً ”بغداد سے ملک شاہ کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا کہ
کے خیمے کے برابر ایک اور عالی شان خیمہ استادہ ہے اور کنیز و غلام اندر باہر
ہیں۔ ملکہ کلیجہ پکڑ کر رہ گئی۔ ملکہ کے بھی خواہوں نے اسے خاموشی اختیار
مشورہ دیا۔ ملک شاہ کے مزاج کی برہمی سے ہر امیر خائف رہتا تھا۔ سچ ہے

اور پورا لشکر ملکہ عالیہ کے ساتھ ہے۔ شہزادے محمود کی تخت نشینی میں جو طاقت بھرا
ماں ہوگی اسے ہم پاش پاش کر دیں گے۔ آپ فوراً شہزادے کی بادشاہت کا اعلان
کر دیجئے۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے ملکہ عالیہ۔“ امیر ابوالمعالی نے اس کی تائید کی۔ ”خلیفہ
ہندی نے تو شہزادے محمود کی ولی عہدی کا پروانہ جاری کر دیا ہے۔ اب کس کی مجال
ہے کہ ملکہ عالیہ کے سامنے آئے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے تاج الملک؟“ ملکہ نے کچھ عجیب نظروں سے تاج الملک
کو دیکھا۔ ”کیا ہم تم پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں؟“

”ملکہ عالیہ میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اپنی وفاداری کی وضاحت کر سکوں۔“
تاج الملک بڑی لجاجت سے بولا۔ ”ملکہ عالیہ ہی کی مہربانی اور الطاف سے میں اس مقام
پر پہنچا ہوں۔ میں تمام عمر خدمت کرنے کے بعد بھی ملکہ کے احسانات کا بدلہ نہیں
داں سکتا۔“

”تاج الملک! ہم اپنے ہر امیر کو معزز اور محترم دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ملکہ بول
ہی تھی۔ جیسے وہ ملک شاہ کی موت کو بالکل بھول گئی تھی۔

”ہم ہر امیر کا درجہ بلند کر دیں گے بشرطیکہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں رہے۔“
”ملکہ عالیہ! آپ تو اس وقت بھی صاحب اقتدار ہیں۔“ تاج الملک نے کہا۔
”میرے ہاتھ بھی وفادار تھے اور اب بھی اسی طرح وفادار ہیں۔ ملکہ عالیہ حکم فرمائیے۔
امیر و وزیر اس پر عمل کریں گے اور جو مخالفت کرے گا۔۔۔۔۔“

”اسے قتل کر دیا جائے گا۔“ امیر ابوالمعالی نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔
ملکہ عالیہ! شہزادے کی تاج پوشی کا اعلان فرمائیے۔ ہم دیکھیں گے کہ کون مخالفت کرتا
ہے۔“

”تاج الملک۔۔۔۔۔!“ ملکہ ترکان نے تاج الملک سے آنکھیں چار کرتے
کہا۔ ”اگر تم ہمیں سہارا دو اور یہ دونوں امیر قسم کھا کر وفاداری کا یقین دلائیں
ہم انہما کے لئے کچھ صلاح مشورہ کریں۔“

”میں اپنے پیدا کرنے والے کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ تمام عمر

اٹھا کر بے نقاب امیروں کے سامنے آگئی۔ تمام امیر گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔
تاج الملک کے کسی اور امیر نے ملکہ کو اب تک نہ دیکھا تھا۔ امیروں نے ملکہ کے اس
قدم کو ایک اضطرابی رد عمل خیال کیا۔

ملکہ آہستہ آہستہ ملک شاہ کے سرہانے پہنچی۔ جھک کر ملک شاہ کا بے جان چہرہ
دیکھا اور سیدھے کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ امیر جھکی جھکی نظروں سے ملکہ کو
دیکھ رہے تھے۔ ملکہ کا چہرہ سنا ہوا اور پھیکا پھیکا تھا۔ جب اس طرح کئی لمبے گزرے
تو مستوفی نے تاج الملک کو اشارہ کیا۔ انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ ملکہ کہیں شدت غم سے
بے ہوش نہ ہو جائے۔

”ملکہ عالیہ!“ تاج الملک، مستوفی کا اشارہ پا کر بولا۔ ”مشیت ایزدی میں کسی
داخل نہیں۔ بندگان عالی ملکہ کے اس عظیم غم میں برابر کے شریک ہیں۔“

ملکہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ملک شاہ کا چہرہ چادر سے ڈھانپ دیا اور غم
آواز میں بولی لیکن اس طرح جیسے وہ ملک شاہ سے مخاطب ہو۔ ”سلطان! موت تو برحق
ہے۔ لیکن تم تو کہتے تھے کہ شہزادے محمود کو اپنے ہاتھوں سے تاج پہناؤ گے۔ کچھ

انتظار کیا ہوتا۔ کم از کم اس کی ولی عہدی کا اعلان تو کر جاتے۔ میں اکیلے کیا کیا کر
گی۔ میرا کون ساتھ دے گا۔ تمہارا دم بھرنے والے بھی آنکھیں پھیر لیں گے۔ مجھے
تنہا کیوں چھوڑ گئے ملک شاہ!“ اور پھر ملکہ کی خشک آنکھوں سے سیلاب اٹھ پڑا۔
لاش کے سرہانے بیٹھ کر سسکیاں لے لے کر خوب روئی مگر آواز دبائے رکھی۔

ملکہ کا رونے سے غم کچھ ہلکا ہوا تو تاج الملک نے کہا۔ ”ملکہ عالیہ! سلطان
معظم کو تو ہم واپس نہیں لاسکتے لیکن ہم وفاداران تخت و تاج آپ کو یقین دلاتے ہیں
کہ شہزادہ محمود کے سر پر سلطنت سلجوقیہ کا تاج رکھا جائے گا اور ملکہ تخت و تاج کی
اس طرح مالک رہیں گی جس طرح سلطان کی زندگی میں ہوتی تھی۔“

”تاج الملک“ ملکہ کی آواز واقعی درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ”ہم وفادار امیروں
اور وزیروں کے شکر گزار ہیں۔ لیکن ایک طرف تنہا ہم ہیں، دوسری طرف پورا سلجوقی
خاندان، ہم اکیلے ان کا مقابلہ کس طرح کریں گے؟“

”ملکہ عالیہ تنہا نہیں ہیں۔“ امیر مستوفی نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”تمام امیر

”لیکن ملکہ عالیہ!“ تاج الملک سوچتے ہوئے بولا۔ ”اصفہان کا قلعہ وار ہمیں بند کیسے دے گا؟“

”تاج الملک! ہمارے امیروں کو فکر نہیں کرنا چاہئے کہ کون سا کام کس طرح ہو گا۔“ ملکہ ترکان تو منصوبے کے تمام جزئیات پر غور کر چکی تھی۔ ”اصفہان پر قبضہ کرنا کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ ہم نے صرف اپنے امیروں کی تائید چاہی ہے اور اس بات تک کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے جب تک امراء ہمیں اپنے تعاون کا یقین نہ دلا رہے۔“

”ملکہ عالیہ!“ تاج الملک نے کہا۔ ”میں اور میرے تمام ساتھی امراء ملکہ کو اپنے بارے تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ ملکہ عالیہ تخت و تاج کے حصول اور قبضے کے لئے ارے ذمہ جو بھی کام کریں گی ہم اسے بے چون و چرا انجام دیں گے۔“

ملکہ ترکان خاتون بلاشبہ بڑی ذہین اور ہوشیار عورت تھی۔ ملک شاہ کے ساتھ ہر عرصہ گزارنے کی وجہ سے اس میں امور سلطنت اور جہانداری کی مہارت بھی مل ہو گئی تھی لیکن وہ انتہائی مفاد پرست تھی۔ ملک شاہ کے اور بھی کئی بیٹے مری بیویوں سے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا برکیارق جوان تھا۔ اس کا حق بھی تھا اور مائیں شاہانہ صلاحیت بھی موجود تھی۔ لیکن ترکان خاتون اپنے چار سالہ بیٹے محمود کو غلام بنا کر اس کی آڑ میں خود حکومت کرنا چاہتی تھی۔ اقتدار کی جنگ اس نے ملک کی زندگی میں ہی شروع کر دی تھی۔ تاج الملک پر بے انتہا التفات اور نظام الملک امروزی وغیرہ اس کی مختلف کڑیاں تھیں۔ نظام الملک کے قتل میں اس کا ہاتھ نہ ملتا تھا۔ اس کی آرزو یہی تھی۔

ملکہ نے تمام امیروں کو اپنا ہمنوا پایا تو شاہانہ انداز میں بولی۔ ”ہم اپنے امراء پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں اقتدار کی کوئی خواہش نہیں۔ ہم جو قدم اٹھانا چاہتے ہیں وہ سلطنت سلجوقیہ کی بھلائی کے لئے ہو گا۔ اگر حکومت برکیارق کے ہاتھ میں آئے تو وہ نادان اس بارگراں کو نہیں اٹھا سکے گا اور سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ شہزادے محمود کو ہم اس لئے ولی عہد بنانا چاہتے ہیں کہ ہم آپ جیسے نیکو کے مشورے سے کاروبار سلطنت چلاتے رہیں۔ ہمیں امراء کا اعتماد حاصل ہو

ملکہ عالیہ کا وفادار رہوں گا۔“ امیر ابوالمعالی نے قسم کھائی۔ امیر مستوفی نے بھی اسی طرح قسم کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔

”ملکہ عالیہ!“ تاج الملک نے کہا۔ ”تاج الملک کا سر احسانات سے جھکا ہوا ہے۔ ملکہ اپنے ہر حکم کے لئے مجھے تیار پائیں گی۔“

”ہمیں امیروں سے یہی امید تھی۔“ ترکان خاتون مطمئن ہو کر بولی۔ ”ہمارا ذاتی خیال ہے کہ سلطان کی وفات کو ابھی پوشیدہ رکھا جائے۔ امیروں کا کیا مشورہ ہے؟“

امیروں کی سمجھ میں نہ آیا اس موت کو پوشیدہ رکھنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ پھر اس میں طرح طرح کی قباحتیں بھی ہیں۔ خلیفہ مقتدی کا طیب خاص روزا ملک شاہ کو دیکھنے آتا ہے۔ بغداد کے امراء بھی عیادت کے لئے آ جاتے ہیں۔ لوگوں کو کس طرح روکا جائے۔ سب سے بڑا سوال لاش کو محفوظ رکھنے کا تھا لیکن نہیں جانتے تھے کہ جس ہستی نے موت کو پوشیدہ رکھنے کا خیال ظاہر کیا ہے وہ سب سے زیادہ عالی دماغ اور شاطر و چالاک ہستی ہے۔ ملکہ ترکان خاتون کو ملک شاہ کی موت کا پہلے ہی یقین ہو گیا تھا اور اس نے کئی دن پہلے سے اس مسئلے پر غور کرنا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ اس وقت تو محض غم کا اظہار کر کے امیروں کو اپنے اعتماد لینا چاہتی تھی اور اس میں وہ کامیاب ہو گئی تھی۔

”سلطان کی موت کو پوشیدہ رکھنا بہت مشکل ہے۔“ مستوفی پریشان لہجے بولا۔ ”ہم کس کس کو منع کریں گے اور کسے کسے یہاں آنے سے روکیں گے؟“

”یہ ہمارے امیروں کا درد سر نہیں۔“ ملکہ نے فوراً جواب دیا۔ ”اس انتظام ہم خود کریں گے۔ ہم نے تو اس خیال کا اظہار اس لئے کیا ہے کہ ہم لوگ اس وقت بغداد میں ہیں اور دار السلطنت اصفہان میں شہزادہ برکیارق موجود ہے۔ سلطان کی وفات کا اعلان ہوتے ہی وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے گا۔ ہمیں اصفہان پر قبضے سے پہلے سلطان کی موت کا اعلان نہ کرنا چاہئے۔“

”ملکہ عالیہ کا خیال بالکل درست ہے۔“ ابوالمعالی اور مستوفی نے ملکہ پوری طرح اتفاق کیا۔

ان کو وسیع اختیارات حاصل تھے لیکن اب تو اسے تخت و تاج سنبھالنے کا موقع مل ہوا تھا۔ پھر وہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کیوں نہ کرتی۔ تین امیروں کو اپنا طرفدار بنا چکی تھی۔ امرا تو عہدوں کے طلب گار ہوتے ہی ہیں۔ وہ پہلے بھی کسی خوشامد میں لگے رہتے تھے اور ملکہ ان پر اپنی نوازشوں کی بارش کرتی رہتی تھی۔ اب وہ پوری طرح ملکہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے۔

ملکہ شاہ کو انتقال کئے چار گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ ملکہ کو اس کے مرنے کا فطری پروا نہ تھی۔ وہ تو اپنے جوڑ توڑ میں لگی تھی۔ اس دوران وہ ایک بار ملکہ کے کمرے میں تھام گئی تھی اور اس کی انگلی سے وہ انگشتی اتار لائی تھی جو مرہم لگائی جاتی تھی۔ ملکہ شاہ جب کسی بڑے سردار کو کوئی اہم پیغام بھیجتا تو قاصد کے ہاتھ اپنی انگوٹھی روانہ کرتا جس کا مطلب ہوتا کہ قاصد کا پیغام سلطان کے فرمان درجہ رکھتا ہے اور اس کی تعمیل لازمی ہو جاتی تھی۔

ملکہ ترکان بڑی بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹھل رہی تھی۔ اس کی کنیز خاص روز سر جھکائے، ہاتھ باندھے، اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ملکہ کی بے چینی سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ملکہ آج کسی خاص الجھن میں ہے۔ اس نے کئی بار چاہا کہ ملکہ کے کچھ دریافت کرے مگر اس کی ہمت نہ ہوئی۔

”نوروز!“ ملکہ نے ایک دم قدم روک کر اسے مخاطب کیا۔

”جی ملکہ عالیہ! کنیز تعمیل حکم کے لئے حاضر ہے۔“

”تم امیرانز کو جانتی ہو؟“

”جی ہاں ملکہ عالیہ! امیرانز بڑے خوبصورت سردار ہیں۔“

”تاج الدولہ سے بھی واقف ہو؟“

”کیوں نہیں ملکہ عالیہ! وہ بھی بہت خوبصورت آدمی ہیں۔“

”تیری نظر میں سب ہی خوبصورت ہیں۔“ ملکہ ترکان خاتون مسکرا دی۔

”منہ چڑھی کنیز نے ملکہ کو مسکراتے دیکھا تو کھل پڑی۔“ ملکہ عالیہ! یہ کنیز بھی تو خوبصورت ہے۔ خوبصورت تو خوبصورت آدمی کو پسند کرتے ہیں۔“

”اچھا دیکھو۔ تمہارا کام ہے کہ امیرانز، تاج الدولہ اور قوام الدولہ کو ہمارے

گیا اور سب نے ہمارے خیال سے اتفاق کیا ہے تو تاج الملک تمہارا کام یہ ہے کہ قصر سلطان کے اندر اور باہر سخت پہرہ لگا دو۔ جو لوگ سلطان کی عیادت کے لئے آئیں انہیں جواب دیا جائے کہ شاہی طبیب نے ملاقات پر پابندی لگا دی ہے۔ مگر وہ جب کل شاہی طبیب آئے تو اسے نہ روکا جائے بلکہ عزت و احترام کے ساتھ ہمارے پاس لایا جائے۔ اس کا انتظام ہم خود کر لیں گے۔ یوں سمجھو کہ شاہی طبیب کو ہم قمر میں اس وقت تک روکے رکھیں گے جب تک اصفہان پر ہمارا قبضہ نہیں ہو جاتا۔“

ملکہ ترکان خاتون نے پہلی مرتبہ تاج الملک اور امراء کے سامنے کھل کر بات کی تھی۔ اس سے امیروں کو اس کی صلاحیت اور اہلیت کا اندازہ ہو گیا۔ ان کو اس بات سے بھی اطمینان ہوا کہ ملکہ واقعی جہانداری کے اصولوں سے واقف ہے اور برکیارق کے مقابلے میں زیادہ بہتر حکمران ثابت ہو گی۔

تاج الملک نے ادب سے پوچھا۔ ”ملکہ عالیہ ہمارے لئے اور کوئی حکم ہے؟“

”نہیں تاج الملک!“ ملکہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”اب تم جا کر آرام کرو۔ میں بھی اصفہان کے لئے کچھ سوچنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اصفہان کا مسئلہ اس طرح حل ہو کہ سانپ بھی مرے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔“

ملکہ نے امیروں کو رخصت کرنے کے بعد اپنے محافظ دستے کی سرداری کو بلاا اور اسے تاکید کی کہ مریض (ملکہ شاہ) کے کمرے کی سخت حفاظت کی جائے کیونکہ خلیفہ مقتدی کے آدمی سلطان کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ ترکان خاتون کے محافظ دستے میں ایک سو پچاس مسلح عورتیں شامل تھیں۔ یہ عورتیں بیک وقت شمسوار، شمشیر زن اور تیر انداز تھیں۔ شاہی خزانے سے انہیں منقول تتخواہ ملتی تھی اور ان کا تمام خرچہ ملکہ ترکان خود برداشت کرتی تھی۔ حکم ملتے ہی محافظ عورتوں نے ملکہ شاہ کا کمرہ گھیرے میں لے لیا۔ ملکہ ترکان پہلے ملکہ شاہ کے برابر والے کمرے میں مقیم تھیں لیکن اب وہ دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئی۔



ہوس اقتدار انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ ملکہ شاہ کی زندگی میں ملکہ ترکان

پاس لے آؤ۔“ ملکہ ترکان خاتون نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”اس وقت ملکہ عالیہ! آدمی رات کو؟“ نوروز نے حیرت سے ملکہ کو دیکھا
 ”ہاں نوروز —“ ملکہ چھت کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بڑے کام کے
 نظرس بھی بلند رکھنا پڑتی ہیں۔ اور ہر بڑا کام رات کی تاریکی میں انجام دیا جاتا ہے
 نوروز آداب بجالا کر دروازے کی طرف چلی۔

”نوروز! ایک بات کا خیال رکھنا۔“ ملکہ کی آواز پر نوروز کے قدم رک گئے
 ان کے آنے کی اطلاع شاہی فوج کے کسی آدمی کو نہ ہونے پائے۔“

”مگر ملکہ عالیہ —“ نوروز پریشانی سے بولی۔

”ہم تجھے اسی وجہ سے پسند کرتے ہیں کہ تو —“

”ملکہ عالیہ مطمئن رہیں۔“ نوروز نے فوراً جواب دیا۔ ”تمام امرا اسی طر
 لائے جائیں گے جس طرح ملکہ عالیہ نے ارشاد فرمایا ہے۔“

”شباباش نورز۔“

نوروز بڑی خاموشی سے حرم سرا کے دروازے سے نکل کر اس حصے میں پہنچی
 جہاں شاہی لشکر امیر اور سردار ٹھہرے ہوئے تھے۔ سب کے خیمے تھوڑے تھوڑے
 فاصلے پر ایک قطار میں لگے تھے۔ ان خیموں کی پشت پر لشکریوں کے خیموں کا شرابا
 تھا۔ نوروز ہر خیمے سے واقف تھی۔ دن میں کئی بار وہ ادھر کا چکر لگاتی تھی۔ نوروز
 ایک خوبصورت ایرانی کنیز تھی۔ وہ بڑی ہنس مکھ تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ ملکہ کی
 کنیز خاص ہے۔ اس لئے اسے چھیڑتا تو کوئی نہ تھا، مگر ہر دل میں اسے چھیڑنے کی
 آرزو ضرور تھی۔

نوروز دبے پاؤں امیرانز کے خیمے کی طرف جا رہی تھی کہ کسی نے آواز دی۔

”کون ہے؟“

نوروز کے قدم رک گئے۔ آواز دینے والا قریب آیا تو نوروز اٹھلا کر بولی۔

”پچانو تو بھلا میں کون ہوں؟“

پہریدار نے لالین اونچی کر کے دیکھا۔ ”تم ہو نوروز۔“

”ہاں نوروز ہوں۔ ڈاکہ ڈالنے جا رہی ہوں۔ روک سکتے ہو تو روک لو۔“

نوروز سکرانے لگی۔

”تمہیں بھلا کون روک سکتا ہے۔“ پہریدار ریشہ عطی ہو گیا۔

نوروز قدم بڑھاتی امیرانز کے خیمے پر پہنچ گئی۔ امیر کے خیمے کے باہر ایک سپاہی
 ہوا دے رہا تھا۔ نوروز اس کے بولنے یا پوچھنے سے پہلے ہی خود بول پڑی۔ ”میں نوروز
 ہوں۔ امیر کو جگا دو۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔“

پہریدار تذبذب میں پڑ گیا۔ امیرانز سو رہا تھا۔ نوروز بگڑ گئی۔ ”میں حکم دیتی
 ہوں، امیر کو فوراً جگا دو۔“

پہریدار ڈر گیا۔ اس نے خیمے میں داخل ہو کر امیر کو جگا دیا۔ نوروز کی اس بے
 وفائی سے امیر بھی گھبرا گیا۔ اس نے فوراً نوروز کو اندر بلا لیا۔ نوروز خیمے میں
 بے دھڑک داخل ہو گئی۔ پہریدار خیمے کا بجھا ہوا چراغ روشن کر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی
 روشنی پھیل گئی تھی۔

”خیریت تو ہے نوروز؟“ امیر نے پریشانی سے سوال کیا۔

”نوروز کا منہ میٹھا کیجئے امیر۔ ملکہ عالیہ نے اسی وقت یاد فرمایا ہے۔“ نوروز ہنسنے
 لگی۔

”چلو —“ امیرانز کھڑا ہو گیا۔

”اس طرح نہیں امیر! آپ کو پہریدار بن کر جانا ہو گا۔“ نوروز شوشی سے بولی۔
 امیرانز نوروز کو حیران حیران سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ”فوجی دماغ ذرا موٹا ہوتا
 ہے۔ آپ مطلب نہیں سمجھتے۔ ملکہ عالیہ کا حکم ہے کہ آپ کو خاموشی سے لایا جائے۔
 آپ اپنے پرے دار کے کپڑے پہن کر میرے ساتھ ہو لیجئے۔ اس طرح آپ کو کوئی
 پچان نہ سکے گا۔“

مرتا کیا نہ کرتا۔ امیرانز کو نوروز کی بات ماننا پڑی۔ پہریدار کے کپڑے پہن کر
 نیچے سے نکلا۔ نوروز باہر کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”پہریدار کو تاکید کر
 دیجئے کہ آپ کی واپسی تک وہ خیمے کے اندر ہی رہے۔“

نوروز اور امیرانز حرم سرا میں داخل ہوئے۔ نوروز کے ساتھ ایک پہریدار کو
 دیکھ کر حرم سرا کی پرے دار عورتیں بڑی حیران ہوئیں لیکن نوروز سے پوچھ کچھ

کرنے کی انہیں ہمت نہ ہوئی۔ ملکہ نے کہا تھا کہ امیروں کو الگ الگ کمروں میں بٹھایا جائے۔ نوروز امیر کو ایک کمرے میں لے گئی اور ہنستے ہوئے بولی۔ ”اطمینان سے بیٹھے، نیند آرہی ہے تو سو جائیے۔ جب آپ کی طلبی ہوگی، میں اطلاع دوں گی۔“

نوروز چلی گئی۔ امیر انز نے کمرے کا جائزہ لیا تو حیران رہ گیا۔ یہ شاہی حرم سرا کا ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ تھا۔ شاہی حرم سرا کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ امیر ہرچیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ نوروز اس طرح تاج الدولہ اور امیر قوام الدولہ کو بھی حرم سرا میں لے آئی اور انہیں الگ الگ کمروں میں بٹھا کر ملکہ کے پاس پہنچی۔ ملکہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

”کیا تو امیروں کو لے آئی؟“ ترکان خاتون نے نوروز کو دیکھتے ہی کہا۔

”جی ہاں ملکہ عالیہ!“ نوروز ہنستے ہوئے بولی۔ ”امیر تو نہیں مل سکے، میں ان کے پریداروں کو ساتھ لے آئی ہوں۔ یہ پرے دار اپنے امیروں کے نمائندگی کرنے آئے ہیں۔“

”کیا بکواس کر رہی ہے؟“ ملکہ چیخ پڑی۔ ”ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور تو اترا رہی ہے۔ دور ہو جا ہماری نظروں سے۔ زندگی بھر میں ایک کام تیرے سپرد کیا۔ اسے بھی تو نہ کر سکی۔ دفع کر دے پریداروں کو۔“

”میں نے ملکہ عالیہ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔“ شوخ نوروز بولی۔ ”پریداروں کے بھیس میں سلجوقی امراء تشریف لائے ہیں۔ اگر انہیں امراء کے لباس میں لایا جاتا تو سب کو علم ہو جاتا۔ اس لئے میں انہیں پریداروں کے کپڑے پہنا کر لائی ہوں۔ ہر امیر الگ الگ کمرے میں بیٹھا ملکہ عالیہ کے حکم کا منتظر ہے۔“

”تو بڑی سمجھدار ہے نوروز۔“ ملکہ خوش ہو کر بولی۔ ”اچھا تو سب سے پہلے امیر انز کو پیش کیا جائے۔“

نوروز دم کے دم امیر انز کو ساتھ لے کر واپس آگئی۔ امیر انز کو دیکھ کر ملکہ مسکرائی اور بولی۔ ”امیر ہمیں افسوس ہے کہ آپ کو پریدار کے لباس میں آنا پڑا۔“

”خفائے راز کا خطرہ تھا اس لئے آپ کو اس طرح بلایا گیا۔“

”ملکہ عالیہ!“ امیر انز نے گہراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی دوراندیشی کا ہر شخص

اہل ہے۔ یقیناً“ اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی۔ خادم حاضر ہے۔ حکم دیجئے۔ یہ بازار کس طرح آپ کی خدمت کر سکتا ہے۔“

”امیر انز!“ ملکہ بڑے وقار سے بولی۔ ”ہمیں تمہاری وفاداری پر اعتماد تھا اسی لئے رات کے اس پر تمہیں شاہی حرم سرا میں آنے کی دعوت دی گئی۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ سلجوقی فوجوں کی مکمل سپہ سالاری تمہارے سپرد کی جائے۔ تمہارے طورے سے تمام مہمات پر لشکر روانہ کئے جائیں۔ تم اپنے طور پر بھی جہاں مناسب ہو، فوجیں روانہ کر سکتے ہو۔ تمہارے احکامات میں شاہی خاندان کا کوئی فرد دخل راندی نہ کر سکے گا۔ کیا تم اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر آمادہ ہو؟“

”ملکہ عالیہ! آپ کا حکم سر آنکھوں پر میرے لئے تو یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔“ ملکہ عالیہ نے یہ فیصلہ کرتے وقت سلطان معظم کی رضامندی حاصل کر لی ہے۔ ”تم سلطان کی فکر نہ کرو امیر!“ ملکہ نے متانت سے کہا۔ ”ملک شاہ کا دور ختم ہو چکا۔ وہ انتقال کر چکے ہیں اور اب سلطان کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ ہم حکومت تفخیل دے رہے ہیں۔ جلد ہی ولی عہد شہزادے محمود کی جانشینی کا اعلان کر جائے گا۔ اس وقت ہمیں تمہارا مشورہ اور تعاون درکار ہے۔“

”میں اپنی وفاداری اور تعاون کا ملکہ عالیہ کو یقین دلاتا ہوں۔“ امیر انز خوش ہو کر بولا۔ ”ملکہ عالیہ اپنے ہر حکم کی تعمیل پر مجھے مستعد پائیں گی۔“

”تو سنو سپہ سالار امیر انز!“ ملکہ نے امیر انز کو سپہ سالار کہہ کر مخاطب کیا۔ ”قوام الدولہ کو ملک شاہ کی انگوٹھی دے کر اصفہان بھیج رہے ہیں تاکہ وہ قلعہ دار انگوٹھی دکھا کر اصفہان پر قبضہ کر لے۔ اسے یہ بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ برکیارق کو تار کر کے قید میں ڈال دیا جائے۔ اصفہان پر قبضہ ہوتے ہی ہم ملک شاہ کی لاش مار اصفہان پہنچ جائیں گے۔ اصفہان پر قبضے سے پہلے ہم ملک شاہ کی موت کو یقین دلا رکھیں گے۔“

”ملکہ عالیہ کا منصوبہ حالات کے مطابق ہے۔“ امیر انز نے سر خم کر کے کہا۔ ”مار اصفہان پر بغیر خون بہائے قبضہ ہو جائے گا۔ اور مخالفوں کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔“

”اب تم جا سکتے ہو سپہ سالار!“ ملکہ نے کہا۔ ”کل کسی وقت ہماری پھر ملاقات ہوگی۔“

امیرانز کے جانے کے بعد ملکہ ترکان خاتون نے الگ الگ تاج الدولہ اور قوا الدولہ سے ملاقات کی۔ تاج الدولہ کو مشیر سلطنت کا عہدہ دے کر رام کیا گیا اور قوا الدولہ کو اصفہان کا گورنر اور قلعہ دار بنایا گیا۔ ملکہ نے قوام الدولہ کو ملک شاہ انگوٹھی دی اور چچاس سواروں کے ساتھ اسے صبح ہونے سے پہلے اصفہان کی طرف بھیج دیا۔ اس طرح ملکہ ترکان خاتون نے ایک ہی رات میں تمام امیروں کو اپنا طرز بنا لیا اور دارالسلطنت اصفہان پر قبضہ کے لئے بھی قوام الدولہ کو روانہ کر دیا۔ ہونے والی تھی۔ اور تمام رات بیدار رہنے کی وجہ سے ملکہ تھک گئی تھی۔ دوسرے دن بھی اسے بہت سے کام نمٹانا تھے۔ اس لئے وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیٹ گئی۔

ملکہ نے سونے سے پہلے کنیزوں کو حکم دیا تھا کہ اگر شاہی طبیب آئیں یا غلظہ کی طرف سے کوئی پیغام موصول ہو تو اسے فوراً بیدار کر دیا جائے۔ ملکہ مشکل سے دو گھنٹے سوئی تھی کہ نوروز نے آ کے اسے اٹھا دیا۔

”شاہی طبیب تشریف لائے ہیں ملکہ عالیہ!“ مجرا بجالانے کے بعد نوروز نے ہنستے ہوئے اطلاع دی۔

ملکہ کی طبیعت بہت کمزور تھی لیکن نوروز کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ بھی مسکرا دی۔ ”نوروز تجھے ہر شخص خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ طبیب شاہی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”طبیب شاہی اپنے پیشے میں بہت خوبصورت ہیں ملکہ عالیہ۔“ نوروز نے بڑبڑا کر جواب دیا۔

ملکہ ہنس پڑی۔ ”تیری اسی حاضری کی وجہ سے ہم تجھ پر زیادہ مہربان ہیں۔“ نوروز بڑی حاضری جواب اور ہنس مکھ تھی۔ تمام دن مسکراتی رہتی۔ سلجوقی امیر وزیر، نوروز کی خوش مزاجی اور خوش سلیقگی کی وجہ سے اسے پسند کرتے تھے۔ ملکہ کا منظور نظر ہونے کی وجہ سے نوروز کا درجہ دوسری کنیزوں کے مقابلے میں بہت بلند

ملکہ ترکان خاتون، سیاست کی بساط بچھا چکی تھی۔ اس نے حصول سلطنت کے لئے رات ہی سے سوچ سوچ کے چالیں چلنا شروع کر دی تھیں۔ شاہی طبیب، خلیفہ ہندی کی ملازمت میں تھا۔ اس لئے اس مخالف کو رام ہی نہیں کرنا تھا بلکہ اس سے ہم بھی لینا تھا۔ ملکہ، طبیب شاہی سے بڑی خندہ پیشانی سے ملی اور اسے ساتھ لے کر ملک شاہ کے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے کے باہر مسلح عورتوں کا سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ دور دور تک پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ کسی کو کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ صرف نوروز کمرے کے دروازے تک آ سکتی تھی۔ اسے بھی یہ حکم تھا کہ باہر سے دستک دے۔

شاہی طبیب نے ملک شاہ کے چہرے سے چار ہٹائی تو جھک کے پیچھے ہٹے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد دگر آواز میں بولے۔ ”ملکہ عالیہ! سلطان العادل اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ اب کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ مغفرت کے لئے دعا کیجئے۔“

”ہمیں اس کا علم ہے طبیب محترم!“ ملکہ سنجیدگی سے بولی۔ ”ہم اس صدمے کو تمام رات بڑے کرب سے برداشت کرتے رہے۔ ہمیں آپ کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔“

”کس وقت انتقال فرمایا سلطان معظم نے؟“ طبیب نے پریشانی سے پوچھا۔

”سلطان تو ہمیں آغاز شب ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے۔“ ملکہ نے گھٹی لگی آواز میں جواب دیا۔

”ملکہ عالیہ! مجھے اسی وقت طلب کر لیا ہوتا آپ نے۔“ طبیب صدمے سے بولا۔

”نہیں طبیب محترم!“ ملکہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”صاحب اقتدار لوگوں کی موت پر مصلحت کی چادر ڈالنا پڑتی ہے۔ آپ کو علم ہو گا کہ خلیفہ المسلمین، امیر المومنین، خلیفہ دولت عباسیہ محترم و مکرم مقتدی با امر اللہ نے شہزادہ محمود کو ولی عہد طاعت سلجوقیہ کا پروانہ جاری کر دیا ہے لیکن ہم اس وقت دارالسلطنت اصفہان سے دور ہیں۔ اگر سلطان کی وفات کا اعلان بغداد میں کیا جائے تو کتنے ہی دعویداران

نہیں، صرف ایک سیاسی مصلحت ہے۔ آپ ہم سے وعدہ کیجئے کہ ملک شاہ کی موت کا راز اپنے سینے میں اس وقت تک محفوظ رکھیں گے جب تک اصفہان پر ہمارا قبضہ نہیں ہو جاتا۔ یہاں تک کہ اس کا ذکر آپ خلیفہ معظم و محترم سے بھی نہیں کریں گے۔“

”میں اس کا وعدہ نہیں بلکہ سچے دل سے عہد کرتا ہوں۔“ طبیب نے بلا عذر مدد کر لیا۔

ترکان خاتون کا ایک اور مسئلہ حل ہو گیا۔ طبیب نے ملک شاہ کی لاش پر دائیں ہاتھ کر اسے ایک ماہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ شاہی طبیب اپنا وعدہ نبھانے کے لئے روزانہ قصر سلطان آتا اور لوگوں پر یہی ظاہر کرتا کہ وہ سلطان کا علاج کر رہا ہے۔ ترکان خاتون کے حیرن شانے پر لگ رہے تھے۔ ملک شاہ کی لاش کو مصلحت کی چادر میں لپیٹ کر ایک ماہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ ادھر قوام الدولہ اصفہان پہنچا۔ اس نے قلعہ دار کو قلعہ اس کے حوالے کرنے کا ملک شاہ کا زبانی فرمان پہنچایا اور ثبوت میں شاہی انگشتری پیش کی۔

شاہی انگشتری کو شاہی فرمان کا درجہ حاصل تھا۔ قلعہ دار نے قلعہ قوام الدولہ کے حوالے کر دیا۔ قلعہ پر قبضہ ہونے کے بعد قوام الدولہ نے برکسلوق کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ اس نے اپنی کامیابی کی اطلاع ایک تیز رفتار فامسد کے ذریعے بھجوائی۔

ملک شاہ کی وفات کو چھپانے کے لئے ترکان خاتون نے جو احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ اس نے لوگوں میں شکوک و شبہات کو جنم دیا۔ قوام الدولہ کے بغداد سے اصفہان چلے جانے سے سلجوقی لشکر میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی۔ سب سے زیادہ بے چینی نظامی ممالیک میں پیدا ہوئی۔ یہ ملک شاہ کے غلاموں کا وہ گروہ تھا جو سب سے زیادہ جاں نثار اور بہادر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تعداد ہزاروں پر مشتمل تھی اور ان کی وفاداریاں ملک شاہ کے بڑے بیٹے برکیارق کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے پہلے اسے الفاظ میں پھر کھلم کھلا سلطان کو دیکھنے کا مطالبہ شروع کیا۔ ملکہ ترکان خاتون نے شاہی طبیب کی آڑ لے کر انہیں ملاقات سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ سرکشی

سلطنت کھڑے ہو جائیں گے اور پورے ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ اس لئے ہم پوری رات صبر کی سل سینے پر رکھے بیٹھے رہے۔ رات میں آپ کو تکلیف دہ یوں مناسب نہ سمجھا گیا کہ لوگ شبہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔“

”ملکہ عالیہ!“ طبیب نے سر جھکا کر کہا۔ ”اس عظیم صدمے میں میں آپ شریک ہوں۔ آپ نے درست فرمایا کہ سلطان کی وفات کے اعلان سے خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ اب میرے لئے کیا حکم ہے۔ اگر آپ کے غم کو میں کسی طرح اکر سکوں تو میں تیار ہوں۔ آپ حکم دیجئے۔“

”طبیب معظم!“ ملکہ ترکان خاتون ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولی۔ ”آپ ہمارے غم میں شریک ہوئے۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ لیکن یہ غم ہائے کی چ نہیں۔ ہاں اگر آپ سلجوقی سلطنت کو خانہ جنگی سے روکنے میں ہماری مدد کریں تو آپ کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔“

”فرمائیے ملکہ عالیہ!“ طبیب نے جواب دیا۔ ”سلجوقی سلطنت اور آل سلجوق خدمت کر کے مجھے انتہائی خوشی ہوگی۔ میں ہر خدمت کے لئے آمادہ ہوں۔“

”محترم طبیب!“ ملکہ نے طبیب کو پوری طرح اپنے اعتماد میں لینے کے لئے کہا۔ ”ہم نے دار السلطنت اصفہان پر قبضے کے لئے فوج اور سرداروں کو بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں دو چار دن ضرور لگیں گے۔ اگر آپ سلطان کی لاش کو دوران میں محفوظ رکھ سکیں تو یہ آپ کی بہت عظیم خدمت ہوگی۔ اور ہم پر ذاتی طور پر آپ کا احسان ہو گا۔“

”آپ بالکل فکر نہ کریں ملکہ عالیہ!“ طبیب نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”سلطان کی لاش کو محفوظ کرنے سے خانہ جنگی رک سکتی ہے تو دو چار دن کیا ہیں۔ ہفتے اسے خراب نہ ہونے دوں گا۔ مجھے اجازت دی جائے کہ لاش کو محفوظ کرنے کے لئے میں ضروری ادویات اپنے ساتھ لے آؤں۔“

”ٹھیک ہے طبیب محترم!“ ملکہ نے طبیب کو اجازت دے دی۔ لیکن شرط لگا دی۔ ”آپ ہمارے کسی آدمی کو ساتھ لے جائیے اور ادویات لے آئیے لیکن اسلئے میں آپ کو ہم سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ اس سے خدا نخواستہ آپ کی

”ہمارے خیال کے مطابق قوام الدولہ نے اس وقت تک اصفہان پر قبضہ کر لیا ہے۔“ ملکہ ترکان خاتون نے کتنا شروع کیا۔ ”قوام الدولہ کی کامیابی کا پیغام ہمیں کسی بات بھی مل سکتا ہے۔ اگر ہم اصفہان پر قبضے کا انتظار کر سکیں تو اس کے کئی فائدے ہوں گے۔ اصفہان ہاتھ آتے ہی ہم سلطان کی وفات کا اعلان کر دیں گے اور اسی کے ساتھ شہزادہ محمود کی ولی عہدی کی رسم ادا کریں گے۔ مقتدی نے ہمیں ولی عہدی کا پرانہ دے دیا ہے۔ ہم اس کی تشہیر پورے بغداد میں کریں گے۔ اس لئے بغداد کا کوئی شخص ہماری مخالفت نہ کرے گا اور اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو ہم اصفہان سے تازہ دم نظر منگوا سکتے ہیں۔“

”ملکہ عالیہ کی تدبیر نہایت دانشمندانہ ہے۔“ تاج الدولہ بولا۔ ”لیکن ہمیں نظامی ممالک سے بھی ہوشیار رہنا ہو گا۔ ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہئے۔“

”اس کا علاج بھی سوچ لیا گیا ہے۔“ ملکہ نے مسکرا کر کہا۔ ”ہم نے امیر ابوالمعالی کے سپرد یہ کام کیا ہے کہ اگر کل تک اصفہان پر قبضے کی اطلاع موصول نہ ہو تو لشکر میں جتنے نظامی ممالک ہیں انہیں غیر مسلح کر دیا جائے۔ اگر آپ لوگوں کو یہ بات پسند نہ ہو تو ہم اپنا حکم واپس لے سکتے ہیں۔“

”ملکہ عالیہ نے یہ قدم اٹھا کر ہماری مشکل آسان کر دی۔“ تاج الملک نے کہا۔ ”ہم سب ملکہ سے یہی درخواست کرنے والے تھے۔ ہم تو چاہتے تھے کہ نظامی ممالک آج ہی گرفتار کر لیا جائے۔“

اس مختصر گفتگو کے بعد یہ محفل برخاست ہو گئی۔ ملکہ ترکان کو وہی قدم اٹھانا ناچو وہ خود طے کر چکی تھی۔ اس نے امیروں کو بلا کر انہیں مطمئن بھی کر دیا اور انہیں بھی حاصل کر لی۔ جس رات یہ معاملات طے ہوئے اسی رات ملکہ ترکان کو اصفہان پر قوام الدولہ کے قبضے کی اطلاع بھی مل گئی۔ اس خبر سے اسے بے انتہا خوشی ہوئی۔ ملکہ نے اسی وقت اپنے معتمد خاص اور وزیر اعظم تاج الملک کو بلا کر یہ فوجی سنائی اور اسے حکم دیا کہ کل ملک شاہ کی وفات کے اعلان اور شہزادہ محمود کی ولی عہدی کی رسم ادا کرنے کے انتظامات کیے جائیں۔

تاج الملک کو رخصت کرتے کے بعد ملکہ نے امیر ابوالمعالی کو طلب کیا اور حکم

اور بغاوت پر اتر آئے۔

ملکہ نے اپنے ہمنوا امیروں کو مشورے کے لئے طلب کر لیا۔ حالات بہت دگرگوں ہو رہے تھے۔ اس لئے امیروں کی اکثریت نے ملک شاہ کی موت کے اعلان پر زور دیا۔ ملکہ ترکان خاتون سب کی باتیں خاموشی سے بیٹھی سنتی رہی۔ جب سب اپنی اپنی رائے پیش کر چکے تو ملکہ نے بڑے پروقار لہجے میں کہا۔ ”اے آل سلجوق کے وفادار امیرو! آپ لوگوں کی گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ ہم سلطان کی وفات کا اعلان کر دیں۔ ہم اس مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن ہمارے امیروں نے اگر اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اس وقت ہم دارالسلطنت اصفہان سے دور بغداد میں مقیم ہیں۔ بغدادی امراء کی تمام ہمدردیاں خلیفہ مقتدی کے ساتھ ہیں اور مرحوم سلطان عباسی خلیفہ کو بغداد چھوڑنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ اگر اعلان ہوتے تو مقتدی کے ہوا خواہوں نے ہمارے لشکر پر حملہ کر دیا تو ہم کیا کر سکیں گے؟“

”ملکہ عالیہ!“ سپہ سالار انز بڑے جوش سے بولا۔ ”اگر بغداد والوں نے احساہ فراموشی کا مظاہرہ کیا تو ہم انہیں ایسا سبق دیں گے کہ جسے وہ عمر بھر نہ بھول سکیں گے۔“

”امیر انز — ہم یہ نہیں کہتے کہ پانچ ہزار کا سلجوقی لشکر بغدادیوں پر قابو نہ سکے گا لیکن جنگ کا پانسہ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ یہ کشمکش طویل کھینچ جائے۔ اس صورت میں ہمیں کہاں سے کمک مل سکے گی۔ خود ہمارے لشکر شہزادے برکیارق کے ہمدرد نظامی ممالک شامل ہیں۔ وہ بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔“

”ملکہ عالیہ!“ تاج الملک نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ خطرات واقعی ایسے ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کب تک امید و تمنا کشمکش میں مبتلا رہیں گے۔ ہمیں جلد اس کا کوئی معقول حل تلاش کرنا ہو گا۔“

”ہمیں تمہاری بات پسند آئی، تاج الملک!“ ملکہ نے اسے ملتفت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر امراء پسند فرمائیں تو ہم اس کی تدبیر پیش کریں۔“

”ضرور ضرور ملکہ عالیہ!“ ہر طرف سے آواز آئی۔ ”ہم وفادار آپ کی تدبیر ضرور عمل کریں گے۔“

دیا کہ کل نظامی ممالیک پر گہری نظر رکھی جائے۔ اگر وہ شہزادے محمود کی ولی عہد کے وقت کوئی گڑبڑ کرنے کا ارادہ کریں تو انہیں فوراً قتل کر دیا جائے۔ لیکن مار والے سے بچانے والا زبردست ہوتا ہے۔

امیر ابو العالی لشکر گاہ میں جا کر اپنے دستوں کے سرداروں سے اس سلسلہ گفتگو کرنے میں مصروف ہو گیا تاکہ صبح سے پہلے سب انتظامات مکمل کر لے۔ اس وقت نظامی ممالیک کے ایک خیمے میں کئی سردار بیٹھے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ نظامی ممالیک کے ہمدرد اور ملکہ ترکان کے مخالف اصفہان میں بھی موجود تھے۔ قوام الدولہ نے اصفہان پر قبضہ کر کے جب شہزادہ برکیارق کو گرفتار کیا۔ اسی وقت نظامی ممالیک کے دو سوار اصفہان سے بغداد کی طرف چل پڑے۔ یہ دونوں سوار بھاگ بغداد پہنچے اور بڑی پوشیدگی سے ممالیک کے خیموں تک پہنچ گئے۔ اس وقت نظامی ممالیک کو اصفہان پر قبضے کی اطلاع ملکہ ترکان خاتون سے کئی گھنٹے پہلے مل گئی۔ صبح کو جب تمام سلجوقی امراء اور وزراء، ملکہ ترکان خاتون کے سامنے ملک کی وفات کے اعلان اور شہزادے محمود کی رسم ولی عہدی کے انتظامات کی تفصیل کر رہے تھے تو انہیں اطلاع دی گئی کہ نظامی ممالک کے خیمے خالی ہیں اور رات کے وقت وہ سب لشکر گاہ کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اس خبر سے تمام امیر پریشان ہوئے لیکن ملکہ ترکان کے چہرے پر شگن تک نہ آئی۔

○ اس نے پر رعب لہجے میں کہا۔ ”نظامی ممالیک کا ہمارے لشکر سے ٹکل ایک اور نیک شگون ہے۔ ہم انہیں گرفتار کرنے یا قتل کرنے کی زحمت سے بچ گئے۔ اصفہان پر ہمارا قبضہ ہے۔ وہاں کا تمام شاہی لشکر ہمارے ساتھ ہے۔ یہ ہزاروں سوار ہمارا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ انہوں نے برکیارق کے زور پر ہمیں چھوڑا ہے، انہیں خبر نہیں کہ برکیارق پہلے ہی گرفتار کیا جا چکا ہے۔ اصفہان پہنچے ہی ہم اس فیصلہ بھی کر دیں گے۔“

ترکان خاتون کا یہ تیر بھی نشانے پر بیٹھا تھا۔ بات بھی سمجھ میں آنے والی تھی۔ امیروں کی پریشانی دور ہو گئی۔ دن چڑھتے ہی قصر سلطان سے سلطان العادل ملک شاہ وفات کا اعلان ہوا۔ ملکہ ترکان خاتون ماتمی لباس پہنے، بال کھولے حرم سرائے سلطان

سے برآمد ہوئی۔ سلجوقی لشکر میں کھرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اشکبار ہو گئی۔ خلیفہ مقتدی کو معلوم ہوا تو وہ بھی گھبرا کے اپنے عمائدین کے ساتھ ملکہ ترکان خاتون کے پاس تعزیت کے لئے آیا۔ ملکہ ترکان خاتون نے آنسو بہاتے ہوئے خلیفہ کا استقبال کیا اور دست ہوش کی اجازت چاہی۔ یہ ایسا موقع تھا کہ خلیفہ انکار نہ کر سکا۔ ملکہ ترکان خاتون دل میں نفرت بھرے لیکن چہرے پر تعظیم و احترام سجائے آگے بڑھی اور نہایت ادب سے خلیفہ مقتدی کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔

یہ نظارہ بڑا غم انگیز تھا۔ سلطانوں کا سلطان دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ سلجوقی سوار دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ ملکہ ترکان خاتون ملک شاہ کے غم میں پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ خلیفہ مقتدی نہ چاہتے ہوئے بھی ملکہ کی اشک شوئی کر رہا تھا اور اسے تسلی دے رہا تھا۔ پھر ملکہ لیک دم سنبھلی اور بھرائی آواز میں مخاطب کیا۔ ”اے سلطنت سلجوقیہ کے وفادارو۔ اے خلیفہ المسلمین، امیر المومنین کے چاہنے والو، آج آل سلجوقی کا روشن آفتاب غروب ہو گیا۔ اس کے لئے جتنا بھی غم کیا جائے، وہ کم ہے۔ لیکن موت برحق ہے۔ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک دن اس دار فانی کو چھوڑنا ہے۔ سلطان ملک شاہ ہمیں چھوڑ گئے لیکن اس کی نشانی اور یادگار ہمارے پاس موجود ہے“ یہ کہتے ہوئے ملکہ نے اشارہ کیا۔ ایک کثیر شہزادے محمود کو لئے ہوئے ملکہ کے پاس آگئی۔ ملکہ نے چار سالہ محمود کو اپنی گود میں لے لیا اور سسکی بھرتے ہوئے بولی۔ ”خلافت عباسیہ کے پرستارو اور آل سلجوقی کے وفادارو، یہ شہزادہ محمود ہے۔ ملک شاہ کی نشانی، خلیفہ المسلمین، امیر المومنین، خلیفہ محترم و مکرم نے اسے سلطان مرحوم کا لہجہ اور جانشین مقرر فرمایا ہے۔ میں مجبور عورت ہوں۔ شہزادے کو خلیفہ محترم کے قدموں میں پیش کر رہی ہوں تاکہ وہ ملک شاہ کے جانشین کی تصدیق فرما دیں۔“

خلیفہ مقتدی، ولی عہدی کا پروانہ جاری کر کے پہلے ہی اپنے ہاتھ کٹا چکا تھا۔ اب بھلا اس بھرے مجمع میں جہاں سلجوقی سرداروں کے علاوہ ہزاروں بغدادی عوام اور اس موجود تھے۔ وہ محمود کی جانشینی سے کیسے انکار کر سکتا تھا۔ وہ کیسے کہتا کہ یہ دار اس سے جبراً حاصل کیا گیا ہے۔ آخر خلیفہ نے شہزادے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کی جانشینی کی تصدیق کر دی۔ مجمع میں سلطان محمود شاہ کے نعرے بلند ہو گئے۔

لشکر مل گیا اور اس کے گرد نصف سے زیادہ ملک شاہ کے پرانے امیر جمع ہو گئے۔ اس نے اصفہان پر دوبارہ قبضے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ملکہ ترکان خاتون نے اصفہان پہنچ کر ملک شاہ کے کفن و دفن کا انتظام کیا اور اسے ایک مدرسے میں سپرد خاک کرنے کے بعد برکیارق کے خلاف ایک لشکر روانہ کیا۔ برکیارق اپنے لشکر کے ساتھ رے سے اصفہان کی طرف چل پڑا تھا۔ رے اور اصفہان کے درمیان دونوں لشکروں کا سامنا ہوا۔ برکیارق کے لشکر اور خصوصاً نظامی ممالک نے اس جنگ میں بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ملکہ ترکان خاتون کے کچھ سردار بھی برکیارق سے مل گئے۔ اصفہانی لشکر زیادہ دیر میدان میں نہ ٹھہر سکا اور شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ برکیارق تعاقب کرتا ہوا اصفہان پہنچا اور اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔

اگر اصفہان پر برکیارق کا قبضہ ہو جاتا تو اس خانہ جنگی کا خاتمہ ہو جاتا لیکن اس محاصرے کے دوران سلجوقی سلطنت کا ایک اور دعویدار کھڑا ہو گیا۔ یہ ملک شاہ کا بھائی تھس ارسلان والی دمشق تھا۔ تھس ارسلان کی مدد پر حلب اور رہا کے حاکم بھی آمادہ ہو گئے۔ برکیارق کو تھس ارسلان کے بڑھنے کی خبر ملی تو اس نے تھوڑی سی فوج اپنے بڑے ماموں امیر اسماعیل کے حوالے کر کے اصفہان کا محاصرہ جاری رکھنے کا حکم دیا اور خود باقی فوج لے کر تھس ارسلان کے مقابلے پر آذر بای جان کی طرف چلا۔ تھس ارسلان اس وقت موصل اور دیار بکر پر قبضہ کرنے کے بعد آذر بای جان پہنچ گیا تھا۔

ملکہ ترکان خاتون کو برکیارق کے واپس جانے کی خبر ملی تو اس کے دماغ میں ایک نئی ترکیب آئی۔ اسے معلوم تھا کہ برکیارق کا ماموں امیر اسماعیل رتلین طبیعت کا مالک ہے اس لئے اس نے امیر اسماعیل کو اپنے دام میں پھانسنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ترکان خاتون کی عمر تینتیس چونتیس سال کی تھی لیکن وہ نہایت حسین و جمیل اور بلاشبہ نظر عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی کا پوری سلطنت میں چرچا تھا۔ ملک شاہ کی وفات کے بعد تو ہر امیر اسے محبت کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ ان امیروں میں وزیر اعظم تاج الملک پر وہ سب سے زیادہ مہربان تھی۔ سپہ سالار امیرانز بھی اس کے عشاق میں شامل ہو گیا تھا۔ ملکہ ترکان خاتون جب کسی امیر سے گفتگو کرتی تو اس کا انداز بے انتہا والہانہ ہوتا جس سے ہر امیر اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ ملکہ اس کی طرف مائل ہے۔

خلیفہ کچھ ایسا دل برداشتہ ہوا کہ اسی وقت اٹھ کے چلا گیا۔ ملکہ ترکان کو اب غلیظ ضرورت نہ رہی تھی۔ اس کا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔ اب مخالفت کون کرتا۔ غلیظ تصدیق کے سامنے بغدادیوں نے سر جھکا دیئے۔

☆☆☆

ترکان خاتون نے برکیارق کو محروم کر کے محمود کی جانشینی کا اعلان کر دیا۔ نے اپنی ہوشیاری اور چالاکی سے محمود کے لئے خلیفہ مقتدی کی رضامندی بھی حاصل کر لی لیکن اس کوشش نے سلجوقی سلطنت کے عالیشان ایوان کی بنیادیں ہلا کے دیں۔ پوری سلطنت خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گئی۔ برکیارق کے طرفدار نظامی مام بغداد سے سیدھے دارالسلطنت اصفہان پہنچے۔ ان کے ہمدرد قلعہ اصفہان میں تھے۔ اس لئے انہیں قلعے میں داخل ہونے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ ترکان خاتون مقرر کئے ہوئے قلعدار قوام الدولہ کو نظامی ممالک کی اس وقت اطلاع ملی جب شاہ کے یہ غلام قلعے میں داخل ہو چکے تھے۔ کہنے کو تو یہ غلام تھے لیکن ان میں بڑے امیر شامل تھے اور شاہی لشکر میں بھی ان کا اثر تھا۔ ان باغی امیروں نے قوام الدولہ کو گرفتار کر کے قتل اور برکیارق کو آزاد کرا کے اسے ملک شاہ کے ولی عہد کی حیثیت سے سلطنت کا وارث تسلیم کر لیا۔

اسی دوران ترکان خاتون ملک شاہ کی لاش لے کر اصفہان کے قریب پہنچ گئی۔ ملکہ ترکان کے پاس برکیارق کے بجائے شہزادہ محمود کی ولی عہدی کا پروانہ تھا۔ ملکہ اس کی خوب تشییر کرائی اور یہ بھی اعلان کرایا کہ خلیفہ بغداد نے خود اپنے ہاتھوں محمود کی جانشینی کی رسم ادا کی ہے۔ خلیفہ کے پاس اگرچہ دنیاوی طاقت نہ تھی لیکن مسلمان خلیفہ کی دل سے عزت و احترام کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصفہان موجود امیروں اور لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور برکیارق کے لئے اصفہان میں ٹھہر کر ترکان خاتون کا مقابلہ کرنا ممکن نہ رہا۔ وہ فوراً اپنے ہمدردوں کو ساتھ لے سلجوقیوں کے پرانے دارالسلطنت رے پہنچ گیا۔ رے والوں نے برکیارق کو ہاتھ لیا اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ برکیارق کو رے سے دس ہزار

اس طرح ملکہ نے ہر امیر کو اپنے حسن کا شکار بنا لیا تھا۔ اب اس کا نیا شکار محاصرہ کرنے والی فوج کا سالار امیر اسماعیل تھا۔ جس پر قابو پا کر وہ اس مہرے کو بریکاریق کے خلاف استعمال کر سکتی تھی۔

ملکہ ترکان خاتون نے ایک دن اپنی کثیر نوروز کو ایک خط دے کر حکم دیا کہ وہ خط کو امیر اسماعیل کے پاس پہنچائے اور تحریری یا زبانی جواب لے کر آئے۔ ملکہ نے اس سلسلے میں اپنے امیروں کو بھی اعتماد میں لے لیا تھا اور ان پر یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ امیر اسماعیل کو گورنری کا لالچ دے کر اپنا طرفدار بنانا چاہتی ہے۔ اس کے تمام امیر مہاصرے سے پریشان تھے۔ انہوں نے ملکہ کے منصوبے کی فوراً تائید کر دی۔

نوروز پانچ سوار لے کر قلعے سے نکلے۔ انہوں نے نیزوں پر سفید پھیرے باندھ رکھے تھے۔ اس لئے ان سے کسی نے تعرض نہ کیا۔ انہیں مصالحت کا وفد سمجھ کر امیر اسماعیل کے خیمے پر پہنچا دیا گیا۔ امیر اسماعیل نے خیمے سے نکل کر وفد کی پذیرائی کی۔ جب انہیں بتایا گیا کہ وفد کی قائد ایک عورت ہے تو امیر اسماعیل اور زیادہ خوش ہوا۔ نوروز چہرے پر پورا نقاب چڑھائے ہوئے تھی۔ اس نے امیر اسماعیل سے تخلیہ میں گفتگو کی درخواست کی۔ امیر کو کیا انکار ہو سکتا تھا۔ نوروز کے ساتھیوں کو دوسرے کمرے میں ٹھہرایا گیا اور امیر اسماعیل، نوروز کو لے کر اپنے خیمے میں آ گیا۔

خیمے میں پہنچ کر نوروز نے چہرے سے نقاب اٹھایا تو خیمہ جیسے جگہ کا اٹھا۔ نوروز بھی بڑی خوبصورت کثیر تھی۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ وہ ہنس مکھ اور حاضر جواب بھی تھی۔ امیر اسے دیکھ کر مبسوت رہ گیا۔ نوروز نے امیر کی محبت کا یہ عالم دیکھا تو آنکھیں منکارتی ہوئی شوخی سے بولی۔ ”امیر محترم، شاید آپ نے زندگی میں کوئی اچھی صورت نہیں دیکھی۔“

امیر اسماعیل چونک پڑا۔ سنبھل کے بولا۔ ”یہ بات نہیں ہے معزز خاتون۔ صورتیں تو نظر سے بہت گزری ہیں۔ لیکن یہ حسن۔ یہ شوخی اور۔۔۔“

نوروز ہنس پڑی۔ ”اے امیر محترم! میرا خیال ہے کہ اگر آپ کہیں ہماری ملکہ عالیہ ترکان خاتون کو دیکھ پائیں تو دیکھتے ہی بے ہوش ہو جائیں۔“

”کیا وہ تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں؟“ امیر اسماعیل نے بڑی دلچسپی سے

پوچھا۔

”خوبصورت —“ نوروز اٹھلائی۔ ”صرف خوبصورت کہنا ان کے حسن کی ذہن ہے امیر۔ آپ نے قاف کی پریوں کا حال تو سنا ہو گا لیکن قاف کی پریاں بھی اگر ہماری ملکہ عالیہ کو دیکھ لیں تو سر جھکا لیں۔ مشتری اور زہرہ جیسی کثیریں تو ملکہ کے پیر دہوتی ہیں۔ اس غم کے زمانے میں بھی ملکہ عالیہ جب مسکراتی ہیں تو گلاب کی نرم و بازک شاخیں جھوم اٹھتی ہیں۔ اور اگر وہ ہنس دیں تو جیسے پھولوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔ مگر افسوس اس وقت ان پر برا وقت آن پڑا ہے۔ اپنے بیگانے ہو گئے۔ ملکہ نے جن امیروں پر تکیہ کیا ان میں سے اکثر ان کا ساتھ چھوڑ گئے — وہ بے سہارا ہو گئی ہیں انہیں ایک مضبوط سارے کی ضرورت ہے۔“

امیر اسماعیل کا خیال اس مجسم حسن سے ہٹ کر اس پیکر کا احاطہ کرنے لگا جس کی تعریف نوروز کر رہی تھی۔ ملکہ ترکان خاتون نے اس نازک مہم کو سر کرنے کے لئے نوروز جیسی نوخیز کثیر کا انتخاب کیا تھا۔ اور نوروز نے امیر اسماعیل کے پاس آتے ہی اپنی چرب زبانی اور ناز و انداز سے اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ نوروز بظاہر تو صلح کی گفتگو کرنے آئی تھی۔ لیکن دراصل وہ دربار حسن کا پیامبر تھی جو اسماعیل کو ملکہ کے عشق میں گرفتار کرنے پر متعین کی گئی تھی۔ امیر اسماعیل، ملکہ کے خیالی پیکر میں کچھ ایسا کھویا کہ نوروز سے اس کا نام اور اس کے آنے کا مقصد پوچھنا بھی بھول گیا۔

”محترم امیر اسماعیل —!“ نوروز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

”میں ملکہ عالیہ کا پیغام آپ کے نام لائی ہوں۔“

”ملکہ کا پیغام؟“ امیر اسماعیل نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا پیغام دیا ہے ملکہ نے؟“

”کاش یہ کوئی ایسا پیغام ہوتا جس سے آپ کے دل کو سکون پہنچتا۔“ نوروز اپنے اوپر افسردگی طاری کرتے ہوئے بولی۔ ”لیکن اس جنگی ماحول میں جنگ و جدل کے سوا اور کیا پیغام ہو سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نوروز نے اندر کی جیب سے ملکہ کا خط نکل کر امیر اسماعیل کی طرف بڑھایا۔ ”امیر محترم۔ یہ پیغام یا خط ملکہ عالیہ نے بڑی محنت اور خلوص سے بھیجا ہے اور زبانی یہ کہلایا ہے کہ یہ اس بد قسمت ملکہ کا پیغام ہے جس کی نظریں اس وقت ایک پر خلوص انسان کی تلاش میں بھٹک رہی ہیں۔“

نوروز کو ملکہ نے خط پڑھ کر سنا دیا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ امیر اسماعیل نے خط کے ذی الفاظ دہرائے ہیں۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے امیر کی کمر میں لگے ہوئے خنجر اچھڑکھڑکاتے ہوئے بولی۔ ”امیر محترم۔ کاش آپ کو کبھی قصر ان میں آنے اور ملکہ عالیہ کی مہمان نوازی کا موقع حاصل ہوتا تو پھر آپ ملاحظہ کرتے کہ اس بارگاہ حسن کی کنیزیں اور میزبان کس سلیقے اور تہذیب کا اظہار کرتے ہیں۔“

”نوروز اس بارگاہ میں حاضری کی مجھے بھی آرزو ہے۔“ امیر اسماعیل نے فوراً ”ہاں۔“ ”ملکہ عالیہ نے صلح کی گفتگو کے لئے قلعے میں آنے کی دعوت دی ہے لیکن ہر سردار شاید یہ پسند نہ کریں۔ تم یہیں میرا انتظار کرو۔ میں سرداروں سے راز کر کے ابھی تمہیں جواب دیتا ہوں۔“

امیر اسماعیل، ملکہ کا خط لئے ہوئے باہر چلا گیا۔ وفد کے آنے سے اس کے دل میں طرح طرح کی باتیں اور چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ امیر اسماعیل نے خاص سرداروں کو ایک خیمے میں جمع کر کے ملکہ کا خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ ان تحریر میں بڑی اپنائیت اور خلوص موجود تھا۔ اس لئے تمام سرداروں نے اس کو پسند کیا۔ برکیارق اس وقت آذر بائی جان میں تھا۔ اس سے مشورے کا وقت نہ ہر سردار نے اس بات سے اتفاق کیا کہ صلح کی گفتگو کرنے میں کوئی ہرج مہرج نہ ہو۔ اگر معقول شرائط طے ہو جاتی ہیں تو پھر برکیارق کو مطلع کر کے ان کی مدد حاصل کی جائے۔ آخر رائے یہ ٹھہری کہ امیر اسماعیل کو قلعے میں جانے کے لئے ملکہ ترکان خاتون کو یہاں مدعو کیا جائے۔ اگر ملکہ اپنی تحریر کے مطابق قلعہ سے آگئی تو پھر اس کے خلوص میں کوئی شبہ نہ رہ جائے گا اور گفتگو بغیر کسی خطرے باری رکھی جاسکتی ہے۔

امیر اسماعیل نے واپس آکر نوروز کو اپنے جواب سے مطلع کر دیا۔ نوروز چلنے والی طرف سے ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو اس کی وضاحت تم ملکہ عالیہ سے کرنا۔ وہ

امیر اسماعیل نے نوروز سے خط لیا۔ خط مختلف قسم کی خوشبوئیاں سے معطر تھا۔ بھینی بھینی خوشبو سے وہ مست ہو گیا۔ ملکہ بڑی خوشخط عورت تھی۔ خوش نویسی کی اس نے باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ پھر یہ خط تو اس نے بڑی محبت سے تحریر کیا تھا۔ لکھا تھا۔

”امیر محترم!

یہ اس بد قسمت ملکہ کا نامہ ہے جس کی نظریں ایک پر خلوص انسان کی تلاش میں ہر طرف بھٹک رہی ہیں۔“

امیر اسماعیل نے خط سے نظریں اٹھا کر نوروز کی طرف دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ کچھ اس قسم کی بات نوروز نے بھی کہی تھی۔ اس لئے امیر اسماعیل کا نوروز پر اعتماد بڑھتا ہوا گیا۔ اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

”ہم ایک ہی شجر کی مختلف شاخیں ہیں لیکن ہوس اقتدار نے ہمیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے۔ برکیارق بھی مجھے محمود کی طرح عزیز ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ ہم آپس میں بیٹھ کر اس مسئلے کو حل کر لیتے اور خلق خدا کا مزید خون نہ بہتا۔ اگر امیر محترم پسند فرمائیں تو صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے قلعے میں تشریف لے آئیں۔ امیر ہمیں پذیرائی میں بے تکلف پائیں گے۔ ہم امیر محترم کے منتظر ہیں۔ برا ہو زمانے کا جو دو مخلص ہستیوں کو سر جوڑ کر بیٹھنے نہیں دیتا۔ اگر امیر کو کوئی ایسی مشکل پیش آجائے اور ان کے دل میں محبت کے بجائے خدشات جنم لینے لگیں تو ہم اس سلسلے میں خود قدم اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ عزت و سلامتی کا یقین دلایا جائے تو ہم خود امیر سے گفتگو کے لئے ان کے خیمے پر آسکتے ہیں۔ تحریری جواب میں کوئی تکلف ہو تو وفد کی سربراہ کے ذریعے زبانی جواب بھیجا جائے۔ ہماری مذہب اور بالیقہ کنیز نوروز قابل اعتماد ہے۔“

راقم۔ ملکہ ترکان خاتون ”مذہب اور بالیقہ کنیز نوروز۔۔۔۔۔“ خط پڑھنے کے بعد امیر اسماعیل نے نوروز کو مسکرا کے دیکھا۔ ”نوروز! تمہاری ملکہ نے تمہارے بارے میں صبح الفاظ استعمال کئے ہیں۔ تم واقعی بہت مذہب اور سلیقہ مند ہو۔“

پرسکون زندگی گزارنے کا قائل ہے اور ملکہ کی قدم بوسی کے لئے ہر وقت حاضر ہوتے کو تیار ہے۔

”قدم بوسی۔“ نوروز مسکرائی۔ ”امیر محترم! اگر آپ قدموں کے دیدار سے سرفراز ہو گئے تو پھر ان قدموں کو چھوڑنا مشکل ہو جائے گا۔“

امیر اسماعیل نے بڑھ کے نوروز کے سینے پر لڑائی ہوئی دونوں چوٹیوں کو پکڑ لیا۔ ”ان زلفوں میں بھی اتنی ہی طاقت ہے نوروز بشرطیکہ تم۔۔۔“ نوروز ہنستی ہوئی خیمے سے نکل گئی۔

ملکہ ترکان خاتون نے امیر اسماعیل کا جواب پاتے ہی امیرانز اور تاج الملک کو طلب کر لیا۔ ملکہ کے ساتھ اب یہی دو قابل فکر امیر رہ گئے تھے۔ دونوں امیروں نے یہ بات تو پسند کی کہ ملکہ توران اور امیر اسماعیل کی ملاقات کرائی جائے لیکن انہوں نے اس کی مخالفت کی کہ ملکہ ترکان تن و تنہا امیر اسماعیل سے ملنے اس کے خیمے میں جائے۔ امیرانز اور امیر اسماعیل میں پرانی دشمنی بھی تھی اس لئے اس نے شدید مخالفت کی۔ پھر اسے یہ بھی خطرہ پیدا ہوا کہ کیسں ملکہ، امیر اسماعیل کا تعاون حاصل کرنے کے بعد اسے نہ چھوڑ دے اور وہ دھڑی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا بن کر رہ جائے۔ تاج الملک کے دل میں بھی کچھ اسی قسم کے خدشات پیدا ہوئے۔ وہ ملکہ کے قریب اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ اب کسی اور کو ملکہ کے قریب دیکھنا بھی پسند نہ کرنا تھا۔ امیر اسماعیل کی عیش پرستی سے سب واقف تھے۔ اس لئے وہ ملکہ کو امیر اسماعیل کے پاس بھیجنے پر رضامند نہ ہوا۔

”ملکہ عالیہ۔“ تاج الملک نے دبے لفظوں میں کہا۔ ”امیر اسماعیل کچھ اچھے کردار کا مالک نہیں۔ اس سے آپ کا ملنا میرے خیال میں کچھ مناسب نہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے ملکہ عالیہ۔“ امیرانز نے تاج الملک کی تائید کی۔ ”ایک تو یہ بات ملکہ عالیہ کے وقار کے خلاف ہے کہ وہ امیر اسماعیل جیسے معمولی امیر سے ملاقات کریں۔ پھر دشمن کے لشکر میں ملکہ عالیہ کا تنہا جانا کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے اس میں ملکہ کی گرفتاری کا بھی خطرہ ہے۔“

”مگر مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے امیرانز۔“ ملکہ جھلا کر بولی۔ ”ہم کوئی دھوکا

مہیا تو نہیں کہ امیر اسماعیل ہمیں مٹھی میں دبا لے گا۔ اس وقت برکیارق اصفہان سے دور ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہم امیر اسماعیل سے صلح کی شرائط طے کریں گے یا نہیں تو اسے درغلا کر کسی طرح اپنے ساتھ ملانا ہے۔ امیر اسماعیل، برکیارق کا بہن ہے اور برکیارق کے لشکر میں اس کے فوجی دستے بھی شامل ہیں۔ اگر وہ ہمارے ہاتھ مل گیا تو وہ اپنے دستوں کے ساتھ قلعے میں آ جائے گا۔ ہماری طاقت میں اضافہ ہو جائے گا اور ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ باہر نکل کر محاصرہ کرنے والوں پر حملہ کر لیں اور برکیارق کے واپس آنے سے پہلے اس لشکر کا خاتمہ کر دیں۔“

ملکہ کی بات بڑی دور اندیشی پر مبنی تھی۔ تاج الملک اور امیرانز کو اس کی تائید لانا پڑی لیکن طے یہ ہوا کہ محاصرین کے خیموں اور قلعہ کے درمیان ملکہ ترکان اور امیر اسماعیل کی ملاقات کے لئے ایک خیمہ نصب کیا جائے تاکہ ملکہ ترکان کی گرفتاری اظہر نہ رہے۔

یہ بات طے ہو جانے کے بعد ملکہ نے نوروز کو پھر امیر اسماعیل کے پاس بھیجا کہ اس کی رضامندی حاصل کی جائے۔ برکیارق کی فوج میں سب سے زیادہ وفادار اہل ممالیک کے دستے تھے۔ ان ممالیک کے بیشتر دستے تو برکیارق اپنے ساتھ لے گیا لیکن کچھ دستے اب بھی یہاں موجود تھے۔ ان ممالیک کو امیر اسماعیل پر اعتماد نہ تھا۔ امیر کو مفاد پرست سمجھتے تھے اور انہیں خطرہ تھا کہ اس ملاقات میں کیسں امیر، ملکہ ترکان خاتون کے ناز و غمزے کا شکار ہو کر کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے جس سے محاصرین دشمن میں جھلا ہو جائیں لیکن ان ممالیک کی تعداد کم تھی، اس لئے ان کی بات نہ سنی گئی اور امیر اسماعیل نے الگ خیمے میں ملاقات پر رضامندی ظاہر کر دی۔

چند گھنٹوں کے اندر اصفہان والوں نے ایک عالی شان خیمہ دونوں فوجوں کے درمیان نصب کر دیا۔ پہلے امیر اسماعیل کے ایک سردار نے خیمے کا معائنہ کیا تاکہ یہ لیٹان کیا جاسکے کہ کوئی فریب تو نہیں کیا جا رہا۔ اس اطمینان کے بعد پہلے امیر اسماعیل کو تنہا خیمے میں بھیجا گیا۔ امیر کو ملکہ حسن کے حضور پیش ہونا تھا۔ اس لئے وہ اب بن سنور کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ملکہ توران خاتون پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ملاؤ لائے خیمے پر آئی۔ چونکہ یہ ملاقات تنہائی میں ہونا تھی اس لئے ملکہ نے نوروز

”میں اس عزت افزائی کے لئے ملکہ عالیہ کا شکر گزار ہوں۔“ امیر اسماعیل، ملکہ سامنے بچھا جا رہا تھا۔

”امیر اسماعیل۔ اپنے مرتبے کو پہچانو اور ہماری بات کو غور سے سنو۔ ہم اس جنگ کو پسند نہیں کرتے۔ ہم سلطان ملک شاہ کی ملکہ تھے اور ملکہ بن کر سکون سے رہنا چاہتے ہیں۔ سلجوقی سلطنت کا اصل وارث ہمارا بیٹا شہزادہ محمود شاہ ہے۔ اسے عیسیٰ کی تائید حاصل ہے لیکن اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے ہم شہزادے کو کے جائز حق سے محروم کرنے کے لئے آمادہ ہیں بشرطیکہ برکیارق بھی دست بردار رہے۔“

امیر اسماعیل نے گہرا کر ملکہ کو دیکھا۔ ”لیکن ملکہ عالیہ پھر سلجوقی سلطنت کے تاج کا وارث کون بنے گا۔“

”تم۔۔۔ امیر اسماعیل! سلجوقی تخت پر تم بیٹھو گے۔“

شہزادوں کی موجودگی میں، میں کیسے وارث بن سکتا ہوں ملکہ عالیہ؟

”امیر اسماعیل۔ خود میں حوصلہ پیدا کرو۔“ ملکہ نے اسے سہارا دیا۔ ”ہم اسے ساتھ ہیں۔ ہم محمود کی معزولی کا اعلان کر دیں گے اور تم برکیارق کو اپنے لئے بٹھا دو گے۔ پھر تمہارے سوا اور کون وارث ہو گا۔ ملک شاہ کی بڑی ملکہ خاتون ہیں اور تم ان کے بھائی ہو۔ کوئی بھی تمہاری مخالفت نہ کر سکے گا۔ اگر اسے مخالفت کی تو ہم اور تم مل کر اس کا سر پھیل دیں گے۔“

”مگر ملکہ عالیہ۔۔۔“ امیر اسماعیل نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”آپ کن شرائط پر آمادہ ہیں؟“

ملکہ ترکان خاتون نے برق پاش نظروں سے امیر اسماعیل کو دیکھا۔ پھر مسکرائی۔ ”امیر اسماعیل، ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمیں اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے۔ اس خانہ جنگی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں تخت و تاج دلانے کے بعد ہم گوشہ نشین ہو جائیں گے یا اگر تم پسند کرو گے تو ہم اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر کے دوبارہ سلجوقی ملکہ کا درجہ حاصل کر لیں گے۔“

کو خیمے کے باہر ہی سے رخصت کر دیا۔ اب ایک طرف محاصرین کے خیمے کے سارے امیر اسماعیل کا لشکر صف آرا تھا۔ دوسری طرف قلعے کے اوپر اور باہر ملکہ توران خاتون کے سوار صف در صف کھڑے تھے۔

ملکہ توران خاتون جادو جگاتی خیمے میں داخل ہوئی۔ امیر اسماعیل سرپا شوق خیمے کے دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ ملکہ ترکان نے ایک ادائے خاص سے چہرے سے نقاب اٹھایا اور تبسم کی بجلیاں گراتی آگے بڑھی۔ امیر اسماعیل پہلی ہی نظر میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ رعب حسن سے اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اس بڑی مشکل سے جھک کر ملکہ کو تعظیم پیش کی۔ ملکہ نے بڑی بے تکلفی سے مصافحے کے لئے اپنا مرمریں ہاتھ بڑھا دیا۔ حنا آلود انگلیاں، پور پور ہیرے کی انگوٹھیاں۔۔۔ امیر اسماعیل حیران نظروں سے کبھی ملکہ کا مسکراتا چہرہ دیکھتا کبھی جگمگاتی انگلیوں پر نظر ڈالتا۔ ملکہ کے حسن بے محابہ اور مصافحے کے اعزاز نے امیر اسماعیل کو بالکل بے خبر کر دیا۔ اس نے بڑی مشکل سے مصافحہ کیا اور ہاتھ باندھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھ جاؤ امیر اسماعیل۔“ ملکہ نے ایک نشست کی طرف اشارہ کیا اور خود اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”ملکہ عالیہ۔ آپ فرمائیے۔“ امیر اسماعیل نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میر تو ملکہ عالیہ سے ہر شرط پر مصالحت کے لئے آمادہ ہوں۔۔۔۔۔“

”امیر اسماعیل۔ ہم پوچھتے ہیں کہ تم کیا چاہتے ہو؟“ ملکہ ترکان نے امیر کو الجھا دیا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ امیر گھبرا گیا ”میں تو مصالحت کا خواہشمند ہوں ملکہ عالیہ۔۔۔۔۔“

”امیر اسماعیل۔ ہم سے آنکھیں ملا کے گفتگو کرو۔ تم ہمارے مرتبے کے امیر ہو۔“ ملکہ نے اپنے شکار پر پہلا تیر پھینکا۔

”اگر تم ہمارے مرتبے کے نہ ہوتے تو ہم تمہیں تنہائی میں ملاقات کا موقع ہر گز نہ دیتے۔ ہم تمہاری عزت کرتے ہیں امیر اسماعیل۔ ہماری خلوت میں صرف ملکہ شاہ کو آنے کی اجازت تھی۔ تم دوسرے شخص سے ہم نے ملاقات کی عزت بخشی

”ملکہ عالیہ گوشہ نشین نہیں ہو سکتیں۔“ امیر اسماعیل نے یوں کہا جسے وہ واہ سلجوقی سلطان بن گیا ہے۔ ”ترکان خاتون سلجوقی ملکہ تھیں اور میرے تخت نشین ہونے کے بعد بھی ملکہ سلجوقی رہیں گی۔“

”بشرطیکہ تم برکیارق کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔“ ملکہ بڑی محبت بھری نظروں سے امیر اسماعیل کو دیکھا۔

ملکہ ترکان نے پہلی ہی ملاقات میں امیر اسماعیل کو رام کر لیا۔ پھر دونوں نے جوڑ کے برکیارق کے قتل کی سازش تیار کی۔ ملکہ سازش تو تیار کر کے لائی تھی صرف امیر اسماعیل کو ڈھرے پر لگا کر اسے سمجھانا تھا۔ ملکہ ترکان نے اپنے منصوبے ایک ایک بات کھول کر بیان کی اور امیر اسماعیل کو یہ یقین دلایا کہ وہ اس پر عمل کے سلجوقی سلطنت کا سلطان بن سکتا ہے۔ پھر وہ دونوں دیر تک پیار و محبت کی بات کرتے رہے۔ ملکہ اسے سبز باغ دکھاتی رہی اور امیر اسماعیل مستقبل کے سحر خوابوں میں جھولتا رہا۔

تین گھنٹے کی ملاقات کے بعد ملکہ قلعہ واپس چلی گئی اور امیر اسماعیل اپنے میں لوٹ آیا۔ امیر اسماعیل نے اپنے سرداروں کو اس گفتگو کا لب لباب یہ بتایا کہ ترکان خاتون اس بات پر آمادہ ہے کہ اگر اسے اصفہان کا قلعہ دے دیا جائے تو برکیارق کو سلطان تسلیم کر لے گی۔ ملکہ ترکان نے یہ پٹی امیر اسماعیل کو پڑھائی تھی کہ اس کے سردار مطمئن ہو جائیں اور امیر اسماعیل کو برکیارق تک پہنچنے میں کوئی وقت نہ ہو سکے۔ یہ شرط بہت معمولی تھی۔ سب نے اسے پسند کیا لیکن جب امیر اسماعیل نے یہ کہا کہ وہ اس کی منظوری لینے خود برکیارق کے پاس جائے گا تو نظامی ممالیک کے سواروں نے اس کی مخالفت کی۔ ان کا جواز یہ تھا کہ سپہ سالار کو محاذ چھوڑنا چاہئے۔ یہ اطلاع برکیارق کے قاصد کو ذریعہ بھی بھیجی جاسکتی ہے۔ لیکن امیر اسماعیل کا تو کچھ اور ہی منصوبہ تھا۔ اس نے نظامی ممالیک کے سواروں کو ڈانٹ کر اس بات سے انہیں کچھ شبہ پیدا ہو گیا۔

نظامی ممالک میں یہ طاقت تو نہ تھی کہ وہ امیر اسماعیل کو زبردستی روک لے لیکن انہوں نے باہم مشورہ کیا اور ایک قاصد کے ذریعہ ملکہ ترکان اور امیر اسماعیل

ان کا حال لکھ کر برکیارق کو بھیجا اور اسے خبردار کیا کہ امیر اسماعیل سے تنہائی میں نہ ملنے کی جائے۔

ادھر ملکہ نے قلعہ میں پہنچ کر تاج الملک اور امیرانہ کے سامنے ایک نئی کہانی سنانی۔ اس نے امیروں کو بتایا کہ امیر اسماعیل برکیارق کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس نے اس کے لئے کچھ وقت مانگا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ فوجی دستے لے لے سکے۔ کہانی اس قدر خوبصورتی سے گڑھی گئی تھی کہ تاج الملک اور امیرانہ اس پر یقین کرنا پڑا۔

امیر اسماعیل، ملکہ ترکان خاتون کے منصوبے کے مطابق برکیارق سے ملنے کے لئے دارالسلطنت رے کی طرف روانہ ہوا۔ برکیارق اس عرصے میں اپنے چچا شش سلطان کو شکست دے کر رے پہنچ گیا تھا کہ وہاں سے مزید لشکر حاصل کر کے پھر سلطان واپس آئے۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ نظامی ممالیک کا قاصد خط لے کر اس کے پاس پہنچا۔ خط پڑھ کر برکیارق دنگ رہ گیا۔ اسے امیر اسماعیل پر سخت غصہ آیا۔ امیر اسماعیل کی تنہائی میں ملکہ ترکان خاتون سے ملاقات ہی قابل اعتراض تھی۔ اسے قدم بغیر برکیارق کے مشورے کے نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ دوسرے سپہ سالار کا بیان جنگ چھوڑ کر آنا اس سے بھی زیادہ حماقت آمیز اور نا عاقبت اندیش اقدام تھا۔ تاہم اسے خبردار رہنے کا بھی مشورہ دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ ماموں کے رشتے کو بالائے لڑکھ کر محتاط ہو گیا اور اس سلسلے میں بعض احتیاطی تدابیر بھی اختیار کر لیں۔

اصفہان سے قاصد کے آنے کے چوتھے دن امیر اسماعیل بھی رے پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ خاص اس کے دستے کے پچاس سوار بھی تھے۔ برکیارق نے حکم دے رکھا کہ امیر اسماعیل آئے تو اسے سیدھا اس کے پاس نہ آنے دیا جائے۔ بلکہ اسے سلطان خانے میں ٹھہرا جائے اور جب تک وہ خود اسے طلب نہ کرے، اس وقت تک اس کی غاص نگرانی کی جائے۔ برکیارق کے دارالسلطنت رے میں نہ تو اصفہان جیسی طاقتور تھی اور نہ بڑے بڑے محلات تھے۔ مرحوم ملک شاہ کو عمارتیں بنانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے یہ شوق دارالسلطنت اصفہان میں پورا کیا۔ اس نے اصفہان کے اندر

ہائی تو اپنی ناکامی کے اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کے دل کی حرکت اس پر کوئی ہی ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی اور جوان عمر سلطان برکیارق کو سلجوقی ساحرہ کی بیگانگیوں سے چھٹکارا مل گیا۔

☆☆☆

عمارت قصر خاتون تھا جس میں ملکہ ترکان خاتون رہتی تھی۔ یہ محل اس کے ہم منسوب تھا۔ رے میں اس نے صرف ایک چھوٹا سا محل بنوایا تھا۔ برکیارق اسی میں مقیم تھا۔

امیر اسماعیل اپنے سواروں کے ساتھ سیدھا برکیارق کے محل پر پہنچا اور فوراً طور پر برکیارق سے ملاقات کی خواہش کی۔ محافظ اسے مہمان خانے میں لے گئے اندر جا کر برکیارق کو اطلاع دی۔ برکیارق نے امیر اسماعیل سے ملاقات کے لئے کمرہ مخصوص کر دیا تھا۔ وہ پہلے خود اس کمرے میں پہنچا پھر امیر اسماعیل کو وہیں لانے کے لئے بلایا۔ امیر اسماعیل بڑے اطمینان سے برکیارق کے کمرے میں داخل ہوا، برکیارق سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ امیر اسماعیل بغیر کچھ کے تیزی سے برکیارق کے پاس گیا اور بڑی پھرتی سے خنجر نکال کر اس پر حملہ کر دیا۔ برکیارق ہوشیار بیٹھا تھا۔ اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ اسی وقت پردے کے پیچھے چھپے ہوئے درجنوں محافظ نے نکل کر امیر اسماعیل کو دوچ لیا۔ امیر اسماعیل کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر گر گیا۔

”امیر اسماعیل تم میرے ماموں ہو۔“ برکیارق نے اسے حقارت سے بولے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے اس رشتے کو دھبہ لگایا ہے۔ خدا کی قسم اگر موت سے کر کوئی اور سزا ہوتی تو اس کا حکم دیتا۔“

”مجھے معاف کر دو سلطان برکیارق! مجھ سے غلطی ہو گئی۔ امیر اسماعیل نہاد سے سر جھکا کر گڑ گڑایا۔ مجھے ترکان خاتون نے ———“

”چپ رہ غدار۔“ برکیارق غصے سے کانپنے لگا۔ ”اس سلجوقی ساحرہ کا تو میں حشر کروں گا کہ دنیا کو عبرت ہوگی۔“

مگر برکیارق، سلجوقی ساحرہ کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ برکیارق نے امیر اسماعیل کو وقت قتل کرا دیا۔ پھر وہ جلدی جلدی لشکر لے کر اصفہان کی طرف روانہ ہوا۔ اصفہان سے ابھی وہ کچھ دور تھا کہ اسے ملکہ ترکان خاتون کے مرنے کی اطلاع ملی۔ ملکہ ترکان نے تو برکیارق کو قتل کرانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس کے لئے بہت امید تھی لیکن جب اسے برکیارق کے بجائے امیر اسماعیل کے قتل ہونے کی خبر ہوئی

جک اٹھا تھا۔

”وہ ہمارے گلی میں داخل ہوتے ہی واپس چلا گیا تھا۔“ ابراہیم نے آقا کو

لمبان دلایا۔

اس کے آقا نے اپنی بھیگی پیشانی صاف کی مگر اس کی آنکھوں میں خوف اب بھی رہا تھا۔ ”اب کیا ہو گا ابراہیم۔ ہم بلال کا کب تک انتظار کریں گے؟“

”آقا! ابھی تو ہم وہ قہوہ خانہ ہی تلاش نہیں کر پائے جہاں بلال کو آتا ہے۔“ ابراہیم نے بڑی بے دلی سے کہا۔ ”آپ کی احتیاط ہمیں کسی مصیبت میں پھنسا دے گی۔“

جمال پیکر جمال

”دیکھو ابراہیم! تم عقل و دانش سے خالی ہو۔“ اس کے آقا کو جیسے غصہ آ گیا۔ ”تم کیا جانو احتیاط کے کیا فائدے ہیں۔ فرض کرو تم نے کسی سے پوچھا کہ اس میں ”بغدادی قہوہ خانہ“ کون سا ہے اور اس نے تم سے پلٹ کر سوال کر لیا کہ تم خانے کو کیوں پوچھ رہے ہو تو پھر تم کیا جواب دو گے؟“

آقا میرے آقا۔“ ابراہیم جھلا اٹھا۔ ”کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ہم سے طرح کے بیہودہ سوالات کرے۔ اگر کسی احمق نے یہ سوال کر ہی لیا تو کہہ دیں کہ ہمیں ایک دوست نے بغدادی قہوہ خانہ میں ملاقات کا وقت دیا ہے۔ بس بات ہو جائے گی۔ اس میں خوف کھانے کی کیا ضرورت ہے۔؟“

”تمہاری عقل تو گدی میں ہے ابراہیم۔“ آقا کو بھی غصہ آ گیا۔ ”بات یہیں پر ختم نہیں ہو گی۔ وہ تم سے کہہ سکتا ہے کہ بغداد میں رہتے ہوئے بغدادی قہوہ خانہ نہیں جانتے اس طرح یہ راز کھل جائے گا کہ ہم پردہ کی ہیں اور ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو جائے۔“

ابراہیم شاید اپنے وہی آقا سے زیادہ عقلمند تھا۔ اس نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے ”سرکار ہمارد خدا کے لئے کسی وہم کو دل میں جگہ نہ دیجئے۔ اگر ہم صبح تک بھی طرح قہوہ خانوں کے نام پڑھ پڑھ کر بغدادی قہوہ خانہ ڈھونڈتے رہے تو ہمیں ملانے ہو گی اور کو تو ال ہمارا انتظار کر کے واپس چلے جائیں گے۔“

”واپس چلے جائیں گے۔ کیا ہمارا انتظار نہیں کریں گے۔ ابراہیم تم اس واقعہ کو

وہ دونوں سیاہ چوغوں میں لپٹے ہوئے بغداد کی گلیوں میں گھوم رہے تھے۔ یہ بغداد کا مشہور محلہ کرخ تھا۔ رات ابھی بھیگی نہ تھی اور محلے کی تمام روشن اور نیم تاریک گلیوں میں چل پھل تھی۔ ہر گلی کے کنارے پر دونوں طرف قہوہ خانے تھے جو لوگوں سے کھچا کھچ بھرے تھے۔ دونوں اجنبی ان گلیوں کے اندر باہر کئی کئی چکر لگا چکے تھے۔ ان کا لباس اگرچہ عام بغدادیوں جیسا تھا اور بظاہر ان پر شبہ نہ کیا جاسکتا تھا پھر بھی ان کا اس طرح بے مقصد گھومنا اور ہر گلی کے سامنے سے کئی کئی بار گزرتا دیکھنے والوں کو شبہ میں مبتلا کر رہا تھا۔ ایک قہوہ خانے کا مالک تو اپنی نشست چھوڑ کے ان کے تعاقب میں بھی چل پڑا تھا۔

”آقا! آپ نے دیکھا۔ ایک بغدادی ہمارا پیچھا کر رہا تھا؟“ ان میں سے ایک نے دوسرے کا چوغہ پکڑتے ہوئے کہا۔

”دوسرے کے قدم فوراً رک گئے۔“ کہیں اس نے ہمیں پہچان تو نہیں لیا ابراہیم؟“ ابراہیم کے آقا کی آواز تھر تھرا رہی تھی اور اس کی پیشانی پر خوف کا پتہ

یاد رکھنا۔ جس وقت اقتدار ہمارے ہاتھ میں آئے گا تو سب سے پہلے ہم کو قاتل یاد رکھنا۔ جس وقت اقتدار ہمارے ہاتھ میں آئے گا تو سب سے پہلے ہم کو قاتل یاد رکھنا۔ جس وقت اقتدار ہمارے ہاتھ میں آئے گا تو سب سے پہلے ہم کو قاتل یاد رکھنا۔ جس وقت اقتدار ہمارے ہاتھ میں آئے گا تو سب سے پہلے ہم کو قاتل یاد رکھنا۔

ابراہیم کا آقا نہ معلوم کس رو میں بکلا چلا جا رہا تھا اور ابراہیم منہ کھولے اس منہ دیکھ رہا تھا۔ ابراہیم نے اپنے وہی آقا کو جواب تو نہ دیا بس اس کا ہاتھ منہ سے پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

”ابراہیم! تمہیں پاس ادب چاہیے۔“ اس کے آقا نے احتجاج کیا۔ ”آؤ ہمارے ہیں۔ تمہیں ہمارا ادب کرنا چاہیے۔ یاد رکھو اگر تم نے ہم سے معافی مانگی تو برسر اقتدار آنے کے بعد ہم.....“

”چپ ہو جائیے آقا۔“ ابراہیم نے بڑی سختی سے کہا۔ ”وہی بغدادی پھر رہا۔“

”کون بغدادی؟“ آقا گھبرا گیا۔ ”تم ہمارے وفادار دوست ہو ابراہیم۔“

”آقا! اگر آپ نے اپنی زبان بند نہ رکھی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہو جاتا ہے۔“

”ابراہیم نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔“ بغدادی سے میں بات کروں گا۔“

”آپ ایک لفظ بھی نہ بولے گا۔“

”بالکل نہیں بولیں گے۔“ آقا نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یہ ہمارا وعدہ ابراہیم۔“

مشہور ہے کہ دیوانہ بکار خویش دیوانہ نیست۔ یعنی دیوانہ اپنے کام میں نہیں کرتا۔ کہاں تو ابراہیم کا آقا ارسطونی اور افلاطونی باتیں کر رہا تھا مگر جب جان کا خطرہ پیدا ہوا تو کیسا نرم پڑ گیا۔ بغدادی واقعی اس طرف بلکہ ان کی طرف رہا تھا۔ ابراہیم اور اس کا وہی آقا ایک جگہ ٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ بغدادی ان

پاس آ کے رکا اور انہیں بڑے ادب سے سلام کیا۔

”آپ لوگ پردیسی معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”ابراہیم کے آقا کو پسینہ آ گیا۔ انہیں سخت تعجب تھا کہ بغدادی نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ پردیسی ہیں۔ وہ اپنی کوئی منطق جھاڑنے والے تھے کہ ابراہیم

نہیں۔ ان کی ج ج دھج دیکھتے ہی نووارد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کونسا قہوہ خانہ
”مگر میران یہاں پر ایک سوال اور اٹھتا ہے۔“ ابراہیم نے پھر اچ
بگھاری۔ ”ہم اس وقت بھی ایک قہوہ خانے کے سامنے کھڑے ہیں اور یہ
ہے کہ یہ قہوہ خانہ سامنے والے قہوہ خانے سے زیادہ آراستہ اور خوبصورت
ہے۔ کیا ایک نووارد کو اس پر قہوہ خانہ سامرو کا دھوکہ نہیں ہو سکتا؟“

”ہرگز نہیں!“ ابراہیم کا آقا ایک دم اس طرح بولا جیسے مردہ کفن پھا
ہے۔ ”ابراہیم تمہارا سوال نہایت نامعقول ہے مابدولت تمہاری حماقت پر افسوس
ہیں۔“

بغدادی نے چونک کر ابراہیم سے نظریں ہٹا کر اس کے آقا کو دیکھا۔ ابرا
آقا کی اس مداخلت سے گھبرا گیا تھا اس نے بغدادی کو فوراً اپنی طرف منہ
”میران آپ ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کیجئے یہ میرے دوست ہیں اور آج
بیمار ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے ابراہیم نے بغدادی کو اپنی آنکھ اور ہاتھ سے اس ط
کیا جیسے کہہ رہا ہو کہ میرا دوست ”پاگل“ ہے۔

بغدادی مسکرایا اور اس نے سر کے اشارے سے ابراہیم کی بات کی تاء
وہ کچھ شوخ طبیعت کا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”میں آپ کی بات
ہوں۔“ پھر اس نے مابدولت کہنے والے ابراہیم کے آقا سے سوال کیا۔ ”شہنشاہ
کیا آپ یہ وضاحت فرمائیں گے کہ آپ کو اپنے دوست کی کون سی بات
معلوم ہوئی ہے؟“

ابراہیم اپنی جگہ کانپ اٹھا۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اس کا آقا کوئی ا
منہ سے نہ نکال دے جس سے ان کی اصلیت اور شخصیت ظاہر ہو جائے۔ ا
چاہا کہ بغدادی کو وہ کوئی جواب دے مگر اس وقت تک اس کا آقا زبان کھول نہ
”مابدولت کو ابراہیم کی اس بات پر افسوس ہوا کہ اس گلی میں سامرو
شانداز قہوہ خانہ صرف قہوہ خانہ بغدادی ہو سکتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ
وقت اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔“ ابراہیم کے آقا نے ٹھہر ٹھہر کر اور ایک ابا
قول قول کر کہا تھا۔

”سبحان اللہ“ سبحان اللہ۔ کیا عقل و فراست پائی ہے۔ آپ نے۔“ بغدادی جج
آپ کو پاگل کہنے والا خود پاگل ہے۔ خدا کی قسم میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ
سلطان اور خلیفہ تسلیم کر لوں۔ کیا دلیل دی ہے آپ نے۔ آپ لوگ بغدادی
نے پر کھڑے ہیں اور اس قہوہ خانے کا نا چیز مالک آپ لوگوں سے ہم کلامی کا
ماصل کر رہا ہے۔“

”اچھا تو یہی بغدادی قہوہ خانہ ہے اور آپ اس کے مالک ہیں۔“ ابراہیم خوش ہو
رہا تھا کہ آراستہ پیراستہ قہوہ خانے کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

”ہاشا اللہ“ بڑا خوبصورت قہوہ خانہ ہے۔“ ابراہیم کے آقا نے ایک بار پھر دخل
ایا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ قہوہ خانہ ہمارے ہی لئے آراستہ کیا گیا ہے۔ مابدولت
نہ دیکھ کے بہت خوش ہوئے ہیں۔“

ابراہیم نے اپنے آقا کو گھور کے دیکھا۔ ”آقا! آپ ذرا کم بولا کریں۔ یہ آپ کا
نہیں ہے۔“ اور ابراہیم نے زور سے اس کا ہاتھ دبایا۔ اس کے آقا کو جیسے
آگیا۔ اس نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

”خفی دوستو۔ اب فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ قہوہ خانے
لے انہیں اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ”اس محلے کے ہر شخص کو میں جانتا ہوں۔
ام بتائیے۔ میں انہیں یہیں بلوا لوں گا یا پھر آپ کو آپ کے میزبان کے پاس
دل گا۔“

ابراہیم کو سخت تاکید کی گئی تھی کہ بغداد میں وہ کسی شخص سے اپنے بارے میں
نہ بتائے یہ دراصل سلطان مسعود سلجوقی کا حکم تھا۔ یہ چھٹی صدی ہجری کا زمانہ
بغداد کی عباسی خلافت ٹوٹ پھوٹ کے رہ گئی تھی۔ عباسی خلافت کا شاندار زمانہ
بغیر معصوم کے زمانے ہی سے گستا گیا تھا۔ اس کے بعد تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ جو
حکمران طاقتور ہوتا وہ خلیفہ سے زبردستی اپنی بادشاہت کا پروانہ حاصل کر لیتا اور
ناکالقب اختیار کر کے تمام مسلم علاقوں پر حکمرانی کرتا تھا۔ بے چارے خلیفہ کی
فی شرب بغداد اور اس کے ارد گرد کے چند علاقوں پر باقی رہ گئی تھی۔ اس میں کئی
لے مگر لینے کی طاقت نہ تھی اور وہ عالم اسلام کا ایک مذہبی پیشوا بن کے رہ

کا ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھا۔ شاہی حجام کی ان دلوں بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی۔ شاہی حجام کا ہر امیر کے محل میں آنا جانا ہوتا تھا اس وجہ سے سلطان وقت سے جاسوس کا کام لیا کرتے تھے۔ یہ جاسوس بڑے دوغلے ہوتے تھے۔ ایک طرف امراء کی جاسوسی کر کے سلطان سے انعام حاصل کرتے دوسری طرف امراء تک محل کی باتیں پہنچاتے اور امیروں سے خوب دولت گھسیٹتے تھے۔ سلطان مسعود کو اپنے امراء اور شہزادے ملک شاہ کی دوستی کا حال معلوم تھا مگر اس نے ڈھیل دے رکھی تھی۔ ابراہیم سے در پردہ یہ کہہ دیا تھا کہ ملک شاہ کو جہاں تک ہو سکے رنگ ریلوں سے محفوظ رکھے تاکہ سلطانی کا خیال اس کے دماغ میں نہ آ سکے۔

شہزادہ ملک شاہ کئی سال پہلے بغداد آچکا تھا کہتے ہیں بغداد کا سلطانی شہنشاہ مسعود اس شہزادے کا احسان مند تھا۔ جس وقت بغداد کا نیا شہنشاہ مقرر کیا جا رہا تھا۔ اس وقت بلال کے علاوہ اور بہت سے امیر اس عہدے کے لئے امیدوار تھے لیکن اسے ملک شاہ نے سلطان مسعود سے ضد کر کے مسعود بلال کو یہ عہدہ دلایا تھا جس سے مسعود بلال شہزادے کو سر پر بٹھاتا تھا۔ پچھلی دفعہ بھی جب شہزادہ بغداد آیا تھا تو اس وقت بلال ہی کے یہاں مقیم رہا تھا مگر سلطان کا حکم تھا کہ شہزادے ملک کی بغداد میں رہنے کا کسی کو علم نہ ہو۔ اس لئے شہزادہ چوروں کی طرح آیا تھا اور یہاں کچھ دن رہا۔ راتیں مٹا کر چوروں ہی کی طرح واپس چلا گیا تھا۔ یہ اب بغداد میں اس کا دوسرا بار تھا اور اس بار بھی اسے حکم تھا کہ وہ بغداد میں اپنی شخصیت کا اظہار نہ ہونے دے۔ اس لئے مسعود بلال نے شہزادے کو سیدھا اس کے پاس آنے کے بجائے ایک قہوہ خانے میں آنے کی تاکید کی تھی۔

قہوہ خانے کے مالک کے سوال پر ابراہیم پریشان ہو گیا تھا۔ وہ کس طرح بتاتا کہ شہزادہ کے شہنشاہ مسعود بلال سے ملنا ہے۔ اس سوال سے بچنے کے لئے تو وہ اتنی باتیں کہتا تھا کہ شہزادہ کو چکر لگا رہا تھا۔ ایک دن پہلے ابراہیم اور شہزادہ بغداد پہنچے تھے۔ ابراہیم کا قیام ایک سرائے میں تھا۔ ابراہیم نے مسعود بلال کے پاس جا کر اطلاع دے دی کہ شہزادہ اس کے ساتھ آیا ہے اور اس کی رہائش کا کوئی معقول انتظام کیا جائے۔ مسعود بلال نے انہیں دوسری شب بغدادی قہوہ خانہ میں بلایا تھا تاکہ وہیں سے

گیا تھا۔

جس طرح خلافت عباسیہ زوال پذیر تھی اسی طرح سلجوقی سلطانوں کا دور بھی ہو رہا تھا اور ان کا پہلے جیسا رعب و دبدبہ نہ رہا تھا۔ ایک طرف تو سلجوقی شہزادے ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے دوسری طرف بغداد کے جس خلیفہ کو طاقت حاصل ہو جاتی اور سلجوقیوں کے مخالف امراء اس کا ساتھ دینے پر بھی آمادہ ہو جاتے تو وہ سلجوقی سلطان کا جوا اپنے سر سے اتار پھینکنے کی کوشش کرتا تھا۔ جس وقت سلطان طغرل کا انتقال ہوا اور امراء نے سلطان مسعود سلجوقی کے سر پر تاج رکھا وقت بغداد میں خلیفہ راشد برسر اقتدار تھا۔ سلطان مسعود کو اس سے خطرہ پیدا ہوا اس نے اس پر طرح طرح کے الزامات لگا کر خلافت سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ مستقی کو خلیفہ بنا دیا۔ سلطان مسعود نے صرف خلیفہ ہی کو نہیں بدلا بلکہ ان تمام سلجوقی امراء کو بھی ایک ایک کر کے ٹھکانے لگا دیا جنہوں نے خود مسعود کو سلطان بنانے کا اہم خدمت انجام دی تھی۔

سلطان مسعود کے قریب قریب تمام مخالف ختم ہو گئے تھے۔ کوئی قابل ذکر سلجوقی شہزادہ بھی نہ تھا جس سے سلطان کو خطرے کا امکان ہوتا۔ صرف دو سلجوقی شہزادے ملک شاہ بن محمود اور محمد بن محمود زندہ تھے۔ یہ دونوں شہزادے سلطان مسعود کے بھتیجے تھے مگر ان کے عادات و اطوار ایسے نہ تھے جن سے بغاوت کی ذرا بھی بو آتا ہو۔ شہزادہ ملک شاہ کے لئے تو یہ مشہور تھا کہ وہ اللہ کی گائے ہے۔ ملک شاہ رات دن شراب و کباب میں مشغول رہتا۔ سلطان مسعود نے اس کا یہ رنگ دیکھ کر اسے اور زیادہ ڈھیل دے دی تھی۔ اس کے گزارے میں اضافہ کر دیا گیا تھا جس سے شہزادے ملک شاہ کی محفلوں کی رونق پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ شہزادہ بڑا خوبصورت جوان تھا مگر اس کی لمبی لمبی زلفوں اور خواتین کے طرح بناؤ سنگھار نے اسے ایک وجیہہ جوان کے بجائے ایک منٹ بنا دیا تھا۔ عیاشی کے علاوہ اسے گانے بجانے کا بھی شوق تھا اور اس شوق کے توسط سے بہت نچلے درجہ کے لوگ اس کے حلقہ احباب میں داخل ہو گئے تھے۔

شہزادے ملک شاہ اور ابراہیم میں بڑی پکی دوستی تھی۔ ابراہیم شاہی حجام کا بیٹا اور

انہیں اس جگہ پہنچا دے جہاں ان کے لئے انتقام کیا گیا ہو۔

ابراہیم کوئی جواب دینے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت مسعود بلال قہ خانے میں داخل ہوا۔ ابراہیم لپک کر اس کے پاس گیا۔ ”مہریان آپ نے بہت دیر دی۔ ہم تو آپ کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔“ اس کے ساتھ ہی ابراہیم نے اسے سرگوشیوں میں بتایا۔ ”خدا کے لئے ہمیں جلدی سے یہاں سے لے چلے قہو خانے مالک آپ کا نام پوچھ رہا ہے۔ کہیں شہزادے بھانڈا نہ پھوڑ دیں۔“

مسعود بلال بڑا شاطر انسان تھا۔ وہ مسکراتا ہوا قہو خانے کے مالک کے پاس پر اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جناب آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہمارے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔“

”مسعود بلال کو بغداد میں رہتے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ اس کا لہجہ اور انداز بالکل عام بغدادیوں جیسا تھا۔ قہو خانے کے مالک کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا کہ اس سے کوئی غیر ملکی مخاطب ہے۔“

”جناب اس میں شکریہ کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔“ آپ تشریف رکھنے میں آپ کے لئے بہترین قہو تیار کراتا ہوں۔“

”نہیں۔ نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔“ مسعود بلال نے جلدی سے شہزادے کا ہاتھ پکڑ کے اسے کھڑا کر دیا۔ ”میرے دوست ان مہمانوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے فوراً گھر پہنچنا ہے۔“ اور یہ تینوں دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

”مگر سنئے تو جناب۔“ مالک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”کم از کم اپنا تعارف تو کرانے چاہیے؟“

مسعود بلال نے آہستہ سے دھکا دے کر شہزادے کو دروازے کے باہر کر دیا۔ پھر منہ گھما کر بولا۔ ”آپ کا قہو باقی رہا۔ اس وقت بہت جلدی ہے۔ کل آپ سے تفصیلی ملاقات ہو گی۔“

یہ کہتے ہوئے مسعود بلال بھی قہو خانے سے باہر آ گیا۔ اس نے دونوں کو ساتھ لے کے بڑی تیزی سے سڑک پار کی اور ایک گلی میں کھس گیا۔

”عجیب لوگ ہیں۔“ قہو خانہ کا مالک آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ ”بغدادی اتنے بد مذہب تو نہیں ہوتے۔“

ادھر مسعود بلال، ابراہیم اور شہزادے ملک کو گلی میں گھسیتا ہوا بھاگا چلا جا رہا تھا۔



عباسی خلیفہ معتمد نے بغداد کے مقابلے پر ایک نیا شہر سامرا کے نام سے آباد کیا تھا۔ معتمد کے زمانے میں ایرانیوں کا بہت زور بڑھ گیا تھا اور وہ آئے دن فتنے اٹھاتے رہتے تھے۔ ان کا زور توڑنے کے لئے خلیفہ نے بغداد سے تیس میل شمال میں سامرا آباد کیا۔ یہاں معتمد نے ترکوں کی فوج رکھی تھی۔ ایرانیوں کے مقابلے میں وہ ترکی فوج پر زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ آئندہ زمانے میں اس ترکی فوج نے عباسیوں کے لئے بعض اہم کارنامے انجام دیئے۔ ایک تاریخی حوالے کے مطابق سامرا کے بہت سے لوگ شہر میں آکر آباد ہو گئے تھے اور سندھ کا سومرو خاندان اسی سے متعلق بتایا جاتا ہے۔

سامرا اگرچہ بغداد سے تیس میل دور تھا لیکن آئندہ زمانے میں اس کی آبادی بڑھتے بڑھتے بغداد تک پہنچ گئی تھی۔ سامرا کا ایک محلہ قصر جعفری بغداد سے صرف نین سو ستر (فرسخ) دور تھا۔ قصر جعفری محلہ کیا بلکہ ایک پورا شہر تھا۔ اسی جگہ بغداد کے شہنشاہ مسعود بلال کا محل تھا۔ کہنے کو تو مسعود بلال بغداد میں سلطان مسعود سلجوقی کا منیر تھا لیکن حقیقت میں وہ بغداد کا گورنر ہوتا تھا۔ بغداد کا خلیفہ مقتنی باوجود خود مختار ہونے کے بغیر شہنشاہ کی اجازت کے کوئی نیا کام نہیں کر سکتا تھا۔ 530 ہجری میں جب سلطان مسعود سلجوقی نے خلیفہ راشد کو معزول کر کے ابو عبد اللہ مقتنی کو خلیفہ بنایا تو عباسی خلیفہ کے بچے کھجے اختیارات بھی اپنے قبضے میں کر لئے۔ قصر خلافت کا تمام طوائف اور نفرتی سامان ضبط کر لیا گیا۔ خیمہ، خرگاہ اور سر آپردہ شاہی بھی جتنی سلطان نے قبضے میں لیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ عوار الخلافہ بغداد کے تمام جانوروں کو بھی بغداد سے نکلان بھیج دیا گیا۔ خلیفہ کے پاس سوائے سرکاری زمین کے اور کچھ نہیں چھوڑا گیا۔

میں۔ قصر جعفری دور ہی کتنا تھا۔ یہ لوگ دم کے دم میں شخہ کے محل پہنچ گئے۔ مسعود بلال کے محل کو دیکھ کر ابراہیم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ شخہ کا محل، سلطان مسعود سلجوقی کے ہمدان کے محل سے کسی طرح کمتر نہ تھا بلکہ محل کے اندر جو نوادرات موجود تھے ان جیسی کوئی چیز قصر سلطانی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ سلجوقی دستوں کی فوجی بیرک قصر کی پشت پر تھی۔ سامنے ایک بہت بڑا باغ تھا۔ جسے سیراب کرنے کے لئے دس میل دور سے نہر لائی گئی تھی۔ قصر میں کنیزوں اور غلاموں کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے مسعود بلال بغداد کا شخہ نہیں بلکہ خود بغداد کا خلیفہ ہے۔

شہزادے ملک شاہ کے لئے مسعود بلال کے محل کے ایک بڑے کمرے میں مسند لگائی گئی تھی۔ شہزادہ مسند پر اس انداز سے براجمان تھا جیسے وہ خود سلجوقی سلطان ہو۔ اس کے سامنے شہزادے کا یار غار اور رازداں ابراہیم بڑے ادب سے سر جھکا کے بیٹھا تھا۔ جب شہزادہ اور ابراہیم باہر ہوتے تو بے تکلف دوستوں کی طرح گفتگو کرتے تھے۔ شہزادے کو احساس تھا کہ وہ سلجوقی شہزادہ ہے بلکہ لاشعوری طور پر اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ سلجوقیوں کا اصل سلطان وہی ہے اور اس نے اپنی طرف سے سلطان مسعود کو یہ عہدہ عطا کیا ہے۔ اس لئے ہمیشہ ”مابدولت“ کا کلمہ استعمال کرتا تھا۔

”ابراہیم“ شہزادے نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”مابدولت محسوس کرتے ہیں کہ بغداد کے شخہ مسعود بلال نے ہمارے حضور پیش ہونے میں بہت تاخیر کی ہے۔ کیوں نہ اسے اس گستاخی کی سزا دی جائے۔“

ابراہیم نے دیکھا کہ شہزادے پر اپنے وقار کا دورہ پڑ رہا ہے، اس نے فوراً بات نبھال۔ ”اعلیٰ حضرت، مسعود بلال آپ کا پرانا نمک خوار اور وفادار ہے۔ ابھی کچھ ہی روز پیشتر وہ آپ کو بغدادی قہوہ خانے سے لے کر آیا ہے۔ اس نے آپ کے لئے اس حد کا انتظام کیا ہے۔ اس لئے اس کی کوتاہی اور تاخیر کو معاف فرمایا جائے۔“

”اچھا تو وہ ہمارا وفادار ہے!“ شہزادے نے قدرے حیرانگی سے کہا۔ ”خیر ہم تمہاری درخواست پر غور فرمائیں گے لیکن اسے فوراً“ حاضر ہونا چاہیے۔“

پھر ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصے بعد سلطان مسعود سلجوقی نے اپنا قاصد خلیفہ کے پاس بھیجا اور اس سے ایک لاکھ دینار کا مطالبہ کیا۔ خلیفہ اس مطالبے پر چچ پڑا۔ اس نے سلطان کو جواب لکھا۔

”تمہارا یہ مطالبہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ مسترشد تمہارے مقابلے میں جاتے وقت شاہی خزانہ ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کا بھی تمہیں علم ہے۔ اس سے جو کچھ بچ رہا تھا وہ راشد ساتھ لے گیا تھا۔ اس کا حشر بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ ان کے بعد دارالخلافہ میں صرف ساز و سامان رہ گیا تھا اس پر تم نے قبضہ کر لیا۔ نکسال، تبرکات اور زرعی آمدنی تک تم نے لے لی۔ اب میرے پاس کیا ہے جو تمہاری فرمائش پوری کی جائے۔ صرف یہی ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ دارالخلافہ تمہارے حوالے کر کے کسی طرف نکل جاؤں میں نے عہد کر رکھا ہے کہ مسلمانوں سے ایک جہ بھی ظلم و ستم سے وصول نہ کروں گا۔“

سلجوقی سلطان نے خلیفہ کا یہ جواب سن کر اسے تو چھوڑ دیا لیکن اس نے بغدادیوں کو معاف نہیں کیا اور ایک لاکھ دینار کی رقم بغداد کے صاحب جائیداد امراء اور تاجروں سے وصول کر کے چھوڑی۔ اس رقم کو حاصل کرنے کے لئے بغداد کے شخہ نے طاقت کا استعمال کیا تھا۔ شخہ کے پاس سلجوقی فوج کے کئی مضبوط دستے رہتے تھے جن کے زور پر وہ نہ صرف سلطانی احکام کی تعمیل کراتا تھا بلکہ جب اسے رقم کی ضرورت پڑتی تو سلطان کے نام پر امراء سے حسب ضرورت رقم حاصل کر لیتا تھا۔ قصر جعفری میں بہت سے سلجوقی امیر آباد ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے اپنے محلات تعمیر کرا لئے تھے۔ اسی وجہ سے یہ محلہ قصر جعفری کے علاوہ قصر سلطانی امراء کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔

بغداد کا شخہ دونوں ساتھیوں کو لئے ہوئے گلی کی دوسری طرف پہنچا۔ وہاں تین گھوڑے تیار کھڑے تھے ایک پر شخہ سوار ہوا اور باقی دو پر شہزادہ اور ابراہیم بیٹھ

آنکھیں، چمکتی پیشانی، میدے جیسی رنگت، وہ دست و بازو، وہ چال ڈھال، ہائے ابراہیم اس کا عضو عضو جیسے تراشا گیا تھا۔ ڈھالا گیا تھا۔ تم نے دیکھا ہوتا تو بس دیکھتے ہی رہ جاتے۔“

”جی ہاں خوب فرمایا آپ نے۔“ ابراہیم نے خفگی سے کہا۔ ”آپ تو میری موت چاہتے ہیں۔ آپ نے جمال کو زبانی محفل میں دیکھا تھا اگر میں وہاں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو کیا میری گردن بچ جاتی؟“

”ٹھیک ہے تمہیں وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔“ شہزادے نے نہ جانے کس رو میں کہا۔ ”وہ شاہوں کی محفل تھی۔ صرف بادشاہ وہاں جا سکتے تھے۔ ہم نے جمال کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے۔“

”عالی جاہ! آپ کو جمال کا نام کس نے بتایا تھا؟“ ابراہیم کو اک دم خیال آیا۔ ”نام کون بتاتا۔“ شہزادے نے تن کر کہا۔ ”کس کی مجال تھی کہ مابدولت کی گفتگو میں دخل دیتا۔ ہم نے خود اس ماہ پیکر سے نام پوچھا اور اس نے ہمیں اپنا نام جمال جہاں آرا بتایا تھا۔“

”اور کیا گفتگو ہوئی تھی حضور؟“

”تم بیوقوف ہو ابراہیم، ایسے موقع پر صرف دیدار کیا جاتا ہے۔ ہماری نظریں اس کے مابتلابی چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور دل تھا کہ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔“

”عالی جاہ! آپ کے بے قابو دل نے آپ کو یہ بات نہیں سمجھائی کہ جب اس کا نام پوچھنے کی جرات کی ہے تو پتہ بھی معلوم کر لے۔ آپ نے اس کے بارے میں کوئی معقول بات پوچھ لی ہوتی تو آج اس طرح دبدب نہ پھرنا پڑتا۔“

”تم نے ٹھیک کہا ابراہیم۔“ شہزادہ افسردہ ہو گیا۔ ”مابدولت کو اپنی اس غفلت پر انوس ہے۔“

شہزادہ ملک شاہ اور پری جمال، جمال کی ملاقات اتفاقہ ہوئی تھی۔ سلطان مسعود سلجوق کا پورا زمانہ شورشوں کے فرو کرنے میں گزرا مگر وہ تخت سلطنت اور میدان جنگ دونوں جگہ مبارک قدم ثابت ہوا تھا۔ کہتے ہیں سلطان مسعود بڑا ظریف الطبع فدا کر عیش و عشرت سے اسے ذرا بھی لگاؤ نہ تھا۔ تاج و رنگ سے اسے جیسے ہمیشہ کا

”ٹھیک ہے عالی جاہ! میں ابھی اسے بلواتا ہوں۔“ ابراہیم نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ”لیکن حضور، اس نے بتایا تھا کہ وہ آپ ہی کے کسی کام سے کہیں جا رہا ہے۔“

”ہمارے کام سے؟“ شہزادے کا دماغ پھر گھوم گیا۔ ”وہ حقیر انسان ہمارا کیا کام کرے گا۔ لوگوں کے کام تو ہم کرتے ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہماری سفارش ہی پر اسے بغداد کا شہنشاہ بنایا گیا تھا۔“

”غلام کو معلوم ہے عالی جاہ۔“ ابراہیم نے منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن مسعود بلال وہ کام کرنے گیا ہے جسے خود اعلیٰ حضرت نہیں کر سکتے۔“

”ابراہیم تم پاگل ہو گئے ہو۔ وہ کون سا کام ہے جسے مابدولت سرانجام نہیں دے سکتے۔ ہم نے اس دنیا میں بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ جن لوگوں نے ہمارے سامنے سر اٹھایا ہم نے اس کا سر کچل دیا۔ جس نے ہمارے حکم کی نافرمانی کی اسے ہم نے طوق و سلاسل میں جکڑ دیا۔“

”بے شک عالی جاہ کے اختیارات لامحدود ہیں۔“ ابراہیم اس وقت چڑ جایا کرتا تھا جب شہزادہ خواجواہ ڈینگیں مارنے لگتا تھا۔ اس وقت اس نے شہزادے کے جذبات پر ضرب لگائی۔ ”لیکن عالی جاہ کو اپنے دل پر اختیار نہیں اور مسعود بلال حضور کے لا علاج دل کا علاج تلاش کرنے گیا ہے۔“

”ابراہیم تم بھی گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہو۔ ہمارے دل کو کیا ہوا ہے۔ مابدولت اس قدر کمزور نہیں کہ اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکیں۔“ شہزادے نے فوراً دوسرا پہلو بدلا۔

”جی! مجھے معلوم ہے عالی جاہ۔“ ابراہیم جھلا گیا۔ ”اگر آپ کو دل پر اتنا ہی قابو ہوتا تو پہلی ہی نظر میں جمال کو دل عطا نہ کر دیتے۔ آپ نے تو میرا بھی بیڑا غرق کر دیا ہے۔ پتہ نہیں جمال کس کی بیٹی ہے۔ کس کی نہیں ہے۔ نہ کوئی پتہ نہ نشانی۔ آپ ہوا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور مجھے بھی ساتھ میں لئے لئے پھرتے ہیں۔“

”ہائے ظالم ابراہیم، تم نے کس کا نام لے لیا۔“ جمال کے نام پر شہزادہ حال سے بے حال ہو گیا۔ ”قدرت نے کیا شکل دی ہے اسے۔ دراز قامت، جھیل جیسی مہمی

پھر آخر ایک پری پیکر شہزادے کی گرفت میں آ ہی گئی۔ شہزادے نے اسے منبوطی سے پکڑ لیا۔ اس نے کلائی چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ اس نے مجبور ہو کر بڑی آس سے شہزادے کو دیکھا اور شہزادہ اس کی اس ادا پر مرعہ ریشہ عظمیٰ ہو گیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ شہزادے کے لہجے میں جوانی کی تمام حدت سمٹ آئی تھی۔
 ”میرا نام..... میرا نام جمال ہے۔“ لڑکی گڑگڑائی اور دوسری لڑکیوں نے قہقہہ بلند کر دیا۔

”جمال..... پری جمال..... ماہ جمال۔“ شہزادے پر بے خودی سی طاری ہو گئی۔
 گرفتار بلا لڑکی کو اپنی کلائی پر پکڑنے والے کی گرفت کچھ ہلکی محسوس ہوئی۔
 ”چھوڑ دیجئے مجھے۔ سلطان معظم تشریف لا رہے ہیں۔“

سلطان کے نام پر شہزادے کی گرفت ہلکی ہی نہیں پڑ گئی بلکہ خود اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ شہزادے کی بدحواسی سے لڑکی نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا کھکھلا کے ہنسی اور بھاگ کے اپنی سیلیوں میں شامل ہو گئی۔ یہ تھی شہزادے ملک شاہ اور جمال کی پہلی ملاقات۔ اس مختصر ملاقات نے شہزادے ملک کو جمال کا شیدائی بنا دیا۔ اس کے محل میں دو خوبصورت بیویاں اور کئی حسین کنیزیں موجود تھیں مگر ملک شاہ رات دن جمال ہی کا کلمہ پڑھتا اور اس کے عشق میں آہیں بھرتا۔

ابراہیم حجام اسی وقت سے شہزادے کا دوست بنا تھا۔ شہزادہ اس کے سامنے اپنا حال دل بیان کرتا اور جمال کے دوبارہ دیدار کی فرمائش کرتا تھا مگر ابراہیم کیا کر سکتا تھا۔ اپنے باپ شاہی حجام کی وجہ سے اس کی پہنچ امراء کی ڈیوڑھیوں تک تھی لیکن ڈیوڑھی سے اس کے قدم زناخانے میں نہ جا سکتے تھے۔ پھر کچھ دن بعد بغداد کا شہنشاہ بلال ہمدان گیا تو شہزادے ملک شاہ نے اس سے اپنا دکھڑا بیان کیا اور مدد کی خواہش کی۔ مسعود بلال اس کا احسان مند بھی تھا اور شہزادے کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سلجوقیوں میں نئے سلطان کے انتخاب کے وقت کسی گئے ہندو اصول کی پابندی نہ کی جاتی تھی بلکہ درباری امراء جس شہزادے یا شاہی خاندان

بیر تھا لیکن اپنی تخت نشینی کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے مناتا۔ سلطان اپنی طبیعت کے خلاف راگ و رنگ نہی محفلوں میں شرکت کرتا اور عوام کو ہر انداز سے اس جشن کو کامیاب بنانے کی اجازت تھی۔ قصر شاہی میں بھی مردانہ اور زنانہ محفلیں جہتیں۔ زنانہ محفل میں امرا اور وزراء کی مستورات شریک ہوتیں۔ زنانے طائفے پیش ہوتے اور انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر جاتے۔

اس طرح کی ایک محفل میں شہزادہ ملک شاہ بھی شریک تھا۔ شہزادہ بچپن ہی سے دل چھینک اور حسن پرست واقع ہوا تھا۔ مردانی محفل میں رقص دیکھتے دیکھتے دل گھبرا تو اس نے زناخانے کا رخ کیا۔ کنیزوں اور غلاموں نے اس کا راستہ روکنا چاہا مگر کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ شہزادے کو بتاتے کہ زناخانے میں مردوں کے جانے کی اجازت نہیں۔ پس شہزادہ شتر بے مہار کی طرح خواتین میں گھستا چلا گیا۔ نیک اور باحیا خواتین نے ایک مرد کو آتے دیکھا تو بھاگ کر ادھر ادھر چھپ گئیں۔ شہزادہ اگرچہ حسین تھا لیکن اس کی لمبی زلفیں اور بناؤ سنگھار نے اسے مرد سے زیادہ ایک خوبصورت عورت کا روپ دے دیا تھا۔ محفل کی شوخ و شنگ لڑکیوں کو شرارت سوجھی وہ شہزادے سے واقف نہ تھیں۔ انہوں نے ہر طرف سے شہزادے کے گرد گھیر ڈال لیا اور طنز و مزاح کے تیر برسانے لگیں۔ شہزادہ ملک جیسے پریوں کی محفل میں آ گیا تھا۔ اس نے حسن بے حجاب کا اتنے قریب سے پہلے نظارہ نہ کیا تھا۔ وہ حسینوں کے اس ہنگامٹ کو دیکھ کر مسرت سے پاگل ہو گیا۔

شہزادے ملک شاہ نے شاہی وقار اور اپنے مرتبے کو بالائے طاق رکھ دیا اور دوڑ دوڑ کر لڑکیوں کو پکڑنے لگا۔ لڑکیاں بھی جنگلی ہرنیوں کی طرح چوڑیاں بھرنے لگیں بڑی دیر تک یہ دھما چوڑی مچی رہی۔ شہزادے نے بہت کوشش کی لیکن کوئی دوہڑا اس کے ہاتھ نہ آ سکی۔ کونے کھدروں میں چھپی ہوئی خواتین اس بے ہنگم بھاگ دوڑ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ دوہڑائیں ایسی شریر تھیں کہ کوئی شہزادے کو جنگی کاٹ کے بھاگتی تو کوئی اس کے پہلو میں گدگدی کر کے ہوا ہو جاتی۔ ایک شوخ لڑکی نے تو شہزادے کے سر پر ایک ہلکی سی چپت بھی رسید کر دی مگر شہزادہ تھا کہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ لڑکیوں کے اس مذاق کو وہ دل لگی سمجھ رہا تھا۔

ہائے۔ وہ ایک بغدادی امیر کی لڑکی تھی اور مسعود بلال کے اس امیر سے کچھ زیادہ مرام بھی نہ تھے۔ بغداد کا خلیفہ مقتنی اور اس کے امیر مسعود بلال کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔ بغداد کا شہنشاہ ہونے کی وجہ سے بغداد کے امراء مسعود بلال کا احترام کرنے پر مجبور تھے لیکن ان کا دل صاف نہ تھا۔

مسعود بلال اسی ادھیڑ میں بھاگا بھاگا پھر رہا تھا مگر کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ ادھر شہزادہ اس کی غیر حاضری پر بگڑ رہا تھا۔ پھر جب مسعود بلال تمام دن کوشش کرنے کے بعد شہزادے کے پاس پہنچا تو وہ اسے دیکھتے ہی برس پڑا۔

”مسعود بلال! کیا تم نے مابدولت کو بغداد بلا کر قید تنہائی کے عذاب میں مبتلا کیا ہے۔“ شہزادے ملک شاہ نے بڑے غصے سے کہا۔ ”ہم بغداد یا تمہارے محل کو دیکھنے نہیں آئے ہیں۔ تم کہاں غائب ہو گئے تھے اور صبح سے اب تک ہمارے سامنے کیوں نہیں آئے؟“

”شہزادے بہادر!“ مسعود بلال نرمی سے بولا۔ ”میں اسی کام کے سلسلے میں گیا تھا اس کے لئے میں نے آپ کو ہمدان سے آنے کی تکلیف دی ہے۔ میں نے آج اس کے باپ سے ملاقات کی ہے۔“

”تم کس کے باپ سے ملاقات کرنے گئے تھے۔ ہم نے تمہیں کسی سے ملنے کا علم نہیں دیا تھا۔“ شہزادہ اپنی رو میں کھتا چلا جا رہا تھا۔ ہمیں بغداد آئے دوسرا دن ہے اور تم نے ہمارا کوئی کام نہیں کیا۔“

”وہی تو عرض کر رہا ہوں شہزادے بہادر۔“ مسعود بلال نے سمجھایا۔ ”میں اس نذر عمر کے والد بزرگوار سے ملنے گیا تھا جس کی یاد آپ کو بے چین کئے ہوئے ہے۔“

شہزادے نے چونک کر مسعود بلال کو دیکھا۔ ”کیا تم ہماری جان آرزو جمال کا ذکر کر رہے ہو؟“

”جی حضور! میں اس کے گھر کا چکر لگا کے آ رہا ہوں۔“ مسعود بلال نے جیسے لال کے کہا۔

”تم عجیب احسن انسان ہو مسعود بلال، پہلے ہی کیوں نہیں کہا کہ تم جمال سے ملنے

کے رکن کو چاہتے سلطان بنا دیتے تھے۔ موجودہ سلطان مسعود سلجوقی کی ابھی زیادہ عمر نہ تھی لیکن وہ کسی وقت معزول کیا جاسکتا تھا۔ پھر نئے سلطان کے انتخاب کے وقت شہزادے ملک شاہ کے نام پر بھی غور ہو سکتا تھا چونکہ شہزادہ نہایت کمزور طبیعت اور عیش و عشرت کا رسیا تھا اس لئے اس کے انتخاب کا بھی زیادہ امکان تھا۔ امراء کی بیعت یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایسے شہزادے کو سلطان بنایا جائے جو ان کے قابو میں رہ سکے۔ ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے مسعود بلال نے شہزادے سے ”جمال“ کے تلاش کرنے اور اسے اس کی محل کی زینت بنانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مسعود بلال اپنے وعدے میں پر خلوص بھی تھا اسے ”جمال“ کے بارے میں کوئی علم نہ تھا لیکن اس نے اپنے وعدے کے مطابق ”جمال“ نامی حسینہ کی تلاش شروع کر دی۔ اس نے ہمدان میں ایسی عورتوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ جو امراء کے گھروں میں جاسکتی تھیں۔ ان عورتوں نے گھر گھر کے چکر لگائے تھے مگر اس نام کی کوئی حسینہ ہمدان کے کسی گھر میں نہ مل سکی تھی۔ اس کوشش سے مسعود بلال نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ملک شاہ کی محبوبہ ہمدان کے کسی گھر سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ اب دوسرا اور سب سے بڑا شہر بغداد تھا۔ مسعود بلال نے بغداد میں بھی ایسی عورتیں چھوڑ رکھی تھیں۔

گذشتہ سال مسعود بلال کو ایک عورت نے بتایا تھا کہ جمال نام کی ایک مہ جبین بغداد میں موجود ہے مگر اس کا تعلق کسی امیر گھرانے سے نہیں بلکہ وہ بغداد کی ایک مشہور رقاصہ ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے شناخت کون کرے۔ مسعود بلال کو اس کا بہترین طریقہ یہی سوچا تھا کہ وہ شہزادے کو بغداد بلا کے ”جمال“ کو دکھائے، اس نے فوراً ایک قاصد شہزادے کے پاس بھیجا تھا اور جواب میں شہزادہ خود ابراہیم کو ساتھ لے کر بغداد پہنچ گیا تھا لیکن جب ”جمال“ کو شہزادے کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے فوراً ”کہہ دیا کہ یہ وہ جمال نہیں جس کی تصویر اس کے دل میں بسی ہوئی ہے۔“

اس سال پھر مسعود بلال کو جمال نام کی ایک دوشیزہ کی خبر ملی تھی۔ یہ جمال دوبار خلافت کے ایک امیر کی ناکھدا بیٹی تھی اور بتانے والی نے بتایا تھا کہ وہ سراپا جمال ہے اور ایک دوبار ہمدان بھی ہو آئی ہے۔ اس امید پر مسعود بلال نے شہزادے کو ایک بار پھر بغداد بلوایا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ جمال کو شہزادے کے سامنے کس طرح پیش کیا

ابراہیم اور مسعود بلال کو شہزادے کے حال پر افسوس ہوا۔

”شہزادے! آپ ہمارے آقا ہیں۔“ مسعود بلال نے اس کی دلجوئی کی۔ ”آقا

اپنے غلاموں کو معاف کرتے ہیں ان سے معافی نہیں مانگا کرتے۔“

شہزادے کی باچھیں کھل گئیں۔ ”تم بہت عقل مند ہو مسعود بلال۔ جب ہم

ملتان ملک شاہ بنیں گے تو تمہیں اپنا وزیر اعظم مقرر کریں گے۔“

”آمین، آمین۔“ ابراہیم نے ہنس کر کہا۔ ”اور عالی جاہ سلطان ہونے کے بعد

اس خادم کو کونسا عمدہ عطا فرمائیں گے۔“

شہزادے ملک شاہ کو اس وقت کچھ زیادہ ہی عقل آگئی تھی۔ وہ زور سے ہنسا۔

”مسعود بلال جس قدر عقل مند ہے۔ ابراہیم تم اتنے ہی بے وقوف ہو۔ ارے احمق

جب مسعود بلال ہمارا وزیر اعظم بنے گا تو بغداد کا شہنشاہ کا عمدہ خالی ہو گا۔ اس عمدے

کے لئے تم سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”خدا آپ کی زبان مبارک کرے اور وہ دن جلد آئے۔ جب مسعود بلال

وزیر اعظم اور میں بغداد کا شہنشاہ بنوں۔“ ابراہیم نے اتنے خلوص سے کہا جیسے وہ واقعی

بغداد کا شہنشاہ بن گیا ہے۔

”ہاں مسعود بلال، تمہاری جمال کے والد سے کیا بات ہوئی۔“ شہزادے کو ایک

دہشت یاد آگئی اور وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”شہزادے بہادر! میں نے ان سے کہا ہے کہ اگلی جمعرات کو میری بیٹی کی آٹھویں

سالگرہ ہے۔“ مسعود بلال نے اپنی ترکیب کی تفصیل شروع کی۔ ”یہ کہنے کے بعد میں

نے اسے معہ اہل و عیال کے اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی اور دعوت اس

کے قبول بھی کر لی ہے۔“

”واہ امیر! آپ نے کیا جلال پھیکا ہے۔ پرندہ بھسنے اور بھسنے۔“ ابراہیم نے

اپنے معیار کا عامیانہ محاورہ استعمال کیا۔

”مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ امیر اپنی بیٹی کو ساتھ لے کر نہ آئے۔“ شہزادہ اپنے

لہجہ پر بڑی دور کی کوڑی لایا۔

”اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس محل میں آگ لگ جائے اور ہم سب اس میں

گئے تھے۔“ مسعود بلال کو شہزادے کا یہ تلخ جملہ بہت ناگوار گزرا۔ اسے غصہ بھی آیا مگر مصلحتاً پی گیا۔

”شہزادے بہادر! میں نے جمال سے نہیں اس کے باپ سے ملاقات کی ہے۔“

”چلو اس کے باپ سے سہی۔ تمہاری ملاقات تو ہو گئی۔ کیا کہا ہے اس نے؟“

شہزادہ بے چین ہو گیا۔

”میں نے ایک تدبیر کی ہے۔ امید ہے کہ مجھے کامیابی ہو گی۔“ مسعود بلال۔

اپنی طرف سے خوش خبری سنائی۔

شہزادے نے غصے سے مسعود بلال کو گھورا۔ ”تدبیر اور کامیابی کے کیا معنی۔“

نے اس کے باپ کو ہماری طرف سے حکم دیا ہوتا کہ وہ جمال کو ساتھ لے کر فوراً

ہماری قدم بوسی کو حاضر ہو۔“

ابراہیم اب تک خاموش تھا مگر شہزادے کی بات پر جل گیا۔

”عالی جاہ! یہ ہمدان نہیں بغداد ہے۔ یہاں آپ کے چچا کی حکومت نہیں۔ ار

ملک کا بادشاہ بغداد کا خلیفہ مقتدی ہے۔“

شہزادہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ مسعود بلال نے دخل دیا۔ ”شہزادے بہادر! ابراہ

ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جمال کا باپ بغداد کے خلیفہ کا ایک معتمد امیر ہے۔ اس پر میرا

نہیں چلتا۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے۔ آپ ہمارے عالی جاہ ہیں۔ بادشاہ ہیں۔ خد

وہ دن دکھائے کہ آپ سلجوقی تخت و تاج کے مالک بنیں۔ پھر جمال کا باپ کیا بغداد

خلیفہ بھی آپ کا حکم مانے گا۔“

”یہی بات میں شہزادے کو روز سمجھاتا ہوں۔“ ابراہیم نے بھی جلتے پھولے

پھوڑے۔ ”لاکھ بار کہا کہ ابھی آپ شہزادے ہیں۔ مگر یہ ”مابدولت“ کے تخت سے

نیچے نہیں اترتے اور عالی جاہ اور اعلیٰ حضرت سے کم کی بات نہیں کرتے۔“

مسعود بلال اور ابراہیم نے جب شہزادے پر یکے بعد دیگر طعن کے حملے کئے تو

شہزادے کی عقل کچھ ٹھکانے آئی۔ فوراً ”سنجھل“ کے بولے۔ ”ہم نے تو بس بونہی کہ

دیا تھا۔ امید ہے کہ جس طرح ہم تمہیں معاف کرتے ہیں اسی طرح تم ہمیں بھی

معاف کر دو گے۔“

جہرات کو مسعود بلال نے واقعی ایسا جشن کیا کہ بغداد کے امراء حیران رہ گئے۔ اس تقریب میں مسعود بلال نے خلیفہ مقتنی کو بھی مدعو کیا تھا۔ اس نے دربار خلافت میں حاضر ہو کر خلیفہ سے شرکت کی درخواست کی مگر خلیفہ نے ناسازی طبع کا بہانہ کر دیا۔ ایک تو خلیفہ کا اس کی طرف سے دل صاف نہ تھا دوسرے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ سلجوقی شہنشاہ اور بغداد میں مقیم دوسرے سلجوقی امراء اپنی محفلوں میں اکثر شراب کا استعمال کرتے ہیں۔ خلیفہ مقتنی شراب نوشی کے سخت خلاف تھا۔ اس نے اس کی سخت سے ممانعت کر رکھی تھی مگر مسعود بلال اور سلجوقی امراء پر اس کا زور نہ چلتا تھا۔

بغداد کے امراء اگرچہ مسعود بلال کو ناپسند کرتے تھے مگر مسعود بلال سلجوقی سلطان کا بغداد میں نائب تھا۔ اس لئے تمام امراء اس سے خوف کھاتے تھے۔ مسعود بلال کی دعوت پر ان سب نے اس جشن میں شرکت کی۔ انہیں اس تقریب کے پس منظر کا علم نہ تھا چونکہ مسعود بلال نقد رقم اور تحائف جمع کرنے کے لئے بغدادی امراء کی کسی نہ کسی بہانے اکثر دعوتیں کیا کرتا تھا۔ اس لئے انہیں خیال تھا کہ شہنشاہ ان سے بیٹی کی مالگہ کے بہانے کچھ انشعنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ حسب حیثیت تیار ہو کر آئے تھے اور انہوں نے بڑھ چڑھ کر قیمتی تحائف اور نقد رقم مسعود بلال کی نذر کی۔ مسعود بلال کے لئے یہ تقریب واقعی ایک پختہ دو کاج بن گئی تھی۔ ایک طرف امراء سے دولت کا حصول دوسری طرف شہزادے ملک شاہ کی خوشنودی۔ وہ فائدے ہی فائدے میں تھا۔

مسعود بلال نے شہزادے اور ابراہیم کو اپنے محل کے بالائی حصے میں ایک ایسی جگہ بٹھا دیا تھا جہاں سے محل کی وہ ڈیوڑھی صاف نظر آتی تھی جہاں امراء کی بیگمات سواریوں سے اتر کر زناخانے میں داخل ہوتی تھیں۔ مسعود بلال نے ایک ایسی عورت کا بھی انتظام کیا تھا جو بغداد کی تمام امراء کی بیگمات اور ان کی لڑکیوں کے نام جانتی تھی۔ اس عورت کے ساتھ مسعود بلال دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا جہاں سے اس کا شہزادے سے رابطہ تھا۔ بیگمات کی آمد شروع ہوئی تو یہ لوگ ہوشیار ہو کے بیٹھ گئے۔ جب کوئی بیگم سواری سے اترتی تو مسعود بلال کے پاس بیٹھی ہوئی عورت اس کا اور اس کے شوہر یا باپ کا نام اتنی زور سے بتاتی کہ آواز شہزادے کے کانوں تک پہنچ جاتی۔ مسعود بلال پکارے جانے والے نام پر شہزادے کی طرف دیکھتا اور شہزادہ نفی میں

جل کے بھسم ہو جائیں۔“ ابراہیم نے جیسے تنگ آ کے کہا۔

”تیرے منہ میں خاک نمک حرام۔“ شہزادے کو تاؤ آ گیا۔ ”اتنی اچھی باتوں پر تو جلنے مرنے کا ذکر لے بیٹھا۔“

”شہزادے بہادر! آپ بھی تو اتنی اچھی باتوں میں کیرے ڈالنے لگے۔“ ابراہیم اس گستاخی نے مسعود بلال کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ شاہی حجام کا یہ بیٹا شہزادے ملک شاہ کا بہت منہ چڑھا ہے اور اگر اسے واقعی کوئی عمدہ دیا گیا تو یہ اس کا بیزار غرور کر دے گا۔

”ابراہیم تمہیں ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے۔“ مسعود بلال نے ذرا سنبھل کر سخت لہجہ اختیار کیا۔ ”کیا ہونے والا ہے اس کا حال تو وہ عالم الغیب ہی جانتا ہے۔ بہر حال میں کوشش کروں گا کہ امیر اپنی بیٹی کو ساتھ لائے۔ تمہیں صرف یہ دعا کرنا چاہیے کہ یہ دو شیزہ وہی جمال ہو جو شہزادے بہادر کی محبوب اور مطلوب ہے۔“

”اس لئے مابدولت تمہیں عقلمند کہتے ہیں مسعود بلال“ شہزادہ خوش ہو گیا۔ ”اپنی کوشش جاری رکھو ہماری تقدیر میں جو ہے وہ سامنے آ جائے گا۔“

ابراہیم نے دیکھا کہ شہزادہ اور مسعود بلال ایک زبان ہو گئے ہیں۔ اس لئے اسے بڑی پریشانی ہوئی۔ شہزادے کا مقرب خاص تو وہ تھا پھر مسعود بلال کا جھنڈا کیوں اونٹ ہونے دیتا۔ وہ فوراً سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ”عالی جاہ! میرا دل کتا ہے کہ آپ یہ کام بھی میرے ہی ہاتھوں سرانجام پائے گا۔ مسعود بلال کو کوشش کر لینے دیجئے پھر میدان میں میں آؤں گا اور اگر آپ کی محبوبہ پاتال میں بھی چھپی بیٹھی ہے تو میں اسے ڈھونڈ کے آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ مل جائے۔“

”مابدولت کو تم سے ایسی ہی امید ہے۔“ شہزادہ فوراً ابراہیم کی طرف ہو گیا۔

مسعود بلال کو شہزادے کی یہ دو عملی بہت ناگوار گزری مگر وہ طرح دے گیا۔



مقرر کیا ہے۔ آپ جس کام میں ہاتھ ڈالیں اس میں کامیاب کیوں نہ ہوں۔“
”بے شک، بے شک ابراہیم تم نے سچ کہا۔“ شہزادہ مسرت سے بولا۔ ”مبادولت

مسعود بلال کی فراست اور وفاداری کے قائل ہیں۔“
”اب فرمائیے شہزادے بہادر اس سلسلے میں ہمارا آئندہ قدم کیا ہونا چاہیے؟“
بلال نے شہزادے کو ٹھلا۔ ”جمال ایک امیر کی بیٹی ہے اور اسے حاصل کرنے
لئے خلیفہ بغداد کی اجازت ضروری ہوگی۔“

شہزادے کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے ابراہیم کو
ما۔ ابراہیم اس کا مطلب سمجھ گیا اور آہستہ سے بولا۔

”اے سلطانی امیر! آپ بغداد کے شہنشاہ ہیں۔ اس معاملے کو آپ خود ہی سلجھا
ہیں۔ اگر آپ شہزادے بہادر کے لئے خلیفہ سے جمال کا رشتہ مانگیں تو میرا خیال
کہ وہ انکار نہ کر سکیں گے۔“

”ہاں یہ بات ٹھیک ہے مسعود بلال۔“ شہزادے کو سہارا ملا۔ تو اس نے بھی زبان
بلا۔ ”تم خلیفہ سے بات کرو۔ اگر وہ انکار کریں تو میں چچا سلطان مسعود سے ان کا
ٹھیک کرا دوں گا۔“

”شہزادے بہادر۔ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نکل آئے تو پھر جھگڑا کرنے کی کیا
دراہت ہے۔“ مسعود بلال نے نرمی سے سمجھایا۔ ”مجھے خلیفہ سے گفتگو کرنے میں
لی تباہت نہیں لیکن ان کے اور میرے درمیان شکر رنجی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ
کام بگڑ جائے۔“

”میر آپ اس کی فکر نہ کریں۔“ ابراہیم نے فوراً اپنی ٹانگ اڑائی۔ اگر آپ کو
بغداد کے پاس جانے میں تکلف ہے تو یہ فرض میں ادا کرنے کو تیار ہوں۔ شہزادے
کا پیغام لے کر میں جاؤں گا۔“

”ابراہیم تم اپنی اوقات میں رہا کرو۔“ مسعود بلال نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”شہزادے
اور سلطانی سلطان کے بھتیجے ہیں۔ رشتے کا پیغام سلطان کی طرف سے جانا چاہیے۔“
”یہ تو بڑا مشکل کام ہے مسعود بلال۔“ شہزادہ گھبرا گیا۔ ”اگر سلطان نے انکار کر
لے گا تو کیا ہو گا؟“

گردن ہلا دیتا۔

دو گھنٹے تک بیگمات کے آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس میں جمال نام کی کئی
خواتین آئیں مگر شہزادہ ہر نام پر بے دلی سے نفی میں سر ہلاتا رہا۔ یہاں تک کہ بیگمات
کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا۔ مسعود بلال بدظن سا ہو گیا۔ پھر ٹھیک اسی وقت ایک
سواری ڈیوڑھی میں رکی اور اس میں سے دو عورتیں برآمد ہوئیں۔ ایک ادھیڑ عمر اور
دوسری جوان بلکہ نوجوان۔ مسعود بلال مایوس ہو کر عورت سے باتیں کرنے میں
مصروف ہو گیا تھا مگر شہزادہ شاید اب تک اس لگائے بیٹھا تھا۔ شہزادے ملک شاہ کی
نظر جیسے ہی جوان لڑکی پر پڑی وہ ”جمال۔ جمال۔“ کہتا ہوں کھڑا ہو گیا۔

مسعود بلال نے گھبرا کے شہزادے کو دیکھا۔ شہزادہ خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا۔
”مسعود بلال! یہی ہے جمال۔ میری جمال۔ میری آرزو میری تمنا۔“

مسعود بلال نے شہزادے کو صبر کرنے کا اشارہ کیا۔ پھر عورت سے باتیں کرنے
لگا۔ تجربہ کار عورت نے نہ صرف ”جمال“ کے نام کی تصدیق کی بلکہ اس کا پورا
خاندانی شجرہ مسعود بلال کو سنا اور سمجھا دیا۔ مسعود بلال کو اپنی اس کامیابی پر بہت خوشی
ہوئی۔ اس نے عورت کو رازداری کی تاکید کی اور انعام دے کر رخصت کر دیا۔ پھر وہ
مبسمکراتا ہوا شہزادے کے پاس آیا۔ شہزادہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔

”تم نے دیکھا مسعود بلال ہماری جمال کتنی حسین ہے۔۔۔۔۔؟ خوشی کے مارے
شہزادے کی زبان سے الفاظ نہ نکل رہے تھے۔“

”میں شہزادے بہادر کے انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ واقعی آپ کی پسند ہزاروں میں
ایک ہے۔“ مسعود بلال نے شہزادے کی تائید کی۔ ”مجھے دھہری خوشی ہوئی ہے۔
شہزادے بہادر ایک تو آپ نے اپنے محبوب کا دیدار کر لیا۔ دوسرے مجھے اپنی خوشی
کا پھل مل گیا۔ وہ میرا جو آپ کی آنکھوں سے پوشیدہ تھا۔ اسے میں نے ڈھونڈ
نکالا۔“ پھر ایک لمحہ رک کر مسعود بلال نے طنزیہ انداز میں ابراہیم کی طرف دیکھا۔
”کیوں ابراہیم! تمہارا کیا خیال ہے۔ میں کامیاب ہو گیا ہوں نا؟“

”یہ تو میں پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔“
ابراہیم نے فوراً اپنا رخ بدلا۔ ”عالی جاہ سلطان نے اسی وجہ سے تو آپ کو بغداد

پیش نظر شہزادے نے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کی۔

مسعود بلال تو ہمدان چلا گیا مگر اس کی عدم موجودگی میں اس عورت نے جسے مسعود بلال نے بیگمات کی شناخت کے لئے بلوایا تھا۔ ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا۔ اس وقت کو مسعود بلال کے محل ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ تقریب محض ”جمال“ کو رکمانے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ اسے یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ مسعود بلال نے یہ کام کس کے لئے کیا تھا مگر یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ جس شخص نے ”جمال جمال“ کی آواز بلند کی تھی وہ اگرچہ ظاہر طور پر نیم پاگل معلوم ہوتا تھا۔ مگر تھا کوئی اہم آدمی جس کے لئے مسعود بلال نے اتنی بڑی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔

دوسرے دن وہ عورت پیکر جمال کے گھر پہنچی عباسی امیر یعنی جمال کا باپ گھر پر ہرگز نہ تھا۔ اس فتنہ پرور عورت نے یہ موقع غنیمت جانا اور جمال سے یہ جھگڑا لے لیا۔

”اے بیٹی جمال! اللہ رکھے تم خوبصورت اور چندے آفتاب چندے ماہتاب ہو مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہر ایرا غیرا تمہارا نام لے لے کر نعرے لگاتا رہے۔ فائدہ کرے اس سے تو تم بدنام ہو جاؤ گی۔“ اس شیطان کی خالہ نے ایک ہی زبان لیا کی شوشے چھوڑ دیئے۔

جمال کا رنگ اڑ گیا۔ جوان لڑکی یوں بھی بدنامی سے گھبراتی ہے۔ ”خالہ کیا کہہ لای ہو۔ کون میرے نام کے نعرے لگاتا ہے۔ قسم لے لو۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔“

”لے بیٹی۔ میں تجھ پر کب الزام دھر رہی ہوں؟“ خالہ آگ کی پرکالہ نے جمال کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”خدا تجھے خضر کی عمر دے اور تیرا شباب ہمیشہ برقرار رکھے۔ تجھے تو غصہ اس شخص پر آ رہا ہے۔ اس کج بخت کو کیا سوچھی جو تجھے دیکھنے کے لئے اتنا ہانک رہا ہے۔“

جمال ہکا بکا اس کا منہ دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ کئی وقت جمال کی ماں بھی دوسرے کمرے سے آگئی اور خالہ آفت کی پرکالہ، جمال کو بلانے کے لئے اس سے مخاطب ہو گئی۔

”دیکھو امیر بیگم! یہ شریفوں کا طریقہ نہیں کہ پرانی ہو بیٹیوں کی ناک جھانک

”شہزادے بہادر دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ مسعود بلال نے تسلی دی ”آپ کوئی خلیفہ کے گھر رشتہ تو نہیں مانگ رہے کہ سلطان اعتراض کریں۔ سلطان آپ کی ذاتی زندگی میں بالکل دخل نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں ایک عبا امیر کی بیٹی سے آپ کا رشتہ ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے مسعود لیکن اس کے لئے ہمیں پھر ہمدان جانا پڑے گا۔ شہزادے نے برا سامنہ بنایا۔

”آپ کو وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام آپ کا غلام کرے گا۔“ مسعود بلال نے اپنی خدمات پیش کیں۔

”تم..... تم سلطان سے اجازت لینے جاؤ گے؟“ شہزادے نے اسے تعجب سے دیکھا۔

”شہزادے بہادر! میں آپ کا اس لئے وفادار نہیں ہوں کہ آپ ایک سلجوقی شہزادے ہیں بلکہ میرے خلوص اور تعاون کی اصل وجہ یہ ہے کہ آپ میرے محرم ہیں۔ آپ ہی کے طفیل میں آج اس عہدے پر سرفراز ہوں۔ یہ تو ایک معمولی سا کام ہے، خدا نخواستہ کوئی وقت پڑا تو میں آپ پر اپنی جان تک نچھاور کر دوں گا.....؟“

”مسعود بلال اسی وجہ سے تو مابدولت کہتے ہیں کہ آپ جیسا عقل مند اور وفادار امیر پوری سلطنت سلجوقیہ میں موجود نہیں۔“ ابراہیم نے بڑی شوقی سے شہزادے کی بات قطع کر کے اسے اپنی طرف سے پورا کیا۔

مسعود بلال اور شہزادے کو ابراہیم کی شوقی پر ہنسی آگئی۔ شہزادہ تو قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ مسعود بلال اسی دن ہمدان روانہ ہو گیا اس نے چلتے وقت اپنے غلام خاص کے ذریعے خلیفہ کو مطلع کرا دیا کہ وہ سلطان مسعود سلجوقی کی طلبی پر کچھ دن کے لئے ہمدان جا رہا ہے۔ ادھر ابراہیم اور شہزادے نے اپنے کو مسعود بلال کے محل میں قید کر لیا۔ مسعود بلال انہیں سمجھا گیا تھا کہ وہ محل سے باہر ہرگز قدم نہ رکھیں تاکہ باہر والوں کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ کوئی سلجوقی شہزادہ بغداد آیا ہوا ہے۔ شہزادے کا بغداد گھومنے کو بہت دل چاہتا تھا مگر مسعود بلال نے جس انداز سے اسے تاکید کی تھی اس

کریں۔“

”ہاں ہاں اس موئے نے تو یہ بکھڑا کھڑا کیا ہے۔“ خالہ کا لہجہ ترش ہو گیا۔ ”نہ پر زادی جمال کو لے کر اس کی بیٹی کی سالگرہ میں جاتیں نہ یہ فتنہ اٹھتا۔“ جمال کی ماں کے پیر تلتے سے زمین نکل گئی۔ انہوں نے گھور کے بیٹی کو دیکھا۔ اس کے رہ گئی۔ وہ ماں کی تیز نظروں کی تاب نہ لا سکی اور سر جھکا لیا۔ ”خالہ! کیا کیا تھا جمال نے وہاں۔ میں تو سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔“ کی ماں نے ڈرتے ڈرتے کہا اور پھر دل ہی دل میں عزت و آبرو کے لئے دعائیں گئیں۔

”اے واہ امیر بیگم!“ خالہ ہاتھ چلا کے بولیں۔ ”میری بیٹی جمال تو خٹم سے زیادہ صاف ہے۔ اس بے چاری کی کیا خطا۔ اس کو تو کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوئی۔ بری اتفاق سے نظر پڑ گئی اور بس میں نے ایک ہی نظر میں سب کچھ بھانپ

”خالہ خدا کے لئے ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ تم نے تو سارا خون خشک کر دیا۔“ جمال نے بڑی بے بسی سے کہا۔

”اے کتنا کیا امیر بیگم۔“ پھر خالہ نے ننکیوں سے جمال کو دیکھا جو بے چاری دم بھری تھی۔

”ہال! تم اندر جاؤ۔“ خالہ کا اشارہ سمجھ کے جمال کی ماں نے اسے اندر بھیج دیا یہ نظروں سے خالہ کو دیکھا۔ ان کا دل بری طرح ہول رہا تھا مگر خالہ چپا چپا کے لری تھیں۔

”امیر بیگم! یہ جو اپنا شخنہ ہے ناں۔ وہی مسعود بلال۔ مجھے تو بد معاش لنگھا معلوم ہے۔ اس دن سالگرہ میں وہ ایک جھروکے میں جا بیٹھا تھا اور ڈیوڑھی میں اترنے بیگم کو گھور گھور کے دیکھ رہا تھا۔ چلو یہاں تک غنیمت تھا مگر اس نے اپنے کچھ بھی وہاں بلائے تھے اور وہ سب کے سب بیگمات کو جھانک جھانک کے، کہہ تے۔ بھلا بتاؤ تم۔ یہ بھی کوئی شرافت ہے؟“ اور خالہ نے رک کے جواب کے ل کی ماں کو دیکھا۔

”مال کی ماں سلت کے رہ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ خالہ کا منہ نوچ لے۔“ پھر کیا

”کیا ہوا خالہ۔“ جمال کی ماں بھی گھبرا گئی۔ ”تم کس کا ذکر کر رہی ہو۔ کس نے جھانکا۔ کس نے تاکا۔ صاف صاف بتاؤ ایسے لوگ شریف نہیں کہیں ہوتے ہیں۔“ ”بالکل سچ امیر بیگم“ جگ خالہ سنبھل کر بولی۔ ”تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔“ میں بھی تو یہی کہوں کہ تاک جھانک کرنے والے شریف زادے نہیں کہیں زادے ہوتے ہیں۔“

”خالہ کچھ بتاؤ تو۔ تم کس کہیں اور کس شریف کا ذکر کر رہی ہو؟“ جمال کی ماں کو الجھن ہونے لگی۔

”ارے وہی بیگم کیا نام ہے اس کا ہاں مسعود بلال۔ بغداد کا شخنہ بنا پھرتا ہے اور کر توت ایسے۔“ اور خالہ نے اس طرح زمین پر تھوکا جیسے مسعود بلال کا نام لیتے ہوئے اس کا منہ کڑوا ہو گیا ہو۔

”خالہ! کیا ابھی ابھی باتیں کر رہی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتیں؟“ جمال کی ماں گھر گھر پھرنے والی اس خالہ پر کالہ کو خوب جانتی تھی۔ ”میں لگی لپٹی باتیں سننے کی عادی نہیں۔ دو ٹوک بات کو ورنہ اپنا رستہ ٹاپو۔“

”امیر بیگم! میں تو اپنا سمجھ کے تمہارے پاس آئی تھی اور تم بچے جھاڑ کے میرے پیچھے پڑ گئیں۔ واہ رے اللہ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ نہیں سنتیں تو نہ سنو۔ لو میں چلی گھر مگر یہ سمجھ لو کہ ایسی بدنامی ہو گی کہ گلی گلی تھڑی تھڑی سچ جائے گی۔ کنواری بیٹی کچا شیشہ ہوتی ہے۔“ اور خالہ نے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

”کنواری بیٹی۔“ جمال کی ماں زیر لب بولی اور اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ ”ارے سنو تو خالہ۔“ وہ لپک کے خالہ کے پاس پہنچ گئی۔ ”ارے تم تو ناراض ہو گئیں۔“ جمال کی ماں خالہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس لے آئی۔

”امیر بیگم!“ خالہ پھر شروع ہو گئیں۔ ”جیسی تمہاری بیٹی ویسی میری۔ یہی سمجھ کے میں آئی تھی مگر تمہیں جو ان جہان بیٹی کو شخنہ کے گھر لے کے نہیں جانا چاہیے تھا۔“

”خالہ! تم بغداد کے شخنہ امیر مسعود بلال کا ذکر کر رہی ہو۔“

سے موڈ میں تھے۔ ”چلے اگر آپ کا اور اس کا سامنا ہو بھی گیا تو آپ کی صورت میں کون سے لعل نکلے تھے جو اس نے اکھاڑ لئے۔؟“

”خدا کے لئے کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کیجئے۔“ بیوی نے تیز نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ ”یہ بات نہیں میں اڑانے کی نہیں۔ اس کا تعلق آپ کی لاڈلی جمال سے ہے۔ یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔“

جمال کے باپ کا سر گھوم گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کے بیوی کو دیکھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو تم۔ جمال نے کیا کیا ہے۔؟“

”جمال نے تو کچھ نہیں کیا۔“ بیوی سنبھل کے بولی۔ ”مگر شخص نے سالگرہ کی یہ قرب اس لئے کی تھی کہ وہ بغداد کے امیروں کی بیگمات کو اپنے محل میں بلا کے اپنے دوستوں کو ان کا دیدار کرائے۔“

”کیسی بے نیکی بات کہہ رہی ہو بیگم۔“ امیر نے جھلا کر کہا۔ ”جھلا مسعود بلال کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ تقریب کے دن مسعود کے دوست بھی محل میں موجود ہوں اور ان میں سے کسی نے تمہیں یا کسی اور بیگم کو اذیت دیکھ لیا ہو۔ یہ تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ خوشی کے موقعوں پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔“

”ہو نہیں جاتا ہے بلکہ ایسا کیا گیا ہے۔“ بیوی نے بھی تنہی سے جواب دیا۔ ”میری بات کا یقین نہیں ہے تو پوچھ لو خالہ سے۔ انہوں نے سب کچھ دیکھا اور سنا ہے۔“

”ہاں، امیر بیگم صحیح کہہ رہی ہیں۔“ خالہ نے فوراً بیگم کی حمایت کی۔ ”مجھے جس ات ساری حقیقت معلوم ہوئی میں یہاں دوڑی چلی آئی۔“

اس کے بعد خالہ نے جو کچھ دیکھا سنا تھا اس میں نمک مرچ لگا کے جمال کے لہجہ کو سنا دیا اور کچھ اس انداز سے بیان کیا کہ جمال کے باپ کو یقین کرنا پڑا۔

”خالہ! یہ تو بہت برا ہوا۔“ جمال کا باپ بڑا فکر مند تھا۔ ”اس بات کو تو میں غلط نہ سمجھتا تھا۔“ خالہ تمہیں خلیفہ کے سامنے گواہی دینا ہو گی۔“

خلیفہ کا نام سن کر خالہ کو ہلکے لگ گئے مگر بڑا کے بولیں۔ ”امیر! اگر آپ مجھے اہل خلافت میں کھینچنا چاہتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ مگر یہ بیٹی کا معاملہ ہے۔ منہ سے

ہوا کچھ آگے بھی تو کسو؟“ جمال کی ماں نے خالہ کو پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا۔ خالہ نے ان کی بات پر ذرا بھی توجہ نہ کی اور اپنی رو میں بولی۔ ”پھر جب تم اور اپنی بیٹی جمال کے ساتھ سواری سے اتریں تو شخصہ کے ایک دوست نے جمال، محل کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔“

”کون تھا وہ۔ میں اس کا خون پی لوں گی؟“ جمال کی ماں کا پارہ اک دم چڑھ گیا۔ ”میں کیا جانوں کون تھا وہ مگر اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے بیٹی محل کو پہلے بھی دیکھا ہے۔“

”یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا خالہ؟“ جمال کی ماں کی تیوریوں پر ہل پڑ گئے۔

”امیر بیگم! وہ کہہ رہا تھا کہ ہا ہا میں نے پہچان لیا یہی ہے۔ جمال۔۔۔ میری جمال۔ اسی کو میں نے دیکھا تھا مگر وہ مجھے کوئی پاگل معلوم ہوتا تھا جیسی الٹی سیرم باتیں کر رہا تھا۔“

”وہ تو الگ بات ہے خالہ مگر شخصہ نے ایسا کیوں کیا۔ یہ تو شرافت سے گری ہوئی بات ہے۔“ جمال کی ماں کو جلال آ گیا تھا۔ ”میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ ذرا آنے تو دو جمال کے باپ کو۔“

اس کے ساتھ ہی جمال کا باپ گھر نہیں داخل ہوا۔ جمال کی ماں دوڑ کے اس کے پاس گئی۔ ”سنا کچھ آپ نے۔ یہ جو مسعود بلال ہے۔ وہی بغداد کا شخصہ۔ وہ شرفا کی بیگمات کو اپنے گھر بلا کر ان کی صورتیں دیکھتا ہے۔ ہے نا وہ بد معاش؟“

”بد معاش اور نیک معاش کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا۔“ جمال کے باپ نے بڑے تسنن سے کہا۔ ”پہلا سوال یہ ہے کہ شرفا کی عورتیں اس کے محل پر جاتی کیوں ہیں جب انہیں بلایا جائے تو انکار کر دیں۔“

جمال کی ماں منہ بنا کے بولیں۔

”واہ یہ اچھی رہی۔ اگر کوئی تقریب میں منہ پھوڑ کے بلائے تو چاہا ہی پڑتا ہے۔ میں جمال کو ساتھ لے کے اس کی بیٹی کی سالگرہ میں گئی تھی۔ آپ نے خود ہی اجازت دی تھی۔“

”تو کیا شخصہ نے خواہنا اسے آپ کی صورت دیکھ لی۔“ شوہر صاحب اب تک ڈان

نکلی بات پرائی ہوتی ہے۔ ایک بار جمال کا نام لوگوں کی زبان پر آگیا تو پھر اس غریب/ شوہر ملنا مشکل ہو جائے گا۔ ویسے آپ کی مرضی۔“

خالہ نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جمال کی ماں کا بھی سارا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ”خالہ کی رائے ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس میں ہمارے خاندان کی بدنامی ہے بات باہر نکلی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ میں تو کہتی ہوں کہ آپ اس بات کو بیکر پر ختم کر دیں۔ خدا مسعود بلال سے خود بدلہ لے گا۔“

”تم بھی کمال کرتی ہو بیگم یہ بغداد کے تمام امیروں کی عزت کا سوال ہے۔ میر اس معاملے میں خاموش نہیں رہ سکتا۔“ امیر نے بڑے استقلال سے کہا۔

خالہ کا پورا بدن کانپ اٹھا۔ خلیفہ کے دربار میں پیش ہونا پھر مسعود بلال کا بھی سامنا ہو سکتا تھا اگر اس نے کہہ دیا کہ میں نے اس عورت کو اس بات کا معاوضہ دیا تھا تو پھر کیا ہو گا۔ ”امیر آپ کیوں بات بڑھا رہے ہیں۔ اس میں تلواریں بھی چل سکتی ہیں۔ کیوں بے گناہوں کا خون بہائیے گا۔“

”یہ تمہارے سوچنے کی باتیں نہیں۔ خون بہانے ہی کے لئے ہوتا ہے۔“ امیر نے خالہ کو ایسا سخت جواب دیا کہ وہ پھر نہ بول سکی۔ مگر اسے اپنی غلطی پر انوس ضرور ہو رہا تھا۔ وہ تو اس خیال سے آئی تھی کہ جمال کے والدین کو خوفزدہ کر کے اس بات کی پردہ پوشی کا کچھ صلہ وصول کرے گی مگر اب تو اسے لینے کے دینے پڑ رہے تھے۔



عباسی خلیفہ مقتدی نے جن حالات میں خلافت سنبھالی تھی اس وقت وہ محض شطرنج کا ایک مرا تھا۔ سلجوق سلطان مسعود سلجوقی جس طرف چاہتا اسے موڑ دیا کرتا تھا۔ مگر اب اس کی خلافت کو پندرہ سولہ سال ہو چکے تھے اور اس نے اپنی حسن تدبیر اور شجاعت سے سلجوقی سلطان کا اثر بہت کچھ زائل کر دیا تھا۔ تین سال پہلے جب سلجوقی امراء نے بغداد پر حملہ کیا تو تھا خلیفہ مقتدی نے خود میدان جنگ میں نکل کر ان کا ہمدردی سے مقابلہ کیا تھا اور اسے اس طویل جنگ میں کافی کامیابی حاصل ہوئی

نہی لیکن اس کے باوجود وہ سلجوقی سلطان سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہتا تھا اور اپنی طاقت کو کسی بڑے معرکے کے لئے محفوظ کر رہا تھا۔

اسی دوران بغداد کے شہنشاہ مسعود بلال کا واقعہ پیش آیا۔ جمال کے باپ نے قصر خلافت میں پہنچ کر مسعود بلال کی شکایت کی۔ مسعود بلال کی حرکتوں سے خلیفہ نالاں تھا مگر بغیر سوچے سمجھے وہ کوئی قدم اٹھانے پر تیار نہ تھا۔ سلجوقیوں کے اقتدار کا محل گر رہا تھا۔ خانہ جنگیوں نے اس عظیم سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ ہاتھی لاکھ لئے مگر سوا لاکھ نکلے گا۔ سلجوقیوں کے پاس اب بھی طاقت تھی اور ان سے خواہ مخواہ نکرانا کوئی عقل مندی کی بات نہ تھی۔

خلیفہ نے جمال کے باپ کی شکایت بڑی توجہ سے سنی پھر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”امیر بغداد کے شہنشاہ کی حرکت کی وجہ سے تمہارا دل دکھا ہے۔ تمہارا غصہ حق بجانب ہے۔ یہ صرف تمہاری ہی توہین نہیں بلکہ تمام امراء بغداد کی ذلت اور رسوائی ہے لیکن تمہارا مسئلہ بہت زیادہ غور و فکر کا طالب ہے۔“

”غور و فکر کرنا امیر المومنین کا کام ہے۔“ جمال کا باپ غصے سے بولا۔ ”مسعود بلال نے میری اور میرے خاندان کی توہین کی ہے۔ مجھے اس سے بدلہ لینے کی اجازت دی جائے۔“

جمال کے باپ کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ خلیفہ نے نرمی سے سمجھایا۔ ”امیر ہمیں تمہارے احساسات کا پورا پورا خیال ہے لیکن اس مسئلے میں دو باتیں بہت غور طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں اطلاع دینے والی ایک ایسی عورت ہے جو گھر گھر گومتی ہے۔ ایسی عورتیں قابل اعتبار نہیں ہوتیں۔ انہیں لالچ دے کر کوئی شخص اپنی مرضی کا بیان دلا سکتا ہے پھر ایک بات یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس عورت نے مسعود بلال کے مقابلے میں تمہارا کیوں زیادہ خیال رکھا۔ اگر وہ مسعود بلال سے لڑے یہ کہتی کہ اس نے خود اسے عالی مرتبہ بیگمات کو چوری چھپے دیکھتے ہوئے پکڑا ہے تو مسعود بلال اسے لے دے کر خاموش کر سکتا تھا۔“

”امیر المومنین! وہ عورت بغداد کی رہنے والی ہے۔ اسے عباسیوں کی عزت کا لالہ خیال ہے اس وجہ سے وہ میرے پاس آئی۔“ جمال کے باپ نے قومی حیثیت کا

مبارک کہا۔ ”مسعود بلال سلطان کا خاص آدمی ہے۔ آپ نے اس سے باز پرس کی تو سلطان سے مدد طلب کرے گا۔“

”ہم جنگ سے خوف نہیں کھاتے امیر لیکن جنگ کی ٹھوس وجہ ہونا چاہیے۔“
فلذ نے بڑی مستقل مزاجی سے کہا۔ ”اگر مسعود بلال نے واقعی یہ ناشائستہ حرکت کی ہے تو ہم اس سے جواب طلب کریں گے۔ اگر وہ معقول عذر نہ پیش کر سکا تو ہم اس کا معاملہ سلطان مسعود کے پاس بھیجیں گے۔ وہاں بھی اگر انصاف نہ ہوا تو پھر انصاف کے لئے ہم خود میدان میں اتریں گے۔“

”نہیں، نہیں امیر المومنین! میں جنگ نہیں چاہتا۔“ اور جمال کا باپ گھٹنوں کے بل خلیفہ کے سامنے جھک گیا۔

خلیفہ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اپنے غلام کو حکم دیا۔ ”بغداد کے شخصہ کو اطلاع دی جائے کہ ہم ان سے ایک اہم معاملے میں مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہم سے ملاقات کا وقت مقرر کریں۔“

خلیفہ کا غلام حکم لے کر باہر چلا گیا۔ پھر خلیفہ نے امیر سے کہا۔ ”تم واپس جا لے ہو۔ ہم تمہیں اس وقت طلب کریں گے جب مسعود بلال ہمارے سامنے پیش ہو گا۔ تمہیں اس بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ یہ ایک انتہائی نازک مسئلہ ہے۔ اس لئے تم اس وقت تک اپنی زبان بند رکھو گے جب تک ہم تمہیں اجازت نہ دیں۔“
”امیر المومنین کے حکم کی تعمیل ہو گی۔“ امیر نے اور زیادہ خم ہو کر کہا۔ ”لیکن امیر المومنین کے غلام نے ہماری باتیں سنی ہیں۔ وہ کہیں دوسرے امیروں کو اس کی خبر نہ کر دے۔“

”تم ہمارے غلام پر شک کر کے قصر خلافت کے وفاداروں کی توہین کر رہے ہو۔“
خلیفہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”قصر خلافت کی کینز اور غلام نہ یہاں ہونے والی گفتگو سننے ہیں اور نہ گفتگو کرنے والوں کو دیکھتے ہیں۔ ان کے کان صرف ہمارا حکم سنتے ہیں اور آنکھیں ہمارے اشارے کی منتظر ہوتی ہیں۔“

ادھر ہمدان میں سلجوق سلطان مسعود کے حالات پہلے سے زیادہ خراب ہو گئے تھے اور سلجوقی سلطنت ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ سلطان کے دست خاص امیر جاؤلی کا

ایک کمزور سہارا لیا۔

خلیفہ مقتدی نے تبسم فرمایا اور کہا۔ ”امیر تم بغدادیوں کی حمیت کا سہارا لے رہے ہو مگر ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر بغداد والے ایسے ہی باضمیر ہوتے تو عباسیوں کی عظیم الشان سلطنت اس طرح پارہ پارہ نہ ہوتی۔ تم جس عورت کو اس قدر قابل اعتماد سمجھتے ہو اسے ہمارے سامنے پیش کرو۔ ہم خود اس سے تحقیقات کریں گے۔“

وہ امیر المومنین کے سامنے آنے سے خوفزدہ ہے۔ ”جمال کے باپ نے کہا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ جھوٹی ہے بلکہ آپ امیر المومنین ہیں اور وہ آپ کا ساتھ نہیں کرنا چاہتی۔“

”یہ کوئی دلیل نہیں۔“ خلیفہ نے بڑے رعب سے کہا۔ ”کیا کوئی عباسی یا بغدادی کہہ سکتا ہے کہ ہم نے کسی کے ساتھ نا انصافی کی ہے۔ یہ اس کا محض عذر لگ ہے۔“

”امیر المومنین! اس عورت کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر اس نے دربار خلافت میں سلجوقیوں کے خلاف کوئی بیان دیا تو ممکن ہے کہ خلیفہ معظم اور سلطان مسعود سلجوقی میں جنگ شروع ہو جائے اور ہزاروں بے گناہ مارے جائیں۔“

خلیفہ نے چونک کر امیر کو دیکھا۔ ”وہ عورت بہت زیادہ شاطر اور چالاک ہے۔ اگر یہ اس کا بیان ہے تو سمجھ لو وہ عورت خود چاہتی ہے کہ خلافت اور سلطانی کرا جائے اور ہزاروں بے گناہ جنگ کی بھیڑ میں بھسم ہو جائیں۔“

جمال کے باپ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے گڑگڑا کے کہا۔ ”اس عورت پر خدا کی مار جو ایسا چاہتی ہے۔ میں نے ان آنکھوں سے بغداد کا وہ منظر دیکھا جب سلجوقیوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ اس کے تصور ہی سے رو گھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں منظر پھر نہیں دیکھنا چاہتا امیر المومنین۔ میں اپنی شکایت واپس لیتا ہوں۔“

”نہیں امیر! تم نے خلیفہ المسلمین سے شکایت کی ہے۔“ خلیفہ نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”ہم اس کی تحقیقات کریں گے اور تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔“
”مگر امیر المومنین! کہیں سلجوقیوں سے جنگ نہ چمڑ جائے۔“ جمال کے باپ نے

چکا تھا۔ رے میں چچا بھتیجیوں کی ملاقات ہوئی۔ سلطان مسعود اور خاص بک نے خبر کو اس قدر قیمتی سمجھا کہ اس کا دونوں کی طرف سے دل صاف ہو گیا اور دونوں کو تنبیہ کر کے خوزستان واپس ہو گیا۔

سلطان مسعود نے ابھی ان حالات سے فراغت پائی تھی کہ بغداد سے مسعود بلال آیا۔ سلطان ملکی حالات سے بہت پریشان تھا اس کے علاوہ اس کی طبیعت بھی کچھ بک نہ تھی۔ اس نے مسعود بلال کی باتیں سنیں تو توجہ سے مگر فیصلہ کرنے میں الجھتا رہا۔ اسے معلوم تھا کہ شہزادہ ملک شاہ ایک بے وقوف اور عیش پرست آدمی ہے۔ اس کے محل میں بیگمات اور کنیزوں کی بھی کمی نہ تھی پھر ایک نئی شادی کے لئے اسے طلب کرنا کچھ مناسب نہ معلوم ہوتا تھا مگر اس کے ساتھ سلطان کو یہ بھی شبہ کہ اس کے مخالف امیر شہزادے کو بھڑکا کر سلطان کے خلاف نہ کھڑا کر دیں۔ سلطان انکار کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ مسعود بلال کو سلطان نے بغداد کا شہنشاہ بنایا تھا اور شہنشاہ پر اعتماد بھی تھا مگر بادشاہی میں تو شاہ اپنے سائے سے بھی خوف لگاتا تھا اور اپنے سب سے زیادہ با اعتماد آدمی سے ہی زیادہ محتاط رہتا ہے۔

”مسعود بلال! تمہارا اس سلسلے میں کیا مشورہ ہے؟“ سلجوقی نے مسعود بلال پر دیکھ کر اسے ٹولا۔

”عالی جاہ! میں نا چیز حضور اعلیٰ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔“ مسعود بلال نے عاجزی سے کہا۔ ”غلام تو حکم کا بندہ ہے۔ شہزادے آپ کے حکم سے میرے پاس نہ لائے۔ میں نے انہیں ہر آنکھوں پر بٹھایا۔ انہوں نے آپ کے ہاں بھیجا۔ میں نہ ہو گیا۔ جو حکم عالی ہو وہ بجا لاؤں۔“

”اچھا یہ بتاؤ اس معاملے میں کسی سلجوقی امیر کی تو سازش نہیں؟“ اس قسم کی کوئی بات ہوتی تو میں حضور عالی میں پہلے ہی حاضر ہو گیا ہوتا۔“

”بلال کی حد سے بڑھی ہوئی عاجزی نے سلطان کو بہت متاثر کیا۔

”دیکھو بلال! ہم شہزادے کا دل نہیں توڑنا چاہتے لیکن اس کے لا ابالی پن سے اسے واقف ہو اگر اس نے کوئی غلط حرکت کی تو خلیفہ بغداد سے ہمارے تعلقات بہتر ہو سکتے ہیں۔“

انتقال ہو گیا تھا۔ سلطان کو اس امیر کا سب سے بڑا سارا تھا جاؤلی کے مرتے ہی باقی امراء نے پھر سراٹھایا۔ عبدالرحمان عباس اور امیر بوزاہ نے انتظام سلطنت زبردستی اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ سلطان مسعود سلجوقی میں ان امراء کو روکنے یا منع کرنے کی طاقت نہ تھی اس لئے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ ان دو امیروں نے سلطان کے وزیر جمال الدین کو معزول کر کے تاج الدین کو وزیر مقرر کر دیا۔ تاج الدین ان امیروں کا خاص آدمی تھا اور ان ہی کے حکم پر چلتا تھا۔

سلطان مسعود سلجوقی وقتی طور پر دب گیا تھا لیکن تھا بڑا ذہین انسان۔ اس نے محل کے اندر ہی بیٹھے بیٹھے اپنے معتد غلام خاص بک کے ذریعے ایسا چکر چلایا کہ عبدالرحمان، امیر بوزاہ اور تاج الدین با اختیار ہونے کے باوجود سلطان کے سامنے زچ ہو کے رہ گئے۔ مسعود سلجوقی کے غلام نے ان تینوں اہم شخصیتوں کو تہ تیغ کر کے سلطان کو ان کے پنجے سے آزاد کرا دیا۔ سلطان نے خوش ہو کر خاص بک کو امیر الامراء بنا دیا۔ خاص بک کی خدمات ایسی تھیں کہ وہ اس مرتبے کا حقدار تھا لیکن شخص حکومتوں میں کسی کا حق نہیں دیکھا جاتا بلکہ جس کی تلوار ہو وہی سب سے بڑا حقدار ہو جاتا تھا۔

خاص بک کے امیر الامراء کے عہدے پر مقرر ہوتے ہی ایک نئے فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ دربار کے تمام سلجوقی امیر خاص بک کے خلاف ہو گئے اور ہر طرف سازشیں پھوٹ پڑیں۔ امراء نے اپنا ایک وفد خراسان بھیجا۔ خراسان کا خود مختار بادشاہ سلطان مسعود کا چچا سخر سلجوقی تھا۔ سخر سلجوقی سے سلطان مسعود بہت ڈرتا تھا کیونکہ سلجوقیوں میں سب سے اہل اور با عزت سخر سلجوقی ہی تھا اور ہمدان کی سلطانی پر اس کا حق تھا مگر اس نے خود ہی مسعود کے لئے جگہ خالی کر دی تھی اور خراسان چلا گیا تھا۔ سخر سلجوقی کے پاس امیروں نے خاص بک اور سلطان کے خلاف ایک لمبی چوڑی شکایت لکھ بھیجی تھی۔ چونکہ یہ شکایت سلجوقی امراء کی طرف سے تھی اس لئے سخر حالات سے آگاہ ہوتے ہی فوراً ہمدان کی طرف چل پڑا۔

ادھر کسی طرح سلطان کو امراء کی اس سازش کا علم ہو گیا وہ فوراً خاص بک کو اپنے ساتھ لے کر ”رے“ پہنچا۔ سلطان مسعود کا چچا شاہ سخر اس وقت تک ”رے“

آپ کے منہ میں سچی شکر امیر۔" ابراہیم نے فوراً لقمہ دیا۔
 میں نے شہزادے بہادر سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ امیر مسعود بلال آپ کے لئے
 کا پیغام لے کے آئیں گے۔"

مسعود بلال مابودلت تم سے بہت خوش ہیں۔ تمہیں ہم اپنا وزیر اعظم ضرور مقرر
 کیا ہے۔ شہزادہ خوشی سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ "خلیفہ کی طلبی سے مابودلت
 پریشان ہو گئے تھے وہ پریشانی تو ختم ہوئی مگر اب یہ فکر ہے کہ کہیں خلیفہ اس
 سے انکار نہ کر دے۔"

"آپ کیوں فکرمند ہوتے ہیں شہزادے۔" مسعود بلال نے بڑے رعب سے
 خلیفہ کی کیا مجال ہے کہ وہ انکار کرے ہمیں سلطان مسعود سلجوقی کی اجازت
 مل ہو گئی ہے۔ اگر خلیفہ نے انکار کیا تو ہم دوسرا قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔"
 "نہیں نہیں ایسا موقع نہ آنے دیجئے گا امیر۔" ابراہیم گھبرا گیا۔ "پردیس کا معاملہ
 بگ چھڑ گئی تو ہمارا کیا بنے گا؟"

"چپ رہو ابراہیم۔" مسعود بلال نے اسے ڈانٹ پلائی۔ "یہ امور مملکت ہیں۔
 لانا باتوں میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔"
 ابراہیم چپ ہو کے بیٹھ گیا۔

مسعود بلال نے غسل کیا۔ تھوڑی دیر آرام کر کے سفر کی تھکن دور کی پھر قصر
 کی طرف چلا۔ خلیفہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ مسعود بلال ہمدان گیا ہوا ہے۔ انہوں
 کے باپ کو رازداری کی سخت تاکید کی تھی اور مسعود بلال کی واپسی تک
 ان کی حرکت کرنے سے منع کیا تھا۔ جس وقت خلیفہ کو مسعود بلال کے حاضر
 ہونے کی اطلاع دی گئی تو جمال کا باپ اتفاق سے خلیفہ کے حضور میں موجود تھا۔

خلیفہ نے مسکرا کے کہا۔ "اچھا ہوا کہ مدعی اور مدعیہ الیہ دونوں اس وقت موجود
 تھیں۔ شکایت کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔"

جمال کا باپ مسعود بلال کی آمد ہی سے پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے سر جھکا کر کہا۔
 "والہو منین! آپ جو فیصلہ صادر کریں گے وہ مجھے منظور ہے مگر مسعود بلال کے
 لئے پیش نہ کیجئے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بڑا سخت آدمی ہے۔"

"عالی جاہ نے درست فرمایا۔" مسعود بلال نے سلطان کی تائید کرتے ہوئے
 "مگر شہزادے کا پیغام آپ کی طرف سے خلیفہ کے پاس جائے گا اگر وہ انکار کریں۔
 تو بات ان پر پڑے گی شہزادے کو آپ سے کوئی شکوہ نہ ہو گا۔"

"تمہاری رائے درست معلوم ہوتی ہے۔" آخر سلطان مسعود سلجوقی نے فیصلہ
 لیا۔ "تم ہماری طرف سے تحائف لے کر خلیفہ کے حضور میں پیش ہو اور ابو
 ہماری طرف سے ان کے امیر کی بیٹی کا رشتہ شہزادے ملک شاہ کے لئے مانگو۔
 تمہارے الفاظ میں درخواست کا پہلو ہونا چاہیے۔ خلیفہ کو یہ محسوس نہ ہونا چاہیے
 ہم ان پر جبر کر رہے ہیں۔"

انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا عالی جاہ۔" مسعود بلال اپنی کامیابی پر پھول اٹھا۔
 دوسرے دن مسعود بلال نے خلیفہ کے لئے بیش قیمت تحائف لے کر
 خوشی بغداد واپس ہوا۔ مسعود بلال اپنے محل میں پہنچا تو ابراہیم نے اسے گھبرا
 ہوئے لہجے میں بتایا۔ "امیر محترم! خلیفہ بغداد نے آپ کو کسی اہم مشورے کے
 فوری طور پر طلب کیا ہے۔"

اس خبر سے مسعود بلال کے تھکے ہوئے چہرے پر رونق سی آگئی۔ شہزادے
 شاہ نے اسے تعجب سے دیکھا۔ "مسعود بلال! تمہارے چہرے سے معلوم ہوتا ہے
 خلیفہ کی طلبی سے تمہیں خوشی حاصل ہوئی ہے۔"

"جی ہاں شہزادے بہادر! آپ نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔"
 مسعود بلال اسی مسرت سے بولا۔ "دراصل مجھے آپ کا پیغام لے کر خودی
 کے پاس جانا تھا۔ میں اس خیال سے پریشان تھا کہ خلیفہ مجھے ملاقات کا وقت کم
 ایک ہفتے بعد دے گا لیکن میری یہ مشکل آسان ہو گئی ہے۔"

"کیا چچا سلطان نے خلیفہ کے پاس ہمارا پیغام بھیجا ہے؟" شہزادے کی باج
 خوشی سے کھلی جا رہی تھیں۔

"آپ کا یہ اندازہ بھی درست ہے شہزادے۔" مسعود بلال مسکرایا۔ "شہزادہ
 ملک شاہ کی خواہش اور مسعود بلال کی وکالت۔ سلطان کو اقرار ہی کرتے بنا۔ اب
 سمجھئے کہ آپ کی جان آرزو آپ کی آغوش آرزو میں ہو گی۔"

”غلام کی عقل ناقص امیر المومنین کے سوال کو نہیں سمجھ سکی۔“ مسعود بلال نے سمجھتے ہوئے بھی انجان بننے کی کوشش کی۔ ”حضور عالی اگر کچھ وضاحت.....“

”مسعود بلال! زیادہ بننے کی کوشش مت کرو۔“ خلیفہ کو جلال آگیا۔ ”کیا یہ غلط ہے کہ اس محفل میں ہمارے ایک امیر کی نیک خصلت بیٹی ”جمال“ پر آوازے کے لئے تھی؟“

”امیر المومنین اگر نیک خصلت بیٹی جمال کے محترم والد صاحب کا نام نامی امیر بن ہے تو غلام کچھ عرض کرے؟“ مسعود بلال کو فوراً شک ہو گیا تھا کہ خلیفہ کے نور میں بیٹھا ہوا یہ شخص ضرور جمال کا باپ ہے اور اسے کسی ذریعے سے اس دن کے حالات کا علم ہو گیا ہے۔

”ہاں اس امیر کا نام یہی ہے۔ کیا تم امیر سیف کو جانتے ہو؟“ خلیفہ کا لہجہ تلخ و رے درشت ہو گیا تھا۔

”امیر المومنین! میں نے امیر سیف اور ان کی نیک دختر کا نام سلطان مسعود لڑائی کے دہن مبارک سے پہلی بار سنا تھا۔ اس لئے ان دونوں قابل احترام ہستیوں کا نام نہ متعارف ہوں۔“

خلیفہ چونک پڑا۔ ”سلطان نے ان دونوں کا ذکر کس ضمن میں کیا تھا۔؟“

مسعود بلال نے شکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھا جس کے بارے میں اس لڑکے کے باپ ہونے کا شبہ تھا۔ ”اس تفصیل کے لئے مجھے تنہائی اور تنہائے کی فرمائش کرنا ہوگی۔“

خلیفہ نے دیکھ لیا تھا کہ مسعود بلال ایک دوسرے شخص کی موجودگی سے پریشان رہا تھا۔ ”مسعود بلال! ہم اس وقت تنہا ہیں یہاں جس شخص کو تم دیکھ رہے ہو وہی مل کے والد امیر سیف ہیں۔ ان کے سامنے تمہیں جھکنے کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا تو آپ ہیں امیر سیف!“ مسعود بلال نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”میں ہر سلام اور مبارکباد پیش کرتا ہوں۔“ آخری الفاظ جیسے مسعود بلال کی زبان سے لڑکے کے لئے گئے۔

”مسعود بلال تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ تم اس وقت کس دربار

”تمہاری بزدلی پر ہمیں افسوس ہوا امیر۔“ خلیفہ کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”بغداد کے امیروں کی اس کمزوری سے سلجوقی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مسعود بلال تمہاری طرح انسان ہے۔ تمہیں کھا تو نہیں جائے گا۔“

جمال کے باپ کو کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ خلیفہ نے مسعود بلال کو باریابی کی اجازت دیدی۔ مسعود بلال سر جھکائے خلیفہ کے حضور پیش ہوا اور قاعدے کے مطابق خلیفہ کو تعظیم پیش کی۔

”مسعود بلال! ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم اپنے سلطان کے پاس گئے ہوئے ہو۔ خلیفہ نے پر جلال لہجے میں کہا۔

”غلام اس وقت سلطان معظم کی قدم بوسی کے بعد بغداد پہنچا ہے۔“ مسعود بلال نے ادب سے کہا۔ ”سلطان معظم نے اس خادم کے ذریعے امیر المومنین کے پاس ایک اہم پیغام بھیجا ہے۔ اجازت دی جائے کہ میں سلطان معظم کا پیغام حضور عالی پر عرض کروں۔“

سلطان کے پیغام کے ذکر پر خلیفہ مضطرب سا ہو گیا تھا۔

”مسعود بلال! ہم نے تمہیں کسی اور وجہ سے طلب کیا تھا۔ خیر وہ بات تو بد میں ہوگی پہلے تم بتاؤ کہ سلطان نے کیا پیغام دیا ہے؟“

”امیر المومنین! سلطان کا پیغام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس معاملے پر پہلے توجہ فرمائیں جس سلسلے میں مجھے طلب کیا گیا ہے۔“ مسعود بلال نے بڑی ملائمت سے درخواست کی۔

”اچھا غور سے سنو مسعود بلال۔“ خلیفہ نے تیوریوں پر بل ڈال کے کہا۔ ”کیا سچ ہے کہ کچھ دن پہلے تم نے اپنی بیٹی کا جشن منایا تھا۔ جس میں دربار خلافت کے تمام امیروں کی بیگمات کو مدعو کیا گیا تھا؟“

”امیر المومنین یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس تقریب میں تو غلام نے حضور عالی کو بھی مدعو کیا تھا مگر حضور کسی خاص وجہ سے شرکت نہیں فرما سکے تھے۔“ مسعود بلال نے بے جھجک جواب دیا۔

”کیا اس تقریب میں کوئی واقعہ پیش آیا تھا؟“ خلیفہ کا لہجہ تند ہو گیا۔

میں کھڑے ہو؟“ خلیفہ نے بڑی خفگی سے مسعود بلال کو ٹوکا۔

”میں خلافت ماب سے معافی چاہتا ہوں۔“ مسعود بلال کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”دراصل میں امیر محترم کو اس وقت حضور خلافت میں دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔“

”تم اب بھی اپنے ہوش میں نہیں ہو۔“ خلیفہ کی خفگی بڑھتی جا رہی تھی۔ ”ہم سلطان کا پیغام سننا چاہتے ہیں۔ جو کہنا ہے جلدی کرو۔ تمہیں ابھی امیر سیف کے گھر کی خواتین کے بارے میں جواب دینا ہے۔“

”اسی لئے میں زیادہ خوش ہوں امیر المومنین۔“ مسعود بلال کے منہ سے خوشی کے مارے ٹھیک سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ ”امیر المومنین! مجھے سلطان معظم نے ایک خاص مشورے کے سلسلے میں ہمدان طلب کیا تھا۔ اس مسئلے کا تعلق بغداد سے تھا۔ میں چونکہ آپ کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اس لئے خلافت ماب کے سلسلے میں میں نے وہی کچھ کہا جو ایک خادم کو اپنے آقا کے بارے میں کہنا چاہیے۔ میں ان سے.....“

”مسعود بلال! ہمیں لمبی چوڑی تمہید نہیں چاہیے۔ سلطان کا پیغام بیان کرو۔“ خلیفہ کا مزاج برہم ہو گیا۔

”میں دوبارہ معذرت خواہ ہوں امیر المومنین۔“ مسعود بلال سنبھل کے بولا۔ ”سلطان معظم کے بھائی ملک شاہ بن محمود کو اگر دوبار خلافت کے امیر سیف اپنی فرزندگی میں قبول فرمائیں تو یہ امر سلطان معظم کے لئے باعث مسرت و انبساط ہو گا۔“ خلیفہ متفنی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”کیا سلطان، شہزادہ ملک شاہ کی شادی امیر سیف کی دختر جمال سے کرنے کے خواہش مند ہیں؟“ خلیفہ نے یوں کہا جیسے انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

”امیر المومنین! میں نے یہی عرض کیا ہے۔“ مسعود بلال نے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس مشورے کے لئے مجھے ہمدان طلب کیا گیا تھا اور اس خادم کی مصافحہ سے مطمئن ہونے کے بعد سلطان معظم نے یہ پیغام دوبار خلافت میں بھیجا ہے۔“ خلیفہ کو اچنبھا بلکہ سکتہ سا ہو گیا۔ وہ سر جھکا کے سوچنے لگے۔ امیر سیف نے

سلطان کا پیغام سنا تو اس کا خوشی کے مارے برا حال ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شاہ ملک شاہ شادی شدہ ہے۔ اس کے حرم میں ایک سے زیادہ بیگمات ہیں۔ شاہی رات میں کینڑوں کا تو کوئی حساب ہی نہ ہوتا تھا۔ پھر بھی ایک امیر کے لئے یہ کیا کم کر اس کی بیٹی سلطان وقت کے بھتیجے سے منسوب ہو رہی تھی۔ اسے یوں محسوس رہا تھا جیسے خوش نصیبی اور خوش بختی اپنے پیروں سے چل کر اس کے گھر آ رہی

”مسعود بلال! خلیفہ نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ ”سلطان کے پیغام کا تعلق براہ راست ہماری ذات سے نہیں ہے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ امیر سیف اس وقت یہاں موجود ہمارے انہوں نے اپنے کانوں سے سلطان کا پیغام بھی سن لیا ہے۔ اس لئے اب یہ ہمارا تعلق ہے۔ ہم اس معاملے میں غیر جانبدار ہیں اگر امیر سیف اس رشتے کو مزید کرین تو ہمیں خوشی ہو گی اور اگر انکار کر دیں تو ہم انہیں مجبور نہیں کریں گے۔“ خلیفہ نے امیر سیف کو مخاطب نہیں کیا تھا مگر وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کو سچا کہیں خلیفہ اور مسعود بلال میں اختلاف نہ پیدا ہو جائے اس لئے جلدی نہ بولا۔ ”امیر المومنین! میں اپنے مقدمے کو واپس لیتا ہوں۔ یقیناً مجھے غلط لگاؤ دی گئی تھی مجھے امیر مسعود بلال سے کسی قسم کی شکایت نہیں۔“

مسعود بلال نے وقت سے فوراً فائدہ اٹھایا۔ ”میں امیر محترم کے گھر کی معزز انہوں کے بارے میں کسی غلط بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا پھر بھی اگر امیر کو مجھ سے شکایت ہے تو میں معذرت کے لئے تیار ہوں۔“

خلیفہ نے مسکرا کے امیر سیف کو دیکھا۔ ”امیر اس کا مطلب ہے کہ تمہیں سلطان کا پیغام منظور ہے؟“

”امیر المومنین! غلام کی منظوری عزت ماب کی اجازت کے تابع ہے۔“ امیر نے سر جھکا کر کہا۔ ”امیر المومنین، جو حکم فرمائیں۔ اس پر عمل ہو گا۔“ خلیفہ نے محسوس کیا کہ امیر سیف اس رشتے کو منظور کرنے کے لئے بے چین نہیں اس نے اجازت دے دی۔

”امیر المومنین! مجھے اجازت دیجئے کہ میں امیر سیف کو مبارکباد پیش کروں۔“
مسعود بلال نے خلیفہ پر سے نظریں ہٹا کر امیر سیف کو دیکھا۔ ”امیر اگر پسند فرمائیں تو
یہ شادی کل ہو سکتی ہے شہزادے ملک شاہ بن محمود اس وقت میرے مکان میں قیام
فرما ہیں۔“

”کیا شہزادہ ملک شاہ بغداد میں ہے؟“ خلیفہ نے حیرت سے مسعود بلال کو دیکھا۔
”امیر المومنین! مجھے یقین تھا کہ خلافت ماب اس رشتے کو پسند فرمائیں گے۔ اس
لئے میں شہزادے کو اپنے ساتھ لے کے آیا ہوں۔ میری عاجزانہ درخواست ہے کہ
شہزادے اور جمال خاتون کی شادی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔“

خلیفہ نے اس جھگڑے میں پڑنا مناسب نہ سمجھا اور مسعود بلال کو اجازت دے
دی۔ مسعود بلال نے شہزادے ملک شاہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا پورا ثبوت دیا اور
دوسرے دن شہزادے اور جمال کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اس شادی میں
مسعود بلال نے کافی رقم خرچ کی لیکن اس نے یہ تمام رقم سلطان مسعود سلجوقی کی
خوشنودی کے بہانے بغدادی امراء سے بخوشی یا بالجبر وصول کی پھر اسی رات مسعود بلال
نے شہزادے ملک شاہ اور اس کی بیوی یا محبوبہ کو ہمدان روانہ کر دیا۔

شہزادے کو جمال کیا ملی جیسے اسے دنیا کے تمام خزانے مل گئے۔ وہ جمال کو لے
کر ہمدان پہنچا۔ مگر وہ جمال کے جمال جہاں سوز میں ایسا غرق ہوا کہ ہمدان پہنچنے کے
بعد سلطان مسعود کی سلامی کو جانے کے بجائے تمام دن اور رات بھر محل میں گھوم
رہا۔ جمال سولہ سنگھار کئے ہوئے اس کے سامنے بیٹھی تھی اور شہزادہ پروانہ وار اس
نثار ہو رہا تھا۔ محل کی دوسری بیگمات کے چراغ گل ہو گئے تھے اور تمام کینز اور
غلام جمال کے خنوروں میں لگے ہوتے تھے۔ شہزادے کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان
مسعود ان دنوں بیمار ہے مگر جمال کا عشق اس پر ایسا سوار تھا کہ وہ چچا کی عیادت
بھی نہیں گیا۔ جمال نے بھی اپنا چولا بدل لیا تھا۔ وہ ایک معمولی امیر کی بیٹی تھی لیکن
شہزادے کے ساتھ شادی ہونے کی وجہ سے وہ شاہی خاندان میں شامل ہو گئی تھی اور
اسی انداز سے کینزوں سے خطاب کرتی تھی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ جمال کسی اچھے گھرانے سے تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ

میں ایک کینز زادی تھی اور شہزادہ ملک شاہ اس پر عاشق ہو کے اسے اپنے محل میں
لے آیا تھا۔ حقیقت کچھ بھی ہو مگر تاریخ بتاتی ہے کہ جمال نامی عورت شہزادے کے
محل میں موجود تھی اور وہ شہزادے پر اس قدر حاوی تھی کہ شہزادہ اس کی اجازت کے
بغیر نوالہ تک نہ اٹھاتا تھا۔ شہزادے نے دو راتیں اور ایک دن محل میں بڑے سکون
سے گزارا مگر تیسری صبح کو جب وہ حمام میں تھا تو جمال نے تھرتھرائی آواز میں اسے خبر
دی۔

”شہزادے بہادر! جلد باہر تشریف لائیے۔ امیر خاص بک بہت سے امیروں کے
ساتھ آیا ہے اور اس وقت آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

شہزادے ملک شاہ کی آنکھوں سے ابھی رات کی عشرت کا بخار بھی زائل نہ ہوا
تاکہ خاص بک کے آنے کی اطلاع نے اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ اسے معلوم تھا
کہ خاص بک سلطنت سلجوقی کا مرد آہن ہے اور سلطان مسعود سلجوقی بھی اس کے
سامنے دم نہیں مارتا ہے۔ اس کا اس وقت آنا کسی علت سے خالی نہیں۔ کہیں سلطان
! خود خاص بک اس سے ناراض تو نہیں ہو گیا اور اب اس کی گرفتاری کو آیا ہے۔
شہزادے کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔

”جمال! تم جا کے معلوم تو کرو کہ خاص بک اس وقت کیوں آیا ہے؟“ شہزادے
نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

”شہزادے میری کیا مجال کہ میں امیر خاص بک سے گفتگو کروں۔ وہ ناراض ہو
کے کہیں میری گردن نہ اتروا دے۔“

”گردن تو مبادولت کی اترنے والی ہے۔“ شہزادہ لرزتا ہوا حمام سے نکلا۔ ”جمال!
مبادولت نے تمہاری آرزو کی تمہیں حاصل کیا مگر دنیا والے ہماری خوشی نہیں دیکھ
سکے اور۔۔۔“

”فضول باتیں نہ کیجئے شہزادے۔“ جمال جھلا گئی۔ ”آپ دیر کریں گے تو وہ اندر
میں آئے گا۔ جلدی کیجئے۔“

”جمال کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تم یہاں سے بھاگ چلیں۔“
”شہزادے آپ کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم بھاگ کے کہاں جائیں گے۔ تمام

ہے پہلے ہمارا قصور بتا دو تو ہماری روح کو تسکین ہوگی۔ ہم اپنی صفائی میں صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ آج تک ہم نے سلطنت کے کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دیا۔ آپ میں سے کسی امیر کے بارے میں کوئی غلط لفظ زبان سے نہیں نکالا۔ اگر آپ کو ہماری زبان پر اعتبار ہے تو ہماری جان بخشی فرمائیے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم اپنی جہال کے ساتھ کسی ایسی جگہ چلے جائیں گے جس کا کسی کو علم نہیں ہو سکے گا۔ یہ بھی یقین کیجئے کہ ہم نے سلجوقی سلطنت یا آپ لوگوں سے کبھی غداری نہیں کی۔ ہم اپنی اور اپنی جہال کی زندگی کی آپ سے بھیک مانگتے ہیں۔“

”سلطان عالم مقام! آپ غلاموں کو کیوں شرمندہ کر رہے ہیں۔“ امیر خاص بک نے سر اٹھایا۔ ”ہم سب آپ کے تابعدار اور وفادار ہیں۔ سلطان مسعود سلجوقی گزشتہ شب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں اور تمام امراء نے متفقہ طور پر آپ کو سلجوقی سلطنت کا سلطان تسلیم کر لیا ہے۔“

شہزادے کے کانپتے ہوئے ہاتھ پیراک دم ساکت ہو گئے اس نے بے یقینی سے امیروں کو دیکھا۔ ”سچ کہہئیے! امیر خاص بک آپ ہمارا مذاق تو نہیں اڑا رہے ہیں؟“

”خاص بک یا کسی امیر کی کیا جرات ہے کہ وہ سلطان وقت کا تسخیر اڑانے کا تصور بھی کر سکے۔“ خاص بک نے پھر تعظیم کے لئے سر جھکایا۔ ”عالی جاہ! دربار شریف لے چلے۔ امراء نذریں پیش کرنے کے لئے بے چین ہیں۔“

”امیر خاص بک! کیا ہم واقعی تمہاری بات کا اعتبار کریں۔ کیا تم نے ہمیں سلجوقی سلطان بنا دیا ہے؟“

”یہ تمام امراء کا فیصلہ ہے عل اللہ۔“ خاص بک نے کمال ادب سے جواب دیا۔ ”تو کیا ہمیں لباس تبدیل کرنے اور اپنی جہال کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہے۔“ شہزادے کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”عالی جاہ! آپ کو کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔ آج سے آپ کے ہر حکم کی عمل ہوگی۔ شاہی سواری آپ کو قصر سلطانی لے جانے کے لئے باہر موجود ہے۔“

”اچھا تو ہم ابھی چلتے ہیں۔“

امیر محل کے اندر آچکے ہیں۔ کیا پتہ فوجوں نے محل کو گھیر لیا ہو۔“

شہزادہ چل رہا تھا مگر اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ جمال نے اسے ٹوکا۔ ”آپ کدھر جا رہے ہیں۔ امیر خاص بک مہمان خانے میں انتظار کر رہے ہیں۔“

”جمال! کیا مابدولت ان سادے کپڑوں میں باہر آجائیں۔ آخر دنیا کیا کہے گی۔“

شہزادے کے سر پر شاہی طنطنہ اب بھی سوار تھا۔

”آپ کا دماغ چل گیا ہے شہزادے۔ اگر موت آتی ہے تو وہ آپ کے لباس کا کوئی لحاظ نہ کرے گی۔ اسی طرح فوراً تشریف لے جائیے۔“

شہزادہ رک کر جمال کی صورت دیکھنے لگا۔ خود اس کی صورت پر حسرت برس رہی تھی۔

”مجھے کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی شہزادے۔ میں تو آپ کے پاس آکے پچھتا رہی ہوں۔۔۔۔۔“ جمال ہاتھ ملنے لگی۔

”ایسا نہ کہو جمال۔ میں نے صرف تم سے محبت کی ہے۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں کیا پتہ پھر تمہیں دیکھنے کا موقعہ نہ ملے۔“

”للہ۔ شہزادے قدم بڑھائیے۔“

شہزادہ ملک شاہ لرزتا، کانپتا اور سہما سہما مہمان خانے کی طرف جا رہا تھا۔ محل کی کینیز اور غلام دم بخود کھڑے تھے۔ کسی کو علم نہ تھا کہ چند لمحوں کے بعد اس محل پر کیا گزرے گی۔ شہزادے کا تمام خون جیسے نچو گیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید تھا۔

شہزادہ سر جھکائے ہوئے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ امیر خاص بک اور دوسرے امراء اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ پھر امیر خاص بک اور تمام امراء شہزادے کے سامنے اس طرح جھک گئے جیسے وہ سلجوقی سلطان کو بجز پیش کر رہے ہوں۔

”شاہ دوراں۔ سلطان ملک شاہ بن محمود کی خدمت میں خادم خاص امیر خاص بک تسلیمات پیش کرتا ہے۔“ یہ الفاظ امیر خاص بک نے بڑی متانت سے کہے۔

شہزادے ملک شاہ نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔ تمام امیر اس کے سامنے جھکے ہوئے تھے۔ شہزادے نے مردہ آواز میں کہا۔ ”امیر خاص بک! کیوں مذاق اڑا رہے ہو۔ ہمیں قتل ہی کرنا ہے تو اس طرح ذلیل کرنے سے کیا فائدہ۔ ہاں اگر قتل

”شہزادے! مجھ سے کیا خطا ہو گئی۔ آپ نے اتنی جلدی آنکھیں پھر لیں؟“ جمال
وڑکائے لگی۔

”پھر وہی شہزادے۔“ ملک شاہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ”کیا تم نے اب تک نہیں
یا کہ ہم شہزادے سے سلطان ملک شاہ سلجوق بن چکے ہیں۔“
”معاف کیجئے عالی جاہ! مجھ سے غلطی ہو گئی۔“ جمال نے بھی ادب سے سر جھکا
یا۔

”نہیں جان سلطان! تمہیں ہمارا اتنا احترام کرنے کی ضرورت نہیں۔“ ملک شاہ
نے بڑی محبت سے جمال کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”اب تمہارے جمال سے قصر سلطانی
لگائے گا۔“

”ملکہ عالم! کیا ہم کنیزوں کو آپ یہیں چھوڑ جائیے گا؟“ ایک کنیز نے کہا۔
”نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ پھر جمال نے سلطان ملک شاہ سے درخواست کی۔
”عالی جاہ آپ حکم دیجئے کہ ہماری تمام کنیزیں ہمارے ساتھ قصر سلطانی جائیں گی۔“
”ہاں ہاں ہم حکم دیتے ہیں.....“ ملک شاہ..... نے ادھر ادھر دیکھا۔ قصر سلطان
فاجہ سرا کچھ دور سر جھکائے کھڑا تھا۔ ملک شاہ نے اس سے کہا۔ ”دیکھو! ہم حکم
دیتے ہیں کہ ہماری تمام کنیزیں اور غلام ہمارے ساتھ قصر سلطانی جائیں گے۔“
”عالی جاہ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔ سب کو شاہی محل پہنچا دیا جائے گا۔“ خواجہ
نے ادب سے کہا۔

ملک شاہ سلجوق نے اپنے محل میں موجود سب سے زیادہ نفیس اور قیمتی لباس
باتن کیا اور جمال کو ساتھ لے کر قصر سلطانی روانہ ہوا۔ قصر سلطانی میں امیر خاص
کے حکم سے ملک شاہ اور ملکہ جمال کا شاندار استقبال کیا گیا۔ عمائدین سلطنت
علاہ شاہی محل کے تمام منتظمین کو اس بات کا علم تھا کہ امیر خاص بک نے ملک
کو اپنی بساط شہنشاہ کا ایک مہرہ بنایا ہے اور یہ مہرہ اس وقت تک بساط پر قائم رہے
ب تک وہ خاص بک کے اشاروں پر چلتا رہے گا اور جب بھی اس نے خاص بک
کی حکم کی تعمیل میں عذر کیا اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا جائے گا۔ پہلے
انہوں نے ملک شاہ کا ایسا فقید المثل استقبال کیا کہ پہلے ہی دن سے ملک شاہ

اس کے ساتھ ہی شہزادہ ملک شاہ مہمان خانے سے نکل کے اس قدر بے تحاشہ
محل کے اندر کی طرف بھاگا کہ اس کے پیر کی ایک جوتی راستے ہی میں رہ گئی۔ وہ
ایک جوتی کو ساتھ گھسیتا ہوا محل میں داخل ہوا۔ باہر کھڑی ہوئی کنیزیں اور غلام اسے
حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ خطی شہزادہ آج بالکل ہی پاگل ہو
گیا ہے۔ ملک شاہ کی محبوبہ پری پیکر جمال اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگی کھڑی اپنے
کردہ اور ناکردہ گناہوں کی خدا سے معافی مانگ رہی تھی۔ اپنی جان کی سلامتی کی
دعائیں مانگ رہی تھی۔ اس نے ملک شاہ کو بدحواسی سے بھاگتے آتے دیکھا تو اس کا
دل ڈوبنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ شہزادے کے قتل کا حکم صادر ہو گیا ہے اور وہ جان
بچانے کے لئے محل کے اندر بھاگ آیا ہے۔

شہزادہ ہانپتا ہوا جمال کے کمرے میں آیا۔ جمال کے پاس بہت سی کنیزیں پریشانی
کے عالم میں کھڑی تھیں۔ شہزادے کی ہیئت کدائی دیکھ کر ان کے ہوش جاتے رہے۔
شہزادہ اندر آتے ہی دوڑ کر جمال سے لپٹ گیا۔ ”جمال..... جمال..... ہم..... ہم شہنشاہ
ہو گئے۔ ہم ملک شاہ سلطان سلجوق ہیں۔ تم ملکہ ہو۔ ملکہ عالم ہو۔ خاص بک ہمارا غلام
ہے۔ شاہی سواری باہر کھڑی ہے۔ ہم قصر سلطانی جا رہے ہیں۔“

جمال اس کے مضبوط ہاتھوں میں دبی ہوئی نکر نکر اس کے چہرے کو دیکھ رہی
تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ شہزادہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیسے وہ واقعی پاگل تو
نہیں ہو گیا۔ جمال اس کش مکش اور تذبذب کی کیفیت میں تھی کہ سبزے پکے والا
قصر سلطانی کا خواجہ سرا کمرے میں داخل ہوا اور ادب سے سر جھکا کر گویا ہوا۔ ”عالی
جاہ! جلد تشریف لے چلئے۔ سلجوقی امراء قدم بوسی کے لئے بے چین ہو رہے ہیں۔“
قصر سلطانی کے خواجہ سرا نے تمام شکوک و شبہات دور کر دیئے تھے اور سب کو
یقین ہو گیا کہ شہزادہ سلطان بن چکا ہے۔ پھر کنیزوں نے مبارک سلامت کے نعروں
سے پورا محل سر پر اٹھا لیا۔ جمال نے بڑے پیار سے کہا۔ ”شہزادے! کیا قصر سلطانی
آپ تنہا تشریف لے جائیں گے یا میں بھی....“

”دیکھو جمال تم ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہو مگر ہم تمہیں اپنی توہین کرنے کی
اجازت نہیں دے سکتے۔“ شہزادے نے اس پر رعب سے کہا کہ جمال سسم گئی۔

دربار کا مطالبہ کرتے۔ اصل طاقت اور اقتدار امیر خاص بک کے ہاتھ میں تھا اور اب اسی کا منہ دیکھتے تھے۔

ادھر بغداد میں نئے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ خلیفہ بغداد مقتفی کو جیسے ہی اطلاع ملا کہ سلطان مسعود سلجوقی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی جگہ امراء نے ملک شاہ جیسے ہلال کو سلجوقی سلطان کی گدی پر بٹھا دیا ہے تو انہوں نے بھی ہاتھ پیر نکالے۔ خلیفہ اپنے ہی سلجوقیوں کی سیادت کا جو اپنی گردن سے اتار پھینکنے کی کوشش کرتے تھے اور اب یہ نازک موقعوں کا انتظار کرتے تھے۔ پس خلیفہ مقتفی نے فوراً "سلجوقی امراء کو بغداد سے نکال باہر کیا اور ان کے محلات پر قبضہ کر لیا۔ بغداد کے شہنشاہ مسعود ہلال کو بھی بغداد سے بھاگنا پڑا۔ وہ بغداد سے ہمدان آ سکتا تھا کیونکہ ملک شاہ اس کا محسن اور اب احسان مند تھا لیکن مسعود ہلال کی امیر خاص بک سے نہ بنتی تھی۔ وہ ہمدان ہانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا پس بغداد میں جو سلطانی دستے اس کے پاس تھے انہیں لے کر نکرت پہنچا اور حلہ پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ مقتفی یہ کب برداشت کر سکتا تھا اس نے مسعود ہلال کو حلہ سے نکالنے کے لئے فوجیں بھیج دی تھیں۔ مسعود ہلال ہلالی مقابلے کی طاقت نہ تھی اس لئے اس نے حلہ سے بھاگ کے واسطے میں پناہ لی۔

سلجوقیوں کا غافل اور عیش پرست سلطان ملک شاہ اپنی محبوبہ جمال کے ساتھ ہمدان میں رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ شاہی حجام کا بیٹا ابراہیم اب بھی اس کا مقرب خاص تھا اور سلطان کے لئے نت نئے عشرت کے سامان مہیا کرتا تھا۔ جمال کو حکم تھا کہ وہ ہر گھنٹے نیا لباس تبدیل کرے اور بن سنور کرنے انداز سے اس کے سامنے آئے۔ جمال کی تمام کنیزوں کو بھی یہی حکم تھا۔ شاہی محل میں ایک گھنٹے سرخ رنگ کی دھوپ چلتی تو دوسرے گھنٹے اس کا رنگ سبز ہو جاتا۔ اس طرح ہر ساعت رنگ بدلتا رہتا۔ کبھی جمال کاسنی لباس میں جلوہ گر ہوتی تو محل کی ہر چیز کاسنی نظر آتی۔ کاسنی رنگ میں لمبیں کنیزیں جمال کے جلو میں چلتیں۔ کھڑکیوں، دروازوں اور دریچوں پر کاسنی رنگ کے پردے پڑ جاتے یہاں تک کے بستروں اور فرنیچر کا رنگ بھی کاسنی ہو جاتا۔

ملک شاہ راجہ اندر بنا شاہی محل کے دربار ہال میں زنانہ دربار لگاتا۔ ملکہ اور کنیز سلطان کو مجرا پیش کرتیں۔ رقص و موسیقی کی محفل بنتی اور ملک شاہ پھولے

یہ سمجھ بیٹھا کہ وہ سلجوقی سلطان ہی نہیں بلکہ سلطان عالم ہے اور اس کے حکم سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔

ملک شاہ نے شاہی لباس پہن کے بڑی شان سے پہلا دربار لگایا۔ تمام امراء نے نذرانے پیش کئے۔ شعراء نے قصائد پیش کئے اور گراں بہا انعام کے مستحق ٹھہرے۔ محل کی زنانی محفل میں سلطان ملک شاہ اور ملکہ جمال کو بیگمات اور شاہی خاندان کی دیگر خواتین نے ندریں گزاریں اور شہزادہ ملک شاہ ایک ہی دن میں سلجوقی سلطان بن گیا۔ خاص بک نے شاہی خزانچی کو حکم دے دیا کہ سلطان ملک شاہ کے جائز اور ناجائز ہر مطالبے کو بے چوں و چرا پورا کیا جائے مگر دوسرے عمامدین سلطنت کو حکم دیا کہ ملکی اور انتظامی معاملات میں سلطان کا کوئی حکم اس وقت تک تسلیم نہ کیا جائے جب تک امیر خاص بک اس کی اجازت نہ دے۔

ملک شاہ فطرتاً "عیش و عشرت کا دلدادہ تھا مگر اسے عیاش اس لئے نہیں کہا سکتا تھا کہ اسے محل کی خوبصورت کنیزوں سے کوئی خاص دلچسپی تھی۔ اسے یہ ہم خواہش نہ تھی کہ اس کے محل میں دیس دیس کی حسین عورتیں جمع کی جائیں۔ اس عشرت اور عیاشی کا محور اور مرکز صرف جمال تھی۔ جمال سے اسے واقعی عجب تھی..... اپنے مختصر دور حکومت میں اس نے جمال کے سوا کسی دوسری عورت طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ صرف جمال کے ناز و خجروں میں لگا رہتا اور ہر طرف اس دھن میں لگا رہتا کہ جمال کی خوشنودی کے لئے ہر وہ چیز مہیا کرے جس کی جم خواہش کرے خواہ اس میں شاہی خزانہ خالی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ملکہ جمال کسی قبیلے یا کسی خاندان سے سہی لیکن قدرت نے اسے حسن و جمال کے علاوہ عقل اور سمجھ بھی عطا کی تھی اس نے شاہی محل میں قدم رکھتے ہی یہ انداز کر لیا تھا کہ عیش و عشرت کے اس طوفانی سمندر کی شوخ و شنگ لہروں پر ملک زیادہ دن تک قابو نہ رکھ سکے گا اور ان میں بہتا ہوا کہیں سے کہیں نکل جائے گا۔ ملک شاہ کو فضول خرچی اور عشرت پسند سے بھی نہ روک سکتی تھی۔ اس نے پہلی کوشش کی ملک شاہ عیش و عشرت کے ساتھ ملکی معاملات میں بھی دلچسپی لے سلطان نے تو دربار لگانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ امراء کو سلطان کی ضرورت بھی کب نہ

نہ سہاتا۔ دوسرے گھنٹے یہ محفل کسی دوسرے رنگ میں بدل جاتی۔ ملک شاہ کے رات یونہی گزر رہے تھے اور وہ عیش و عشرت کو ہی اصل سلطانی سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ کو تمام دنیا کا عیش حاصل تھا۔ ملک شاہ اس کے اشارے کا منتظر رہتا تھا مگر جمال دار عورت تھی۔ اسے یہ اسراف پسند نہ تھا۔ وہ سلطان کی باتوں پر کڑھتی تھی۔

ملک شاہ نے ایک دن جمال کو خاموش دیکھا تو وہ تڑپ اٹھا۔ ”جان سلطان تم کیا ہوا۔ یہ چاند سے مکھڑے پر فکر کے سائے کیوں؟“

”عالی جاہ! مجھے عشرت کی یہ محفلیں بالکل پسند نہیں۔“ جمال کے اندر دبا ہوا غصے کا لاوا پھٹ پڑا۔

”کیا کہہ رہی ہو جمال؟“ ملک شاہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”یہ مختصر زندگی عشرت سے عبارت ہے۔ انسان اس عیش و عشرت کے لئے تمام جدوجہد کرتا ہے۔ کفران نعمت کر رہی ہو جمال۔“

”کفران نعمت میں نہیں آپ کر رہے ہیں عالی جاہ۔“ جمال نے تنک کے ا ”آپ سلجوقیوں کی عظیم سلطنت کے سلطان ہیں مگر آپ کو یہ بھی علم نہیں کہ محل کے باہر کیا ہو رہا ہے۔؟“

”تم نادان ہو جمال باہر کی فکر کرنے کے لئے ہمارے نوکر ہیں۔ عمائدین سلط ہیں۔ امراء ہیں۔ سب سے بڑھ کر ہمارا وفادار امیر خاص بک ہے اس نے انتظامات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہیں۔ پھر ہمیں فکر کی کیا ضرورت ہے۔“

”عالی جاہ! یہ خیال غلط ہے۔“ جمال نے سختی سے تردید کی۔ ”سلطان آپ بلکہ خاص بک ہے۔ حکم اس کا چلتا ہے۔ آپ تو شاہی فرمانوں پر دستخط کرنے کی ہیں۔“

”جان سلطان! اس قدر ناراض نہ ہو۔ یہ گلزار چہرہ پھیکا پڑ جائے گا۔“ اور ملک شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے برابر بٹھالیا۔

”عالی جاہ! آپ غافل ہیں۔ آپ خواب میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ سفر اس دشمن ہو جائے گا جب خاص بک آپ کو معزول کر کے کسی دوسرے کو سلطان بنادے گا۔“

جمال نے ایک ایسی پیشین گوئی کی جسے سن کر سلطان کانپ اٹھا۔ ذرا دیر بعد بولا مگر خاص بک ایسا کیوں کرے گا جمال۔ وہ تو ہمارا تابعدار ہے؟“

”وہ ہرگز آپ کا تابعدار یا وفادار نہیں۔“ جمال شیرینی کی طرح بھرپڑی۔ ”آپ نے اسے حکم دیا تھا کہ بغداد پر حملہ کر کے خلیفہ کو مسعود بلال کو بغداد سے نکالنے کی مرادی جائے لیکن اس نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔“

”یہ بات نہیں ہے جمال۔“ ملک شاہ میں شاید پہلی مرتبہ سنجیدگی پیدا ہوئی۔ ”سلطانی لشکر واسطہ بھیجا گیا تھا اور اس لشکر کو دیکھ کر خلیفہ اپنی فوجوں کو واپس لے کر بغداد چلا گیا۔“

”مگر خاص بک نے مسعود بلال کو آپ کے پاس کیوں نہیں بھیجا؟“ جمال نے ایسا سوال کیا جس کا جواب سلطان کے پاس موجود نہ تھا۔ وہ جمال کا منہ دیکھ کے رہ گیا۔

”آپ کے پاس اس کا جواب نہیں لیکن میں جانتی ہوں۔“

”تم..... جمال تم جانتی ہو؟“

”جی ہاں عالی جاہ! خاص بک یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی ایسا امیر آپ سے ملاقات کرے یا آپ کے قریب ہو سکے جو آپ کا ہمدرد اور بھی خواہ ہو۔“ ملکہ جمال نے اپنا ہاتھ مشاہدہ بیان کیا۔ ”آپ نے دربار میں جانا چھوڑ دیا ہے لیکن آپ نے بعض امراء کو ملاقات کی اجازت دی ہے۔ آپ سے ملنے والے یہ چھوٹے امراء بھی خاص بک کے خلاف ہیں اور اسے معزول کرنا چاہتے ہیں۔“

”جمال اگر تمہارا یہ خیال درست ہے تو پھر ان امیروں سے ہم کام لے سکتے ہیں۔ خاص بک ہمارے خیال میں بھی بہت خود سر ہو گیا ہے۔ اس کا علاج کرنا پڑے گا۔“ ملک شاہ نے خود ہی اپنی تباہی کو دعوت دی۔

”یہ سب کمزور سارے ہیں عالی جاہ۔“ جمال متانت سے بولی۔ ”خدا! خواستہ اگر تم کو کوئی وقت پڑا تو یہی امراء ہمارے بجائے خاص بک کا ساتھ دیں گے۔“

”پھر تم ہی بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”خود کشی۔“

ملک شاہ گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ ”کیا کہہ رہی ہو جمال؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں عالی جاہ۔“ جمال نے بڑی مستقل مزاجی سے کہا۔ ”کل جو ذلت پیش آنے والی ہے اس سے یہ بہتر ہے کہ ہم خود موت کو گلے لگالیں۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو۔ جمال۔“ اور ملک شاہ نے فوراً ”رقص و موسیقی کی محفل کا حکم دیا۔“

جمال نے جو کچھ مشاہدہ کیا تھا اور اس مشاہدے سے نتیجہ نکالا تھا وہ بالکل درست تھا۔ جمال نے اس کے بعد پھر ملک شاہ سے اس سلسلے میں گفتگو نہ کی اور اس نے خود کو بھی عشرت کی ان محفلوں میں غرق کر دیا۔ اب وہ خود عیش و عشرت کے نئے سامان منگاتی اور خوب داد عیش دیتی۔ ایک دن ملک شاہ نے اس سے پوچھا۔

”جمال پہلے تم ہی نصیحت کرتی تھیں مگر اب ہم سے زیادہ زندگی کی رنگینیوں کا لطف اٹھا رہی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“

”اس کی وجہ یہ ہے کہ اب میں انجام سے بے پروا ہو گئی ہوں۔“ اور جمال نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

”ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے جمال؟“

”عالی جاہ! حضرت آدمؑ نے خدا کے حکم کی صرف ایک بار نافرمانی کی تھی جس کی پاداش میں انہیں جنت سے نکال کر اس سنگلاخ زمین پر پھینک دیا گیا۔“ جمال نے شوخ نظروں سے ملک شاہ کو دیکھا ”مگر آپ نے وقت کے بادشاہ خاص بک کی اس قدر نافرمانیاں کی ہیں جس کا شمار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے صبر کا پیمانہ کسی وقت چھلک سکتا ہے پھر آپ ہوں گے اور قید خانے کی سلاخیں۔“

اور سلطان نے اس کو شوخی سے جواب دیا۔ ”جمال! جنت سے حضرت آدمؑ کے ساتھ حضرت حوا بھی باہر کی گئی تھیں۔ اگر ہمیں قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے بھجا گیا تو تم بھی ہمارے ساتھ ہو گی۔“

”بے شک عالی جاہ!“ جمال نے گردن اٹھا کر کہا۔ ”میں نے عالی جاہ کا عیش و عشرت میں ساتھ دیا ہے تو پھر ان کے ساتھ قید کی سختیوں کو بھی برداشت کروں گی۔“

پری جمال نے جو کہا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ رجب 547ھ میں ملک شاہ کو سلطانی ملی تھی اور صفر 548ھ میں خاص بک نے ملک شاہ کو معزول کر کے بیرج ہمدان میں

بند کر دیا۔ جمال نے یہ بھی ثابت کیا کہ وہ واقعی ملک شاہ کے سکھ دکھ کی ساتھی ہے ملک شاہ کی گرفتاری کے وقت اس نے درخواست کی کہ اسے ملک شاہ کی خدمت کے لئے قید خانے بھیج دیا جائے اور وہ اس طرح از خود ملک شاہ کی قید و بند کی صعوبتوں میں شریک ہوئی۔

رہنے پر گیا۔ اس کی کثیر نوشتائی مگر تپتی پڑتی رہی تھی۔ عبدالرحمن کو
لے کا احساس ہوا۔ اس نے بڑھ کر دیوار سے لٹکی ہوئی تلوار اتار لی۔

”آقا! نوشتائی نے اوپر آ کے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”آپ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔“
”بھاگ جائیں۔“

”مگر بھائی یحییٰ کہاں ہیں؟“ عبدالرحمن نے پریشانی سے پوچھا۔
”ان۔۔۔۔۔ ان کی فکر نہ کیجئے آقا۔۔۔۔۔“ نوشتائی کے پیٹ میں سانس نہ سہا
رہی تھی۔ ”عباسیوں نے۔۔۔۔۔“ نوشتائی نے آگے کچھ نہ کہا اور حسرت بھری
نگاہوں سے شہزادے کو دیکھنے لگی۔

عبدالرحمن کے ہاتھ میں تلوار کانپنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے بھائی یحییٰ کو
ہابیوں نے قتل کر دیا ہے۔ پھر بھی اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”نوشتائی خدا
کے لئے جاؤ۔ میرا بھائی کہاں ہے؟“

”میرے آقا۔۔۔۔۔!“ کثیر کے ہونٹ لرزے لگے، آنکھیں بھر آئیں۔ ”وہ
ہابیوں سے لڑتے لڑتے۔۔۔۔۔“ کثیر کا گلا رندھ گیا اور آنکھیں برسنے لگیں۔

”میں۔۔۔۔۔ میں ان سے انتقام لوں گا۔۔۔۔۔“ عبدالرحمن نے چیخنے ہوئے
لا اور تلوار بے نیام کر لی۔ کثیر دوڑ کر عبدالرحمن کی راہ میں حائل ہو گئی۔ ”نہیں
فائیں، وہ ہزاروں ہیں اور آپ۔۔۔۔۔ تلوار پھینک دیجئے۔ آپ کی جان بہت قیمتی
ہے۔ نفعے سلیمان کا خیال کیجئے۔ آپ اس کے لئے زندہ رہئے۔“

سلیمان، شہزادے کا چار سالہ لڑکا تھا۔ بیٹے کا نام سن کر عبدالرحمن کی آنکھوں
میں کی تصویر گھوم گئی۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر تلوار نیام میں ڈال لی۔

”باغی کس جگہ ہیں؟“ عبدالرحمن نے کثیر کو راہ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں
باغی کی لاش اٹھا کر لا سکتا ہوں کیا؟“

”نہیں آقا۔“ نوشتائی سختی سے بولی۔ ”میں آپ کو صدر دروازے سے نہیں
لے دوں گی۔ ہزاروں باغی سیاہ پرچم اٹھائے گاؤں میں داخل ہو چکے۔ دروازے کا
کھڑا مجھے خبر کر کے بھاگ گیا ہے۔ آپ پچھلے دروازے سے نکل جائیے۔“

”اور تم۔۔۔۔۔ تم کیا اکیلی رہو گی یہاں؟“ عبدالرحمن نے حیرانی سے پوچھا۔

صحرا نور و شہزادہ

حسن اتفاق سے عبدالرحمن اپنی جاگیر پر گیا ہوا تھا۔

اموی شہزادے عبدالرحمن کی جاگیر دار الخلفہ دمشق سے ہزار میل دور تھی۔
دریائے فرات کے کنارے فارس کی حدود میں یہ بڑا خوش حال علاقہ تھا۔ عبدالرحمن
اپنی جاگیر کی دیکھ بھال کے لئے سال میں ایک ماہ کے لئے یہاں آیا کرتا تھا۔ جس وقت
اموی حکومت کا خاتمہ ہوا، شہزادہ، فرات کے کنارے ایک محل میں مقیم تھا۔ اسے
اموی حکومت کے خاتمے اور عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کی اڑتی ہوئی خبر اسی محل
میں ملی تھی۔ عبدالرحمن نے اس خبر کی تصدیق کے لئے اپنے بھائی کو کچھ ہی دیر پہلے
باہر بھیجا تھا۔ سوائے ایک غلام اور کثیر کے محل کے تمام ملازم اسے چھوڑ گئے تھے۔
کیونکہ دمشق اور دوسرے مقامات پر اموی شہزادوں کا قتل عام ہونے کی خبریں گشت
کرتی پھر رہی تھیں۔

عبدالرحمن محل کے دروازے بند کرا کے بلائی منزل کے ایک کمرے میں جا
چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اسی وقت زینے پر کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ عبدالرحمن دوڑ

”میری فکر نہ کیجئے آقا!“ نوشائی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”میں تنہا ہوں اور عمر بھر تنہا ہی رہوں گی۔ میں آپ کو زندہ سلامت دیکھنا چاہتی ہوں۔“

نوشائی کے خلوص سے شنزادہ بہت متاثر ہوا۔ وہ بال بچوں والا تھا لیکن مردانہ وجاہت کا بھی اسے احساس تھا۔ دراز قامت کشادہ پیشانی، مضبوط اعضاء، چوڑا چکلا سینہ، گھونگرہ والے بالوں نے تو اس کی رعنائی میں اور چار چاند لگا دیئے تھے۔ و الرحمن کی آنکھوں میں مسکورت کن جاذبیت تھی۔ جس وقت وہ گھوڑا چکاتا ہوا دمشق بازاروں سے گزرتا تو دکان دار اور خریدار اس یوسف ثانی کو دیکھ کر رہ جاتے عورتیں دروازوں پر آ جاتیں اور دو شیرازیں در بچوں سے لگ کر ٹھنڈی سانسیں لے لگتیں۔ دوسرے اموی شنزادے سر تا پا عیش و عشرت میں غرق رہتے تھے لیکن عبدالرحمن نے نہ تو اب تک شراب کو ہاتھ لگایا تھا اور نہ کسی خوبصورت سائے تعاقب کیا تھا۔

”نوشائی!“ شنزادے نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا ”میں تمہاری پرظوم خدمت کبھی نہ بھولوں گا اگر میں زندہ رہا اور کوئی مقام حاصل کیا تو تمہیں تلاش کر کے اپنے پاس بلواؤں گا۔“

”شنزادے اگر مجھے بھول بھی جائیں تو مجھے کوئی افسوس نہ ہو گا“ نوشائی نے نہیں کس جذبے سے کہا۔ ”مجھے زندگی گزارنے کے لئے شنزادے کے یہ الفاظ کلام ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی نوشائی کی چیخ نکل گئی۔ ”شنزادے۔۔۔۔۔ جلدی بھاگئے۔ جا پرچم بردار قاتل آگئے۔“

شنزادہ عبدالرحمن نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ محل سے کچھ دور اسے سیاہ پرچم نظر آئے۔ اس نے نوشائی پر نظر ڈالی۔

”اچھا نوشائی! میں جا رہا ہوں۔“ اور شنزادہ میڑھیوں کی طرف بڑھا۔

”فی امان اللہ“ خدا آپ کو زندہ سلامت امن کی جگہ پہنچائے۔“

نوشائی، شنزادے کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی اور شنزادہ عبدالرحمن نے نہ اتار کر پائیں باغ پار کیا اور محل کی دیوار چھاند کر باہر نکل گیا۔ اس نے گھوڑا لے کر مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ دشمن چار اطراف سے محل کی سمت بڑھ رہے تھے اور

۷۵۰ء کا آغاز بنی امیہ کی خلافت کے لئے بڑا پر آشوب ثابت ہوا۔ ابو مسلم زہری نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ اموی خلیفہ مروان ثانی نے عباسی سردار عبداللہ بن عباسے ساحل زاپ پر شکست کھائی اور موصل میں پناہ حاصل کی لیکن عباسی لشکر اسے غائب کرتا ہوا موصل پہنچا۔ مروان وہاں سے بھاگ کر مصر پہنچا لیکن وہاں بھی اسے شکست کھانی۔ مروان اور پینٹھ سالہ بوڑھا خلیفہ، بوجہ کے مقام پر لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس نے خلافت امیہ کا آخری چراغ ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲ھ یعنی اگست ۷۵۰ء کو ہمیشہ کے لئے بجھا دیا اور تخت خلاف پر ابو العباس سفاح عباسی نے قدم رکھا۔

ابو العباس نے بنو امیہ کے خاندان کے تمام شنزادوں کی ایک فہرست تیار کرانے بعد ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ اموی شنزادے ایک ایک کر کے اقتدار کی بھینٹ بن گئے۔ اگر عبدالرحمن دمشق میں موجود ہوتا تو یقیناً ”قتل کر دیا جاتا لیکن وہ اس باب کے وقت دمشق سے دور اپنی جاگیر پر گیا ہوا تھا۔ اس لئے وہ کسی کے ہاتھ نہ

ابو العباس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک ایک بھی اموی شنزادہ زندہ ہے وہ اسے نہ بیٹھے گا۔ اس نے شنزادہ عبدالرحمن کے سر کی ایک ہزار اشرفی قیمت مقرر کر دی۔ انعام کا اعلان ہوتے ہی مفاد پرست، شنزادے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے پوچھتے پوچھتے اس کی جاگیر تک پہنچ گئے۔

شنزادہ بڑی بے سرو سامانی کے عالم میں محل سے نکلا تھا۔ شام کے دھندلکے نے دشمنوں سے پوشیدہ رکھا اور جس وقت عباسی پرچم بردار اس کے محل پر پہنچے تو وہ ماسے کافی دور نکل چکا تھا۔ نوشائی چھت پر کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی اور اقتدار کی اسے شائق اور پامالی پر آنسو بہا رہی تھی۔ پھر محل کے بھاری دروازے پر چوٹیں پڑنا لگا ہوئیں۔ نوشائی کو اطمینان ہوا کہ شنزادہ بچ کر نکل گیا ہے ورنہ شنزادے کے لاشیں نہ آتے۔ وہ محل میں اسیلی تھی۔ اگر دروازہ کھولنے خود نہ جاتی تو وہ توڑ دیا لاش لئے وہ بھاگتی ہوئی نیچے گئی اور جا کے دروازہ کھول دیا۔

محل کا دروازہ کھلا تو دشمنوں کے پرے کے پرے اندر گھس آئے۔ نوشائی دبک

پہنچ گیا۔ ہال کا دروازہ اتنا بڑا تھا کہ گھوڑا معہ سوار کے اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ اس ہال کو بڑی محنت سے سجا کر اس کے ایک حصے میں لائبریری بھی بنائی گئی تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ وہاں بیٹھ کر مطالعہ کرتا تھا۔ پورے ہال میں کافرش اور دیواروں پر بہترین تصاویر سونے کے فریموں میں جڑی آویزاں تھیں۔ کچھ لوگ پہلے ہی ہال میں پہنچ چکے تھے اور انہوں نے تصویروں کو پھاڑ کے ان کے فریموں پر قبضہ کر لیا تھا۔

جب محافظ ہی نمک حرامی پر تل جائیں تو اور کسی کو کیا دوش دینا۔ عبدالرحمن کی تمام قیمتی اشیاء لوٹ لی گئیں۔ نوشائی سے یہ بتا ہی نہ دیکھی گئی اور وہ چپکے چپکے نکل کر ایک طرف چل پڑی۔ نوشائی ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ ہٹ پر روشنی محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر جو دیکھا تو عبدالرحمن کا محل شعلوں میں لگا ہوا تھا۔ نوشائی کے سینے سے ایک درد بھری سسکی ابھری اور پھر وہ پلٹ کر خوف زدہ قدموں سے آگے بڑھنے لگی۔

اس گاؤں کے کھیا کا مکان بالکل سرے پر تھا۔ نوشائی وہاں پہنچی تو عورتوں کے گانے سننے کی آواز سنائی دی۔ نوشائی اندر چل گئی۔ گاؤں کا کھیا روز محل پر لڑائی کی سلائی کو آتا تھا۔ اندر پہنچ کر اس نے وہ منظر دیکھا کہ اس کے جسم کے نچلے کمرے ہو گئے۔ بیچ آگن میں دو لاشیں پڑی تھیں۔ ایک کھیا کی لاش تھی۔ لاش سر بیدار تھی۔ کھیا کی بیوی نے نوشائی کو بتایا کہ دن ڈھلے شہزادہ بیٹی یہاں آئی تھی۔ انہوں نے کھیا سے باتیں شروع کی تھیں کہ دشمنوں نے گھر کو گھیر لیا تھا۔ شہزادے کا چچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے۔ پھر کھیا کی بیوی نے ایک لاش لے کر بتایا کہ اس کے شوہر اور شہزادے بیٹی نے فوراً تلواریں نکال لیں اور لڑتے ہوئے جان دے دی۔ کھیا کی بیوی نے یہ بھی بتایا کہ دشمنوں کے گویاں تک لانے والا محل کا ایک محافظ تھا۔

لوگوں کے لالچ نے ان دنوں اپنے پرانے کی تمیز مٹا دی تھی۔ محل کے محافظ جب سے انعام کا اعلان سنا تھا وہ بوکھلایا بوکھلایا پھر رہا تھا۔ آخر اس نے رابطہ قائم کیا اور انہیں شہزادے عبدالرحمن کے محل پر چڑھا لایا۔ شہزادہ

کر ایک طرف ہو گئی۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ آنے والوں کے چہرے صاف نظر نہ آتے تھے۔ وہ بھوتوں کی طرح محل کے کمروں اور راہداریوں میں دوڑنے لگے۔ پھر انہیں کہیں سے شمعیں مل گئیں اور ایک ساتھ درجنوں شمعیں جل اٹھیں۔

”کدھر ہے۔ کہاں ہے پکڑو۔ جانے نہ پائے۔“ کی آوازیں ہر طرف بلند ہو رہی تھیں۔ محل کا قیمتی سامان لوٹا جا رہا تھا۔ اور بھاری بھاری پلنگ اور بسترے الٹ پلٹ کئے جا رہے تھے، جیسے ان کے خیال میں شہزادہ کسی پلنگ کے نیچے گھسا ہے یا اس نے خود کو بستر میں لپیٹ لیا ہے۔ شور اس قدر ہو رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ دشمنوں کا یہ بے قابو گروہ، پیادوں پر مشتمل تھا۔ ذرا دیر بعد کچھ سوار بھی گھوڑے دوڑاتے اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک سوار کی نظر نوشائی پر پڑی۔ وہ تیزی سے گھوڑے سے اترا اور نوشائی کے بال پکڑ لئے۔

”کہاں ہے عبدالرحمن؟“ سوار نے چیخ کے پوچھا۔

”آقا باہر گئے ہیں، شہزادہ بیٹی کو ڈھونڈنے۔“ نوشائی نے مردہ آواز میں جواب دیتے ہوئے سوار کو حیران نظروں سے دیکھا۔ کیونکہ دوپہر تک یہی سوار محل کے صدر دروازے کا محافظ سردار تھا اور اب اپنے آقا کا نام لے کر اپنی نمک حرامی کا ثبوت دے رہا تھا۔

سوار نے بال چھوڑتے ہوئے ایک زور دار تھپڑ نوشائی کے گل پر جڑوا۔ ”جھوٹ بول رہی ہے کہنی! میں خود عبدالرحمن کو محل میں چھوڑ کے گیا تھا۔“ نوشائی کو تھپڑ سے چکر آ گیا۔ اس نے مشکل سے خود کو سنبھالا اور بولا۔ ”داراب! تم جانئے ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتی۔ پہلے شہزادے بیٹی باہر گئے پھر آقا باہر نکلے تھے۔“

”کتنی دیر ہوئی اسے باہر گئے ہوئے؟“ نمک حرام نے پھرتے ہوئے پوچھا۔

”بہت دیر ہوئی۔“ نوشائی مختصر سا جواب دے کر گل سہلانے لگی۔

داراب اچک کر گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اگر عبدالرحمن محل میں مل گیا تو

تیری بوٹیاں کر دی جائیں گی۔“

نوشائی نے کوئی جواب نہیں دیا اور داراب راہداری طے کر کے محل کے بڑے

کاہر تھا کہ اگر وہ جماعت میں شریک ہوتا تو اسے نماز کے بعد ایک ساتھ بہت بے دردی کا طعنہ ضرور دیتے۔ چند لمحے وہ اسی کش مکش میں گرفتار مسجد کے دروازے پر کھڑا سوچتا رہا۔ آخری کسی غیبی طاقت کے تحت وہ جلدی سے مسجد میں ہوا اور وضو کر کے جماعت میں شامل ہو گیا۔ عبدالرحمن پکا نمازی نہ تھا لیکن اس نے فرضوں اور سنتوں کی ادائیگی میں جو سرور اور طمانیت حاصل ہوئی ایسی نواسے دولت کے ڈھیر دیکھ کر بھی کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔

یہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی چھوٹی سی مسجد تھی۔ نماز کے بعد زیادہ لوگ اکوچلے گئے۔ چند آدمی باقی رہ گئے جنہوں نے امام کے گرد حلقہ بنا لیا اور اسے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ عبدالرحمن نماز سے فارغ ہو کر ایک گوشے میں بیٹھا رہ رہا تھا اور ان کو کن انکھیوں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ اس نے طے کیا تھا کہ کے جانے کے بعد وہ امام مسجد سے اپنی بھوک کا اظہار کرے گا لیکن لوگ امام کو رہنے لگے تھے اور اس وقت گفتگو کا کوئی موقع نہیں تھا۔ عبدالرحمن نے بھی دکر و طیفہ بند کیا اور ان کے پیچھے آ کے بیٹھ گیا۔ اب اس کا دل قوی ہو گیا تھا نماز کا اثر تھا یا پھر جب انسان موت کے زیادہ قریب ہو جاتا ہے تو پھر اسے آنکھیں ملانے میں بھی کوئی جھجک نہیں محسوس ہوتی۔

امام مسجد نے مراقبے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا غضب نازل ہوا ہے امیہ؟ خدا کی پناہ۔ کیسے کیسے جو ان سولی چڑھ گئے۔ انتقام نے لوگوں کو اندھا کر دیا“

”دوست فرمایا پیرو مرشد۔“ ایک نمازی ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔ ”دمشق کی مٹی خون بہہ رہا ہے۔ لاشیں بے گور و کفن پڑی ہیں۔ یہ خدا کا قہر نہیں تو اور کیا کہہ سکتا تھا کہ اتنی بڑی سلطنت دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو جائے گی۔“

”خدا اپنی پناہ میں رکھے۔“ دوسرے نمازی نے کہا۔ ”کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ اللہ اگر نہ کر تو بھی خدا کے غضب سے ڈرتا رہے۔ ایک سے ایک شریف آدمی اٹھتا ہے۔ سب ہی تو برے نہیں تھے مگر قہر خداوندی کا سیلاب سب کو بہا

یجی کو کھیا کے گھرماد کر وہ محل کی طرف بڑھے۔ خدا ابھلا کرے ایک غلام کا جس نے نوشانی کو اطلاع دے دی ورنہ عبدالرحمن، بھائی کے انتظار میں محل میں بیٹھا رہتا تو دشمن یجی کی طرح اس کا بھی خاتمہ کر دیتے۔

شہزادہ عبدالرحمن محل سے نکلنے کے بعد رات بھر آبادیوں سے بچتا ہوا اور بڑھتا رہا۔ صبح ہوئی تو اس نے خود کو ایک دیرانے میں پوشیدہ کر لیا۔ رات بھر پیدل کرنے سے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا جھکن اس قدر غالب تھی کہ اس آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں مگر اس نے آنکھ نہ جھپکائی کہ مبادا دشمن اس دروازے میں پہنچ جائیں اور اسے غافل پا کر قتل کر دیں۔ وہ تمام دن چوکنا چھپا بیٹھا رہا اور رات ہوتے ہی بغیر کچھ کھائے پئے آگے چل پڑا۔ دوسری رات کے اختتام پر وہ اپنی جا سے نکل چکا تھا لیکن اب بھی دن میں سفر کرنے سے خوف محسوس ہوتا تھا کہ کب پہچان نہ لیا جائے۔ عبدالرحمن کئی سال سے ان راستوں سے گزر کر اپنی جاگیر پر جاتا رہا تھا لیکن ان راستوں کے گرد آباد گاؤں اور قصبوں کے سوائے ذیلداروں کے کھیاؤں کے کسی اور سے شناسائی نہ تھی اور ان ذیلداروں کے یہاں پناہ حاصل کرنا کے خیال میں خطرے سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ اس نے باہر نکلنے کی کوشش نہ کی اور پورا دن چھپا بیٹھا رہا۔

رات ہوئی تو اس نے آگے بڑھنے کا قصد کیا لیکن بھوک نے اس کے قدم لئے۔ دو دن اور دو راتیں اس نے بغیر کچھ کھائے گزاری تھیں۔ پانی تو اسے کئی جگہ لیکن کھانا تلاش کرنے کی اس نے کوشش نہ کی لیکن اب بغیر کچھ کھائے اس کے آگے چلنا ناممکن ہو گیا۔ عبدالرحمن کی جان اتفاقیہ طور پر بچی تھی۔ وہ اس اتفاق کو دے رہا تھا۔ اس خونی انقلاب کے وقت وہ دار الخلافہ دمشق سے دور تھا لیکن ایک اتفاق ہی تھا کہ تیسری رات کو وہ جس جگہ موجود تھا وہاں دور دور تک کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ یہاں تک کہ کوئی ایسا باغ بھی موجود نہ تھا جس سے حاصل کر کے وہ پیٹ کے جہنم کو بھرتا۔ ہر طرف سے مجبور ہو کر اسے آبادیوں کو کرنا پڑا تاکہ کھانے کے لئے کچھ حاصل کر سکے۔

عبدالرحمن جس وقت باہر میں پہنچا تو عشاء کی نماز کی جماعت کھڑی ہوئی۔

لے گیا۔

”تم نے بھی ٹھیک کہا بھائی۔“ پیش امام بولے۔ ”تین دن پہلے ایک بوڑھا مسجد میں آیا تھا۔ پتہ نہیں کون تھا۔ شرافت چہرے سے ظاہر تھی مگر وہ خود کچھ نہ کرتا تھا۔ میں نے بہت تسلیاں دیں لیکن وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر وحشت زدہ سا چلا گیا۔“
عبدالرحمن کا دل رو رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ چیخ کر کہے کہ میں بھی اسی بوڑھے کے خاندان سے ہوں۔ میں بھی شریف ہوں مگر دشمن کی نظر میں شریف اور برابر ہوتے ہیں۔ انتقام ایک ایسی آگ ہے جو سب کچھ جلا ڈالتی ہے مگر وہ کچھ نہ سکا اور چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہا۔ ان کی باتوں سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ ہر ایک کے نیک اور سادہ لوح بندے اپنے دل میں ہر ایک کے لئے محبت اور خلوص ہیں۔

امام مسجد دیر تک انہیں نصیحتیں کرتے رہے پھر ایک ایک کر کے سب رہ گئے اور سوائے عبدالرحمن کے اور کوئی مسجد میں نہ رہ گیا۔ اس وقت نیک دل مسجد نے پوچھا۔ ”بھائی تم مسافر معلوم ہوتے ہو۔ اگر بھوکے ہو تو گھر میں جو کچھ دلیا ہے، حاضر کروں۔ اگر رہنے کو ٹھکانا نہیں تو ایک حجرہ خالی ہے“ اس میں رات سکتے ہو۔“

عبدالرحمن نے آہستہ سے کہا۔ ”اگر کھانے کو کچھ میسر آ جائے تو آپ گزار ہوں گا۔“ اور اس طرح عبدالرحمن نے خود کو پیش امام کے رحم و کرم دیا۔

”فکر کی کوئی ضرورت نہیں مسافر۔“ پیش امام کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ”اللہ ایسا رازق ہے جو مسافر کا رزق اس کی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی بھیج دیتا ہے۔“
مسجد میں صرف دو حجرے تھے۔ ایک میں امام مسجد تنہا رہتا تھا اور مسافروں کے لئے ہر وقت خالی رہتا تھا۔ امام مسجد ایک حجرے میں گیا اور مسافر کے کھانا لے کے آ گیا۔ اس نے شانے سے اپنا رومال اتار کے مسافر کے سامنے بچھا دیا۔ کھانا رکھتے ہوئے کہا۔ ”آج گاؤں کے ذیلدار نے نذر دلائی تھی۔ اتنا کھانا مجھے میں اکیلے نہ کھا سکا۔ سوچ رہا تھا کہ صبح تک خراب ہو جائے گا لیکن مجھے کیا

ابیرے مولا کو اسے کھانے کے لئے ایک مسافر بھیجا ہے۔“

عبدالرحمن نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ باوجود بھوکا ہونے کے اس نے کھانے میں احتیاط برتی کہ وہ زیادہ کھا کے بے سدھ نہ ہو جائے بلکہ کھانے سے طاقت حاصل کرے اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ کھانے کے بعد عبدالرحمن نے پہلے اللہ کا شکر ادا کیا اور امام مسجد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

”ارے بھائی! کہاں جا رہے ہو؟“ امام نے گھبرا کر پوچھا۔ ”اللہ نے رات آرام کے لئے بنائی ہے۔ صبح ہوتے ہی چلے جانا۔ حجرہ خالی ہے اس میں اطمینان سے لیٹ جاؤ۔“

”نہیں بزرگ۔“ عبدالرحمن نے بے چینی سے کہا۔ ”مجھے اپنی منزل پر جلد از رہنا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے وہاں پہنچنے کی کتنی جلدی ہے۔“

”میں تمہیں روک تو نہیں سکتا۔“ امام نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن یہ ضرور کہو کہ لڑنا بڑا پر آشوب ہے۔ بھائی، بھائی کا دشمن ہو رہا ہے۔ رات کا سفر یوں بھی اچھا نہیں ہے۔ لوگ لالچ میں گرفتار ہیں۔ انعام حاصل کرنے کے لئے لوگوں کو پکڑتے اور لڑکراتے رہتے ہیں۔“

”آپ فکر نہ کریں بزرگ!“ عبدالرحمن نے مسکرا کے کہا۔ ”جو مجھے یہاں تک لے آیا ہے وہی مجھے آگے بھی لے جائے گا۔“

عبدالرحمن سلام کر کے مسجد سے باہر آیا اور ایک طرف چل پڑا۔

☆☆☆

شل مشہور ہے کہ مصیبت میں عقل ماری جاتی ہے۔ پتہ نہیں یہ بات کس حد درست ہے مگر مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ مصیبت ہی وہ کسوٹی ہے جس پر گھس کر سونا نکالنا جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مصیبت میں انسان کا حافظہ صحیح طور پر کام نہیں کرتا۔ عبدالرحمن تین راتیں سفر کر چکا تھا۔ وہ جلد سے جلد خطرے سے دور ہونا چاہتا تھا۔ ہر صبح کو اسے وہی جانے پہچانے راستے اور مقامات نظر آتے اور اسے محسوس کرتا کہ رات بھر چلنے کے باوجود وہ اب تک اپنی جاکیر ہی میں موجود ہے۔ یہ بھی قسمت

داراب لالچ میں اندھا ہو رہا تھا۔ شہزادہ بچی کو قتل کر کے اس نے انعام حاصل کیا۔ گھر کا بھیدی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عبدالرحمن کا چھوٹا بیٹا اس گاؤں میں اس کی بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ عبدالرحمن اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس لئے اس نے بولے شہزادے کو گرفتار کرنے کے لئے ادھر کا رخ کیا۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ عبدالرحمن اپنے بھائی اور بہنوں سے باتیں کر رہا تھا۔ ننھا بلان مکان کے باہر کھیل رہا تھا۔ اسی وقت سلیمان باہر سے بھاگتا ہوا آیا اور باپ کی درمیں دبا گیا۔ عبدالرحمن کا ہاتھ ٹھنک۔ بچے کی حالت دیکھ کر اسے خطرے کا احسان آیا تھا۔ اس نے سلیمان کو پیار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بیٹا کیا بات ہے۔ کسی نے مارا؟“

سلیمان نے پھٹی پھٹی نظروں سے باپ کو دیکھا پھر انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ عبدالرحمن اسے گود سے اتار کے دروازے کے پاس پہنچا۔ گھر کے تمام افراد اس بچے بچھے ڈیوڑھی میں آگئے۔ باہر نظر پڑتے ہی عبدالرحمن کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

”سیاہ پرچم۔“ عبدالرحمن نے جیسے خود کلامی کی پھر بہن سے کہا۔ ”وقت کم ہے۔ خطرہ سر پر آگیا ہے۔ تم سلیمان کی حفاظت کرو میرے غلام بدر کو جس قدر جلد سکے میرے پاس بھیج دینا۔ کچھ نقد رقم اور جواہرات بھی بھیجنا۔“ عبدالرحمن نے رتی جلدی کہا اور چھوٹے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے باہر نکل گیا۔ رخصتی کا یہ بے انداز تھا۔ اس کی بہنیں اور بہنوں کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ ان کی زبان سے ”خدا“ اور ”فی امان اللہ“ کے الفاظ بھی نہ نکل سکے۔ وہ چپ چاپ کھڑے عبدالرحمن دیکھتے رہے جو تیرہ سالہ بھائی کو گھسیٹا ہوا بے تحاشہ بھاگ رہا تھا۔

ادھر عبدالرحمن ان کی نظروں سے اوجھل ہوا ادھر سیاہ پرچم والے دروازے پر آگئے۔ سلیمان کو اس کی ایک چھو بھی نے گود میں اٹھا لیا تھا۔ اس عباسی گروہ کا غنہ داراب تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ داراب گھوڑے سے کودا اور اپنے قبیل کو لئے ہوئے بے دھڑک گھر میں گھس گیا۔ سب کے ہاتھوں میں تنگی لپٹا پاتی اڑیں تھیں۔ داراب ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھاگتا پھر رہا تھا مگر اسے ماک تلاش تھی وہ پہلے ہی نکل چکا تھا۔ داراب کمرے میں کوئی نہ ملا تو وہ عبدالرحمن

کا ایک چکر تھا۔ چوتھی شب ختم ہوئی تو دن کے اجالے میں اس نے خود کو ایک الم جگہ پایا جہاں سے اس کی بہنوں کے گھر قریب تھے۔ اس کی بہنیں بھی دریائے فرات کے کنارے رہتی تھیں۔ عبدالرحمن نے مجبور ہو کے خود کو قسمت کے حوالے کیا اور بہنوں کے گھر پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

دن بھر وہ ایک ویرانے میں چھپا رہا اور رات بھگتے ہی بہنوں کے گھر پر دیک دی۔ اس گھر میں اس کا چار سالہ لڑکا سلیمان رہتا تھا۔ بہنیں ننھے بچے کو سینے سے لگا سہی ہوئی پڑی تھیں۔ رات کے اس وقت دروازے پر دستک نے انہیں اور سارا وہ سمجھیں کہ مصیبت ان کے دروازے پر آ پہنچی۔ عبدالرحمن کے بہنوں نے سلیمان ایک کوٹھری میں چھپا دیا پھر ڈرتے ڈرتے دروازے کے پاس آیا۔

”کون ہے؟“ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”میں ہوں عبدالرحمن۔“

بہنوں کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھول کر عبدالرحمن کو اندر کیا اور وہیں سے بیوی کو آواز دی۔ ”اے جلدی آؤ۔ بھائی عبدالرحمن آئے ہیں۔“

تینوں بہنیں چراغ لئے بھاگتی ڈیوڑھی میں پہنچ گئیں۔ عبدالرحمن کے کپڑے میلے ہو کر جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ پیروں پر ورم آگیا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں آ رہی تھیں۔ بہنوں نے تسلیاں دیں اور بہنوں کی دلداری میں لگ گئے۔ ننھے سلیمان کو جگا کے باپ کے سامنے لایا گیا۔ عبدالرحمن نے بھیگی پلکوں کے ساتھ بے سینے سے لگا لیا۔ گھر میں تمام رات رت جگا رہا۔ عبدالرحمن نے ان کی سن کر اپنی پورے پتا بیان کر دی۔ طے یہ ہوا کہ عبدالرحمن یہاں پوشیدہ رہ کر حالات کا جائزہ لیں اور حالات سدھرتے ہی کسی سمت نکل جائیں۔

ایک ہفتہ عبدالرحمن نے یہاں قیام کیا۔ کالے جھنڈے والے اب تک اس گاؤں میں نہیں پہنچے تھے۔ یہاں امویوں کے بہت سے ہمدرد تھے جو لے لے کر عبدالرحمن کو پہنچا رہے تھے۔ عبدالرحمن بھی اپنی حالت بحال کر رہا تھا لیکن ابھی تک تھکان دور بھی نہ ہوئی تھی کہ مصیبت اس گاؤں تک آ پہنچی۔ عبدالرحمن کے

ت ہو سکتا ہے اور نہ غلام سادھن۔“

عبدالرحمن کی آواز پر چھوٹے بھائی نے دل مضبوط کیا اور آگے تیرنے لگا۔

اب نے اپنے شکار ہاتھ سے جاتے دیکھے تو پھر پکارا۔ ”چھوٹے شہزادے! تم ہی واپس آؤ۔ آقا تو میری بات سنتے ہی نہیں۔ وہ تو فرات کی لہروں میں گم ہو جائیں گے۔ تم جان کیوں دیتے ہو؟“

کمن شہزادہ جسمانی طور پر بھی کچھ زیادہ مضبوط نہ تھا۔ لہروں کے تھپڑے اس کا پیچھے دے رہے تھے اور ہاتھ، پیر شل ہوئے جا رہے تھے۔ دریا پار کرنا اسے

معلوم ہوا۔ عبدالرحمن دھار کاٹ کر دوسرے کنارے کی طرف پہنچ رہا تھا۔ کمن شہزادہ زندگی کی امید میں داراب کی باتوں سے فریب کھا گیا۔ فرات پار کرنے کے لئے اس نے اپنا رخ بدلا اور اس کنارے کی طرف واپس ہوا جہاں داراب اپنے

تھپڑے کو لئے کھڑا تھا اور چلا چلا کر شہزادے کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف عبدالرحمن دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ رہا تھا اور یہ سمجھتے ہوئے کہ چھوٹا بھائی اس

پچھے آ رہا ہے، چیخ چیخ کر اس کی ہمت افزائی بھی کر رہا تھا۔

اگر کمن شہزادہ کنارے پر پہنچا، داراب نے بڑی محبت سے ہاتھ بڑھا کر اسے کا ہاتھ پکڑا اور بڑے خلوص سے سارا دے کر اسے خشکی پر لے آیا۔ اس کے انہی نیم دائرے میں کھڑے تھے۔ شہزادے کو قریب آتے دیکھ کر سب نے تلواریں نکالیں۔ شہزادے نے گھبرا کر داراب کی طرف دیکھا۔ داراب بھی تلوار بلند کر چکا

۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوف ناک مسکراہٹ تھی۔ کمن شہزادے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے پوری قوت لگا کر بھائی کو آواز دی۔

”بھائی عبدالرحمن۔“

شہزادے کی زبان سے آواز نکلتا تھا کہ داراب اور اس کے ساتھیوں نے فاتحانہ

نہ لگے اور پھر ان کی تلواریں ایک ساتھ چمک کر شہزادے پر گریں۔ شہزادے کی آواز دوسرے کنارے تک پہنچ چکی تھی۔ عبدالرحمن دریا پار کر کے اپنے چھوٹے بھائی

افرات کی لہروں میں ڈھونڈ رہا تھا۔ معا بھائی کی آواز اس کے کانوں سے نکل آئی۔ عبدالرحمن نے گھبرا کر دوسرے کنارے کی طرف دیکھا۔ بھائی کے سر پر درجنوں کھنٹی

کی بہنوں اور بہنیوں کو گالیاں دیتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا اور ایک طرف گھوڑا بھاگنے لگا۔

سہ پہر کے وقت ایک گاؤں سے دو آدمیوں کا بھاگ کر نکل جانا لوگوں کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ گاؤں والوں نے عبدالرحمن اور اس کے بھائی کو بھاگتے دیکھا اور داراب کے دریافت کرنے پر انہوں نے گھبرا کر اس سمت کی نشاندہی کر دی۔ طرف عبدالرحمن گیا تھا۔ عبدالرحمن نے دریا کے کنارے رک کر کشتی کے لئے اوم ادھر نظریں دوڑائیں مگر دور دور تک کوئی کشتی نظر نہ آئی۔

”پیارے بھائی!“ عبدالرحمن نے بڑے استغفال سے کہا۔ ”ہماری پشت پر دشمن کے پرچم اور تلواریں ہیں اور سامنے بٹھائیں مارتا ہوا فرات۔ دونوں طرف موت ہے لیکن تم ہمت کرو تو فرات کی موجیں ہمیں سلامتی بھی دے سکتی ہیں۔“

عبدالرحمن کا کمن بھائی گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور بھائی کے منہ کو دیکھ کر رہ گیا۔ عبدالرحمن کو بھائی کی حالت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے بھائی کا شانہ بھجوا اور چیخ کر کہا۔ ”ہوش میں آؤ۔ موت سر پر آگئی ہے۔ خود کو فرات کی نذر کر دو۔“

عبدالرحمن نے بسم اللہ کہہ کر فرات میں چھلانگ لگا دی۔ اس کے بھائی نے پلٹ کر دیکھا۔ سیاہ پرچم والے اس سے صرف پچاس گز دور رہ گئے تھے۔ اس نے دریا میں چھلانگ لگائی اور تیرنے لگا۔ سیاہ پرچم والے فرات کے کنارے پہنچے تو دونوں بھائی آگے پیچھے فرات کی موجوں سے لڑتے دکھائی دیے۔

داراب نے چاہا کہ گھوڑا دریا میں ڈال دے لیکن فرات کی بھری موجوں کو دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ اس نے راسیں کھینچ کے آواز دی۔ ”اے بنو امیہ کے شہزادو! اپنی جان پر رحم کرو۔ واپس آ جاؤ۔ تمہیں کچھ نہ کہا جائے گا۔ میں تمہاری جان کی ذمہ داری لیتا ہوں۔“

عبدالرحمن بچ دھارے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ داراب کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے محسوس ہوا کہ کمن بھائی داراب کی آواز پر رک رہا ہے۔ عبدالرحمن فوراً چیخا۔ ”بھیا۔ قدم بڑھاؤ۔ اس نمک حرام کی باتوں میں مت آنا۔ نہ غلام سا کئی

ہوئی تلواریں دیکھ کر وہ بے قابو ہو گیا اور دیوانہ وار پھر دریا میں کود گیا مگر عبدالرحمن زیادہ دور نہ گیا۔ اس نے کھینچی ہوئی تلواریں اپنے بھائی کے بدن کے پار ہوتے دیکھ لیں۔ اس کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی پھر وہ واپس کنارے پر آگیا۔

عالی ہمت عبدالرحمن اپنے دل پر کچوکے کھا رہا تھا مگر پائے استقلال آگے ہی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا گھربار لٹ چکا تھا۔ دو بھائی اس کے سامنے مارے گئے تھے۔ بہن ہنوتی اور بیٹا جیتے جی چھٹ گئے۔ مگر جواں عمر اور جواں مرد عبدالرحمن ہنوتی ہوئی تقدیر سے لڑ رہا تھا۔ فرات پار کرتے ہی اس نے فلسطین کا رخ کیا۔ فلسطین میں اس کے چند عزیز دوست رہتے تھے جن کا پتہ وہ اپنی بہن کو دے آیا تھا۔ فلسطین پہنچے پہنچے اس کا لباس تار تار ہو گیا۔ چہرے پر گرد راہ کی حمیں جم گئیں اور جب قطعی خالی ہو گئی تھی۔ بارے اللہ نے رحم کیا اور اس کے دوستوں نے دوستی کا بھرم رکھا۔ عبدالرحمن کو فلسطین میں رک کر اپنے غلام بدر کا انتظار کرنا تھا۔ بدر اس کا وفادار غلام ہی نہیں بلکہ ایک پر خلوص مشیر بھی تھا۔

فلسطین میں عبدالرحمن نے کچھ عرصہ سکون سے گزارا مگر وہ جدھر نظر اٹھاتا اسے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا۔ عباسی سلطنت نے ابھی جڑیں نہ پکڑی تھیں مگر دور دور کے امیر اور والی، عباسیوں کے مطیع ہوتے جا رہے تھے۔ بنی امیہ کے ہاتھ سے اقتدار چھن چکا تھا اور اموی خاندان کے لوگوں نے اپنا نام تک بدل ڈالا تھا۔ ان حالات میں دمشق یا بغداد میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اور عبدالرحمن کی نظر کسی اور ہی میدان کو تلاش کر رہی تھیں۔ فلسطین ہی میں اس کا غلام بدر اس سے آگیا۔ بدر اپنے ساتھ کافی مال و دولت، زیورات اور جواہرات لایا تھا۔ عبدالرحمن اس سے زیادہ خوشی اپنی کنیز نوشائی کے آنے کی ہوئی۔ نوشائی اس کی بہن کے پار پہنچ گئی تھی اور جب بدر فلسطین آنے لگا تو وہ خوشامد کر کے اس کے ساتھ ہوئی۔ کتنے ہیں کہ بدر کے ساتھ عبدالرحمن کا بیٹا سلیمان بھی آیا تھا لیکن وہ راستے کی صعوبتیں برداشت کر سکا اور عبدالرحمن نے اسے اپنی بہنوں کے پاس واپس بھیج دیا۔

عبدالرحمن کی مالی حالت درست ہوئی تو اس نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ آخر اس کی نظر افریقہ پر جا پئی۔ والی افریقہ ابن حبیب تھا۔ اس نے اب تک

بہنوں کی خلافت تسلیم نہ کی تھی اور افریقہ میں ایک الگ حکومت قائم کرنے کے لیے دیکھ رہا تھا۔ ابن حبیب کا تعلق نمر قبیلے سے تھا اور اسی قبیلے کا ایک فرد اس وقت بن کی مسلمان حکومت کا امیر تھا۔ ابن حبیب یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے عزیز امیر اندلس کے لیے افریقہ میں ایک آزاد حکومت قائم کرے۔ اسی دوران عبدالرحمن فلسطین پہنچ کر کے افریقہ پہنچا۔ عبدالرحمن نے والی افریقہ کے متعلق معلومات حاصل کر لی ہیں لیکن دودھ کا جلا ماٹھے سے پرہیز کرتا ہے۔ یہی حال عبدالرحمن کا تھا۔ عباسیوں نے عبدالرحمن کے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی اس لئے وہ پھونک پھونک کے بھاگ رہا تھا۔ اسے یہ تو امید تھی کہ افریقہ میں اسے کسی نہ کسی جگہ پناہ مل جائے گی لیکن اس نے احتیاط کے طور پر افریقہ کے صدر مقام قیرواں جانے کے بجائے برقہ میں پناہ لیا اور قبیلہ بنی رستم میں پناہ حاصل کی۔

قبیلہ بنی رستم والے عبدالرحمن کے ساتھ بڑے التفات سے پیش آئے۔ دربار میں ان کا کافی اثر تھا۔ انہوں نے عبدالرحمن کو مشورہ دیا کہ وہ والی قیرواں کے پاس پناہ حاصل کرے تاکہ اگر عباسی خلافت اس کی واپسی کا مطالبہ کرے تو افریقہ کے نام قابل مل کر عباسیوں کا مقابلہ کریں۔ بنی رستم والوں کا یہ مشورہ بڑا اہم اور قابل اور تھا۔ عبدالرحمن بھی یہی چاہتا تھا لیکن اس نے دور اندیشی کا دامن نہ چھوڑا اور یہ بلکہ کیا کہ پہلے اس کا غلام بدر، قیرواں جا کر ابن حبیب سے گفتگو کرے اور اگر ابن حبیب اجازت دے تو پھر عبدالرحمن اس سے ملنے جائے۔

دوسرے دن بدر کو قیرواں بھیجا گیا۔ مثل مشہور ہے کہ بھاگا بھاگتا جائے اور مالگ ساتھوں ساتھ جائے۔ یعنی لوگ مصیبت سے گھبرا کے بھاگتے ہیں مگر قسمت ان کے ساتھ ہی ساتھ جاتی ہے۔ جس وقت والی افریقہ ابن حبیب کو اطلاع دی گئی کہ دمشق سے ایک اموی شہزادہ فرار ہو کر افریقہ پہنچا ہے اور اس کا غلام اذن باریابی چاہتا ہے، ابن حبیب اس وقت ایک یہودی نجومی سے گفتگو کر رہا تھا۔ یہ یہودی نجومی کچھ دن پہلے ہی قیرواں پہنچا تھا اور اس نے قیرواں کے لوگوں کے سامنے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ خلافت امیہ کے ختم ہونے کے بعد عبدالرحمن نام کا ایک شخص ایک بہت بڑی حکومت قائم کرے گا۔ والی افریقہ کا نام عبدالرحمن ابن حبیب تھا اور وہ آج کل ایک

ہم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔“ ابن حبیب اطمینان سے بولا۔
نام اور خواص میں ہم ابن حبیب کے نام سے مشہور ہیں لیکن ہمارا اصل نام
ابن حنیبل بن حبیب ہے۔“

”میں والی افریقہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے مکمل نام سے آگاہ
کی عزت بخشی۔“ یہودی نجومی روایتی انداز میں اس کا شکریہ ادا کر کے خاموش
ہوا۔

عبدالرحمن کے دل میں لٹو پھوٹ رہے تھے۔ نجومی کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔
”نام نے اس خوش نصیب کا نام عبدالرحمن بتایا ہے۔ میرا نام بھی عبدالرحمن ہے۔
اے علاوہ بھی تمہیں اس خوش قسمت کی کوئی اور شناخت بتائی گئی ہے۔“

”اے والی! مجھے بس کی کچھ نشانیاں بھی یاد آ رہی ہیں۔“ یہودی نے سوچتے
ہے کہ۔“ میں نے دراصل اس پیشین گوئی پر کبھی غور نہیں کیا تھا لیکن جب دمشق
اموی خلیفہ نے عباسیوں کے ہاتھوں شکست کھائی اور تخت خلافت پر عباسی خلیفہ
لوہاس صفاح نے قدم رکھا تو مجھے یہ پیشین گوئی یاد آئی اور میں نے از سر نو زانچہ بنا
اس پر غور کیا تو مجھے اس پر یقین آ گیا اور میں نے اس پیشین گوئی کو عام کر دیا۔“
”ہم نے تم سے اس شخص کی دوسری نشانیاں پوچھی ہیں۔“ ابن حبیب نے بے
نی سے دریافت کیا۔

”جی ہاں والی افریقہ! میں وہی بیان کر رہا ہوں۔“ نجومی نے سانس درست کرتے
ہے کہ۔“ مجھے یاد پڑتا ہے کہ عبدالرحمن نامی شخص دراز قد اور بھرے جسم کا مالک
ہوگا اس کی پیشانی کشادہ رنگ صاف اور آنکھیں بڑی بڑی اور مسخور کن ہوں گی۔
عبدالرحمن کے بال سیاہ اور گھونگھریالے ہوں گے۔“

ابن حبیب نجومی کی نشانیوں کو غور سے سن رہا تھا اور ہر نشانی پر اپنے بدن کو
ڈال جا رہا تھا۔ اس کا قد لمبا اور جسم بھرا ہوا تھا۔ رنگ صاف اور آنکھیں بڑی بڑی
میں مگر اس کے بال بیروں کی طرح سرخی مائل تھے اور گھونگھریالے نہ تھے۔ وہ اسی
خوش تھا کہ نجومی کی بتائی ہوئی بیشتر نشانیاں اس میں موجود تھیں۔

ابن حبیب اپنی مسرت پر قابو نہ پاسکا اور بولا۔ ”معزز نجومی! تمہاری باتوں میں

بڑی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس کے کان تک نجومی کی پیشین گوئی پہنچی
تو وہ بہت خوش ہوا اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ پیشین گوئی اس کے متعلق ہے۔ نجومی کو
اس نے اسی سلسلے میں دربار بلوایا تھا۔ عبدالرحمن ابن حبیب کو اس موقع پر یہ اظہار
ناگوار گزری۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اموی
شہزادے کے غلام کے سامنے یہودی نجومی سے اس پیشین گوئی کے بارے میں گفتگو
کرے تاکہ اسے بھی معلوم ہو جائے کہ افریقہ کا والی بہت جلد ایک عظیم حکومت کا
مالک بننے والا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے بدر کو دربار میں طلب کر لیا۔

بدر دربار میں حاضر ہوا اور ادب سے سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ابن
حبیب نے بڑی رعوت سے بدر سے کہا۔ ”ہم“ تم سے بعد میں گفتگو کریں گے۔ پہلے
ہم اس نجومی سے ایک پیشین گوئی سننا چاہتے ہیں۔“

بدر نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ اپنی جگہ کھڑا رہا۔

ابن حبیب نے مسکرا کے نجومی کو دیکھا اور پوچھا۔ ”ہم نے تمہاری بہت تعریف
سنی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ تم آج کل قیرواں میں کچھ لوگوں سے ایک پیشین گوئی
بیان کر رہے ہو۔ ہم وہ پیشین گوئی تمہاری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔ اگر تمہاری بات
سچ ثابت ہوئی تو تمہیں دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا۔“

”اے عالی مرتبت والی افریقہ!“ یہودی نجومی نے کہنا شروع کیا۔ ”میں نے پہلے
میں اپنے بزرگوں سے پیشین گوئی سنی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ جس وقت دمشق میں
بنو امیہ کی خلافت کا خاتمہ ہو گا تو اسی خاندان کا ایک فرد ایک ایسی حکومت قائم کرے
جو دمشق کی خلافت سے کسی طرح بھی کم درجہ نہ ہوگی۔“

”تم نے اپنی پیشین گوئی میں اس فرد کا نام بھی ظاہر کیا ہے؟“ ابن حبیب نے
دلچسپی سے پوچھا۔

”جی ہاں والی افریقہ! میرے بزرگوں نے اس فرد کا نام عبدالرحمن بتایا تھا۔“

”تمہیں ہمارا نام معلوم ہے؟“

”مجھے آپ کے پورے نام کا علم نہیں۔ صرف یہ جانتا ہوں کہ والی افریقہ کو

لوگ ابن حبیب کے معزز نام سے یاد کرتے ہیں۔“

سچائی نظر آتی ہے۔ ذرا ہماری طرف غور سے دیکھو۔ ہمارا نام عبدالرحمن ہے تمہاری بتائی ہوئی تمام نشانیاں کم و بیش ہم میں موجود ہیں۔ کیا وہ خوش نصیب ہی تو نہیں جس کے لئے یہ پیشین گوئی کی گئی تھی؟“

یہودی نجومی چونک پڑا۔ اس نے اس بات پر تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کا بخہ تھا کہ ابن حبیب نے اسے اس لئے بلوایا ہے کہ ان بگڑے ہوئے حالات میں اپنا زار تیار کرائے گا لیکن یہاں تو بات ہی کچھ اور نکلی۔ اس نے ابن حبیب کے چہرے پر کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ ابن حبیب اس کی تیز نظریں برداشت نہ کر سکا۔ اس وقت گزاری کے لئے بدر کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اموی شہزادہ کس کے پاس ٹھہرا ہے؟“

بدر اس وقت دوسرے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ نجومی جس خوش قسم عبدالرحمن کی نشانیاں بیان کر رہا تھا۔ وہ تمام اس کے آقا میں موجود تھیں۔ چوڑا چمکا سینہ، مسکور کن روشن روشن آنکھیں، کھلتا ہوا رنگ اور گھونگھریالے بال؛ بھی عبدالرحمن تھا۔ بدر نے ابن حبیب کے خطاب پر گھبرا کے دیکھا پھر سنبھل کر کہا۔ ”اے عالی مرتبہ والی افریقہ! میرے آقا! ان دونوں قبیلہ بنی رستم کے مہمان ہیں اور آپ کی نظر اتفاقات کے منتظر ہیں۔“

”ضرور، ضرور۔ ہم شہزادے کی ضرور مدد کریں گے۔“ ابن حبیب نے جواب دیا۔ پھر ایک لمحہ رک کر پوچھا۔ ”تم نے اس معزز یہودی نجومی کی پیشین گوئی کی ہے؟“

”جی ہاں، میں نے بہت غور سے ہر بات سنی ہے۔“ بدر نے جواب دیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ نجومی نے عبدالرحمن کی جو نشانیاں اور علامتیں بیان کی ہیں کیا ہم میں موجود نہیں ہیں؟“

بدر کو بھرجھری سی آگئی۔ اس کا جی چاہا کہ کہہ دے، اے نادان جس عبدالرحمن کی قسمت کا حال نجومی نے بتایا ہے وہ تو نہیں میرا آقا اموی شہزادہ عبدالرحمن بن معاویہ بن یزید ثانی ہے مگر اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور بولا۔

اے خوش نصیب والی افریقہ! نجومی نے جو نشانیاں بیان کی ہیں وہ تمام کی تمام آپ کے بدر کو بھرجھری سی آگئی۔ اس کا جی چاہا کہ کہہ دے، اے نادان جس عبدالرحمن کی قسمت کا حال نجومی نے بتایا ہے وہ تو نہیں میرا آقا اموی شہزادہ عبدالرحمن بن معاویہ بن یزید ثانی ہے مگر اس نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور بولا۔

”ہاں پائی جاتی ہیں اور یقیناً“ آپ وہی عبدالرحمن ہیں جن کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔“ ابن حبیب کمال مسرت سے بولا۔ ”ہم ہیں اور تمہارے آقا کو قیرواں میں ایسی عزت دیں گے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔“

نجومی ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ ابن حبیب چپ ہوا تو نجومی نے کہا۔ ”میں انھیں کی رائے سے پوری طرح متفق نہیں بہ حیثیت نجومی میں تو ان نشانوں سے ابھی نہیں ہٹ سکتا جو مجھے بتائی گئی ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ والی افریقہ ہم ہی عبدالرحمن۔ قد لانا اور آنکھیں بھی روشن ہیں۔ جسامت کے لحاظ سے آپ چڑھنے اور بھرے بھرے بازوؤں والا کہا جاسکتا ہے لیکن۔۔۔۔۔۔“

”لیکن یہ کہ ہمارے بال گھونگھریالے نہیں۔“ ابن حبیب بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”لیکن یہ کہ ہمارے بال گھونگھریالے نہیں۔“ ابن حبیب بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”لیکن یہ کہ ہمارے بال گھونگھریالے نہیں۔“ ابن حبیب بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”لیکن یہ کہ ہمارے بال گھونگھریالے نہیں۔“ ابن حبیب بات کاٹتے ہوئے بولا۔

شہزادہ عبدالرحمن کنیر کے جواب سے بہت خوش ہوا۔ نوشائی مہلات کی پروردہ اور شاہی قانون اور قاعدے جاننے کے علاوہ حسن کلام پر پوری طرح حاوی تھی۔ نانے میں ایسی شائستہ کنیریں ہی شاہوں کی منظور نظر بن کے ”ملکہ“ کے درجے پہنچتی تھیں۔

شہزادے نے اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نوشائی! تم بلاشبہ کے قاتل ہو مگر یہ تمہاری بد قسمتی ہے کہ تم ایک مفرور اور جہاں گرد شہزادے ہاتھ ماری ماری پھر رہی ہو۔“

”ایسا نہ کہئے میرے شہزادے۔“ نوشائی نے بڑی محبت سے جواب دیا۔ ”زمانے انقلاب کو کوئی نہیں جانتا اور قدرت نے کس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے اس سے کوئی واقف نہیں۔ عزت اور ذلت خدائے برتر کے ہاتھوں میں ہے۔ وہ شاہوں ہاتھ سے سلطنت چھین کر کالہ گردائی دیتا ہے تو اس میں یہ بھی قدرت ہے کہ ایک بے نوا کو عروج دے کر تخت شاہی تک پہنچا دے۔“

”خدا تمہاری زبان مبارک کرے نوشائی۔“ شہزادہ مسرت سے بولا۔ ”تم واقعی تاج کا ہیرا بننے کے قاتل ہو مگر تم جس حال میں ہو اسے دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔“

”مجھے تو کوئی دکھ نہیں شہزادے۔“ نوشائی بھی جذبات سے پر لہجے میں بولی۔ شہزادے کے دو بیٹھے بول میسر ہوں اسے کون سا غم ہو سکتا ہے۔“

”میرے قریب آؤ نوشائی۔“ شہزادے نے نہ جانے کس خیال میں کہا۔ ”میں ان نظروں سے دیکھنا چاہتا ہوں، تم جس کے لائق ہو۔“

نوشائی کھسک کے اس کے قدموں میں آ بیٹھی۔ شہزادے نے اسے کچھ عجب سی کے عالم میں دیکھا۔ نوشائی کا انگ انگ جھوم اٹھا۔ شرما تے ہوئے بولی۔

”خدا کے لئے ایسی نظروں سے نہ دیکھئے جن سے محروم ہونے کے بعد میری دیران ہو جائے۔ ہر کنیر اپنی آنکھوں میں رو پہلے سنہرے پنے سجاتی ہے۔ یہ پنے ماکہ دولت ہوتے ہیں۔ میں انہی خوابوں میں رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے میری اوقات نہ کر کے نہ دیکھئے ورنہ خطرہ ہے کہ سپنوں کے تانے بانے نہ بکھر جائیں اور

ہم بہت جلد انہیں ایک بڑی جاگیر بخش دیں گے تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ یہاں گزار سکیں۔ شہزادے کو مطمئن کر دیا جائے کہ ہم نے اب تک عباسی خلیفہ کی مالتسلیم نہیں کی ہے اور نہ اب اس کا موقع آئے گا۔“

ابن حبیب خوشی کے عالم میں اور بھی بہت کچھ کہتا رہا مگر بدر اس کی پوری طرح توجہ نہ دے سکا کیونکہ اس کے دماغ میں نجومی کی پیشین گوئی گھوم تھی جس کا اہل خود اس کا آقا عبدالرحمن تھا۔

عبدالرحمن کے ساتھ قبیلہ بنی رستم کا رویہ بڑا دوستانہ تھا۔ اسے یوں محسوس رہا تھا جیسے وہ اپنے عزیزوں میں آ گیا ہے۔ اس کے لئے ایک الگ حویلی کا انتظام کیا تھا جس میں عبدالرحمن، بدر اور نوشائی آرام سے رہتے تھے۔ نوشائی اگرچہ کنیر تھی لیکن اس نے عبدالرحمن کے لئے جو تکلیفیں اٹھائی تھیں اس نے شہزادے کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ نوشائی کی خدمت گزاری پہلے ہی کنیری کی حد سے بڑھ ہوئی تھی لیکن اب عبدالرحمن کی نظر عنایت نے اس میں شوخی اور امگ بھی پیدا دی تھی۔ وہ شکل و صورت کی بھی بری نہ تھی۔ یوں بھی جوانی میں ہر عورت خوبصورت لگتی ہے۔ پتہ نہیں شہزادے کے دل میں اس کے لئے کس قسم کے جذبات تھے لیکن نوشائی یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ جلد یا بدیر شہزادے کے دل کو ضرور جیت گی۔

اس شام بھی عبدالرحمن اور نوشائی حویلی کے صحن میں بیٹھے ہنس کے کھٹکے کر رہے تھے۔ عبدالرحمن گفتگو کرتے کرتے ایک دم سنجیدہ ہو کر نوشائی کو گھورنے لگا تو وہ شرما کر نظریں نیچے کر لیتی تھی۔ شہزادہ اس شام شاید کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ انے نوشائی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”نوشائی! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کچھ اور سکون ہونے ہی میں کسی معقول جوان سے تمہاری شادی کرا دوں تاکہ تمہیں میرے ساتھ تکلیفیں اٹھانے سے نجات مل جائے۔“

”شہزادے بہادر!“ نوشائی نے بڑی متانت سے کہا۔ ”نوشائی ایک کنیر ہے اور کنیریں گھر اور در نہیں بدلا کرتیں۔ جس کے قدموں سے ایک بار لگ جائیں پھر انہیں چومتے ہی زندگی گزار دیتی ہیں۔“

میرے خیالوں میں کھنچی ہوئی کمکشاں اپنی جگہ گاہٹ کھو بیٹھے۔

اسی وقت حویلی کے باہر گھوڑے دوڑنے کی آواز آئی۔ نوشائی کے چنے پائے گئے۔

”شاید بدر واپس آ گیا ہے۔“ شہزادہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔
نوشائی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ شہزادہ ابھی حویلی کے اندر ہی تھا کہ
گھوڑا باہر چھوڑ کر اندر آ گیا اور شہزادے کو دیکھتے ہی بولا۔ ”شہزادے مبارک ہو۔“
شہزادہ عبدالرحمن نے آگے بڑھ کر بدر کو گلے لگا لیا۔ پھر محبت سے پوچھا
”تمہاری خوشی مجھے یقین دلا رہی ہے کہ والی افریقہ نے مجھے پناہ دینے کا وعدہ کر
ہے۔“

”صرف آپ کی پناہ کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوا بلکہ ابن حبیب کے دربار سے
آپ کی ایک عظیم الشان سلطنت کی نوید بھی ملی ہے۔“ بدر نے ایک ہی سانس
سب کچھ کہہ دیا۔

”میری سلطنت ————— عظیم الشان سلطنت —————؟“ شہزادے نے کربا
تعب کے طے جلے جذبات سے کہا۔ ”بدر! تم میرے مخلص دوست ہو۔ زمانہ
اتنی بلند امیدیں مت باندھو کہ بعد میں افسوس ہو۔ تمہیں ابن حبیب سے ایسا
وابستہ نہیں کرنا چاہئے۔“

”میرے آقا! میں آج بہت خوش ہوں۔ شاید اسی وجہ سے بدحواس
ہوں۔“ بدر نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”آپ اطمینان سے بیٹھئے پھر میں قیولان
دربار کی تمام باتیں بتاؤں گا۔“

بدر اور عبدالرحمن کمرے میں آ گئے۔ نوشائی جو ”عظیم الشان سلطنت“ کا
سن کر پھولے نہ سار رہی تھی، کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔

بدر نے نوشائی کو باہر کھڑے دیکھ کر کہا۔ ”نوشائی! اندر آ جاؤ۔ تم میرے
سکھ کی شریک ہو۔ تم سے کوئی بات راز نہیں رکھی جاسکتی۔“

نوشائی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اندر آ گئی۔
”شہزادے بہادر!“ بدر ایک دم بولا۔ ”وعدہ کیجئے کہ حالات درست ہوں گے۔“

نوشائی کی خدمت کا منہ مانگا انعام عطا فرمائیں گے۔“

”انشاء اللہ اس سے بھی زیادہ۔“ شہزادے نے پورے عزم سے کہا۔
نوشائی کے چرے پر شہابی رنگ کی ایک لہری دوڑ گئی۔

بدر نے شہزادے کو بتایا کہ ابن حبیب نے شہزادے کو پناہ دینے کے ساتھ ساتھ
تمام اخراجات کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے۔ بدر نے اس بات کا بھی اظہار کیا
کہ ابن حبیب آج بہت خوش تھا اور یہ تمام مراعات اس کی خوشی کا نتیجہ ہیں۔

”کوئی خاص خوشی حاصل ہوئی ہے ابن حبیب کو؟“ شہزادے نے دلچسپی سے

”ابن حبیب کے خیال میں وہ بہت بڑی خوشی ہے لیکن یہ اس کا خیال خام
بدر نے منہ بنا کے کہا۔ ”میرے خیال میں خوشی اس کے لئے نہیں ہے۔“

”تم پہلی بھجرا رہے ہو بدر۔“ شہزادہ مسکرایا۔
”شہزادے بہادر نے صحیح فرمایا۔“ اور بدر اس طرح سنبھل کے بیٹھ گیا جیسے وہ

اہم انکشاف کرنے والا ہے۔

شہزادے اور نوشائی کی نظریں بدر پر جم گئیں اور وہ اس اہم انکشاف کا بے چینی
نظارا کرنے لگے۔

بدر نے کھٹکار کر گلا صاف کیا پھر صاف الفاظ میں بولا۔ ”شہزادے بہادر! آج
کے دربار میں جو کچھ پیش آیا وہ ایک پہلی اور خواب سا محسوس ہوتا ہے۔ جس

مجھے ابن حبیب نے اپنے دربار میں طلب کیا، اس وقت دربار میں ابن حبیب کے
امروار اور ایک یسودی نجومی موجود تھا۔ ابن حبیب نے مجھ پر کوئی خاص توجہ نہ

دے، نجومی کو حکم دیا کہ وہ اپنی پیشین گوئی بیان کرے۔“ بدر نے رک کر شہزادے
اسے کو غور سے دیکھا پھر بولا۔ ”آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ دربار میں بیٹھا ہوا

آپ کے بارے میں پیشین گوئی کر رہا تھا۔ اس نے جو کچھ کہا اس کا ایک ایک
پاسے متعلق تھا۔“

شہزادے نے تعجب سے بدر کو دیکھا۔ نوشائی ضبط نہ کر سکی۔ اس نے پوچھا۔
”ابن حبیب! کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نجومی ہمارے شہزادے بہادر کا نام لے کر پیشین

گوئی کر رہا تھا؟“

گوئی کر رہا تھا؟

”میں تو یہی سمجھتا ہوں نوشائی۔“ بدر نے جواب دیا۔ ”مجھے آج ہی معلوم ہے کہ ابن حبیب کا پورا نام عبدالرحمن ابن حبیب ہے۔ وہ دراز قد، بھرے بازوؤں اور چوڑے چکلے سینے کا مالک ہے اور نجومی کی پیشین گوئی سے ابن حبیب یقین ہو گیا کہ وہی اس پیشین گوئی کا مرکزی کردار ہے۔“

”پیشین گوئی کیا تھی بدر بھائی؟“ نوشائی نے بدر کو اصل بات بیان کرنے کو کہ ”نجومی نے اپنے بزرگوں کے حوالے اور علم کے زور پر کہا کہ بنی امیہ زوال پر اسی خاندان کا ایک شخص ایک بڑی حکومت قائم کرے گا۔“ بدر نے کہا شر کیا۔ ”نجومی نے اس ہستی کا نام عبدالرحمن بتایا۔“

”اور عبدالرحمن ابن حبیب یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ عظیم الشان حکومت قائم کرے گا۔“ شہزادے نے بدر کی بات کاٹتے ہوئے ہنس کر کہا۔

”بالکل ایسا ہی ہوا شہزادے بہادر!“ بدر نے فوراً جواب دیا۔ ”نجومی نے عبدالرحمن کا جو حلیہ بیان کیا اس میں عبدالرحمن کا دراز قد، بھرے بازو اور چوڑے سینے ہونا ضروری تھا۔“

”یہ بڑا احمقانہ خیال ہے بدر!“ شہزادے نے پر زور الفاظ میں کہا۔ ”ایک عبدالرحمن اس قدر عام نام ہے کہ اگر اسے شمار کیا جائے تو عربوں میں ہر چوتھا پانچوا آدمی عبدالرحمن نام کا ملے گا۔ میرا نام بھی عبدالرحمن ہے۔ میرے بازو بھرے اور سینے بھی چوڑا ہے۔ اگر میں یہ پیشین گوئی اپنے بارے میں سمجھ بیٹھوں تو لوگ مجھے اتنا نہیں تو اور کیا کہیں گے؟“

”شہزادے بہادر! اصل بات تو یہی ہے۔“ بدر نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”آپ اپنے متعلق خواہ کچھ بھی کہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ نجومی کی یہ پیشین گوئی آپ اور صرف آپ ہی کے لئے ہے۔“

”آخر تمہاری اس خوشی فحشی کی بنیاد کیا ہے؟“ شہزادے نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ابن حبیب کا نام عبدالرحمن ہے، میرا نام بھی عبدالرحمن ہے۔ قیرواں میں اور بھی کئی عبدالرحمن ہوں گے۔ جن کا قد لانا، سینے چوڑا اور بازو بھرے بھرے ہوں گے۔“

یہ کی طرح اس پیشین گوئی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔“

”میرے شہزادے! آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔“ بدر نے اپنی رائے رد ہوتے دیکھ کر کہا۔ ”عبدالرحمن تو سینکڑوں ہیں مگر نہ تو وہ اموی شہزادے ہیں اور نہ انہیں صحرا نگیز اور بال گھنگھریالے ہیں۔“

نوشائی نے بدر کی پریشانی فوراً محسوس کی۔ اس نے بدر کی حمایت کرتے ہوئے بدر بھائی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پیشین گوئی والے عبدالرحمن کے بال گھنگھریالے ہوں اور اس کا بنی امیہ کا شہزادہ ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں بدر بھائی! میں کہہ رہی ہوں نا؟“

”بالکل یہی بات ہے نوشائی۔“ بدر سہارا پا کر جلدی سے بولا۔ ”تم میری اس کا اندازہ تو کرو کہ نجومی اس خوش نصیب عبدالرحمن کی وضع قطع اور چال ڈھال کر رہا تھا اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کے کہوں کہ اے نجومی تو جس رحمن کا ذکر کر رہا ہے وہ صرف میرا آقا ہی ہو سکتا ہے۔ گھنگھریالے بال، سر سے آنکھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میرے آقا اس نجومی کے سامنے کھڑے ہیں اور ان دیکھ دیکھ کر الفاظ میں ان کی تصویر کھینچ رہا ہے۔“

اب تو نوشائی پر بھی حیرت کا دورہ پڑ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے بدر کو دیکھنے شہزادے عبدالرحمن کی کچھ اور حالت تھی۔ وہ کبھی بدر کو دیکھتا اور کبھی آنکھیں کے سوچنے لگتا۔ شہزادے کے ذہن میں ایک کش مکش سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے بار بار لرزتے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کوئی جذبہ اس کی زبان پکڑ لیتا نوشائی، شہزادے کی اس الجھن کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ بدر نے بھی اپنی بات لے کر شہزادے کو دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ شاید وہ شہزادے سے اپنی بات کی تائید

آخر اس سکوت کو نوشائی نے توڑا۔ بولی ”بدر! ہمارے شہزادے بہادر کچھ کہنا ہیں مگر کوئی خیال ان کی زبان روک رہا ہے۔ آؤ ہم، تم شہزادے سے درخواست کرو کہ خود کو پریشان نہ کریں اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ کہہ ڈالیں۔“

عبدالرحمن نے ایک لمبی سانس لی، سر کو دو تین بار جھٹکا دیا پھر کہا۔ ”نوشائی!

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے لیکن میں اسے بیان کرنے سے اس لئے بچا رہا ہوں کہ تم دونوں کہیں مجھے بھی ابن حبیب جیسا وہم پرست اور خوش فہم نہ سمجھ لو۔“

”توبہ توبہ شہزادے بہادر! آپ کیا فرما رہے ہیں؟“ نوشائی نے شہزادے کو ہر دلائی۔ ”بھلا ابن حبیب اور آپ کا کیا مقابلہ آپ اموی شہزادے ہیں اور وہ افریقہ کے محض ایک علاقے کا والی ہے۔ ہمارے لئے آپ کی جوانی اور بچپن دونوں یکساں اہم رکھتے ہیں۔ آپ بچپن کا واقعہ ضرور بیان کیجئے۔“

شہزادے نے اپنی پیشانی کو انگلیوں سے دبایا اور ذہن پر زور دیتے ہوئے کہہ ”مجھے یاد پڑتا ہے کہ میرے ابا حضور کے انتقال کے وقت میری عمر آٹھ نو سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس وقت میرے دادا خلیفہ ہشام برسر اقتدار تھے۔ مجھے تفسیر کے محل رحبانہ میں طلب کیا گیا۔ میں محل میں پہنچا تو میرے چچا مسلمہ بن عبد المالك محل سے نکل رہے تھے۔ انہوں نے مجھے کئی سال بعد دیکھا تھا اس لئے پہچان نہ سکے۔ انہوں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ بچہ کون ہے؟ کسی نے بتایا کہ معاویہ بن یزید ثانی کا بیٹا عبد الرحمن ہے۔ میرے چچا نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا کہ اس بچے کے چہرے میرے سے بہت بڑے آدمی بننے کے آثار نمایاں ہیں پھر انہوں نے مجھے گود میں اٹھا کر لوگوں سے کہا جس وقت سلطنت امیہ کا زوال ہو گا اور ان کی حکومت کا چراغ گل ہو گا اس وقت یہی بچہ جوان ہو کر خاندان امیہ کی لاج اور آبرو رکھے گا۔ اس وقت خلیفہ باہر سے آگئے اور میرے چچا نے یہی بات ان کے سامنے دہرائی۔ اس کے بعد سے دارالحجہ پر اور مہربان ہو گئے۔ یہ بات میرے ذہن سے بالکل نکل گئی تھی۔“ اس وقت غولی کی بات سن کے وہ واقعہ میری نگاہوں میں گھوم گیا ہے۔“

بدر نے جلدی سے شہزادے کے دونوں ہاتھ چوم لئے اور بولا۔ ”یہ واقعہ غولی کی بات کی تصدیق کرتا ہے۔ سلطنت امیہ کا چراغ گل ہو چکا ہے اور آپ وہی ہستی ہیں جو اس خاندان کی آبرو کو پھر سے زندہ کریں گے۔“

شہزادے نے متانت سے جواب دیا۔ ”بدر! یہ میرا عقیدہ ہے کہ عزت اور زل دینے والا صرف خدائے واحد و یکتا ہے۔ اس وقت تو اس طرح کے حالات نظر نہیں

آتے مگر ہمیں خدا کی ذات سے ناامید نہیں ہونا چاہئے۔“

”شہزادے بہادر!“ نوشائی نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”خواہ یہ آپ کے چچا کی دُشمنی ہو یا نجوی کی پیشین گوئی مگر اس میں حقیقت جھلکتی ہے۔ پیشین گوئی کا پہلا حصہ پورا ہو چکا ہے اور باقی حصے کے لئے ہمیں پر امید ہو کر کوشش کرنا چاہئے۔“

”کوشش اور جدوجہد تو اصل زندگی ہے نوشائی!“ شہزادے نے کہا۔ ”یہ ہماری جدوجہد ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم ابھی تک زندہ ہیں۔ لیکن زندہ رہتے ہوئے اور آگے بڑھنے کے لئے نہ جانے کتنی اور کوشش اور جدوجہد کرنا پڑے گی۔ فی الحال بدر کی باتوں سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ابن حبیب کی یہ غلط فہمی کوئی اور رنگ نہ لئے اس لئے ہمیں اس سے بھی محتاط رہنا چاہئے۔“

”شہزادے بہادر! میرا خیال ہے کہ اب آپ کو ابن حبیب کے دربار میں نہیں جانا چاہئے۔“ بدر نے پُر غلوص مشورہ پیش کیا۔ ”اگر اس کی نظر آپ پر پڑ گئی تو وہ آپ کی طرف سے ضرور مشکوک ہو جائے گا۔“

”تم نے یہ بات میرے منہ سے چھین لی۔“ شہزادے نے فوراً کہا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے کہ ابن حبیب سے کوئی امید باندھنے کے بجائے ہمیں کوئی اور صورت نکالنا ہوگی۔“

☆☆☆

شہزادہ عبدالرحمن صرف اپنی دراز قامت، کھٹکھریالے بل اور مسحور کن آنکھوں کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ تھا بلکہ اس توجہ کی دوسری وجہ یہ تھی کہ شہزادے میں وہ تمام خوبیاں یکجا ہو گئی تھیں جو لبو و لعب سے دور ایک شاہی فرد کا طرہ امتیاز ہوتی ہیں۔ اس نے دور دراز کا سفر کر کے اپنے تجربات میں اضافہ کیا تھا۔ علمی معلومات اور دینی علوم میں مزید آگاہی کے لئے اس نے بزرگوں اور عالموں سے فیض حاصل کیا تھا اور عمائدین وقت سے ملکی انتظام کی باریکیاں سمجھی تھیں۔ عبدالرحمن اعلیٰ درجے کا شہسوار اور بے پناہ قوت ارادی کا مالک تھا۔ برقع میں قیام کے دوران اس کے مشاغل محدود ہو گئے تھے۔ وہ دن بھر اپنی حویلی میں رہتا اور شام کو گھوڑے پر سوار ہو کر بازار

پیشین گوئی میں کیا گیا تھا۔

اس اتفاقیہ صورت حال سے سپہ سالار کچھ ایسا پریشان ہوا کہ وہ اسی وقت قیرواں واپس چلا گیا۔ اس نے ارادہ کیا تھا کہ وہ قیرواں پہنچتے ہی ابن حبیب کو آگاہ کرے گا کہ نبی کی بیان کردہ پیشین گوئی کے مطابق اصل ہستی وہ اموی شہزادہ ہے جو قبیلہ بنی رستم کی پناہ لئے ہوئے ہے مگر اسے راستے ہی میں اپنا یہ ارادہ بدلنا پڑا کیونکہ ابن حبیب نے عباسیوں سے بغاوت کے لئے بے شمار سوار بھرتی کر لئے تھے اور اس بات کا فائدہ تھا کہ اگر اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کہیں جھلا کے سپہ سالار کو قتل یا معزول نہ کر دے۔

سپہ سالار اسی تذبذب میں گرفتار قیرواں پہنچا اور حاکم قیرواں سے ملے بغیر اپنے گرجا کر سو گیا۔

دوسری طرف ابن حبیب بھی ایک الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے مختلف نام کی ادویات اور روغنوں کی مدد سے اپنے بالوں کی سرخی اور چہرے کی رنگت کو بالکل حد تک تبدیل کر لیا تھا لیکن اس کے دل میں یہ کھٹک اب بھی باقی تھی کہ اس کا نسل شاہی خاندان سے نہیں ہے۔ وہ اس خیال میں الجھا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ اگر ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ وہ خوشی سے اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا اور اس لب کی جزئیات پر غور کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اگر وہ شاہی ران کی کسی لڑکی سے شادی کر لے تو اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح شاہی خاندان سے پیدا ہو جائے گا۔ ہر طرح سے غور کرنے کے بعد اس نے اس ترکیب پر عمل کرنے کا فوراً ارادہ کر لیا۔

ابن حبیب نے وہ رات بڑے اضطراب کے عالم میں گزاری اور صبح ہوتے ہی اسے حکم دیا کہ سپہ سالار کو تلاش کر کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ سپہ سالار چونکہ ناکو گھرواپس آ گیا تھا اس لئے اس کو حکم پہنچایا گیا اور وہ حکم کی تعمیل کے لئے ابن حبیب کے محل پہنچ گیا۔

ابن حبیب نے اپنے سپہ سالار سے بڑی خوشدلی سے ملتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہا: ”سپہ سالار! تم ہمارے وفادار اور رازدار دوست ہو۔ یہودی نجومی کی بتائی

کی سیر کو نکلتا۔ اس کی مروانہ وجاہت لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتی تھی۔ عورتوں کو اسے دیکھنے کے لئے اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کرتی رہتیں اور دو شیرازوں دلوں میں اسے دیکھ کر گدگدی پیدا ہو جاتی تھی۔

اس دن بھی وہ حسب معمول بدر کے ساتھ شام کی سیر کو نکلا ہوا تھا والی قیرواں ابن حبیب نے ان دنوں اپنی — قوت بڑھانے کے لئے فوجی بھرتی شروع کی تھی اس لئے اس کے سردار اطراف قیرواں میں نئے فوجی بھرتی کر رہے تھے اور قیرواں سپہ سالار اس کام کی نگرانی کے لئے خود برقعہ آیا ہوا تھا۔ عبدالرحمن کی بد قسمتی کہ اس کا ایک موڑ پر سپہ سالار سے سامنا ہو گیا۔ عبدالرحمن اسے نہیں پہچانتا تھا اس نے گھوڑا بڑھائے ہوئے آگے نکل گیا لیکن سپہ سالار اس خوبصورت اور وجہ سے نوجوان کو دیکھ کر ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ عبدالرحمن کے جانے کے بعد اس نے اپنے نائب سے پوچھا کہ سامنے سے گزرنے والا یہ نوجوان کون تھا اور اس کا تعلق کس ملک سے ہے۔

نائب نے اسے بتایا کہ یہ خلافت امیہ کا مفرور شہزادہ ہے جو آج کل بنی رستم کے پاس پناہ لئے ہوئے ہے۔

سپہ سالار چونک پڑا۔ دربار قیرواں میں اس نے نجومی کی پیشین گوئی اپنے کانوں سے سنی تھی۔ ابن حبیب نے پیشین گوئی کی تفصیل کے مطابق اپنے بال کھٹکھڑائے کرا لئے تھے اور بالوں کی سرخی مائل رنگت کو بھی سیاہ کرانے کی تدبیریں اختیار کر رہا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہی اصل عبدالرحمن ہے جس کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے۔ یہودی نجومی کو بھی اس نے قیرواں میں پابند سلاسل کرتے ہوئے حکم دیا تھا کہ وہ روز دربار میں حاضری دیا کرے قیرواں کا سپہ سالار ایک تجربہ کار، جماندیدہ انسان تھا۔ اس نے نجومی کی بتائی ہوئی تفصیل سے اندازہ لگایا تھا کہ ابن حبیب وہ عبدالرحمن نہیں جس کے لئے پیشین گوئی کی گئی ہے اور ابن حبیب اپنی جلد باز طبیعت کی وجہ سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے مگر سپہ سالار نے اپنی آنکھیں اور کان بند کر لئے تھے۔ وہ خواہ مخواہ اپنے والی کی مخالفت کیوں مول لیتا۔ اس کا بھلا تو اسی میں تھا کہ وہ ابن حبیب کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے۔ مگر اس وقت عبدالرحمن کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ اگر پیشین گوئی واقعی سچی ہے کیونکہ یہ جوان اس تفصیل کے بالکل مطابق تھا جس کا ذکر

زہیں کا دل خوبصورت ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اموی شہزادے کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔
 ”حاکم قیرواں کا یہ خیال بھی درست ہے۔“ سپہ سالار نے حاکم کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر بھی اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی وقت اموی شہزادے کو طلب کر کے اپنی تسلی کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ابن حبیب نے سپہ سالار کی بات مان لی۔ ”ہم اسے دربار میں بلائیں گے اور اپنی شادی کے لئے اس سے رائے طلب کریں گے۔“
 سپہ سالار خوش خوش واپس چلا گیا۔ جو بات وہ اپنی زبان سے نہیں کہنا چاہتا تھا اس کے اظہار کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ سپہ سالار کا اندازہ تھا کہ اموی شہزادے کو دیکھتے ہی ابن حبیب کے منصوبے کے تار بکھر جائیں گے اور وہ شہزادے سے تعاون حاصل کرنے کے بجائے اسے قتل کرا دے گا۔

☆☆☆

اموی شہزادہ اپنے بچاؤ کی فکر کر رہا تھا۔ بدر کی بات اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اسی دن سے کسی اور مقام پر منتقل ہونے کی کوشش شروع کر دی۔ قبیلہ ثقیف رستم کا وہ احسان مند تھا لیکن اس نے انہیں یہ بات بتائی نہیں تھی۔ قبیلے والوں سے یہی کہا گیا تھا کہ حاکم قیرواں نے شہزادے کو مزید مراعات دینے کا وعدہ کیا ہے اور اسے بہت جلد دربار میں طلب کیا جائے گا۔ شہزادے نے بدر کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ ”قرب و جوار کے قبائل کے متعلق معلومات حاصل کرے اور کسی ایسے قبیلے سے رابطہ قائم کرے جہاں اسے پناہ مل سکتی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شام کی سیر میں ایشیائی کو بھی ساتھ لے جانا شروع کر دیا تھا تاکہ کسی مناسب دن وہ بدر اور نوشائی کو ملے اور بھانے ساتھ لے کر برقعہ سے نکل جائے۔“

ہوئی تمام نشانیاں ہم میں موجود ہیں اگر کچھ فرق تھا تو اسے ہم نے اپنے طور پر ختم کر لیا ہے۔ اب ہمارے ذہن میں آیا ہے کہ ہم اپنا تعلق بنو امیہ کے شاہی خاندان سے پیدا کر لیں تاکہ ہمارے عبدالرحمن ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہ جائے۔“
 ”حاکم قیرواں کا اعلیٰ خیال نہایت مناسب ہے۔“ سپہ سالار نے الجھتے ہوئے جواب دیا۔

ابن حبیب کو اس جواب کی پہلے ہی امید تھی۔ اس نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہماری ریاست میں اموی خاندان کے بہت سے لوگ موجود ہیں۔ اموی خلیفہ ولید بن عبد المالک کے دو بیٹے بھی ایک عرصے سے ہماری روٹیوں پر پل رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کے گھر کوئی لڑکی یا بیوہ ہو تو ہم رشتہ مانگ کر اس سے شادی کر لیں۔ اموی دور حکومت ختم ہو چکا ہے اس لئے انہیں رشتہ منظور کرنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ قبیلہ بن رستم کے پاس ایک اموی شہزادہ پناہ لئے ہوئے ہے اگر ولید کے بیٹوں نے رشتہ دینے میں کوئی تکلف کیا تو ہم اموی شہزادے سے سفارش کرا سکتے ہیں۔“

”حاکم قیرواں کا یہ خیال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“ سپہ سالار نے اپنا پہلو بچانے ہوئے کہا۔ ”شاہی خاندان سے رشتہ داری سے آپ کا تعلق براہ راست شاہی خاندان سے ہو جائے گا لیکن مفرور اموی شہزادے سے ہمیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہئے۔“
 ”کیوں، کیوں۔۔۔ تم اسے جانتے ہو کیا؟“ ابن حبیب نے پریشان ہونے ہوئے پوچھا۔

”میں اسے جانتا تو نہیں لیکن میں نے اسے ایک بار دیکھا ضرور ہے۔“ سپہ سالار نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”اموی شہزادے کی چال ڈھال اور شکل و صورت کچھ اس طرح کی ہے کہ مجھے اس کی ذات سے کسی وفا کی امید نہیں۔ اسے دیکھ کر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی وقت بھی ہمارے لئے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔“
 حاکم قیرواں کو اپنے سپہ سالار پر بڑا اعتماد تھا اس لئے وہ ایک دم اس کے خیال کی تردید نہ کر سکا بلکہ اسے سمجھانے کے لئے کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ انسان کی ظاہری شکل و صورت اس کے دل کی عکاسی کرتی ہے لیکن بعض حالات میں بد صورت

بدلی کر کے آتا ہوں۔“

بدر کے بجائے سپہ سالار نے گھوڑے کی راسیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔
 انارکلی بڑی بے پروائی سے حویلی میں چلا گیا۔ نوشانی پہلے ہی اندر جا چکی تھی اور
 ہادی کے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ شہزادہ اندر آیا تو اس نے سرگوشی کی۔
 ”خدا پر بھروسہ رکھو نوشانی۔“ شہزادے نے محبت سے اس کی سر پر تھکی دی۔
 ”میں نے یہ سب سنا ہے کہ ابن حبیب، عباسیوں کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنا رہا ہے۔
 یہ صورت میں شاید وہ میری جان کا خواہاں نہ ہو۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔ نوشانی نے کمرے کی پشت کی کھڑکی
 لال کر باہر جھانکا۔ وہ چونک پڑی۔ اس نے پلٹ کر شہزادے سے کہا۔ ”شہزادے
 اور قیروانی سواروں نے حویلی گھیر لی ہے۔“

شہزادے نے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ سپہ سالار کے سوار حویلی کے چاروں
 طرف پھیل گئے تھے۔ اسی وقت بدر گھبرایا ہوا آیا اور کہا۔ ”شہزادے بہادر! ہمیں
 در کر لیا گیا ہے۔“

”فکر نہ کرو بدر!“ شہزادے نے اسے بھی تسلی دی۔ ”مائنس کے ساتھ آس
 نا ہے۔ میں کوئی غلط قدم اٹھا کر اپنا وقار کھوٹا نہیں چاہتا۔ اس امتحان سے بھی مجھے
 نا ہو گا۔ اگر خدا نخواستہ مجھ پر کچھ بیت جائے تو تم نوشانی کو لے کر کسی طرف نکل
 جاؤ۔“

”شہزادے بہادر۔۔۔۔۔“ نوشانی کی آواز بھرا گئی اور ضبط کے باوجود آنکھیں
 پڑیں۔

شہزادہ لبوں پر کچھ عجیب سا تبسم لئے لباس تبدیل کرنے دوسرے کمرے میں
 بلا کپڑے پہن کر جب شہزادہ باہر آیا تو شاہی سواری ڈیوڑھی کے سامنے کھڑی
 ”سپہ سالار گھوڑے پر سوار۔۔۔۔۔ کوچ کے لئے تیار تھا۔“

شہزادے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سپہ سالار! مجھے یہ سواری اور جلوس کی
 ناہند نہیں۔ میں تمہارے ساتھ گھوڑے پر چلوں گا۔“

شہزادہ اپنے طور پر تو تمام تیاریاں کر رہا تھا مگر اسے علم نہ تھا کہ اس کی
 مصیبتوں کا دور ختم نہیں ہوا ہے اسے ابھی نامعلوم کتنے دروازوں کی ٹھوکریں کھانا
 پڑیں گی۔ ایک شام جب وہ بدر اور نوشانی کے ساتھ سیر کر کے واپس آیا تو اسے اپنے
 گھر کے سامنے شاہی سواری دکھائی دی۔ اس وقت تک اس کے انتظامات مکمل نہ
 ہوئے تھے اور راہ فرار کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے اسے گھر جانا پڑا۔ گھر کے باہر
 قیرواں کا سپہ سالار پچاس سواروں کے ساتھ اس کی پیشوائی کے لئے موجود تھا۔

شہزادہ گھوڑے سے اترا تو سپہ سالار نے ہنسنے لگا کہ اس سے بڑی گرجوشتی سے
 مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”قیرواں کا سپہ سالار شہزادے کو تعظیم پیش کرتے ہوئے اسے
 نوید دیتا ہے کہ حاکم قیرواں نے اسے یاد کیا ہے۔“

شہزادے کو مجبوراً ”سپہ سالار سے خندہ پیشانی سے ملنا پڑا اس نے مرت کا
 اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں حاکم قیرواں کا شکر گزار ہوں کہ انہیں ایک بے نوا کا
 اس قدر خیال ہے۔“

”اس شکر گزاری کا اظہار آپ حاکم قیرواں کے سامنے کیجئے گا۔“ سپہ سالار نے
 ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں بہت دیر سے آپ کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں اور یہ شاہی
 سواری آپ کے لئے بھیجی گئی ہے۔“

شہزادے نے بڑی بے بسی سے بدر کو دیکھا۔ بدر نے فوراً ”کہا“ ”شہزادے بہادر!
 آپ کی مراد بر آئی۔ آپ بسم اللہ کیجئے۔“

انکار کا کوئی موقع نہ رہ گیا تھا۔ شہزادے نے بدر سے کہا۔ ”تم میرے ساتھ چلو
 گے بدر!“

”شہزادے!“ سپہ سالار نے دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”حاکم قیرواں سے یہ آپ کی
 پہلی ملاقات ہے۔ اس میں کسی اور کی شرکت کی ضرورت نہیں۔ صرف آپ تشریف
 لے چلئے۔“

شہزادے اور بدر کو سپہ سالار کی اس بات سے خطرہ پیدا ہوا لیکن وہ بے بس
 تھے۔ شہزادے نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔“ پھر اس نے
 گھوڑے کی راسیں بدر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا گھوڑا سنبھالو۔ میں لہاں

بد الرحمن کے نام پر ابن حبیب کو چکر سا آگیا۔ سوائے سپہ سالار کے دوسرا باری شہزادے کے نام سے واقف نہ تھا۔ سپہ سالار نے مصلحتاً "شہزادے کے ابن حبیب کو آگاہ نہ کیا تھا۔"

ابن حبیب نے جلدی سے خود پر قابو پایا اور زہر خند سے کہا۔ "عجب اتفاق ہم دونوں ہم نام ہیں۔"

مگر تقدیریں مختلف ہیں حاکم قیرواں! "شہزادے نے ہنس کے جواب دیا۔

خداوند نے حاکم بتایا ہے اور میرا جو حال ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔"

ابن حبیب کچھ نہ بولا اور شہزادے کو ساتھ لئے ہوئے دربار میں آگیا۔ دربار نے شہزادے سے کوئی گفتگو نہ کی اور یہ کہہ کر جلد ہی رخصت کر دیا کہ اس کی تمام ضروریات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا۔ شہزادہ اپنی جگہ خوش اس کی جلد ہی جان چھوٹ گئی اور ابن حبیب نے کم از کم فوری طور پر اس کے کوئی دم نہیں اٹھایا۔

حالات کا تقاضہ تو یہی تھا کہ شہزادے کو فی الحال نہ چھیڑا جائے لیکن شہزادے کا دل غلط نکلا۔ اس کے دربار سے نکلتے ہی ابن حبیب نے سوائے سپہ سالار کے اور رخصت کر دیا اور پھر بڑی رازداری سے سپہ سالار سے مخاطب ہوا۔ "تمہارا ٹھیک تھا۔ اموی شہزادے سے ہمیں فائدے کے بجائے نقصان پہنچ سکتا ہے لے اس کا تدارک ضروری ہے۔"

سپہ سالار دل ہی دل میں ابن حبیب کی بوکھلاہٹ سے لطف اٹھا رہا تھا اس نے ہر دیا۔ "مجھے تو اس کی صورت دیکھتے ہوئے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ صرف یہی نہیں دلی بھی اموی شہزادہ ہمارا ساتھ نہیں دے گا۔ میرا ناقص مشورہ ہے کہ ان تمام لوگوں سے ہٹا دیا جائے۔"

"ٹھیک سوچا ہے تم نے۔" ابن حبیب جلال سے بولا۔ "کل ہم بنی رستم کے سردار کو بلا کر اسے حکم دیں گے کہ وہ شہزادے کو اپنی پناہ سے خارج کر دے۔ بد کے دونوں بیٹوں کو سنبھالو مگر ان کا خاتمہ بڑی خاموشی سے ہونا چاہئے۔ زیادہ

شہزادے کا لہجہ اس قدر پر رعب تھا کہ سپہ سالار سے کوئی بھی جواب نہ دینا اور وہ کھسیانی نہی ہنس کر رہ گیا۔

شہزادے نے قریب بندھے گھوڑے کو کھولا اور جست لگا کر سوار ہوتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "چلے سپہ سالار! آپ کو بہت انتظار کرنا پڑا۔"

☆☆☆

والی قیرواں شہزادے سے ملاقات کا اس قدر شائق تھا کہ اس کے آنے اطلاع ملتے ہی وہ دربار ہال سے اٹھ کر باہر میڑھیوں پر آگیا۔ اس کے تمام سرد ساتھ ساتھ تھے اور ان میں وہ نجوی بھی تھا جس نے پیشین گوئی کی تھی۔ شہزادے کے پاس رک کے گھوڑے سے اترا۔ ابن حبیب میڑھیوں پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ شہزادے کے گھنگھریالے بال اس کے شانوں کو چھو رہے تھے۔ وہ بڑے شاہ انداز سے میڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ یہ شہزادے کی عالی ہمتی تھی کہ شدید خطرے کا گھرے ہونے کے باوجود اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔ شہزادے کو دیکھتے ہی ابن حبیب کا رنگ اڑنا شروع ہو گیا۔ نجوی کبھی ابن حبیب کو دیکھتا تو کبھی شہزادے کو۔ شہزادے کا ہر اگلی میڑھی پر قدم اپنے سینے پر محسوس ہو رہا تھا۔ آخر میڑھی پر پہنچتے پہنچتے ابن حبیب کو یقین ہو گیا کہ یہی اس کا وہ رقیب ہے جس کی اطلاع سپہ سالار نے دی تھی۔ کیونکہ یہ شان اور جلال کسی بادشاہ وقت ہی کے چہرے پر مل سکتا ہے۔

شہزادے نے ابن حبیب کے پاس پہنچ کے بڑے ادب سے سر ذرا خم کرتے ہوئے وقار سے کہا۔ "میں والی قیرواں کو سلام پیش کرتا ہوں اور اس عزت افزائی کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

ابن حبیب ابھی تک اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے شہزادے کی بات جیسے سنی ہی نہیں۔ اسے تو اپنی فکر پڑ گئی تھی۔ بڑی رعوت سے اس نے پوچھا۔

والی قیرواں اپنے معزز مہمان کو کس نام سے مخاطب کرے؟

"عبد الرحمن۔" شہزادے کے بولنے سے پہلے ہی سپہ سالار نے اس کا نام ظاہر

اس نے شہزادے کو بتایا کہ والی قیرواں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ بنی
سے شہزادے کو خارج کر دیں۔ سردار نے شہزادے کو یقین دلایا کہ اس
صاف انکار کر دیا ہے اور اگر ابن حبیب نے شہزادے کو نقصان
کی کوشش کی تو قبیلہ بنی رستم بغاوت کر دے گا۔

شہزادے کے لئے صورت حال اب اور زیادہ سنگین ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو
بچالے رکھا اور اپنے چہرے سے کسی فکر تردد کا اظہار نہ ہونے دیا۔ وہ
معمول شام کے وقت بدر اور نوشانی کے ساتھ سیر کرنے جاتا۔ راستے میں
خوش دلی سے ملتا اور اسی طرح خوش خوش واپس چلا آتا۔ اسے معلوم تھا
سوار کے سوار اس کی حویلی کی نگرانی کر رہے ہیں۔ وہ ان سواروں کو یہ تاثر

دیتا تھا کہ اسے کسی بات کا علم ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا ارادہ ہے۔ اس
نے افریقہ کے ایک مشہور امیر تہورت اور قبیلہ میکینہ سے رابطہ قائم کر
لیا اور باہمت امیر تہورت نے ابن حبیب کی پروا نہ کرتے ہوئے شہزادے
کا وعدہ کر لیا۔ اسی طرح قبیلہ میکینہ کے سردار نے بھی شہزادے سے
مدد کا وعدہ کیا مگر ان لوگوں نے یہ شرط رکھی کہ شہزادہ کسی طرح فرار ہو کر
اپس پہنچ جائے اور اگر شہزادہ جان بچا کر ان تک پہنچ گیا تو پھر وہ اسے ابن
حبیب کی صورت میں بھی واپس نہ کریں گے۔

شہزادہ عبد الرحمن تعاون اور دوستی کے ان پیغامات کے باوجود قیرواں سے نکلنے
کا محفوظ طریقہ اور راستہ تلاش نہ کر سکا تھا۔ اس کی حویلی تو سواروں کے گھیرے
تھے لیکن اسے یہ بھی شبہ تھا کہ سیر کرنے کے دوران بھی اس کی نگرانی کی جا
رہی ہے۔ شہزادے کے سر پر ہر وقت موت کی تلوار لٹکتی رہتی تھی۔ اس کے شب و
روز کرب سے گزر رہے تھے لیکن قیرواں سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو
سکی۔

ایک شام جب وہ سیر کے لئے نکلا تو وہ کچھ دیر اس تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے
معلوم خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اس نے اس بات کا اظہار بدر اور نوشانی
کے دربار میں کیا جو اس کے دائیں بائیں گھوڑے سے گھوڑا ملا کر چل رہے تھے۔ بدر

شور شرابا نہ ہونے پائے۔ ہم اپنے اس دشمن کا اس طرح صفایا کریں گے کہ کسی کو
بھی نہ ہوگی۔

سپہ سالار تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد واپس آگیا اور ولید کے بیٹوں کو فرار
کرنے کی تدبیروں میں لگ گیا۔ اموی شہزادے کا معاملہ ابن حبیب نے خود اپنے ہاتھ
میں رکھا تھا۔ سپہ سالار خوش تھا کہ اسے شہزادے سے براہ راست نہیں الجھنا پڑے
گا۔ حکومت بنی امیہ کے ختم ہو جانے سے افریقہ کے قبائل میں امویوں کے لئے
ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ اس لئے سپہ سالار کو بڑی رازداری اور احتیاط
سے کام کرنا پڑ رہا تھا۔ ولید کے دونوں بیٹوں کو ختم کر دینا کچھ مشکل کام نہ تھا لیکن سپہ
سالار کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر اس نے ان کے قتل کا حکم دے دیا تو کہیں قبائل
میں بغاوت نہ پیدا ہو جائے۔

ادھر ابن حبیب برابر اصرار کر رہا تھا کہ ولید کے دونوں بیٹوں کا جلد خاتمہ کر دیا
جائے۔ سپہ سالار کی تمام احتیاط کے باوجود ولید کے بیٹوں کو یہ خبر مل گئی کہ قیرواں کا
سپہ سالار انہیں ختم کرنا چاہتا ہے۔ خطرے کی اطلاع پاتے ہی دونوں بھائیوں نے باہم
مشورہ کیا اور ایک رات قیرواں سے نکل بھاگے۔ سپہ سالار کے دس سوار ہر وقت
پوشیدہ طور پر ان کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہیں ابھی قتل کرنے کا حکم نہ ملا تھا۔ مگر
جب انہوں نے ولید کے بیٹوں کو فرار ہوتے دیکھا تو اپنے گھوڑے ان کے پیچھے لگا
دیئے۔ ولید کے بیٹوں نے سپہ سالار کے سواروں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو اپنے
گھوڑے اور تیز کر دیئے۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ قیرواں سے تو نکل آئے لیکن بے
کار بیٹھے بیٹھے روٹیاں توڑنے سے ان کی جنگی صلاحیتیں اور شہسواری کی چستی معدوم
ہو گئی تھی۔ قیرواں کے سواروں نے آخر انہیں گھیر ہی لیا اور ایک مختصر شمشیر زنی کے
بعد ولید کے دونوں بیٹے ابن حبیب کی جلد بازی کی بھیٹ چڑھ گئے۔

ولید کے بیٹوں کے قتل پر قیرواں میں بڑا شور و غوغا ہوا لیکن وہ کسی قبیلہ کی پناہ
میں نہ تھے اس لئے کسی قبیلہ نے ان بے گناہوں کے خون پر کوئی آواز نہ اٹھائی۔ اس
کا اثر شہزادہ عبد الرحمن پر ضرور پڑا۔ وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ ولید کے بیٹوں کے
بعد اب اس کا نمبر ہے۔ شہزادے کے اس خیال کی تصدیق بنی رستم کے سردار نے

اور نوشای بھی اس کے اس اظہار سے مغموم ہو گئے اور ان کے گھوڑوں کی رست پڑ گئی۔ شہزادہ عبدالرحمن نے نہ جانے کس خیال سے اپنا گھوڑا ایک دیرسے طرف موڑ دیا۔ وہ ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اسے پشت پر گھوڑے دوڑنے احساس ہوا۔ اس نے گھوڑا روکا اور پلٹ کر دیکھا۔ پانچ سوار بڑی تیزی سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ شہزادے نے بدر اور نوشائی کی جانب دیکھا۔ خطرے نے ابھی ہوشیار کر دیا تھا اور ان کے ہاتھ شمشیر کے قبضے پر پہنچ گئے تھے۔

”میرے کام لو۔ ابھی تلوار مت نکالنا۔“ شہزادے نے کہا پھر گھوم کر آ والوں کو دیکھنے لگا۔ پانچوں سوار اس کے قریب پہنچ گئے۔ یہ سوار اپنے زور برق با اور چمک دار اسلحے سے شاہی محافظ معلوم ہوتے تھے۔ قریب پہنچ کر چار سوار گھینچ کر رک گئے لیکن پانچواں سوار گھوڑا بڑھاتا ہوا شہزادے کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر باریک نقاب تھی اور نصف کھلی ہوئی کلاٹیاں اس کے صنف نازا ہونے کی غمازی کر رہی تھیں۔ شہزادہ اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔

سوار نے جلدی سے نقاب اٹھایا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شوہ شہزادے! آپ سخت خطرے میں ہیں۔“

”شکر ہے۔“ عبدالرحمن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میری پوری زندگی ہی خطرہ سے عبارت ہے مگر بتایا جائے کہ آپ کون ہیں اور اس ہمدردی کی کیا وجہ ہے؟“

”شہزادے! خدا کے لئے اپنی زندگی پر رحم کیجئے۔“ لڑکی نے پشت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ وقت کسی سنجیدہ گفتگو کا نہیں۔ میرا نام خلیہ ہے اور میں دلا قیرواں ابن حبیب کی بہن ہوں۔“

”ابن حبیب بڑی دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔“ شہزادہ بے پروائی سے بولا۔ ”انہوں نے آپ کو میرے پاس بھیج کر ایک سنگین مذاق کیا ہے۔ میری گرفتاری کا مقصد تھی تو سپہ سالار کو بھیجا ہوتا؟“

”مذاق آپ کر رہے ہیں شہزادے!“ خلیہ چڑ کر بولی۔ ”میں نے دو مرتبہ پہلے بھی آپ کو خطرے سے آگاہ کیا۔ میرے پرچے آپ کو مل گئے ہوں گے؟“

”اوہ! تو وہ پرچے آپ کے لکھے ہوئے تھے؟“ شہزادے نے ذرا بھی سنجیدگی

کہا۔ ”فرمائیے! اب میرے لئے کیا حکم ہے؟“

”حکم نہیں بلکہ درخواست ہے۔“ خلیہ نے سر کو جھٹک کر لہراتی ہوئی زلفیں کی طرف کر لیں۔ ”میرے بھائی نے آپ کی گرفتاری کا حکم دیا ہے اور سپہ سالار کے کئی دستے لے کر آپ کی حویلی پر گیا ہے۔ جب اسے معلوم ہو گا کہ آپ میرے گئے ہیں تو وہ آپ کی تلاش میں ادھر ضرور آئے گا۔“

”لیکن میں تو قبیلہ بنی رستم کی پناہ میں ہوں۔“ شہزادے نے سنجیدگی اختیار کی۔

”رجعت پر آمادہ ہو جائیں گے۔“

”میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“ خلیہ فوراً بولی۔ ”سپہ سالار کو حکم دیا گیا کہ رجعت کرنے والوں کو بے دریغ نہ تیغ کر دیا جائے۔“

”شہزادے کو اب وقت کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے بجھے ہوئے لہجے میں

”یہ وقت میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ کوئی مشورہ دے سکتی ہیں مجھے؟“

”مجھے افسوس ہے شہزادے کہ میں نہ کوئی مشورہ دے سکتی ہوں اور نہ آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔“ خلیہ نے بڑی کوفت سے کہا۔ ”میں آپ کی زندگی چاہتی ہوں۔ آپ اسی وقت کسی سمت نکل جائیے۔ شام ہو رہی ہے۔ جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے دور پہنچ جائیے۔ شام کا دھندلا اور رات کی تاریکی ہی آپ کی مددگار

”نہ ہے۔“

”شہزادہ سوچ میں پڑ گیا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ فرار کا خطرہ مول لے یا خود سالار کے حوالے کر دے۔“

خلیہ نے اسے خاموش دیکھ کر پھر کہا۔ ”شہزادے! بہادری یہ نہیں ہے کہ آپ اس چھلانگ لگا دیں۔ سپہ سالار آپ پر کوئی رحم نہیں کرے گا۔“ پھر وہ ایک دم

”وہ آگئے۔ یقیناً وہ سپہ سالار کے سوار ہیں۔ شہزادے جلدی کیجئے۔ میری

”خدا کے لئے۔“

”شہزادے! بدر اور نوشائی کی ایک ساتھ اس طرف نظریں اٹھ گئیں، جدھر دیکھ رہی تھی۔ بہت دور انہیں گرداؤنی دکھائی دی۔

”نیک دل امیر زادی!“ شہزادے نے راسیں سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”اگر قسمت

شہزادے اور بدر کا ساتھ نہ دے سکی اور اس کی رفتار ست ہو گئی۔ شہزادے اپنے ساتھ بٹھانے کی پیش کش کی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بڑے پر دو سواروں کی وجہ سے رفتار اور زیادہ ست ہو جائے گی۔ شہزادے کی اہمی اور بہت سے مددے لکھے تھے۔ دشمن کے سوار اس کے پیچھے لگے چلے گئے اور درمیانہ فاصلہ ہر لحظہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت شہزادہ ایک سیدھی راہ پر چلا گیا تھا کہ اچانک نوشانی کے گھوڑے نے زور سے ٹھوکر کھائی اور الٹا ہو گیا۔ نوشانی کے سپہ رکابوں میں الجھ گئے اور وہ گھوڑے کے ساتھ الٹی پلٹی ہو کر گر پڑے۔ شہزادے اور بدر نے اپنے گھوڑے روک لئے۔ ڈھلوان پر دشمن کے سوار اس دھندلے میں بھی آتے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔

شہزادے نے ڈھلوان کی طرف گھوڑا موڑا ہی تھا کہ نوشانی کی کراہتی ہوئی آواز آئی۔ ”شہزادے! اپنی جان بچائیے مجھے چھوڑیے۔“

نوشانی اس وقت معہ گھوڑے کے جھاڑیوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کی آواز اسے روک دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اگر وہ نوشانی کو اٹھانے کے لئے ڈھلوان پر قریب پہنچتے ہوئے دشمن اسے گھیر لیتے۔ شہزادے نے بدر کی طرف دیکھا۔ بدر نے چراتے ہوئے کہا۔ ”شہزادے! نوشانی کی بات پر عمل کیجئے۔“

شہزادے کا دل رو دیا مگر مجبوری انسان کو بعض اندوہ ناک قدم اٹھانے پر آمادہ ہے۔ شہزادے نے ایک سرد آہ بھری اور بدر کے ساتھ چڑھائی چڑھنے لگا۔ ایک دھڑکتے دیکھ کر سواروں کے گھوڑے اور تیز ہو گئے مگر نوشانی کو جھاڑیوں میں اڑھ کر انہیں افسوس ہوا۔ سپہ سالار نے دو سواروں کو نوشانی کے پاس چھوڑا اور اسے تعاقب پھر شروع کر دیا۔ نوشانی بے ہوش ہو چکی تھی۔ سوار اسے اٹ میں اٹھا کر حاکم قیرواں کے پاس لے گئے۔

شام کے دھندلے اور رات کی تاریکی نے شہزادے کا ساتھ دیا۔ وہ اور بدر سواروں کی دسترس سے دور ہو گئے۔ رات کی سیاہ چادر دونوں کے درمیان لٹک کر کھڑی ہو گئی۔ حاکم قیرواں کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ شہزادہ اس کے ہاتھ سے لے گیا۔ اس نے اپنا غصہ غریب نوشانی پر اتارا اور اسے قید سخت میں ڈال دیا۔

نے مجھے کسی مقام پر پہنچایا تو میں اس احسان کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خلیب نے شہزادے سے آنکھیں چار کیں اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے ”خدا حافظ، فی امان اللہ۔“

شہزادے نے خلیب کے چہرے پر متکبرانہ نظریں ڈال کر گھوڑے کو اڑا کر گھوڑا اچھل کر ہوا میں جیسے اڑنے لگا۔ نوشانی اور بدر اس کے پیچھے گھوڑے پر چل پڑے۔ شہزادے کو اس وقت افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے خلیب کے مختصر پہلے عمل کیوں نہ کیا۔ شہزادے کو اپنی حویلی کی ڈیوڑھی میں دو بار مختصر سے ملے تھے۔ پہلے پرچے میں لفظ ”ہوشیار“ تین مرتبہ لکھا گیا تھا۔ دوسرا پرچہ بھی مختصر تھا اور اس میں ”فرار“ کا لفظ تین بار درج کیا گیا تھا مگر شہزادے اور بدر کا تھا کہ یہ کسی سازش کا حصہ ہے اور کوئی اسے ورغلا کر فرار ہونے پر آمادہ کر رہا۔ کہ فرار کے دوران اسے گرفتار یا قتل کر دیا جائے۔

خلیب گھوڑا موڑ کر آہستہ آہستہ واپس ہوئی۔ قیرواں کے چالیس سوارا جن آگے آگے سپہ سالار تھا اس کے پاس پہنچ گئے۔ سپہ سالار کو خلیب سے کچھ تعلق تھا اور اسے حاصل کرنے کی کوشش میں تھا۔ اس کا علم خلیب کو بھی تھا۔ اس نے سپہ سالار کو روک لیا اور ادھر ادھر کی گفتگو سے اسے الجھانا چاہا۔ سپہ سالار کے لئے یہ بہترین موقع تھا کہ امیر زادی سے تنہائی میں گفتگو کرے مگر اسے حاکم قیرواں حکم دیا تھا کہ شہزادے عبدالرحمن کو زندہ یا مردہ اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

خلیب نے اس سے بڑی لگاؤ کی باتیں شروع کیں لیکن اس نے دوری نہ تین سواروں کو امیر زادی کے پاس سے بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ امیر زادی اسے باتوں کا قریب دے رہی ہے اور بھاگنے والے سوار ضرور شہزادہ اور اس کے ساتھی ہیں وہ صرف چند لمحے خلیب کے قریب رکھا پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر بھاگنے والوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔

شہزادہ عبدالرحمن ایک بہترین سوار تھا۔ عام حالات میں کوئی اس کی گرد کوئی نہ پہنچ سکتا۔ بدر اس کا پورا ساتھ دے رہا تھا لیکن نوشانی آخر کینز تھی۔ اس نے شہزادے کی ساری ساری کیونکہ کینزوں میں شہزادے کی ساری ایک اضافہ صفت تصور کی جاتی تھی۔

پینتالیس سال پہلے طارق بن زیاد نے ولید بن عبد المالک کے حکم سے سمندر کر کے اندلس پر یلغار کی تھی۔“

اور بدر بڑی متانت سے کہتا۔ ”میرے آقا! آپ فکر نہ کیجئے۔ پینتالیس سال کی تاریخ ایک بار پھر دہرائی جائے گی اور آپ اسی جگہ سے سمندر پار کر کے اس میں فاتحانہ داخل ہوں گے۔“

بدر کے اس خیال نے شہزادے کی ہمت کو سہارا دیا۔ بنو نفوسہ ان کی پشت پر اور سمندر پار قرطبہ میں بہت سے اموی سردار اپنے شہزادہ کو خوش آمدید کہنے کو تھے۔ اندلس کا امیر یوسف المنفری تھا لیکن اس کا تعلق شاہی خاندان سے نہ تھا۔ اس کے خلاف تھے اور جگہ جگہ بغاوتیں ہو رہی تھیں۔

اس جگہ تاریخ کی ایک اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ جس طرح طارق بن زیاد نے اس پر حملہ کرنے سے پہلے طریف نامی ایک شخص کو اندلس کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا، بالکل اسی طرح شہزادہ عبد الرحمن نے اپنے غلام بدر کو جبل بن پار کر کے اندلس جانے کا حکم دیا۔ وفادار غلام تاریخ اسلام کا ایک نیا باب لے کے لئے کشتی پر سوار ہو کے جبل الطارق کے اس پار پہنچا اور جزیرۃ المنفری پر قدم قیام کیا۔ جزیرۃ المنفری وہی مقام ہے جہاں طریف کی کشتی ٹھہری تھی۔ بدر نے بدر کو ہدایت کی تھی کہ وہ چین اور ایلورا کے مقامات پر خاص طور پر لگیں کہ ان جگہوں پر بعض سربر آوردہ اموی سردار آباد تھے۔ بدر نے ادھر ہی کا کیا اور چونکہ شہزادہ عبد الرحمن کے سر سے نحوست اور ادبار کے بادل چھٹ چکے اس لئے اس کے غلام بدر کی ملاقات عبد اللہ اور ابن خالد نامی سرداروں سے جن کا تعلق خود اموی خاندان سے تھا اور وہ اندلس کے موجودہ امیر یوسف کے مخالف تھے۔

بدر نے ان سرداروں کو شہزادے کا خط دیا اور تمام حالات زبانی بیان کئے۔ ان کی حکومت اندلس میں پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اور دمشق کی اموی حکومت کے لئے ان کا بھی علم ہو چکا تھا۔ اس لئے شہزادے عبد الرحمن کے خط سے ایک نیا پیرا ہوا اور وہ اندلس میں ایک بار پھر اموی امارت کے خواب دیکھنے لگے۔ عبد



شہزادہ عبد الرحمن اور بدر اپنی جانیں بچا تو لائے مگر انہیں افسوس تھا وفادار کنیز نوشائی کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ ان کے گھوڑے تمام رات راستوں کے و فراز سے گزرتے رہے۔ صبح ہوئی تو پھر وہی رات، دن کی آنکھ پھولی کا میل ہو گیا۔ وہ دن بھر جنگوں اور دیرانوں میں چھپے رہتے اور رات ہوتے ہی اپنا سفر کر دیتے۔ بدر نے ان راستوں سے پہلے ہی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ اس شہزادے کی رہنمائی کرتا ہوا امیر تلموورت کے قبیلے میں پہنچ گیا۔ امیر نے حسب شہزادے کا ساتھ دیا اور اس کے قیام و طعام کا معقول بندوبست کیا لیکن حاکم کے جاسوس پورے افریقہ میں پھیلے اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ شہزادے کا خطرہ محسوس ہوا تو وہ سفر کرتا ہوا قبیلہ میکینہ پہنچا۔ کچھ دن آرام سے گزرے۔ اسے پھر بھاگنا پڑا اس طرح شہزادے کو پورے پانچ سال افریقہ کے ریتلے میدان خاک چھاننا پڑی۔ آخر وہ بھاگتے بھاگتے افریقہ کے مغرب بعید میں بستہ کے ما میں پہنچ گیا۔ اس جگہ اس کی ملاقات قبیلہ نفوسہ کے سردار سے ہوئی۔ سردار کو معلوم ہوا کہ اموی شہزادہ معاویہ بن یزید ثانی کی اولاد ہے تو اس نے شہزادے کو کلیجے سے لگا لیا اور اسے بتایا کہ شہزادہ اس قبیلے کا خاص عزیز ہے۔ کیونکہ شہزادہ ماں اسی قبیلے کی ایک خاتون تھی۔ اس طرح شہزادہ پورے افریقہ کو طے کر کے اپنے نھیال میں پہنچ گیا۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائی۔ بستہ کا علاقہ اور قلعہ بستہ وہی مقام ہے جہاں اسلام کا ایک مجاہد طارق بن ۹۳ھ میں ایک لشکر لے کر عیسائی سردار نواب جولین کے جہازوں پر سوار ہوا۔ اندلس (ہسپانیہ، اسپین) کو فتح کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا۔ جبل الطارق اسی جگہ نام نامی سے آج تک مشہور ہے۔ بستہ پہنچ کے شہزادے کو اطمینان ہی نہیں بلکہ اس کے حوصلے جوان ہو گئے۔ وہ ساحل سمندر پر کھڑے ہو کر جبل الطارق کے اس نظریں دوڑاتا اور بدر سے کہتا۔ ”اے میرے وفادار دوست! یہ وہی جگہ ہے جہاں“

شاہ شروع کیا۔ خط میں اس کی ملکہ قرطبہ نے لکھا تھا۔
امیر اندلس! میرے سر تاج!

اطلاع ہے کہ اموی خلیفہ ہشام کا پوتا شہزادہ، عبد الرحمن مفرور ہو کر افریقہ، برزین اندلس میں وارد ہو چکا ہے۔ اموی سردار عبد اللہ بن عثمان اور ابن عبداری کی اور دونوں عبد الرحمن کے حلیف بن گئے ہیں۔ مفرور شہزادہ اس نوریس میں مقیم ہے اور فوجیں اکٹھی کر رہا ہے تاکہ اندلس کا تخت حاصل کرے۔ آپ کے حفاظتی دستوں نے ایلویرا کے مقام پر عبد الرحمن کے ہاتھوں شکست کا ہے۔ جلد از جلد قرطبہ پہنچے کیونکہ عبد الرحمن کی حمایت پر اموی، شامی اور اندلسی سردار آمادہ ہیں۔

اس خط سے امیر اندلس کو اپنا تخت و تاج لرزتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اس نے وزیر اعظم حمیل کو طلب کیا۔ خط کے مندرجات پر غور کیا گیا۔ خیمے میں امیر اور کے درمیان صلاح و مشورے ہو رہے تھے کہ اموی شہزادے کی اندلس میں آمد فروری کے لشکر میں پھیل گئی۔ فوج میں ابتری پیدا ہو گئی۔ امیر اور وزیر کے دشمنی اندل نے شاہی لشکر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ امیر اندلس نے افراتفری کا یہ عالم دیکھا تو اٹھا کر سیدھا قرطبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اللہ کی کرم نوازیوں کا کیا ٹھکانہ جب کسی کو دینے پر آتا ہے تو اتنا دے دیتا ہے اسے کہ نامی دامان کی شکایت ہوتی ہے عبد الرحمن رات دن تیاریوں میں مصروف رہتا جانتا تھا کہ ہاتھی لاکھ لائے پھر بھی سوا لاکھ لکے کا۔ اندلس کی حکومت میں فوج اور شورشیں ہو رہی تھیں لیکن امیر اندلس کی طاقت اب بھی اتنی تھی کہ طرح کی شورشوں پر کسی نہ کسی طرح قابو پارہا تھا۔ ایسی طاقت سے ٹکرانے کے فلاح کا جگر چاہیے مگر جب اوپر سے اشارہ ہو جائے تو کام اپنے بنتے چلے جاتے۔ عبد الرحمن کے کام تو خود اس کے دشمن کر رہے تھے۔

جب اندلس کا لشکر قرطبہ واپس ہوا تو وزیر نے امیر اندلس سے کہا۔ ”امیر عالی ہاں! سنے فتنے کو دبانے کی ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے۔ حکم ہو تو میں ماکول۔“

استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ فضائیں شاہ اندلس اور امیر عبد الرحمن کے نفوس۔ گونج رہی تھیں۔ اندلس کے دو رئیس، عبد اللہ اور ابن خالد آگے آگے تھے۔ ان کے چہروں سے مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ شہزادہ عبد الرحمن کا چہرہ فرط انہر سے دھک اٹھا تھا۔ وہ تمام حاضرین سے بڑی گرم جوشی سے ملا۔

عبد الرحمن کی پہلی میزبانی کا شرف ابن خالد کو حاصل ہوا۔ وہ معزز مہمانوں اپنے محل میں لے گیا۔ پھر لوجا قلعہ میں ایک اموی سردار نے اپنے بادشاہ کی میزبانی شرف حاصل کیا اور قلعہ اور خزانے کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ شہزادے قسمت جاگ اٹھی تھی اور ہر قبیلہ اسے اپنا مہمان بنانے کا فخر حاصل کرنا چاہتا تھا قلعہ لوجا سے عبد الرحمن نے آگے بڑھ کر ٹوریکس کے قلعے میں قیام کیا۔ یہ قلعہ و اللہ کا تھا۔ طے ہوا کہ ہمیں ٹھہر کر طاقت جمع کی جائے۔ پھر امیر اندلس یوسف انصر کے خلاف کاروائی کا آغاز ہو۔

امیر اندلس ان دنوں سرقط کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا۔ سرقط قریش النسل حاکم ابو عمر شدید مدافعت کر رہا تھا لیکن رسد کی کمی کی وجہ سے اسے شکست تسلیم کرنا پڑی۔ حاکم اور اس کے دونوں بیٹے گرفتار کر لئے گئے۔ اندلس وزیر اعظم حمیل، قریش سے نفرت کرتا تھا۔ اس نے رائے دی کہ گرفتار شدگان کو قتل کر دیا جائے۔ مگر فوج میں موجود قریش سرداروں نے اس کی مخالفت کی۔ ابھی یہ مسئلہ طے نہ ہوا تھا کہ باسکس کی خونخوار قوم پہاڑوں سے ابل پڑی اور مسلم علاقوں کو تیس تیس کرنا شروع کر دیا۔ حمیل نے اسے گرفتار ہونے والوں کی نحوست قرار دیا اور اس ہمارے ابو عمر اور اس کے دونوں بیٹوں کو قتل کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش النسل سرداروں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔

قریشیوں کا خون بے ابھی چند ہی گھنٹے گزرے تھے اور امیر اندلس سکون قلب کے لئے اپنی دونوں بیٹیوں کے خیمے میں بیٹھا تھا کہ ایک کنیز نے داخل ہو کر اطلاع دی کہ ام عثمان ملکہ قرطبہ کا قاصد آیا ہے اور فوری قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔ امیر پہلے ہی پریشان بیٹھا تھا۔ قرطبہ کے قاصد کی آمد سے وہ اور گھبرا گیا۔ قاصد کو خیمے سے طلب کیا گیا۔ قاصد نے آداب بجا لا کر امیر کی بیوی کا خط پیش کیا۔ امیر نے خط نکال

امیر اندلس یوسف الفہری سخت پریشان تھا۔ اس کے سردار اور سپاہی چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اسے اپنے وزیر پر اب تک اعتماد تھا۔ اس نے فرمایا: ”اے وزیر! ہم نے تمہارا ہر مشورہ قبول کیا ہے اگر تمہارے ذہن میں کوئی بات ہے تو ضرور کہو۔ ہمارے لشکر کا جو حال ہے وہ تم سے چھپا ہوا نہیں ہے۔“

وزیر نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”امیر محترم! جنگ تلوار سے بھی لڑی جاتی ہے ا حکمت عملی سے بھی۔ موجودہ حالات میں مجھے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اموی شہزادے سے ٹکرانے کی بجائے کچھ لے دے کے صلح کر لی جائے۔“

امیر اندلس کی عقل تو پہلے ہی بوڑھی ہو چکی تھی۔ صلح کے نام پر وہ خوش گیا، پوچھا۔ ”میل! تمہارے خیال میں اموی شہزادے کو کیا کچھ دیا جاسکتا ہے جو اسے وہ مطمئن ہو جائے اور جنگ کی نیت نہ آئے۔“

”عورت اور دولت، دو چیزیں انسان کی کمزوری ہیں۔“ میل فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”شہزادے کو انہی دو چیزوں سے مارا جاسکتا ہے۔ اسے کچھ علاقہ دے دیا جا۔ اور اندلس کی کوئی حسین ترین دوشیزہ اس کے عقد میں دے دی جائے۔“

”تمہاری ترکیب دل کو لگتی ہے۔“ امیر نے جواب دیا۔ ”مگر شہزادے کے ذہن میں کس دوشیزہ کو دیا جائے۔ لڑکی ایسی ہونی چاہئے جس سے شہزادہ انکار نہ کر سکے۔“ ”اگر برابر کا رشتہ ہو تو شہزادہ انکار نہ کر سکے گا۔“ میل نے امیر کو غور سے دیکھا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ شہزادی؟“ امیر کہتے کہتے رک گیا۔

”امیر محترم! ہماری چھوٹی شہزادی لاکھوں کروڑوں میں ایک ہے۔ ان کی صورت اور سیرت کی تعریف ہر زبان پر ہے غریب الوطن اور پریشان حال شہزادے کے لئے سب سے بڑا اعزاز ہو گا بشرطیکہ امیر میری اس تجویز کو منظور فرمائیں۔“

امیر یوسف الفہری کو اپنا اقتدار ہر صورت بچانا تھا۔ اس نے وزیر کی تجویز منظور کر لی۔ فوراً ایک سفارت ترتیب دی گئی دربار قرطبہ کی تین اہم ہستیاں اس میں شامل کی گئیں۔ ایک رکن عبید تھا جو پورے اندلس میں اپنی چرب زبانی اور حسن کلام کے لئے مشہور تھا۔ دوسرا رکن خالد تھا۔ جس کا تعلق اندلس کے ایک قبائلی

قبیلے سے تھا۔ جس نے مسلمانوں کی آمد سے اسلام قبول کیا تھا۔ خالد بڑا ذہین اور مہیا تھا۔ یہ اپنی قابلیت کے زور پر امیر یوسف کے مشیر کے عہدے پر فائز تھا مگر اس کا غرور بہت تھا۔ تیسرے رکن کے لئے عیسیٰ کا انتخاب ہوا، جو اندلس کا فوج کا عامل تھا۔

ادھر ٹوریکس کے قلعے میں شہزادے عبد الرحمن نے بیس ہزار کا لشکر تیار کر لیا اور پھر بھی مطمئن نہ تھا۔ اس کے دونوں اموی سردار عبد اللہ اور ابن خالد بھی بیان تھے۔ انہوں نے امیر وقت سے بغاوت کی تھی اب ان کی تمام امیدیں شہزادے کا مہیا بننے سے وابستہ تھیں۔ امید و بیم اور گھٹن کی اس فضا میں ٹوریکس کے رہنما نے اطلاع دی کہ قرطبہ سے صلح کی سفارت آ رہی تھی۔ یہ لوگ قرطبہ کے رکن امید کئے ہوئے تھے۔ سفارت کا نام سن کر ان کے چروں پر رونق آ گئی۔

قرطبہ کی سفارت کو بڑی عزت سے ٹوریکس کے چھوٹے سے قلعے کے ایک کمرے میں شہزادے عبد الرحمن کے سامنے پیش کیا گیا۔ شہزادہ اب غریب و ملن نہ تھا۔ اس کے دربار میں اس کے آدمی اور جان نثار موجود تھے۔ سفارت کا اہل تھا کہ عبد الرحمن مفلوک الحال ہو گا اور اس نے تھوڑی سی فوج اکٹھی کی ہو گی نہ وہ جس راستے سے گزر کر آئے تھے وہاں انہیں فوجی تیاریوں کی جھلکیاں نظر آئی۔ تلواروں پر سان رکھی جا رہی تھی۔ تیروں کی نوکیں درست ہو رہی تھیں، وائوں کی فطیلیں بدلی جا رہی تھیں۔

سفارت کے ارکان عبد الرحمن کو سلام کر کے مٹلیں فرش پر بیٹھ گئے۔ عبد الرحمن زرنگار تکیوں کے سارے یوں بیٹھا تھا، جیسے دمشق کے اموی خلیفہ بیٹھتے تھے۔ اس نے سفارت کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان کے آنے کا مقصد دریافت کیا۔

امیر یوسف کے مشیر خالد نے اپنے ساتھی عبید کو اشارہ کیا اور عبید نے اپنی طرف اشارہ کیا اور چرب زبانی کے جوہر دکھانا شروع کئے۔ اس نے ادب سے سلام کرنے کے لئے

”اے بنو امیہ کے عالی مقام شہزادے! امیر اندلس یوسف الفہری نے آپ کے

اندلس میں درود پر اظہار مسرت کیا ہے اور آپ کو ہر قسم کے فکر و تردد سے رہنے اور جنگ و جدل سے انحراف کا مشورہ دیا ہے۔ امیر نے فرمایا ہے کہ بنو امیہ جلیل القدر خلفاء نے ہمیشہ خاندان الفہری کے ساتھ خسرانہ عنایت کی ہیں خصوصاً فاتح افریقہ عقبہ بن نافع الفہری کے ساتھ امویوں نے جس نوازش اور لطف کا اظہار کیا تھا وہ ناقابل فراموش ہے اور الفہری خاندان والے اس احسان کو آج تک نہیں بھولے۔ امیر محترم نے خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ اندلس کی امارت کے دعوے سے دستبردار ہو کے قرطبہ میں قدم رنجہ فرمائیں جہاں آپ کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے گی اور وہ تمام علاقہ جو آپ کے جنت مکانی دادا خلیہ ہشام بن عبد الملک کے عہد زریں میں فتح ہو چکا تھا آپ کی تحویل میں دے دیا جائے گا اور وہ پیش قیامت تحائف جو آپ کے لئے قرطبہ سے روانہ کئے گئے ہیں آپ نذر کئے جائیں گے۔ اس کے علاوہ امیر اندلس آپ کے ساتھ محبت اور خلوص رشتے استوار کرنے کے لئے آپ کو اپنی فرزندگی میں لینے کے لئے تیار ہیں اور آپ کی اجازت ہوتے ہی ماہتاب قرطبہ شہزادی عالیہ کو آپ کے عقد میں دے دیا جائے گا اگر آپ غور فرمائیں تو یہ اعزاز آپ کے لئے بھی قابل فخر ہو گا۔

وزیر اور امیر اندلس نے شہزادے کو بہت بڑی پیش کش کی تھی۔ اندلس ایک بڑا حصہ شہزادے کے دادا کے عہد میں فتح ہو چکا تھا۔ اس کی امارت کی پیش کش کا مطلب صاف تھا کہ شہزادے کو اندلس کی سب سے بڑی جاگیر دی جا رہی تھی۔ اسے امیر اندلس کی فرزندگی کا لالچ دیا گیا تھا لیکن شہزادے کو تو ایک ایسی حکومت کی آرزو تھی جو دمشق کی خلافت کا جواب ہو اور خلفائے بنی عباس کے سامنے سر بلند کر کے گفتگو کر سکے۔

شہزادے عبد الرحمن نے ابن خالد اور عبد اللہ سے مشورہ کیا پھر متانت سے کہا۔ ”اموی شہزادے عبد الرحمن بن معاویہ بن خلیفہ یزید ثانی کی طرف سے یوسف الفہری کو مطلع کیا جائے کہ ان کے بھیجے ہوئے پیغام پر ہم غور کریں گے۔“ شہزادہ یہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو گیا۔ بظاہر یہ صاف انکار نہ تھا مگر اس جواب سے کوئی امید بھی وابستہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ عبید کی تمام لفاظی بے کار ہو گئی۔ اس

امویہ آواز میں کہا۔ ”سفارت بہت دور سے آئی ہے۔ آپ ہمیں ناامید نہ کیجئے۔“ ہم نے انکار نہیں کیا لیکن ایسے اہم فیصلے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ شہزادے نے اپنے اس جواب میں بھی انکار نہ کیا لیکن جو کچھ کہا وہ انکار ہی کے مترادف تھا۔

عبید نے مجبور ہو کے درخواست کی۔ ”شہزادہ عالی مقام! ہم لوگوں نے اپنے امیر آپ کا جواب پہنچانا ہے۔ برائے کرم تحریری جواب کا حکم دیا جائے۔“ ”رکن سفارت کی درخواست نامنظور کی جاتی ہے۔“ شہزادے نے پر رعب ہمیں کہا۔ ”صلح کی شرائط ہمارے سامنے زبانی پیش کی گئی ہیں اس کا جواب تحریری دیا جاسکتا ہے؟“

اسی وقت سفارت کے دوسرے رکن خالد نے آگے بڑھ کر ایک خط پیش کر دیا۔ ”اموی شہزادے! ہمارے امیر نے عبید کے بیان کی تصدیق کے لئے آپ کے نام ایک خط دیا ہے۔ زبانی اور تحریری بیان میں سرمو بھی فرق نہیں ہے۔“ شہزادے عبد الرحمن نے امیر اندلس کا خط پڑھا۔ خط کا مضمون اس قدر فائدہ تھا کہ اسے امیر اندلس کی ایک تحریری درخواست کہا جاسکتا ہے۔ شہزادہ اس سے بہت متاثر ہوا اور قہر خداوندی سے کانپ اٹھا۔ یوسف الفہری کی تحریک کا انداز کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ اپنے وقار کی بھیک مانگ رہا ہے اور آپ کہ صرف اپنی زندگی تک اندلس کی امارت کا خواہش مند ہے۔

شہزادے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”یوسف الفہری نے ہمارے لئے جن شرائط کا اظہار کیا ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اس مسئلے پر دوبارہ غور کریں۔“ رکن کو سمان خانے میں عزت سے ٹھہرایا جائے۔ جواب ترتیب دے کے جلد ہی کے حوالے کر دیا جائے گا۔“

دربار کی فضا ایک دم تبدیل ہو گئی۔ امیر اندلس کی سفارت کو کسی بہتر جواب کی امید نہ ہو گئی۔ شہزادے نے یوسف الفہری کا خط عبید اللہ حاکم قلعہ ٹوریکس کو بھیج دیا۔ ”اس خط کو غور سے پڑھ کے جواب لکھا جائے اور ہمیں پیش کیا جائے۔“

میں اور افریقہ کے مختلف قبائل پر مشتمل بیس ہزار کا لشکر تھا۔ امیر اندلس یوسف
میں ذہنی طور پر اپنی شکست تسلیم کر چکا تھا لیکن اس کے تینوں لڑکے، دو لڑکیاں اور
ام عثمان میدان جنگ میں مردانہ وار مقابلے کی خواہش مند تھیں۔ شہزادہ قلعہ
میں سے چل کر قرطبہ کے اطراف میں پہنچ گیا۔ جس راستے سے وہ گزرا
نے "امیر اندلس" عبد الرحمن کے نعرے بلند کئے۔ اسے کسی خاص مدافعت کا
باندہ کرنا پڑا۔

جنگ موسورا، سرزمین اندلس پر دوسری جنگ تھی جس میں اندلس کی قسمت
فیصلہ ہوا۔ پہلی جنگ ۹۳ھ میں طارق بن زیاد اور اندلس کے شہنشاہ راڈرک کے
ہاتھ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں دو مختلف قومیں ایک دوسرے کے مد مقابل تھیں۔
راڈرک کو فوجیت حاصل تھی۔ مگر مجاہدین اسلام نے اپنے سے بارہ گنا
ن کو شکست دے کر اندلس کی حکومت حاصل کی۔ جنگ موسورا بھی فیصلہ کن
تھی مگر اس میں ایک ہی دین اور تہذیب و تمدن کے مالک ایک دوسرے کے
مختلف آراء تھے، فرق تھا تو صرف ان کی ہمتوں اور جراتوں کا تھا۔ جنگ سے
کچھ حکمت عملیوں اور حیلہ سازیوں کا بھی سہارا لیا گیا لیکن امیر اندلس کی قسمت
شکست لکھی جا چکی تھی۔ صرف پانچ گھنٹوں کی لڑائی نے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔
امیر اندلس کو میدان چھوڑ کر مریدا کی طرف بھاگنا پڑا۔ اس کا وزیر صمیل، جین
طرف بھاگ گیا۔

فتح کا طبل بجا تو معنیوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ ملکہ اندلس ام عثمان اور
شاہی خیمے ایک خیمے میں موجود تھیں۔ یعنی لوٹ مار کرتے
سے شاہی خیمے تک آ گئے اور ملکہ اور شہزادیوں کے بھی درپے آزار ہوئے۔
اسے کو علم ہوا تو وہ گھوڑا دوڑاتا آ گیا اور شاہی خواتین کو معنیوں سے آزادی
دے کر فوراً صاحب سلامت کو بلوایا۔ صاحب سلامت مسجد قرطبہ کے امام
تھے۔ شہزادے نے شاہی خواتین کو ان کے حوالے کیا اور امیر اندلس تک
پہنچنے کا انتظام کیا۔

شاہی خواتین میں وہ شہزادی بھی تھی جسے امیر اندلس نے شہزادے کے عقد میں

امیر اندلس کا خط اس کے مشیر خالد نے لکھا تھا اور خالد ہی نے یہ خط پیش کیا
تھا۔ وہ اپنی کامیاب تحریر پر دل میں خوش تو بہت ہوا لیکن جب شہزادے نے عبید اللہ
کو اس کا جواب لکھنے کا حکم دیا تو وہ جل گیا۔ عبید اللہ علیت میں اس سے کم تھا۔ پھر
اس نے امیر اندلس کے خلاف سازش کی تھی۔ خالد کی علیت اور ہمہ دانی کا غور غور
کر آیا۔ وہ غصے سے اپنے ہونٹ چباتا رہا پھر تکبر سے سر بلند کر کے بولا۔ "شہزادہ
محترم! مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس قدر نازک اور قابلیت کے کام کے لئے
عبید اللہ جیسے گنوار اور جاہل انسان کا انتخاب قطعی موزوں نہیں ہے۔"

یہ سن کر شہزادے کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ خالد نے سرور بار اس کے محسن کی توہین
کی تھی۔ ادھر عبید اللہ کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ غصے سے اس کا بدن کاپ رہا
تھا اور اس کا ہاتھ بار بار قبضہ شمشیر پر جا رہا تھا۔

شہزادے نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ پر رعب آواز میں بولا۔ "ہم
سفارت کا احترام کرتے ہیں لیکن یوسف الفہری کے ایک سفارت کار نے ہمارے
قابل احترام اموی سردار عبید اللہ کی سخت بے عزتی کی ہے جسے برداشت نہیں کیا جا
سکتا۔ ہم اس سفارت کار کی گرفتاری کا حکم دیتے ہیں۔ باقی سفارت کار قرطبہ واپس جا
سکتے ہیں۔ یوسف الفہری کے لئے یہی ہمارا جواب ہے۔"

بات بنتے بنتے بگڑ گئی۔ ممکن تھا کہ شہزادے اور امیر اندلس میں صلح ہو جاتی
لیکن خالد نے اپنی علیت اور نفرت کا اظہار کر کے بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ خالد کی
گرفتاری سے عبید اللہ اور دوسرے لوگ بہت خوش ہوئے کیونکہ ان کے خیال میں
خالد کی گرفتاری اس توہین کا صحیح فیصلہ تھا۔ اگر شہزادہ اس وقت دوا مریت اور کمزوری
دکھاتا تو اموی سردار اس کا ساتھ چھوڑ دیتے۔
دونوں طرف جنگ کی تیاریوں میں اضافہ ہو گیا۔

☆☆☆

جنگ موسورا میں اندلس کی امارت کا فیصلہ ہو گیا۔ موسور دار السلطنت قرطبہ
سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ شہزادہ عبد الرحمن کے ساتھ یعنی شاہی

اب تک اس کے ساتھ تھا۔ جنگ موسور کے موقع پر امیر یوسف کی بیٹی نے ہلال ایک جین و جمیل کینز شہزادے کی نذر کی تھی وہ اب تک بدر کی تحویل میں تھی۔ لڑائی با حیا کینز تھی۔ ہر وقت چہرے پر نقاب ڈالے رہتی تھی۔ چونکہ ہلال کو اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اس لئے بدر اس کی عزت کرتا اور ہر طرح کا دل رکھتا۔ اس نے اب تک ہلال کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

ایک دن شہزادہ عبد الرحمن جو اب امیر اندلس تھا، کچھ مغموم تھا۔ اسے اپنے لڑکوں کی یاد ستا رہی تھی۔ اس نے بدر کو بلا کر حکم دیا کہ اس کے گھروالوں کو اپنے سے بلانے کا انتظام کیا جائے۔ اس کا لڑکا سلیمان افریقہ پہنچ چکا تھا اور قبیلہ بنی ہاشم میں مقیم تھا۔ بدر تعمیل حکم کے لئے باہر جانے لگا تو عبد الرحمن کو اچانک اس بڑے خیال آیا جسے یوسف کی بیٹی نے نذر کیا تھا۔

”بدر! وہ کینز کہاں ہے جو یوسف کی بیٹی نے ہمیں نذر کی تھی؟“ عبد الرحمن بدر کو روک کر پوچھا۔

”امیر محترم!“ بدر نے ادب سے کہا۔ ”کینز کو امیر نے اس غلام کی تحویل میں لے لیا۔ میں نے اسے اپنی بیٹی کی طرح سر آنکھوں پر بیٹھائے رکھا ہے۔ وہ اس قدر اہم ہے کہ میں نے خود بھی آج تک اس کی صورت نہیں دیکھی۔“

”کینز حاضر کی جائے۔“ امیر نے مسکرا کے کہا۔

بدر اپنے گھر گیا اور تھوڑی دیر بعد کینز کو ساتھ لئے واپس آیا۔ کینز اس قدر با محنت تھی کہ اس نے چہرہ پر تھرا نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس کا پورا جسم چادر میں لپٹا تھا۔ اہل کی ایک پور تک نظر نہ آتی تھی۔ بدر کینز کو عبد الرحمن کے خاص کمرہ میں لے کر باہر چلا گیا۔

بدر کے واپس جاتے ہی کینز نے بڑے ادب سے کورنش پیش کیا اور بولی۔ ”کینز آقا کے محترم کو فتح عظیم کی مبارک باد پیش کرتی ہے۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ شہزادے نے چادر میں لپٹی ہوئی کینز کو غور سے دیکھا۔ ”آقا، کینز کو جس نام سے چاہیں پکار سکتے ہیں۔“ ہلال نے بڑے سلیقے سے جواب دیا۔ ”میرے پرانے آقا اور آقا زادیاں مجھے ”ہلال“ کے نام سے پکارتے

دینے کی خواہش کی تھی۔ وہ چہرے پر نقاب ڈال کے شہزادے کے سامنے آگئی۔ اس نے کورنش پیش کرنے کے بعد کہا۔ ”اے فاتح شہزادے! میں امیر اندلس کی وہ بیٹی ہوں جس کے لئے میرے باپ نے آپ کا انتخاب کیا تھا۔ میں انتخاب کے خلاف تھی کیونکہ وہ ایک سیاسی سودے بازی تھی۔ اب میں ایک شکست خوردہ امیر کی بیٹی ہوں۔ آپ مجھے زبردستی کینز بنا سکتے تھے لیکن آپ نے ہم پر رحم کیا اور ہمیں امیر کے پاس بھیجنے کا حکم دیا۔ میں اس حسن سلوک کے لئے اپنی بہن اور مغموم ملکہ کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ میرے پاس آپ کے شایان شان کوئی چیز نذر کرنے کے لئے نہیں سوائے ایک مہذب، تربیب یافتہ اور حسن و جمال میں لامتناہی کینز کے۔ میں امید کرتی ہوں کہ آپ اس کینز کے نذرانے کو شرف قبولیت بخش کے ہم خانہاں بربادوں پر مزید احسان فرمائیں گے۔“

شہزادہ، شہزادی کی گفتگو سے خوش ہوا۔ اس نے کہا۔ ”نذرانہ قبول کیا جاتا ہے۔ ملکہ اور شہزادیوں کو جس علاقے کی امارت اور حکمرانی چاہئے وہ عطا کی جاسکتی ہے۔“

”شکریہ شہزادے اور امیر اندلس۔“ شہزادی نے گلوگیر آوازیں کہا۔ ”میں اور کچھ نہیں چاہئے۔“ یہ کہہ کر شہزادی نے رخصتی سلام کیا اور تیز قدم اٹھاتی گئی۔

شہزادے نے بدر کو حکم دیا کہ کینز کو حاصل کر کے اس کے سامنے اس وقت پیش کیا جائے جب وہ قرطبہ کا قبضہ حاصل کر لیں۔ پھر شہزادے نے میدان جنگ سے قرطبہ کا رخ کیا۔ شہر کے صدر دروازے پر اس کا نعروں سے استقبال کیا گیا۔ جس وقت شہزادہ عبد الرحمن صدر دروازے سے شہر میں داخل ہو رہا تھا تو امیر اندلس کا ایک بیٹا، جس کے سپرد قرطبہ کی حفاظت تھی، قرطبہ کے دوسرے دروازے سے نکل رہا تھا۔

بنو امیہ کے مفرور اور غریب الوطن شہزادے عبد الرحمن نے اپنی ذاتی کوششوں، مرواگی اور ہمت سے اندلس کی امارت حاصل کر لی تھی وہ تاریخ میں عبد الرحمن الداخل کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی وفادار کینز نوشائی قتل ہو چکی تھی مگر

ہیں امیر کی خدمت کے لئے پھر حاضر ہو گئی۔
 ”ہاں بدر!“ امیر عبد الرحمن نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔
 ”نوشائی کی خدمات کنیز کے مرتبہ سے بہت بلند تھیں۔ ہم نے اسے کھو دیا اور
 اسے خلوص کا صلہ نہ دے سکے مگر اب ایسا نہ ہو گا۔ ہم نوشائی کو اپنے دل میں
 رہنے اور اس کی نسل سے اندلس میں ہماری امارت پر وان چڑھے گی۔“
 امیر اندلس نے جو شاہانہ فیصلہ کیا تھا اس پر عمل بھی کیا۔ کنیز ہلال کو ملکہ
 کا درجہ بخشا گیا اور اسی کنیز کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ ہشام بن عبد
 اللہ کے نام سے امیر کے بعد اندلس کا دوسرا امیر بنا۔ عبد الرحمن کی پہلی بیوی
 سلیمان اور عبد اللہ دو اور لڑکے بھی تھے لیکن وہ دونوں ہشام کے حق میں
 ہار ہو گئے۔

☆☆☆

تھے۔“
 ”ہلال۔“ عبد الرحمن نے زیر لب کہا۔ ”ہم نے تمہاری شرم و حیا کی توثیق
 سنی ہے مگر ہم سے یہ پردہ کیا؟“
 ”کنیز اپنے آقا کے حکم کی منتظر ہے۔“ ہلال نے اجازت طلب کی۔
 ”تمام نقاب چہرے سے علیحدہ کئے جائیں۔“ عبد الرحمن نے حکم دیا۔
 ہلال نے پہلے ہاتھوں پر چڑھے ہوئے دستاں الگ کئے پھر ایک ایک کر کے
 چہرے سے نقاب اتارنے لگی۔ جس وقت ہلال نے پہلا نقاب الگ کیا، عبد الرحمن
 نے اسے تعجب سے دیکھا۔ دوسرا نقاب اترا تو عبد الرحمن کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔
 پھر ہلال نے تیسرا اور آخری نقاب چہرے سے الگ کیا تو عبد الرحمن فرط حیرت
 چیخ کے کھڑا ہو گیا۔

”تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ نوشائی۔۔۔۔۔ تم زندہ ہو نوشائی؟“ عبد الرحمن۔
 نوشائی کا لفظ اس قدر زور سے کہا تھا کہ دروازے کے باہر کھڑا ہوا بدر گھبرا
 دروازے کے قریب آ گیا۔
 ”امیر عالی مقام! کنیز کا نام ہلال ہے۔“ اور کنیز پھٹی پھٹی نظروں سے امیر
 دیکھنے لگی۔

”نہیں نہیں، تم نوشائی ہو۔“

عبد الرحمن بد خواص ہو کر دروازے کی طرف بھاگا اور بدر کو آواز دی۔
 ”بدر۔۔۔۔۔ بدر آؤ۔۔۔۔۔ اندر آ جاؤ۔ دیکھو تو کون آیا ہے۔ ہماری نوشائی واپس
 آ گئی ہے۔“

بدر تو دروازے سے لگا ہی کھڑا تھا۔ عبد الرحمن کی گھبرائی آواز سن کر طبلہ
 سے اندر آ گیا۔ ہلال پر نظر پڑتے ہی وہ بھی بھونچکا رہ گیا۔ وہی رنگ، وہی روپ
 ہلال اور نوشائی میں رقی بھر فرق نہ تھا۔

”دیکھا تم نے۔۔۔۔۔ یہ نوشائی ہے نا؟“ عبد الرحمن نے مسرت سے کہا۔
 ”امیر درست فرما رہے ہیں۔“ بدر نے کہا۔ ”نوشائی نے امیر کی جو خدمت کی
 تھی خدا نے اس کا صلہ دیا ہے۔ امیر اپنی کنیز کو یاد کرتے رہتے تھے، سو وہ اس کنیز

ایمان تھا۔ اس لئے آگے بڑھنے کے بجائے وہ ایک ہی جگہ اچھلنے کودنے لگا۔ زردار کی بری حالت ہو رہی تھی۔ اس کی کمان دب کر ٹیڑھی ہو گئی تھی اور ترکش بار اس کی لمبی چونچ دار ٹوپی سے ٹکرا رہا تھا۔

اس وقت تک اجنبی آذر پائی جان کی سرحد میں کافی اندر تک پہنچ گیا تھا۔ بالآخر بڑے کو زردار بیک پر رحم آیا۔ اس نے اچھلتا کودنا بند کر دیا اور ایک جگہ رک کر راہ ہو گیا۔ زردار بیک نے جلدی سے بائیں سنبھالیں اور تن کر بیٹھ گیا مگر اب مشکل فنی کہ وہ گھوڑا کو دوبارہ ممیز کرتے گھبرا رہا تھا۔ پھر نہ جانے ایک دم اسے کیا خیال کہ اس نے رکاب سے ایک پیر نکال کر ہاتھ سے جوتا کھینچ لیا اور گھوڑے کی گردن پر بھرتے ہوئے گھوڑے سے مخاطب ہوا۔

آغا بیگی

”دیکھ میرے بھائی! میں نے جوتا پیر سے جدا کر دیا ہے۔ اسی جوتے میں وہ کیل جو تیرے پیٹ میں چھپی تھی۔ اب میں اس جوتے کو دور پھینک رہا ہوں۔ نہ گاہنوں اور نہ بچے گی بانسری۔“ یہ کہتے ہوئے زردار بیک نے ممیز والا جوتا دور کیا۔ اس کے ساتھ ہی گھوڑا آہستہ آہستہ اس طرف چلنے لگا جدھر اجنبی سوار اچلا جا رہا تھا۔

”میرے دوست بھائی۔“ زردار بیک نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔ ”تیری اس بے والی چال سے تو میں دشمن تک کبھی نہ پہنچ سکوں گا۔ میری ملازمت پر رحم اگر تساہل اور غفلت کے الزام میں ملازمت سے نکال دیا گیا تو میرے ساتھ تو بھی دل مرجائے گا۔ چل، قدم اٹھا۔ مجھے دشمن تک پہنچا دے میں اس کا سر توڑ دوں۔“ میری اجازت کے بغیر سرحد میں داخل کیسے ہوا؟

گھوڑے کی وفاداری دنیا میں مشہور ہے۔ جواب میں گھوڑے نے بھی وفاداری کا ثبوت دیا اور گردن کو دو، ایک جھٹکے دینے کے بعد طوفان بادوباراں کی طرح زقندیں ہلانے لگا۔ زردار بیک کے چہرے پر مسرت اور مسکراہٹ لہرانے لگی۔ اجنبی سوار کئی دور نکل چکا تھا لیکن زردار بیک کا گھوڑا بہت جلد اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اسے کھینچ کر گھوڑے کو روکنا چاہا مگر گھوڑا تو ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے کے بجائے اپنی رفتار اور تیز گردی۔ زردار بیک کی حالت اب پہلے سے بھی زیادہ

سوار اس تیزی سے سرحد میں داخل ہوا کہ زردار بیک کا منہ کھلا رہ گیا۔ زردار بیک کا تعلق سرحدی محافظ دستے سے تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آنے والا اجنبی سوار اس کے قریب پہنچ کر گھوڑا روکے گا اور زردار بیک سے آذر بایجان کی سرحد میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرے گا لیکن اجنبی سوار جس طرح سرحد گھوڑا دوڑاتا آ رہا تھا اسی طرح بغیر زردار بیک کی پروا کئے اپنا گھوڑا بھگاتا بے دھڑک سرحد کے اندر آ گیا۔ یہ ایک محافظ سردار کی سراسر توہین تھی۔ پھر زردار بیک تو اپنے آگے کسی دوسرے کو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔ اجنبی کے اس غیر مہذب اور سرکش انداز سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

زردار بیک نے ایک جھرجھری لی۔ دوڑتے ہوئے اجنبی کو دیکھا اور پھر اس فنی سے گھوڑے کو ممیز دی کہ لوہے کی کیل آدھ انچ کے قریب گھوڑے کے پیٹ میں اڑ گئی۔ گھوڑا تکلیف سے بیتاب ہو گیا۔ وہ ہنسنا کر کئی فٹ اونچا اچھلا۔ زردار بیک کا توازن بگڑ گیا اور وہ گھبرا کر گھوڑے کی ایال سے چٹ گیا۔ گھوڑے کو شاید اپنے سوار

خراب ہو گئی۔ وہ جتنی طاقت سے راسیں کھینچتا گھوڑے کی رفتار میں اسی لحاظ اضافہ ہو جاتا۔ یہاں تک کہ زردار بیک اپنے دشمن سوار کو پیچھے چھوڑتا ہوا بہت نکل گیا۔ زردار بیک نے تنگ آکر راسیں ڈھیلی کر دیں مگر اسے یہ دیکھ کر سخت ہوا کہ اس کا گھوڑا آگے بڑھنے کے بجائے رک کر کھڑا ہو گیا ہے۔

زردار بیک نے خدا کا شکر ادا کیا پھر گھوڑے کا بھی شکریہ ادا کیا اور گھوم کر آنے والے سوار کو دیکھا۔ گھوڑا کھماتے ہوئے اس نے تلوار نیام سے نکال لی کہ سرکش دشمن کو فی الفور سزا دے۔ مگر اس کا دشمن اس کی پہنچ سے دم بدم ہوتا جا رہا تھا۔ زردار بیک نے دیکھا کہ اجنبی سوار بجائے آگے بڑھنے کے گھوڑا موڑ کر سرحد کی طرف تیزی سے واپس جا رہا تھا۔ یہ بات بھی بڑی تعجب خیز لیکن زردار بیک نے اسے اپنی فتح پر محمول کیا اور فوراً ہی ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا۔

”ڈر کے واپس چلا گیا۔ زردار بیک کے سامنے آج تک کون ٹھہرا ہے؟“ زردار بیک نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور گھوڑا بڑھا کر سرحد پر اس جگہ آگیا جہاں چلا تھا۔ اجنبی سوار بھی سرحد پار کر کے تھوڑی دور پر گھوڑا روک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”خبردار۔۔۔۔۔ اب ہماری سرحد میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ زردار بیک نے سرحد پر کھڑے کھڑے اجنبی پر رعب ڈالا۔

اجنبی سوار سر سے پیر تک اسلحہ میں غرق تھا۔ سر پر آہنی خود جو پورے چہرے کو چھپائے ہوئے تھا۔ جسم پر پوری زرہ بکتر اس کا سینہ اتنا ابھرا ہوا تھا جیسے اس تلے اوپر دو سینے بند چڑھا رکھے ہوں۔ اس نے زردار بیک کو تو کوئی جواب نہ دیا اپنے گھوڑے کو ضرور آگے پیچھے کیا۔

زردار بیک نے پھر اسے لکارا۔ ”جان کی خیر چاہتا ہے تو چپ چاپ واپس جا۔ یہ تیموریوں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں قدم رکھنے والے اپنی ٹانگیں گنوا چکے ہیں۔“

سوار بھی ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ دے کر تلوار سوت اور زردار بیک کی طرف اس طرح چلا جیسے میدان جنگ میں ایک سوار دوسرے کا کرتا ہے۔ زردار بیک تو اجنبی سوار کو بزدل سمجھ کر ڈینگیں مار رہا تھا۔ اسے اپنی لڑ

نے دیکھا تو۔۔۔۔۔ زردار بیک کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے گھبرا کے راستے سے ہٹ کر دشمن کا برق رفتار گھوڑا اس کے سر پر آگیا اور اسی گھبراہٹ میں زردار بیک کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر نیچے گر گئی مگر خیر یہ ہوئی کہ اس نے زردار بیک پر حملہ نہ کیا اور گھوڑا بھگتا آگے نکل گیا۔ زردار بیک نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور گھوڑے سے اتر کر تلوار اٹھالی۔

حملہ آور سوار تھوڑی دور جا کر پھر واپس ہوا اور اسی تیز رفتاری سے زردار بیک پر دوسرا حملہ کیا۔ زردار بیک نے حملے سے بچنے کی پوری کوشش کی لیکن حملہ اسی تلوار زردار بیک کی چونچ دار ٹوپی سے الجھی اور ٹوپی اس کے سر سے اتر کر باری ٹوک میں لٹک گئی۔ زردار بیک اس قدر گھبرا گیا کہ اگر اجنبی سوار رک کر اس کو دھمکا دے کہ اتنا تو زردار بیک ضرور اللہ کو پیارا ہو جاتا مگر سوار تو جیسے بلی چوہے کا بل کھیل رہا تھا۔ وہ آگے جا کر رکا اور پھر تیسرے حملے کے لئے واپس ہوا۔ اب تو زردار بیک بالکل حواس باختہ ہو گیا۔ اس کا پورا بدن خوف سے لرزنے لگا اور موت لمحوں کے سامنے ناچنے لگی۔ حملہ آور نے اس کے قریب آکر گھوڑا روکا اور زردار بیک کے ہاتھ میں کانپتی ہوئی تلوار کو اپنی تلوار مار کر زمین پر گرا دیا۔۔۔۔۔ اب زردار بیک اجنبی سوار کے رحم و کرم پر تھا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہ رہ گئی تھی کہ گھوڑا اکر اپنی جان بچائے۔ حملہ آور سوار اس کے سر پر تلوار لہرا رہا تھا اور اس کا گردن منڈھا ہوا خود اس طرح تل رہا تھا جیسے وہ اندر ہی اندر ہنس رہا ہو۔ زردار بیک پر نزع کا عالم طاری تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ دل ہی دل میں خدا سے بے گناہ بخشوا رہا تھا۔

آزاد بانی جان کی شمالی مشرقی سرحد پر زردار بیک اکیلا گشت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار اور ساتھی بھی تھے۔ وہ ایک ساتھ چل رہے تھے کہ زردار بیک کا گھوڑا جگہ اڑ گیا۔ اس کا گھوڑا بڑا اڑیل تھا۔ زردار بیک کے ساتھی اس کے گھوڑے کے عیب کو جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ زردار بیک جب تک گھوڑے کو گھنٹہ گھنٹہ چکارے گا نہیں اس وقت تک وہ سیدھا نہیں ہو گا۔ اس لئے وہ زردار بیک کے گھوڑے کے آگے بڑھ گئے تھے۔ سرحد سے محافظ دستے پانچ پانچ کی ٹولیوں میں کچھ

فاصلہ دے کر آگے پیچھے گشت کرتے تھے۔

سوار پھر بھی گونگا بنا کھڑا رہا۔ وقاص کو سخت تعجب تھا کہ سوار موت کے گھیرے آ جانے کے باوجود اب تک کیوں خاموش ہے۔ سوار کے زردار بیگ کے ساتھ لائے رویے سے بھی وہ بہت متاثر تھا۔ اس نے ایک بار پھر کوشش کی۔
 ”اجنبی سوار! اگر تم ہتھیار پھینک دو تو تمہاری جاں بخشی ہو سکتی ہے؟“ مگر اس کی بات صدا بصر ثابت ہوئی۔

وقاص کا دل نہ چاہتا تھا کہ ایک ایسے سوار پر حملہ کرے جس نے زردار بیگ پر ہانے کے بعد بھی اسے قتل نہیں کیا تھا لیکن سوار کی مسلسل خاموشی نے اسے بے لارہ کیا۔ اس نے پھر بھی سوار کو رعایت دینے کے لئے کہا۔ ”تم سوچ رہے ہو گے ٹلڈ تیوری سوار تمہیں چاروں طرف سے حملہ کر کے گرفتار کریں گے۔ اگر اسے دل میں یہ خیال ہے تو اسے نکال دو۔ میری اور تمہاری جنگ میں میرا کوئی ناتم پر حملہ نہیں کرے گا۔ یہ کام میں اکیلا سرانجام دوں گا۔“

وقاص نے پوری کوشش کر لی مگر خود پوش سوار نے اس کے کسی سوال کا نام نہ دیا۔ آخر مجبور ہو کر اس نے حملہ کرنے کے انداز میں اپنا گھوڑا سوار کی پڑھایا۔ سوار پہلے ہی تیار تھا۔ اس نے مدافعتی طریقہ اختیار کیا اور جب وقاص اس پر حملہ کیا تو اس نے اس صفائی سے اس کا وار خالی دیا کہ وقاص سخت حیران و وقاص تیوری لشکر کا ایک مشہور گھڑ سوار اور شمشیر زن تھا۔ اس کے وار کو خالی کی معمولی آدمی کا کام نہ تھا۔ وقاص کے ساتھی بھی یہ ماجرا دیکھ کر پریشان ہو گئے

وقاص کا وار خالی جانا اس کی بے عزتی تھی۔ اس نے جھلا کر دوسرا وار کیا۔ خود سوار نے یہ وار بھی خالی دیا۔ تیسرا چوتھا۔ وقاص نے سوار پر درجنوں وار کئے مگر ہر وار اس قدر پھرتیلا تھا کہ وہ وقاص کے ہروار کو خالی دے جاتا۔ وقاص کو پسینہ آ رہا تھا۔ کچھ مشقت اور کچھ شرمندگی کی وجہ سے۔

زردار بیگ سے نہ رہا گیا۔ وہ دور سے چلایا۔ ”سردار! خدا کے لئے اس سے نہ کیجئے۔ یہ میرا محسن ہے۔ اس نے مجھے مغلوب کرنے کے بعد بھی بخش دیا تھا۔ اس سے نہ لڑیے۔“

ٹھیک اس وقت جب اجنبی سوار کی تلوار زردار بیگ کی گردن کو بوسہ دے رہی تھی کہ محافظ سواروں کی دوسری ٹولی اس جگہ آ گئی۔ اجنبی سوار ان کی آمد سے ذرا سا بھی ہراساں نہ ہوا۔ اتفاق سے اس ٹولی میں پورے محافظ دستے کا سردار وقاص بھی شامل تھا۔ اس نے جو زردار بیگ کو ایک خود پوش سوار کے چنگل میں دیکھا تو بڑا تیزی سے گھوڑا بڑھا کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اجنبی سوار زردار بیگ کو اسی حال میں چھوڑ کر وقاص کی طرف پلٹا۔ وقاص بھی اپنی تلوار بلند کر چکا تھا۔
 ”تم کون ہو اور ہمارے محافظ سوار سے کیوں لڑ رہے ہو؟“ وقاص نے پوچھا۔
 ”آواز میں پوچھا۔“

خود پوش اجنبی سوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ وقاص نے پہلے سے زیادہ گرجا لہجے میں اپنا سوال دوہرایا۔ مگر اجنبی سوار نے نہ تو جواب دیا اور نہ اپنا گھوڑا دھرا دھرا کیا۔ وقاص کے ساتھی سوار بھی پہنچ گئے انہوں نے خود پوش سوار کو گھیر لیا۔
 ”سردار! یہ ترکان جاسوس معصوم ہوتا ہے۔“ ایک سوار نے رائے ظاہر کی۔
 ”ضرور یہ کوئی ترکان سردار ہے۔ جیسی جواب نہیں دیتا۔“ دوسرے نے تہرا کیا۔

زردار بیگ کو اپنے سردار کے آ جانے سے بڑا سہارا ہوا تھا۔ وہ آنکھیں کھل کے ہر ایک کو دیکھ رہا تھا۔ وقاص نے تو اپنے سرداروں کی بات کا جواب نہ دیا مگر زردار بیگ سے صبر نہ ہو سکا۔ ”سردار! چاہے یہ جاسوس ہو یا کوئی ترکان سوار۔ مگر ہے بڑا بہادر۔ اس نے میری تلوار اپنی تلوار میں الجھا کر نیچے گرا دی۔ بہادری کے ساتھ ساتھ یہ رحم دل بھی بہت ہے۔ اگر اس کے دل میں رحم نہ ہو تو اس نے مجھے کب کا ختم کر دیا ہوتا۔“

”تم چپ رہو زردار بیگ۔“ وقاص نے اسے ڈانٹا پھر سوار سے بولا۔ ”اگر تم میری بات کا جواب نہیں دیتے تو مجھے مجبوراً تم پر حملہ کرنا پڑے گا مگر تم اطمینان رکھو۔ جس طرح تم نے میرے ایک ساتھی پر رحم کیا ہے اسی طرح میں بھی تم پر رحم کروں گا۔ تمہیں قتل کرنے کے بجائے گرفتار کیا جائے گا۔“

اپنا گھوڑا لے کر دونوں کے درمیان آگیا۔ خود پوش نے زردار بیگ کو پہلے ہی لپک کر دیا تھا۔ اب وہ اس پر کیسے ہاتھ اٹھاتا۔ زردار بیگ نے اپنا گھوڑا روکتے ہوئے خود پوش کے سر پر ایک گہری نظر ڈالی۔

”بہادر ترکان سردار!“ زردار بیگ نے خود پوش سے کہا۔ ”بلاشبہ آپ ایک عظیم شمشیر زن ہیں۔ لیکن ہمارے سردار سعد وقاص بھی اپنی شجاعت کا جواب نہیں دیتے۔ جس طرح آپ نے ان کے طوفانی حملوں کو خالی دیا اسی طرح آپ کے بھی تمام وار خالی گئے۔“

”زردار بیگ! اپنی تقریر بند کرو۔“ سعد وقاص نے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہمارے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میں اپنے بہادر دشمن کی قدر کرتا ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ سوائے اپنی حفاظت کرنے کے میں اس پر کوئی جوابی حملہ نہ کروں گا۔“

”میرے سردار کا حکم سر آنکھوں پر مگر میں بیچ سے کس طرح ہٹ جاؤں۔“ زردار بیگ نے اپنے اڑیل گھوڑے کو چکر دیتے ہوئے کہا۔ ”سارا جھگڑا تو میرا اور میرے اس گھوڑے کا ہے۔ نہ یہ کمبخت اڑ کے راستے میں کھڑا ہوتا اور نہ میرا اس فوج پوش جوان کا سامنا ہوتا۔ اب یہاں یہ سوال کہ یہ خود پوش سوار آپ کا دشمن ہے تو یہ بات میرا دل نہیں مانتا۔ دشمن تو یہ میرا بھی نہیں ورنہ میں اس وقت زندہ نہ ہوتا پھر دشمن اس قدر بے وقوف نہیں ہوتا کہ اپنے مقابل کی طاقت کا اندازہ نہ کر سکے۔ خود پوش جاسوس بھی نہیں ہے کیونکہ جاسوس اس طرح کھلے بندوں کسی دشمن کی سرحد میں نہیں داخل ہوتے۔“

زردار بیگ کے اچانک درمیان میں آ جانے سے وقاص اور خود پوش کی نگاہیں رک کر جھک گئی تھیں۔ وقاص نے نرم لہجے میں کہا۔ ”زردار بیگ! تم نے جو کچھ کہا ہے اس سے میں پورا اتفاق کرتا ہوں۔ اس سوار نے تم پر احسان کیا ہے تم اس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کرو وہ کم ہے۔ میں خود بھی تمہارے محسن کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچانا چاہتا اور اگر یہ شخص اپنی شخصیت ظاہر کر دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں اس کی زندگی کا ضامن بنوں گا۔“

”اے میرے محسن اور غیبی مخلوق! میں تم سے انتہا کرتا ہوں کہ تم میرے سردار

خود پوش کو شاید زردار بیگ کی درخواست ناگوار گزری یا شاید اسے بھی غصہ آ گیا۔ وہ اپنا گھوڑا موڑ کر تھوڑی دور گیا پھر وقاص کی طرف تلواریں تانے ہوئے اس طرح آیا جیسے اس کا سراڑا دے گا۔ خود پوش نے وقاص کے تمام وار خالی دیئے تھے جس کی وجہ سے اس کی اپنے ساتھیوں میں بیٹی اور سبکی ہوئی تھی۔ اس سبکی اور شرمندی کو دور کرنے کا قدرت نے اسے ایک موقع مہیا کر دیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ بھی خود پوش کے تمام واروں کو خالی دے جائے تو اس کی شرمندگی کچھ نہ کچھ ضرور دور ہو سکتی ہے۔ اس کی یہ سوچ فوراً ایک اٹل فیصلے میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے تم کھائی کہ خواہ اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے مگر وہ صرف اپنی مدافعت ہی کرے گا اور خود پوش پر اپنی طرف سے کوئی حملہ نہیں کرے گا۔

خود پوش نے وقاص پر گھوڑا چڑھاتے ہوئے تلواریں بھرپور وار کیا۔ وقاص نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیا اور اپنے سر کو برق رفتاری سے ایک طرف جھکا کر خود پوش کا وار خالی دے گیا۔ اس کے ساتھیوں نے وقاص کی مہارت کی بے ساختہ تعریف کی۔ خود پوش نے قدرے جھلا کر دوسرا حملہ کیا مگر وقاص اپنے ارادے اور منصوبے کے مطابق اس کا وار پھر خالی دے گیا۔ کہتے ہیں کہ اگر میدان جنگ میں حملہ آور کے دو چار وار خالی جائیں تو وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ بڑھ بڑھ کے زوردار حملے کرتا ہے مگر اس کے حملوں میں سوائے طاقت کے مہارت کی کوئی صفت نہیں ہوتی۔ یہی حال خود پوش سوار کا تھا۔ اس کا ہر تازہ حملہ پہلے سے زیادہ شدت کا ہوتا لیکن ہر وار خطا جاتا۔

وقاص اپنے دشمن کو شکست تو نہ دے سکا مگر اس نے اس پر یہ ضرور ثابت کر دیا کہ وہ اپنے دشمن سے شمشیر زنی کے معاملے میں کسی طرح کم نہیں۔ چونکہ وقاص نے یہ وتیرہ اختیار کیا تھا کہ وار خالی دینے کے بعد بجائے پلٹ کر حملہ کرنے کے وہ اپنے حملہ آور کو دوسرے حملے کا موقع دیتا۔ اس سے خود پوش سوار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وقاص کا گیا ہوا وقار ایک بار پھر واپس آ گیا مگر اب دونوں شمشیر زن پسینے میں شرابور اور تھک کے چور ہو گئے۔

ایک بار جب خود پوش گھوڑا موڑ کر وقاص پر حملہ کرنے کے لئے بڑھا تو زردار

نہرو کا نیک دل اور علم پرور بیٹا شاہ رخ مرزا میدان میں نکلا اور شہزادہ خلیل کو دے کر تیوری سلطنت کا مالک بن گیا۔

شاہ رخ مرزا نے شہزادہ خلیل کو گرفتار کرنے کے بعد بھی قتل نہیں کرایا۔ بلکہ اسے اغراجات کے لئے ایک معقول وظیفہ مقرر کر دیا مگر موت نے شہزادہ خلیل کو نہ دی اور شاہ رخ مرزا کے راستے کا کاٹنا خود بخود نکل گیا۔ شہزادی آغا بیگی اسی شہزادہ خلیل کی بہن تھی۔ شاہ رخ مرزا نے آذر بائی جان کا علاقہ آغا بیگی کو بخش دیا اور اپنی طرف سے ایک مشیر مقرر کیا تھا۔

شہزادی کو دیکھ کر کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ حسن و جمال کے اس پیکر ایک شجاع اور جری کی روح تڑپ رہی ہے۔ دمکتا چمکتا چہرہ۔ بھرے بھرے بازو، لگائی رخسار اور روشن روشن آنکھوں نے شہزادی کو سینکڑوں میں نہیں ہزاروں متاثر کیا تھا۔ سپہ گری کا فن اس نے بڑی باقاعدگی سے سیکھا تھا۔ تیر اندازی، شمشیر اور شمشوری میں شہزادی بے مثال تھی۔ چودھویں سال میں قدم رکھا تو لوگوں کا اٹھا کہ شہزادی کسی کو پسند کر کے اپنا جیون ساتھی بنا لے گی لیکن آغا بیگی ان بات سے اس طرح بے تعلق رہی۔ جیسے وہ کچھ جانتی ہی نہ تھی۔

شہزادی آغا بیگی نے سپاہیانہ مہارت کا عملی مظاہرہ بھی کیا تھا۔ شمالی مشرقی سرحد لکھنؤ کی زبردست حکومت تھی جن سے آئے دن سرحدی جھڑپیں ہوا کرتی تھیں۔ شہزادی نے عملی جنگ کا مظاہرہ آہنی ترکمانوں کے ساتھ کیا تھا۔ وہ پورے لباس اور اسلحہ سے تیار ہو کر میدان میں نکلتی اور بہادری کے ایسے جوہر دکھاتی تھیں کہ بھی واہ واہ کر اٹھتے۔ ترکمانوں کا سردار اعلیٰ قرہ یوسف نے خلیفہ بغداد اور ناصر سے گٹھ جوڑ کر کے امیر تیمور کو شکست دینے کی کوشش کی تھی مگر تیمور نے اسے ایک نہ چلنے دی اور اسے شکست فاش دے کر شمال میں اتنی دور تک اس کا ہاتھ نہ لگا کہ قرہ یوسف کی فوجی طاقت ریزہ ریزہ ہو کر رہ گئی تھی لیکن تیمور کے بعد خلیل کے زمانے میں اس نے پھر ہاتھ پاؤں نکالے اور آذر بائی جان کی سرحد پر لڑائی اور تیموریوں کی چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو

کی بات مان لو۔“ زردار بیک نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم نہ تو جاسوس ہو اور نہ ترکمان بلکہ تم کوئی اور ہی مخلوق ہو۔ آخر تم اپنے آپ کو ہم سے کیوں چھپانا چاہتے ہو۔ تم کوئی بھی ہو۔ صرف اپنا نام، قبیلہ اور اپنے ملک کا نام بتاؤ۔ بس قصہ ختم۔ تم جس طرف جانا چاہو گے تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ کیوں سردار وقاص میں نے ٹھیک کہا نا؟“

”میں تمہاری تائید کرتا ہوں زردار بیک!“ وقاص نے فوراً جواب دیا اور خود پوش کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا۔

خود پوش سوار کے رویے میں اچانک تبدیلی آئی۔ اس نے چمکتی ہوئی تلوار نیام میں کر لی مگر اس کے ساتھ ہی ایک اور زیادہ روشن اور درخشان تلوار اس کے خود سے برآمد ہوئی۔ خود پوش نے گلے میں لپیٹی ہوئی زنجیر کو کھولا اور دونوں ہاتھوں سے خود کو سر پر سے اتار لیا۔ خود کو اتارنا تھا کہ ایک بجلی سی لہرائی۔ کوند سا لپکا اور دیکھنے والوں کی نظریں تاب نظارہ نہ لا کر فوراً جھک گئیں۔

”شہزادی آغا بیگی!“ سعد وقاص کے منہ سے جیسے پھسل پڑا۔ اس کا جسم لرزا۔ تلوار کانپ کر ہاتھ سے گر گئی اور نظریں فرش زمین پر ٹک گئیں۔

شہزادی آغا بیگی کو کون نہیں پہچانتا تھا۔ صاحبزادے فرخندہ جمال امیر تیمور کی پوتی اور میرزا میران شاہ گورگانی کی بہادر دختر نیک اختر اپنی دلیری اور سپاہیانہ کارناموں کی وجہ سے پوری ریاست آذر بائی جان میں مشہور تھی۔ آغا بیگی بچپن سے ہی مردانہ صفات کی مالک تھی۔ اس نے ہوش سنبھالتے ہوئے شہزادوں کا لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ اس کا باپ میران شاہ اپنی دیوانگی کی وجہ سے اولاد کی طرف سے بالکل بے پروا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنی مرضی کے مطابق زندگی کو بگاڑ سنوار رہے تھے۔

امیر تیمور کی آنکھ بند ہوتے ہی تیموری شہزادوں میں تخت و تاج کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ آذر بائی جان میں میران شاہ کا بیٹا خلیل موجود تھا۔ اس نے تیمور کے مرنے کی خبر پاتے ہی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ امیر تیمور کا دوسرا پوتا جہان بھارت میں تھا۔ وہ فوراً ”سرقد پانچا اور دارالسلطنت پر قابض ہو گیا مگر شہزادہ خلیل نے اسے شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ خانہ جنگی کا پھر بھی خاتمہ نہ ہوا۔ آخر

کے ساتھ شای محل کی حفاظت بھی نہایت ضروری ہے۔ ہم شای مشیر سے
اپنے لئے مشورہ کریں گے۔ تم جانتے ہو کہ ہم پر چار بار قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے
لئے ہم سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ ہم تمہاری خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔“
وقاص کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ”شہزادی عالیہ کی یہ اعلیٰ طرفی ہے کہ وہ اپنے
ہٹاروں کی حوصلہ افزائی فرماتی ہیں۔“

زردار بیگ اپنی تقرری سے پھولے نہ سا رہا تھا۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا۔
زادی عالیہ! کیا میں آج ہی حضور کے محل میں حاضر ہو جاؤں؟“
”آج ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے تم ہماری خدمت میں ہو۔“ شہزادی
ہنس کر اسے مطمئن کر دیا۔

☆☆☆

زردار بیگ بے وقوفی کی حد تک سیدھا سادا فوجی تھا۔ شہزادی اسے اپنے ساتھ
لے گئی۔ زردار بیگ کا خیال تھا کہ شہزادی اس کے سردار سعد وقاص کو بھی تمیز
جائے گی جب تمیز رواں گی کا وقت آیا اور وقاص کے بارے میں شہزادی نے کوئی
نہ دیا تو وہ بہت پریشان ہوا۔ زردار بیگ کو اپنے سردار سے بہت محبت تھی۔
نہ بھی زردار بیگ کو اس کی سادگی اور شگفتگی کی وجہ سے پسند کرتا تھا۔ دونوں کا کئی
سالے ساتھ تھا۔ اب جو جدائی کا وقت آیا تو زردار بیگ گھبرا گیا۔ آخر اس سے نہ
یا زردار شہزادی کے حضور میں پہنچ کے آداب بجالایا۔

”کیا بات ہے زردار بیگ! تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟“ شہزادی نے ہنس کے
”میں۔۔۔۔۔ میں بیمار ہوں شہزادی عالیہ!“ زردار بیگ نے بات بنائی۔

”کیا بیماری ہے تمہیں؟“
”جی، مجھے سرسام ہو گیا ہے۔“ زردار بیگ کو سرسام کے بارے میں کوئی علم نہ
اُس نے اس بیماری کا نام کسی سے سنا تھا وہی جھٹ سے بتا دیا۔
”سرسام!“ شہزادی نے حیرت اور فکر مندی سے زردار بیگ کو دیکھا۔ ”تمہیں

شہزادی آغا بیگی کے ہونٹوں پر اس وقت بھی بیماری سی مسکراہٹ تھی۔ وہ سعد
وقاص کے جھکے ہوئے سر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”وقاص! سر اٹھاؤ اور مردوں کی طرح بات کرو؟“ شہزادی کا لہجہ بارعب مگر آوا
زیلی تھی۔
”شہزادی عالیہ! غلام کی گستاخی معاف فرمائیے۔“ وقاص نے ہجھکتی نظر
اٹھائیں۔

”وقاص! شہزادی تمہاری شمشیر زنی کی تعریف کرتی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے شہزادی
نے اپنا خود ہوا میں اچھل دیا۔ زردار بیگ قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے بڑی پھرتی سے
گھوڑا بڑھا کر خود اچک لیا۔

شہزادی نے زردار بیگ کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔ اگرچہ تم شمشیر ز
میں ماہر نہیں لیکن تمہاری گفتگو دلچسپ اور فرحت انگیز ہے۔ تم آج سے ہمارا
خدمت میں رہو گے۔“

شہزادی نے زردار بیگ کو اپنی خدمت میں لینے کا اس قدر رس بھرے الفا
میں اعلان کیا کہ وقاص کو زردار بیگ کی قسمت پر رشک آنے لگا۔ اس کے دل۔
جیسے آواز نکلی۔ کاش، مجھے بھی شہزادی کی خدمت کا موقع ملتا۔

کہتے ہیں کہ بعض دعائیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں۔ وقاص کے دل میں ا
آرزو نے جنم ہی لیا تھا کہ شہزادی نے وقاص سے کہا۔ ”وقاص تم بہادر ہو
بہادروں کو سرحد ہی پر رہنا چاہئے۔“

وقاص کا دل بچھ گیا۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید زردار بیگ کی طرح اسے بھی شہزادی
کے محل کی خدمت پر مامور کیا جائے گا مگر شہزادی نے اس وقت اس کی بہادری
تعریف کر کے اسے غمگین کر دیا۔

”شہزادی عالیہ خود مختار ہیں۔ سپاہی کا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔“ وقاص
نے بچھے دل سے کہا۔

”تم نے ٹھیک کہا وقاص! تعمیل حکم ہی سپاہی کا سب سے بڑا فرض ہے
شہزادی نے نرمی سے کہا۔ ”سرحدوں کو تمہارے ہی جیسے سرداروں کی ضرورت ہے۔“

روانہ ہوتا ہے۔“

”مجھے بڑا تیز بخار ہے شہزادی عالیہ!“ زردار بیگ نے فوراً بات پرٹائی۔ ”کھانسی آتی ہے پھر سردی لگتی ہے۔ اس کے بعد زکام ہوتا ہے۔ ہر وقت بدن برف سا رہتا ہے۔؟“

”جکی ہیں۔“

”جی ہاں شہزادی عالیہ! بخ ہو رہا ہے پورا جسم۔“

”تمہیں زکام بھی ہے؟“

”جی شدید زکام ہے۔“

”اور بخار بھی بہت تیز ہے۔“

”شہزادی عالیہ اس قدر تیز بخار ہے کہ پورا جسم آگ کا گولہ بنا ہوا ہے۔“

”اور تمہارے ہاتھ پیر ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں؟“ شنزادی کو ہنسی آگئی۔

زردار بیگ کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پھر بھی ڈھٹائی سے کام اور بولا۔ ”شہزادی عالیہ! میرا مطلب ہے کہ جب بخار تیز ہوتا ہے تو بدن آگ طرح دیکتا ہے اور جب زکام ہوتا ہے تو بدن ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ اگر میں کچھ غلط کہہ ہوں تو شہزادی عالیہ مجھے معاف کر دیجئے۔“

شہزادی ہنسنے لگی۔ ”تم نے کوئی بات غلط نہیں کہی۔ اسی لئے تو ہم تمہیں لے

ساتھ لائے ہیں۔ اچھا اپنی بیماریاں اپنے پاس رکھو اور بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

”شہزادی عالیہ! میں کہنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں مگر ————— مگر —————“

”كهو“ ۋرومت زروار بىگ!“

”جی۔۔۔۔۔! وہ اپنے سردار ہیں نا۔“ زردار بیگ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کون سردار! کس کا ذکر کر رہے ہو؟“

”وہی شہزادی عالیہ! سرحدی دستوں کے سردار سعد وقاص۔“

”وہ۔۔۔۔ کیا ہوا انہیں؟“ شہزادی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہیں وہ اللہ کا شکر ہے۔“

”زردار بیک!“ شہزادی نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ ”بات مختصر کرو۔ ہمیں“

”بجا ارشاد فرمایا۔ شنزادی عالیہ نے۔“ زردار بیگ جلدی سے بولا۔ ”میں نے آپ سے مختصراً کہا کہ آپ بھی تیز چلنے کی تیاری کریں مگر وہ بولے کہ شنزادی عالیہ ان کے لئے اب تک حکم نہیں دیا۔ حالانکہ آپ میرے ساتھ ہی انہیں بھی حکم دے چکی ہیں۔“

”ہونہ۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“

”بالکل، بالکل یہی۔ آپ نے واضح الفاظ میں فرمایا تھا کہ ان کی خدمات آپ کے لئے ہوں گی۔“ زردار بیک نے آخر اپنے سردار دوست کی پوری پوری شک کی۔

شہزادی کو بھولے بھالے زردار بیگ کا یہ انداز بہت پسند آیا۔ اس نے مسکرا

۱۔ ”وقاص سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

”رشتہ۔ وہ میرے سردار ہیں شہزادی عالیہ! ان کے حکم سے میں انکار نہیں کر سکتا۔“ زردار بیک نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”مگر ہیں بڑی خوبیوں کے مالک۔ تلوار کے

”کیا تم کو ار چلاتا ہے۔ مجھ پر ایک وار بھی نہ کر سکا۔“ شہزادی نے تنک کے کہا۔

”جی۔۔۔۔۔ آپ کے سامنے اس کی کیا ہستی ہے۔ کہاں آفتاب اور کہاں ایک

“کازره؟”

”کچھ احمق بھی معلوم ہوتا ہے؟“

”حمقت تو اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔“ زردار بیگ نے فوراً جواب دیا۔

دن میں نے کہا کہ سردار آپ کی پگڑی میں آگ لگ گئی ہے تو انہوں نے فوراً

کی پانی میں ڈال دی حالانکہ وہ دریا میں نہا رہے تھے۔“

”کیا پکڑی باندھ کے دریا میں نہا رہا تھا؟“ شہزادی مسکرائی۔

”کی وہ۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ دریا میں نہانے کی تیاری کر رہا تھا۔“ زردار

۱۰. ہر اہٹ چھپائی۔

زردار بیک! ابھی تم اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے اور اب اس کی

برائی کر رہے ہو؟“

زردار بیگ نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”وہ میری ان کے ساتھ محبت اور تھی اور یہ آپ کے ساتھ وفاداری ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ موقع محل دیکھ گفتگو کرنا چاہئے۔“

”ہم وقاص کی بہادری سے خوش ہیں۔“

”شنزادی عالیہ! سردار وقاص تو سو سواروں پر بھی بھاری ہے۔“ زردار بیگ فوراً ”مزاج شناسی کا ثبوت دیا۔“ ترکمانوں کے ساتھ ایک جھڑپ میں انہوں نے سواروں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا۔“

”ہم نے اسی لئے فیصلہ کیا ہے کہ وقاص کو سرحد ہی پر رکھا جائے۔“

”نہایت اعلیٰ فیصلہ ہے شنزادی عالیہ! وہ سرحد کا تو بادشاہ ہے۔“

”مگر کچھ دن اسے تہیز میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔“ شنزادی نے ایک پھر زردار بیگ کو مخمضے میں ڈال دیا۔

”یہ خیال تو انتہائی بلند ہے۔“ زردار بیگ نے شنزادی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شنزادی عالیہ سے یہی درخواست کرنے والا تھا۔“

”اچھا تہیز پہنچ کے ہمیں یاد دلانا۔ ہم وقاص کو بلوا لیں گے۔“

”جی ہمت ہے۔“ زردار بیگ کا چہرہ اتر گیا۔

شنزادی ہنس پڑی۔ ”گھبراؤ نہیں زردار بیگ! ہم تمہارے دوست کو بلوائیں گے۔“

تہیز پہنچ کے جب زردار بیگ کی یاد دہانی پر شنزادی نے سعد وقاص کو تہیز کا حکم نامہ جاری کیا تو سرحد کے سلطان مشیر نے جو کہ تہیز میں موجود تھا۔ اس حکم سخت مخالفت کی۔

”شنزادی عالیہ!“ مشیر نے ادب سے کہا۔ ”سعد وقاص نے سرحد پر جو خدمات انجام دی ہیں ان کا تقاضا ہے کہ اسے وہیں رکھا جائے۔ شاہ رخ مرزا نے حکم بھیجا کہ ترکمانوں کی طرف سے کسی وقت بھی بڑا حملہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے محافظہ دہلی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا جائے۔ شاہ موصوف نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر فوراً ملک

رت ہو تو پانچ ہزار سواروں کو تہیز یا سرحد پر بھیجا جاسکتا ہے۔“ شنزادی مشیر سے خواہ مخواہ کوئی جھگڑا مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس نے بڑے کمال سے کہا۔ ”محترم! آپ کے تجربے سے فائدہ اٹھانا ہمارا فرض ہے۔ ہم اپنا حکم لے لیتے ہیں۔“

”شنزادی عالیہ! میرا کام صرف مشورہ دینا ہے۔“ مشیر نے نرمی سے کہا۔ ”آپ کے دورے سے ابھی واپس آئی ہیں۔ وہاں کا حال آپ مجھ سے بہتر جانتی ہیں۔ آپ کے خیال میں سرحد کے حالات پر سکون ہیں اور ترکمانوں کے فوری حملے کا نہیں تو آپ سعد وقاص کو ضرور اپنی حفاظت پر مامور کیجئے۔ کیونکہ آپ کی سلامتی پر مقدم ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ آپ کا تمام محل سے نکلنا کسی مناسب نہیں۔ میری اس عرضداشت پر بھی اگر آپ غور فرمائیے تو نوازش ہو

”مشیر محترم!“ شنزادی بڑے وقار سے بولی۔ ”میں بچپن سے آزاد فضاؤں میں لینے کی عادی ہوں۔ محل کی چمادر دیواری میں مجھ سے قید نہیں ہوا جاسکتا۔ میرا ہے کہ موت سے جس قدر بھاگا جائے موت اسی قدر قریب آتی جاتی ہے۔ میں آپ کے اس مشورے کی شکر گزار ہوں۔“

زردار بیگ کو جب معلوم ہوا کہ شنزادی نے سلطانی مشیر کے کہنے سے سعد کا حکم واپس لے لیا ہے تو وہ بڑا جزیب ہوا مگر کر ہی کیا سکتا تھا۔ اسے سردار سے بھی شرمندگی تھی کیونکہ اس نے ایک تیز رفتار سوار کے ذریعے انہیں مطلع کیا تھا کہ ان کے تہیز پہنچنے کے احکامات صادر ہو چکے ہیں۔ زردار بیگ خاموش ہو بیٹھ رہا اور شنزادی اپنے روز کے معمولات میں مصروف ہو گئی۔ اس طرح سعد کا کافی الحال تہیز آنا ٹل گیا۔ ابھی ایک ہی ہفتہ گزرا تھا تھا کہ سرحد سے وقاص کا ایک نامہ بر تہیز پہنچا۔ اس نے شنزادی کو لکھا تھا کہ شمال میں ترکمان لشکر اور ہے اس لئے اسے فوری کمک روانہ کی جائے۔ شنزادی نے فوراً ”مشیر سلطانی گفتگو کی اور طے پایا کہ ایک مضبوط لشکر سرحد کی طرف روانہ کیا جائے اور شاہ کو بھی مطلع کیا جائے تاکہ وقت ضرورت ادھر سے بھی مناسب کارروائی ہو سکے۔

ترکمان سردار قرہ یوسف نے امیر تیمور گورگانی سے زبردست شکست کھائی اور وہ زخمی شیر کی طرح اپنے زخم چاٹ رہا تھا۔ تیمور کے بعد اگر پوری طرح بکھراؤ تو بھی اس کا پہلا جیسا ظنہ باقی نہ رہ گیا تھا۔ پھر بھی میرزا شاہ رخ نے بکھرے ہوئے تیموریوں کو یکجا کر کے ایک زبردست حکومت قائم کر لی تھی اور قرہ یوسف کی جرات تھی کہ وہ براہ راست سمرقند پر حملہ کرے۔ وہ کھیانی بلی کھبا نوچے کے مدد تیموریوں کی دور دراز سرحدوں پر چھاپے مار کر اپنا انتقام لیا کرتا تھا۔

سمرقند سردار سعد وقاص کی درخواست پر تین ہزار سواروں کو سمرقند پر بھیجے انتظام کیا گیا۔ تقریباً اتنے ہی سوار سعد وقاص کی کمان میں تھے جو حساس سرحد پر رات گشت کرتے رہتے تھے۔ لشکر تیار ہوا تو اس کی سرداری کا سوال پیدا ہوا۔ ہزار سواروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہوتی۔ اسے سمرقند تک لے جانے اور وقاص کی کرنے والا کوئی بڑا سردار ہونا چاہئے تھا۔ مشیر سلطانی نے شنزادی کے سامنے دو تین پیش کئے تھے مگر شنزادی نے بڑی ملامت سے انہیں رد کر دیا تھا۔ چنانچہ رواجی کا آگیا۔ منتخب لشکر میدان میں صف آرا بھی ہو گیا مگر سرداری کا معاملہ اب تک کمر میں پڑا ہوا تھا۔ مشیر سلطانی اور شنزادی میں اس سلسلے میں صبح کو بھی گفتگو ہوئی تھی ا شنزادی نے مشیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ اس نے سردار کا انتخاب کر لیا ہے اس کا اعلان وہ عین رواجی کے وقت کرے گی۔ مشیر سلطانی نے خدا کا شکر ادا کیا تھا شنزادی نے سردار کا خود ہی انتظام کر لیا ہے اور اگر کوئی اچھی بری پڑی تو وہی سمرقند کو جواب دے گی۔

لشکر رواجی کے حکم کا منتظر تھا اور مشیر سلطانی بڑی بے بسی اور حیرت شنزادی کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ شنزادی حسب معمول مردانے لباس میں اسلحہ سجائے گھوڑ پر سوار تھی۔ اب اس کے اسلحے میں ایک آہنی خود کا اضافہ ہو گیا تھا۔ پہلے وہ نقاب یا بلکا نقاب چہرے پر ڈال کر ادھر سے ادھر گھوڑا بھگائے پھرتی تھی لیکن پھل یا جب وہ سمرقند پر گئی تھی تو اس نے اچانک ہی خود کا استعمال شروع کیا تھا۔ وقاص قطعی خیال نہ تھا کہ سمرقند پر اس کا مقابلہ کرنے والا خود پوش شنزادی آتا ہے وہی کیا زردار بیگ بھی اسے نہ پہچان سکا تھا۔

شنزادی نے پہلے گھوڑا دوڑا کر لشکر میں ایک چکر لگایا پھر مشیر سلطان کے پاس مشیر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اب تو اسے گھبراہٹ بھی ہونے لگی۔

”مشیر سلطانی کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں؟“ شنزادی مسکرائی۔
”نہیں، نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے لیکن میں۔۔۔۔۔“ مشیر کہتے کہتے رک گیا۔
”شاید آپ سردار کا نام معلوم کرنے کے لئے بے چین ہیں۔“ شنزادی نے جیسے چھیڑنے کے لئے کہا۔

شنزادی نے سچ ہی کہا تھا۔ مشیر سلطانی کی بے چینی بجا تھی۔ اسے کوئی جواب نہ ملا اور وہ شنزادی کا منہ دیکھنے لگا۔

”مشیر محترم۔۔۔۔۔!“ شنزادی نے اطمینان سے کہا۔ ”آپ اس بات سے اتفاق میں گئے کہ قرہ یوسف کا متوقع حملہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔“
”بے شک۔ اس میں کیا شبہ ہے۔“ مشیر نے تائید کی۔

”اور آپ اس بات سے بھی انکار نہیں کریں گے کہ ہر اہم موقع پر میرے دادا بٹ صاحبقران امیر تیمور گورگانی اپنے لشکر کی کمان خود کیا کرتے تھے۔“
”بے شک، بیشک۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں۔“

”اور آپ نے یہ بھی سنا ہو گا کہ جب ایک بار صاحبقران کو ایک ترکمان نے کے نیچے دو بدو جنگ کی دعوت دی تھی تو امیر گورگانی اپنے سرداروں کی شدید نصیحت کے باوجود تنہا گھوڑے اڑائے قلعہ کی فصیل کے نیچے پہنچ گئے تھے۔“

”جی شنزادی! میں نے یہ سنا ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ یہ بات بالکل سچ ہے۔“
سلطانی نے صاحبقران کے ساتھ اپنی پوری عقیدت کا اظہار کیا۔
”تو پھر مشیر محترم! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس اہم مہم کی میں خود باری کروں گی۔“

”آپ۔۔۔۔۔؟“ مشیر کا دہانہ حیرت سے پھیل گیا۔ ”مگر شنزادی یہ کیسے ہو سکتا ہے اس کی اجازت تو آپ کو سمرقند سے حاصل کرنا چاہئے۔“
”مشیر محترم! آپ کو میرے پاس شاہ سمرقند نے اس لئے بھیجا ہے کہ اگر میں

کوئی غلط قدم اٹھاؤں تو آپ مجھے صحیح مشورہ دیں۔“ شنزادی کے چہرے پر غصے کی لہریں دوڑنے لگیں۔ ”آپ مجھے حکم دینے کے مجاز نہیں۔ سرفرد اور تمیز کا درمیانی فاصلہ ہزاروں میل ہے اگر میں ہر بات کے لئے سرفرد قاصد سمجھوں تو حکومت آذر بانی جان کا بیڑہ غرق ہو جائے۔ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہی ہو گا۔“

مشیر سلطان، شنزادی کے مزاج سے واقف تو تھا لیکن اسے یہ خیال نہ تھا کہ شنزادی اس سے اس قدر سختی سے بات کرے گی۔ شنزادی نے گھوڑا موڑا اور لشکر کو کوچ کا حکم دے دیا۔ مشیر سلطانی دانت پیتا ہی رہ گیا۔ لشکر آہستہ آہستہ سرحد کی طرف روانہ ہوا اور کچھ ہی دیر بعد میدان سنسان ہو گیا۔ رخصت کرنے والے لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ شنزادی کے لشکر کی کمان سنبھالنے کی سب سے زیادہ خوشی زردار بیگ کو تھی۔ مشیر سلطانی کے انکار پر وقاص یہاں نہ پہنچ سکا تھا مگر قدرت نے خود زردار بیگ اور شنزادی آغا بیگی کو سرحد پر بھیجنے کا سامان کر دیا تھا۔ شنزادی کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح لیکن شنزادی کو اس بات کی خوشی تھی کہ وہ جس سردار کو تمیز نہ بلا سکی تھی۔ اس وقت وہ ایک فوجی ضرورت کے تحت خود اس کی طرف جا رہی تھی۔

سعد وقاص کو امدادی لشکر کے آنے کی خبر مل گئی تھی اور زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ شنزادی آغا بیگی خود اس لشکر کے ساتھ تھی۔ وقاص نے شنزادی کی آنکھوں میں ایک مچلتا ہوا سمندر تو دیکھا تھا مگر وہ یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ یہ سمندر اسے غرق کرے گا یا ساحل سے لگا دے گا۔ شنزادی کو سرحد سے واپس گئے ابھی زیادہ عرصہ بھی نہ گزرا تھا اس لئے اس کا اس قدر جلد دوبارہ سرحد پر آنا کیا معنی رکھتا تھا۔ شنزادی اس کی آقا زادی تھی اور اب تو وہ خود آذر بانی جان کی ایک طرح سے خود مختار حکمران تھی۔ مشہور ہے کہ گھوڑے کی پچھاڑی اور بادشاہ کی اگاڑی سے ہر وقت ہوشیار رہنا چاہئے۔ وقاص باوجود شنزادی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کے اس کا خاطر خواہ اشتہال نہ کر سکا۔ اس کے دل میں ایک چور سا بیٹھ گیا تھا اور شنزادی کی آمد کو وہ کسی مصیبت کا پیش خیمہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔

وقاص نے جس بجھے دل سے شنزادی کو خوش آمدید کہا، اس کا شنزادی نے کچھ اچھا تاثر نہ لیا۔ اس نے بند الفاظ میں زردار بیگ سے اس کا شکوہ بھی کیا۔ زردار بیگ

شنزادی کا ہمہ وقتی ملازم تھا۔ اس سفر میں بھی شنزادی اسے اپنے ساتھ لائی تھی۔ اصل وہ زردار بیگ کی شگفتہ طبیعت اور غلط سلط حاضر جوابی کو بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ زردار بیگ کو یہ سن کر افسوس ہوا کہ وقاص نے شنزادی کا خاطر خواہ خیال نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ شنزادی نے پچھلی ملاقات میں وقاص کو جس بیدگی کی نظر سے دیکھا تھا اس کا تقاضا تھا کہ وقاص اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتا مگر مل تو معاملہ ہی الٹا نظر آ رہا تھا۔

اسی شب زردار بیگ نے وقاص سے تنہائی میں ملاقات کی اور شنزادی کے تمام اسے شکایت نوک زبان پر لے آیا۔ اس نے بڑے ادب مگر بے تکلف انداز میں کہا۔ سردار! ہم تمیز میں آپ کی ملاقات کے لئے رات دن تڑپتے تھے اور یہ تصور لے آئے تھے کہ جب آپ سے ملیں گے تو آپ ہمیں سینے سے لگائیں گے لیکن آپ بڑی سرد مری اور غیریت کا برتاؤ کیا؟“

سعد وقاص کو اپنے مخلص دوست کی شکایت پر ہنسی آگئی۔ ”زردار بیگ! کیا تم چاہتے تھے کہ میں شنزادی کی موجودگی میں تمام شاہی رسومات کو چھوڑ کر تمہارے لگ جاتا۔ آخر شنزادی میری اس حماقت کو کیا نام دیتی۔ ان کے سامنے تو میں بے تم سے رسمی سلام دعا ہی کر سکتا تھا۔“

”لیکن آپ نے شاہی رسومات کا بھی تو کوئی خیال نہیں کیا؟“ زردار بیگ نے شکوہ کیا۔ ”شنزادی عالیہ آخر سلطنت آذر بانی جان کی حاکم ہیں اگر وہ باقاعدہ دربار مانگتیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ ان کو بادشاہ تسلیم نہ کریں؟“

”میرے دوست!“ وقاص نے بھی پیارے انداز میں شکوہ کیا۔ ”میں دیکھ رہا ہوں چند دن شاہی محل میں رہنے سے تم میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ تم تو اس طرح ماکر رہے ہو جیسے شنزادی کے بجائے تم خود آذر بانی جان کے حاکم ہو۔“

”سردار محترم! اگر میں یہ کہوں کہ یہ شکوہ آذر بانی جان کی حاکم شنزادی آغا بیگی زبان سے کر رہا ہوں تو پھر آپ کا کیا جواب ہو گا؟“ زردار بیگ نے یہ کہہ کر ل کو حیرت میں ڈال دیا۔

”زردار بیگ! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ وقاص نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا تم یہ

”شنزادی نے کیا میرے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے؟“
 ”یہ رائے میری ہے سردار!“ زردار بیگ نے بچوں کی طرح کلکاری بھری۔
 شنزادی کی آنکھوں میں جو سوال ہے اسے نہ آپ نے پڑھا ہے اور نہ جواب دیا ہے۔“

”زردار بیگ! تم چند ہی دنوں میں کتنے عقلمند ہو گئے ہو؟“ وقاص نے بڑی سرت سے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کیا شنزادی کے دل میں میرے لئے کوئی جگہ ہے؟“
 ”سردار! آپ مجھ سے ایسے سوال نہ کیجئے جس کا جواب میں نہ دے سکتا ہوں۔“ زردار بیگ نے اپنی اونچی ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ ”میری موٹی عقل مجھے بتاتی ہے کہ شکوہ شکایت ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جن سے اس کا کوئی تعلق ہو۔
 راہ چلنے والوں سے تو کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اگر شنزادی کے دل میں جگہ نہ ہوتی تو وہ مجھ سے آپ کی شکایت کرنے کے بجائے اپنی توہین کے جرم میں آپ کو سزا سناتی۔
 ایک بادشاہ یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا کوئی ملازم خواہ وہ کوئی بڑا امیر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے شاہانہ وقار کو اہمیت نہ دے اور اس کا عام لوگوں کی طرح استقبال کرے۔“

وقاص سوچ میں پڑ گیا۔

”سردار! فکر نہ کیجئے۔“ زردار بیگ نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”جو ہوا اس پر خاک ڈالنے اور آئندہ کی تدبیر کیجئے۔ مجھے مشیر سلطانی کے رنگ ڈھنگ پسند نہیں۔ وہ شنزادی کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا ہے۔“

وقاص نے چونک کے زردار بیگ کو دیکھا۔ ”مشیر سلطانی کی عمر کیا ہے؟“
 ”بوڑھا ہے، بچپن ساٹھ کے پیٹے میں ہے۔“

”پھر وہ چاہتا کیا ہے؟“

”میرے پاس اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔“ زردار بیگ نے اپنی مجبوری کا اظہار برملا کر دیا۔ ”میں نے اسے صرف دو بار دیکھا ہے۔ بڑا خوفناک چہرہ ہے اس کا۔ دیکھنے سے وحشت ہوتی ہے۔“

”کیس ایسا تو نہیں کہ وہ آذر بائی جان کا خود حاکم بننا چاہتا ہو؟“

”کنا چاہتے ہو کہ شنزادی نے میرے رویے کے متعلق تم سے شکوہ کیا ہے؟“

”سردار! آپ مجھ سے کیس زیادہ عقلمند ہیں۔“ زردار بیگ نے وقاص کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔ شنزادی کو آپ سے زبردست شکایت ہے۔ آپ کو ان کا زبردست استقبال کرنا چاہئے تھا۔“

”ٹھہرو زردار بیگ!“ وقاص نے اسے روکا۔ ”پہلے یہ بتاؤ یہ شکایت تمہیں پیدا ہوئی ہے یا شنزادی نے تم سے خاص طور پر اس سلسلے میں گفتگو کی ہے؟“

”میرے پیارے سردار!“ زردار بیگ جذباتی ہو گیا۔ ”آپ نے شنزادی کی صرف سپہ گری دیکھی ہے۔ وہ جس قدر نڈر اور بہادر ہیں اس سے زیادہ ایک حساس دل کی بھی مالک ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے دل میں آپ کے لئے کوئی اہم جگہ ہے۔ انہوں نے آپ کے تمیز پہنچنے کے احکامات جاری کر دیئے تھے مگر مشیر سلطانی کی مخالفت کی وجہ سے ان پر عمل نہ ہو سکا۔“

”کیا شنزادی نے تم سے کبھی میرا تذکرہ کیا تھا؟“ وقاص نے بے چینی سے پوچھا۔

”سردار! آپ تذکرہ کتے ہیں؟“ زردار بیگ نے وقاص کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”تمیز میں تو روز ہی آپ کا ذکر ہوتا تھا اور شنزادی سے آپ کے بارے میں گھنٹوں باتیں کرتا تھا۔“

”میرے بارے میں شنزادی کی کیا رائے ہے؟“

”شنزادی آپ کو بزدل سمجھتی ہیں۔“

”ہائیں۔۔۔ کیا کہا۔ میں بزدل ہوں۔ تم نے میری صفائی پیش نہیں کی؟“

وقاص پریشان ہو گیا۔

”سردار! بزدلی کا یہ مطلب نہیں کہ آپ دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔“

”اس کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں۔“

”معنی تو میں نہیں بتا سکتا۔“ زردار بیگ نے وقاص کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”لیکن یہ ضرور ہے کہ آپ میں شنزادی کے سامنے وہ باتیں کرنے کی جرات نہیں جو آپ کو کنا چاہئیں۔“

وقاص نے ایک بار پھر حیرت بھری نظروں سے زردار بیگ کو دیکھا۔ ”تم یقین
کے ساتھ کیسے کہہ رہے ہو زردار بیگ؟“

”میرے سردار، میرے آقا۔“ زردار بیگ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں صرف چار
بل اپنی بیوی کے ساتھ گزار سکا ہوں۔ اس کے بعد وہ اللہ کو پیار ہو گئی اور میں اس
نہ بد بند سے ہمیشہ کسلنے آزاد ہو گیا۔ لیکن ان چار برسوں میں، میں عورت کی رگ
رگ سے واقف ہو گیا۔ عورت زبان سے کم اور آنکھوں سے زیادہ گفتگو کرتی ہے۔
میں نے ان پڑھ ہونے کے باوجود شہزادی کی آنکھیں پڑھی ہیں۔ آپ ذرا انتظار کیجئے۔
آپ کو حاضری کا بلاوا آ جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ فوجی ضرورت سے نہیں بلکہ
ہاں اس موضوع پر گفتگو کرنے کا آپ کو موقعہ دیا جائے گا۔“

”زردار بیگ!“ وقاص نے پیار سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”تمہارے
بنے میں واقعی ایک پر خلوص دل موجود ہے۔ مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے زردار
بیگ۔“

زردار بیگ نے وقاص کے دل میں محبت کی جو جوت جگائی تھی۔ اس سے
واقص کئی دن تک بہت مسرور رہا۔ اس کی طبیعت میں شگفتگی اور خیالات میں رنگینی
پیدا ہو گئی۔ شہزادی کا سراپا ہر وقت اس کی نظروں میں گھومتا رہتا اور دل محبت کے
کینے سے بھرا رہتا لیکن جب کئی روز تک شہزادی کی طرف سے کوئی بلاوا نہ آیا تو اس
کی محبت کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ امیدوں پر اوس پڑنے لگی اور دل کی بے چینیوں میں
لگی گنا اضافہ ہو گیا۔ یہی نہیں کہ اس کی شہزادی یا زردار بیگ سے ملاقات نہ ہوئی
۔۔۔ اس کا شہزادی سے دن میں دو ایک بار ضرور سامنا ہوتا باتیں بھی ہوتیں لیکن یہ
باتیں ترکمانوں کے حملے سے آگے نہ بڑھتیں۔ شہزادی کے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی
طاری رہتی۔ رفتہ رفتہ وقاص کی امیدیں ٹوٹنے لگیں۔ وقاص اسے ایک حسین خواب
کچھ کربھولنے پر مجبور ہو گیا مگر دل کسی طرح نہ مانتا تھا۔ امید کے بجھتے چراغ میں کسی
لٹ ایک شعلہ سا بلند ہو جاتا تھا۔

زردار بیگ کے رویے میں بھی فرق آ گیا تھا۔ اس کا زیادہ وقت وقاص کے
ساتھ ہی گزرتا تھا۔ لیکن اس نے اس معاملے میں جیسے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا سردار! یہ باتیں آپ کے سوچنے کی ہیں۔“

وقاص چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ”دیکھو زردار بیگ۔ یہ تو ہونے سے رہا کر
مشیر سلطانی، شہزادی سے شادی کی خواہش کرے۔ اگر اس نے یہ حماقت کی تو یہ معاملہ
ضرور دربار سرقند میں پیش ہو گا اور ہمارا نیک دل بادشاہ میرزا شاہ رخ یہ کبھی پسند نہ
کرے گا کہ ایک جوان شہزادی کو اس کی مرضی کے خلاف ایک بوڑھے کھوسٹ سے
بیاہ دے۔ شہزادی بھی یہ بات گوارہ نہ کرے گی۔“

”سردار! آپ کن باتوں میں الجھ گئے۔“ زردار بیگ نے الجھتے ہوئے کہا۔
”آپ بس اپنے بارے میں سوچئے۔“

”میں اپنے بارے میں کیا سوچوں۔“ وقاص نے افسردگی سے کہا۔ ”ابھی تو مجھے
کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھی یقین نہیں کہ وہ مجھ سے سیدھے منہ بات کریں گی بھی کہ
نہیں۔“

”سردار! میں شہزادی کے شکوے کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔“ زردار بیگ
نے وضاحت کی۔ ”انہیں شکایت ہے کہ سعد وقاص نے ان کا شایان شان استقبال
نہیں کیا۔ آپ اس کی تلافی کی کوئی صورت نکالئے۔“

”تلافی کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ میں شہزادی کے پاس جا کر معافی مانگ
لوں“ وقاص نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”تمہارا کیا خیال ہے زردار بیگ! کہیں شہزادی
کو غصہ تو نہیں آ جائے گا؟“

”میرا تو خیال ہے کہ بغیر بلائے شہزادی سے ملنا آپ کے لئے مناسب نہیں۔“
زردار بیگ نے غظندوں جیسا مشورہ دیا۔ ”پھر اس میں خود آپ کی بھی کمی ہے۔ خود
دار آدمی بغیر بلائے خدا کے گھر بھی نہیں جایا کرتا۔ مزہ تو یہ ہے کہ وہ آپ کو بلائیں پھر
آپ جائیں اور عذر و معذرت کے تمام تیر شہزادی پر چلا دیں۔ اس کے بعد دیکھئے کہ
پردہ غیب سے کیا ہوتا ہے۔“

”مگر زردار بیگ! اس کی کیا ضمانت ہے کہ شہزادی مجھے خاص طور پر بلائیں
گی؟“ سعد وقاص نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”شہزادی آپ کو ضرور بلائیں گی۔“ زردار بیگ نے بڑے یقین سے کہا۔

ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔۔۔۔۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔
 اس راہ میں کئی سخت مقام بھی آتے ہیں۔ آپ دل چھوٹا نہ کیجئے۔ حالات درست
 ہونے ہی وہ سب کچھ ہو گا جو میں نے کہا ہے۔“
 ”کس کے حالات زردار بیگ؟“ وقاص نے چونک کے زردار بیگ کو دیکھا۔
 میرے حالات تو بالکل پرسکون ہیں۔ ہاں اگر شنزادی کو کوئی مسئلہ پیش آگیا ہو تو اس
 بارے میں مجھ سے بہتر تم جانتے ہو گے۔“
 ”حالات سے میری مراد ترکمانوں کا حملہ ہے۔“ زردار بیگ نے صفائی پیش کی۔
 شنزادی کے دل و دماغ پر ہر وقت ترکمان چھائے رہتے ہیں۔ انہیں جب تک ترکمانوں
 کے حملے کا خدشہ رہے گا وہ کسی اور طرف توجہ نہ دے سکیں گی۔“

زردار بیگ نے شنزادی کی عدم توجہی کا جو جواز پیش کیا وہ انتہائی معقول تھا۔
 اس کی سنجیدہ طبیعت نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ اس نے معذرت بھرے انداز میں
 اللہ ”زردار بیگ تم نے میرا ذہن صاف کر دیا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے حالات
 اور انداز کرتے ہوئے شنزادی سے ایسی امید باندھ لی تھی۔ تم نے ٹھیک کہا کہ یہ
 بات نہیں کہ ہم ترکمانوں کا خیال چھوڑ کے رنگین افسانوں کی طرف بھاگتے
 ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا اور شنزادی کی طرف سے میرے
 نامیں بدگمانی پیدا ہوئی۔“

اس گفتگو کے بعد وقاص نے پھر کبھی اس مسئلہ کو نہیں اٹھایا اور پوری تندی
 سے جنگی تیاریوں میں لگ گیا۔ اب وہ شنزادی سے بڑی خوشدلی سے گفتگو کرتا اور اس
 کے منصوبوں پر جی لگا کے غور کرتا۔

☆☆☆

قرہ یوسف زخم خوردہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تیموری سلطنت کمزور ہونے کے
 اندر اب بھی اس قدر طاقتور ہے کہ اسے آسانی سے شکست نہیں دی جاسکتی۔ آذر
 باجان کا علاقہ سمرقند سے ہزاروں میل دور ہونے کی وجہ سے تیموریوں کا کمزور پہلو
 انکس پر قبضہ کرنا بہت مشکل تھا۔ اس نے سرحدی جھڑپیں محض طاقت آزمائی کے

وقاص اگر اشارتاً ”کوئی بات کہتا بھی تو زردار بیگ بڑی صفائی سے ٹال دیتا۔ وقاص نے
 اس کے ٹال مٹول سے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ شاید شنزادی نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ ہوسکا
 ہے کہ زردار بیگ نے شنزادی کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہو اور اس نے وقاص کو خوش
 کرنے کے لئے یہ سب کچھ کہا ہو مگر زردار بیگ کے معاملے میں اس کا دل مطمئن نہ
 ہوتا تھا۔ زردار بیگ ایک نیک اور بذلہ سنج انسان تھا مگر اس کے متعلق یہ سوچنا کہ
 اس نے وقاص کے ساتھ ایک خطرناک مذاق کیا ہے کسی طرح درست نہ تھا مگر جب
 ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا اور وقاص کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹنے لگا تو اس
 نے ایک دن زبان کھولی۔

”زردار بیگ! اس سے تو یہی بہتر تھا کہ میں شنزادی کو ایک مصیبت سمجھ کر اپنا
 دل بہلاتا رہتا۔“ وقاص کے لہجے میں بڑی ترشی تھی۔ ”تم سے کس نے کہا تھا کہ
 میرے دل میں محبت کا نیا چراغ روشن کرو۔ تم نے میرے غموں میں اضافہ کر دیا ہے
 زردار بیگ۔“

زردار بیگ نے وقاص کی گفتگو کی تلخی محسوس کی۔ زردار بیگ سر جھکائے کچھ سوچتا
 رہا پھر جھل نظروں سے وقاص کو دیکھا۔ ”سردار! میں خطاوار ہوں۔ آپ جو چاہے کہ
 سکتے ہیں مگر خدا کے لئے یہ کبھی نہ سوچئے گا کہ میں نے آپ کو دھوکہ دیا ہے یا آپ
 سے مذاق کیا ہے۔“

زردار بیگ کے لہجے میں اس قدر دل گرفتگی اور گداز تھا کہ وقاص بے چین ہو
 گیا۔ ”زردار بیگ! یقین کرو میرے دل میں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں۔ میں
 تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے شنزادی کے بارے میں غلط اندازہ لگایا اور میرا
 دوستی میں وہ بات کہہ گئے جس کا امکان ہی نہیں تھا۔“

”میرے سردار۔۔۔۔۔!“ زردار بیگ بھی جذباتی ہو گیا۔ ”خدا نہ کرے کہ
 آپ کبھی مجھ سے بدگمان ہوں۔ یہ عشق و محبت کے معاملات ہیں۔ آپ کی بے چینی
 بے یقینی اور تلخی اپنی جگہ لیکن ان معاملات میں صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے اور اگر
 مجھے معاف کیجئے تو میں کہوں گا کہ آپ نے اس پر خار وادی میں ابھی پہلا قدم رکھا
 ہے۔“

لئے شروع کی تھیں۔ وہ اپنا لشکر بھی سرحدوں کے قریب لے آیا تھا مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ تیموری سرحدیں نہ صرف محفوظ ہیں بلکہ تھمز سے وہاں برابر کمک پہنچ رہی تھی۔ شزادی آغا بیگی کے سرحد پر آ جانے سے وہ بہت پریشان ہوا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک جنگی چال چلی اور وہ اپنی چال میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔

اس زمانے میں آج جیسا جاسوسی کا نظام موجود نہ تھا۔ مخالف طاقت کے جاسوس چھپتے چھپاتے ایک دوسرے کے علاقے میں تھوڑی دور ضرور گھس جاتے اور جو خبریں حاصل ہوتیں۔ انہیں سرحد تک پہنچاتے مگر یہ خبریں اکثر غلط ثابت ہوتیں۔ شزادی کے جاسوسوں نے اطلاع دی تھی کہ سرحد سے چار پانچ منزل دور ترکمانوں کا ایک لشکر پڑاؤ ڈالے دیکھا گیا ہے۔ یہ اطلاع ملتے ہی شزادی کمک لے کر سرحد پر پہنچ گئی تھی لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ قرہ یوسف نے ایک لشکر تو آذر بائی جان کی سرحد کے قریب اس سڑک پر جمع کیا تھا جو سوداگروں کا عام راستہ تھا اور اپنے دو بڑے لشکروں کو اس کے دائیں بائیں اکٹھا کر دیا تھا اور یہی وہ لشکر تھے جن سے وہ حملے کا اصل کام لینا چاہتا تھا۔

چنانچہ قرہ یوسف نے اپنی حکمت عملی کے تحت سوداگروں کے راستے میں پڑے ہوئے لشکر کو پسائی کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے قرب و جوار کی آبادیوں میں یہ مشورہ کرا دیا کہ ترکمان یہ محاذ چھوڑ کر سمرقند پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ قرہ یوسف اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔ آذر بائی جان کے جاسوسوں نے فوراً "شزادی کو اطلاع دی کہ ترکمانی لشکر واپس ہو گیا ہے۔ اس خبر سے شزادی کے لشکر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ مگر شزادی کو اطمینان نہ ہوا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ اگر ترکمانوں کو بغیر جنگ کے پسپا ہی ہونا تھا تو پھر انہوں نے لشکر کو یہاں تک لانے کی کیوں کوشش کی۔ وقاص بھی شزادی کے خیال سے متفق تھا۔

ادھر تھمز کا لشکر واپسی کے لئے کمریں کس رہا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ ترکمانوں کی واپسی کے بعد پورے لشکر کا سرحد پر بیکار پڑے رہنا مناسب نہیں۔ زردار بیگ نے بھی اپنا بوریا بستر باندھ لیا مگر شزادی نے اب تک کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ ایک ہفتہ اسے تذبذب میں گزر گیا مگر شزادی کی طرف سے کوئی حکم صادر نہ ہوا۔ سرحد سے ترکمانوں

نے واپسی کی اطلاعات تو اتار سے پہنچ رہی تھیں اور اب تو وقاص کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ ترکمانوں کا خطرہ ٹل گیا ہے مگر اسے اس سلسلے میں شزادی سے گفتگو کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ایک شب اس نے زردار بیگ کو چھیڑا۔ "شزادی کی یہ طویل خاموشی سمجھ میں نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ تھمز کا لشکر واپس جانے کے لئے بے چین ہے؟"

"سردار!" زردار بیگ جیسے پھٹ پڑا۔ "تھمز کا لشکر واپس جانے کے لئے بے چین ہو یا نہ ہو مگر میں ضرور بے چین ہوں۔۔۔۔۔ سرحدوں کی خاک چھانٹتے ہوئے بے زمانہ گزر گیا۔ تھمز میں کچھ آرام ملا تھا کہ پھر سرحد پر پھینک دیا گیا۔"

"کیا تھمز بہت خوبصورت شہر ہے؟" وقاص نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

"سردار! تھمز سے بڑا دنیا میں کوئی شہر نہیں۔" زردار بیگ نے آنکھیں بند کر لیا جیسے وہ تھمز کے حسن کو اپنے تصور میں کھینچ رہا ہو۔

تھمز کے بارے میں زردار بیگ کا تبصرہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ حالانکہ اس نے تو بائیں طرف سے ڈیگ ماری تھی لیکن اس کا کہنا سراسر حقیقت پر مبنی تھا۔ ہم آج تھمز کا ٹیڈ صرف حضرت شمس تھمزی کے حوالے سے جانتے ہیں۔ لوگ آج کل اس شہر بھل گئے ہیں مگر تیموریوں کے دور حکومت میں تھمز پر جو شباب تھا اسے پڑھ کر بت ہوتی ہے۔ تاریخیں تو یہاں تک بتاتی ہیں کہ چودھویں صدی عیسوی میں چین دارالسلطنت کو چھوڑ کر تھمز دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ وہاں کی عمارتیں روم اور

اس کی عمارتوں سے زیادہ شاندار اور وسیع تھیں۔ اس کی آبادی تیرہ لاکھ کے قریب تھی۔ ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ تھمز میں ایک پورا بازار مشک فروشوں کا تھا اور دوسرا بازار غبر فروشوں کا۔ اسی طرح جواہرات کا الگ بازار تھا جہاں ہیروں کی چمک دک دیکھ آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔

وقاص نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں تھمز اتنا ہی پسند ہے تو پھر شزادی واپسی کے لئے کیوں نہیں کہتے؟"

"تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں خاموش بیٹھا ہوں مگر واہ ری قسمت۔" زردار نے ٹھنڈی سانس لی۔

”پھر کیا جواب دیا شنزادی نے۔ کیا انکار کر دیا جانے سے؟“

”نہیں سردار!“ زردار بیک نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بھلا اس دیرانے میں کیا

دل لگ سکتا ہے۔ وہ واپسی کے لئے بالکل تیار ہیں۔“

”تو پھر واپسی کا حکم کیوں نہیں دیتیں؟“

”کبھی ہیں کہ ترکمانوں سے ہوشیار رہنا چاہئے۔“ زردار بیک نے شنزادی کو

بات دوہرائی۔ ”ان کا خیال ہے کہ جس طرح قرہ یوسف نے ان کے دادا امیر تہو

گورگانی کو پریشان کیا تھا اسی طرح اب مجھے تنگ کرے گا۔ ابھی کچھ دن اور ٹھہرے!

ارادہ ہے ان کا۔“

”عجب بات ہے۔“ وقاص نے منہ بنایا۔ ”ترکمان لشکر واپس جا چکا ہے

جاسوسوں نے بار بار تصدیق کی ہے۔ پتہ نہیں شنزادی کا وہم کیسے دور ہو گا؟“

اگلے دن شنزادی کے حضور چار سوداگر پیش کئے گئے۔ یہ شمالی علاقوں میں

سلمان فروخت کر کے واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے ترکمانوں کے بارے میں کچھ

باتیں کہی تھیں۔ اس لئے انہیں شنزادی کے سامنے پیش کیا گیا۔

شنزادی نے ایک سوداگر سے پوچھا۔ ”کیا تم نے ترکمان لشکر کو واپس جانے کا

تھا؟“

”شنزادی عالیہ!“ سوداگر نے کمال ادب سے کہا۔ ”ترکمانوں کا ایک زبردست

لشکر ہمیں راستے میں ملا تھا۔ وہ ایک دریا کے کنارے ڈیرے ڈالے ہوئے تھا۔ اس

تمام سپاہی بے حد تھکے معلوم ہوتے تھے اور بڑے بے تکی پن سے جگہ جگہ لوٹ

پڑے تھے۔“

”تم نے کسی لشکری سے بات کی؟“

”جی ہاں شنزادی عالیہ!“ سوداگر نے بتانا شروع کیا ”پہلے تو ہم لوگ انہیں دیکھ

یہ سمجھے کہ کہیں قریب ہی جنگ ہوئی ہے اور یہ لوگ میدان چھوڑ کر بھاگے ہیں۔

لوگ پریشان ہوئے کہ کہیں آگے راستہ نہ بند ہو اور ہمیں اپنا راستہ تبدیل کرنا پڑے۔

اس لئے میں دو آدمیوں کو ساتھ لے کر ان کے پاس گیا۔ جس شخص سے میری بات

ہوئی وہ ان کا کوئی بڑا سردار تھا۔ میں نے دریافت حال کے لئے اپنے خدشات ان

سے تو وہ بہت ہنسے اور بتایا کہ تم لوگ بے فکری سے سفر جاری رکھو۔ راستے میں

خطرہ نہیں ہے۔“

”اور کچھ بتایا انہوں نے؟“ شنزادی نے بے چینی سے پوچھا۔

”ان سے تو میری بڑی باتیں ہوئیں شنزادی صاحبہ!“ سوداگر نے بڑی مسرت

بنائی۔ ”سردار بڑا شریف آدمی تھا۔ اس نے رات کے کھانے پر ہم سب کو مدعو کیا

مجھے مزید مطمئن کرنے کے لئے بتایا کہ وہ ادھر ایک مہم پر آئے تھے مگر بڑے سردار

ہمیں فوراً سمرقند جانے کا حکم دیا ہے۔ ہم دو دو منزلیں ایک ایک دن میں طے

کرتے ہوئے سمرقند جا رہے ہیں۔ میں نے یہی باتیں آپ کے آدمیوں کو بتائی تھیں مگر

میں آپ کے پاس پکڑ لائے۔ شنزادی صاحبہ قسم لے لیجئے۔ میں نے کوئی جاسوسی

کی۔ ہم سب تاجر پیشہ لوگ ہیں ہمیں صرف اپنے کام سے کام رہتا ہے

راستے کھلے رہنے اور امن و امان کی فکر ہوتی ہے۔“

سوداگر کی تمام گفتگو شنزادی نے بڑی توجہ سے سنی پھر ذرا دیر خاموش رہنے کے

کلم دیا۔ ”سوداگروں کو آج شام ہماری طرف سے دعوت دی جائے اور پھر انہیں

ند احترام سے جدھر یہ جانا چاہیں روانہ کر دیا جائے۔ ان کے ساتھ بیس سواروں کا

دستہ بھی بھیجا جائے جو انہیں منزل مقصود تک پہنچائے۔“

سوداگروں نے شنزادی کا شکریہ ادا کیا۔ رات کو دعوت کا لطف اٹھایا پھر سواروں

حفاظت میں آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔ سوداگر کی گفتگو نے شنزادی کا ذہن بالکل

نکال دیا اور اسے یقین ہو گیا کہ ترکمان لشکر سمرقند کی طرف چلا گیا ہے۔ دوسرے

اہل بات کی تصدیق جاسوس سواروں سے بھی کر دی۔ انہوں نے وضاحت کرتے

بتایا کہ قرہ یوسف اپنا لشکر لے کر سمرقند پر حملہ کرنے گیا ہے۔

”دون بعد زردار بیک نے وقاص کو خوشخبری سنائی۔“ شنزادی نے آپ کو طلب

ہے سردار۔“

وقاص کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا صرف مجھے بلایا ہے یا وہاں

موجود بھی ہو گا؟“

”اس کے لئے بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ شہزادی جو سوال کریں گی اس کا جواب خود بخود آپ کے ذہن میں آ جائے گا۔“

زردار بیگ نے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ وقاص کو جیسے پلا دیا۔ یا یوں کہنا اپنے کہ اس نے وقاص کو خوب پکا کر دیا اور تاکید کی کہ وہ وقت مقررہ پر ضرور پہنچ جائے۔

ادھر تو سعد وقاص محبت کا سبق دوہرانے کی تیاری کر رہا تھا اور ادھر تیریز میں بک خاموش انقلاب آ رہا تھا۔ سلطانی مشیر کی نیت میں پہلے ہی فتنہ تھا۔ دراصل وہ زربانی جان کی ریاست پر خود قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اسے طاقت کی ضرورت تھی اور طاقت اس کے پاس تھی نہیں۔ اس لئے اس نے ایک زبردست اہل چلی۔ مشیر سلطانی نے شاہ رخ میرزا کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں اس نے اس ن کا خدشہ ظاہر کیا کہ شہزادی آغا بیگی کا کھلے عام مردانہ لباس میں گھومنا پھرنا تیریزی ٹکڑوں بالکل پسند نہیں اس لئے شہزادی کو یا تو پردے کا پابند کیا جائے یا پھر انہیں ہر کیا جائے کہ وہ کسی معقول جوان سے شادی کر لیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو لشکر میں اہل پھیلنے کا خطرہ ہے۔ خط کے آخر میں اس نے یہ بھی لکھا کہ اس کا بیٹا ظل اللہ سرقد میں شاہی محافظ دستے میں خدمات انجام دے رہا ہے اسے تیریز بھیج دیا جائے کہ وہ ظل اللہ کی کسی مناسب جگہ شادی کر کے اسے ایک ذمہ دار جوان بنا دے۔

سلطانی مشیر نے یہ خط بڑی محنت سے لکھا تھا۔ بظاہر اس میں کوئی قابل گرفت نہ تھی لیکن غور کرنے پر یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ سلطانی مشیر یہ چاہتا ہے کہ اگر زادی شادی کرنے پر رضامند ہو جائے تو وہ اس کے بیٹے ظل اللہ کو بھی اپنے بیرواں میں شمار کرے۔ کیونکہ سلطانی مشیر آذر بانی جان پر اسی وقت پوری طرح رفت رکھ سکتا تھا جب شہزادی آغا بیگی اس کے بیٹے سے شادی کر لے۔ اس وقت میں اس کی پانچوں انگلیاں گھٹی میں ہوں گی۔ مشیر کے اس خط نے شاہ رخ کو بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ اس نے آذر بانی جان کی ریاست آغا بیگی کو بخش دیا اور وہ بخشی ہوئی چیز کو واپس لینا اپنے وقار کے خلاف سمجھتا تھا۔ شہزادی کی

”اور کسی کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سردار۔“ زردار بیگ نے دے کے کہا۔ ”دل کی باتیں تنہائی میں ہوا کرتی ہیں۔ کسی اور کو دخل دینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔“

سعد وقاص عشق و محبت کو معاملات سے ناواقف تھا۔ اس نے شہزادی آنکھوں میں پہلی بار محبت اور اپنائیت کی چمک دیکھی تھی۔ اس نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے دوست! یہ تو بتاؤ۔ میں شہزادی سے کیا باتیں کروں گا؟“

زردار بیگ کو ہنسی آ گئی۔ ”سردار! کیا آپ نے اب تک کسی سے محبت کی؟“

”کی کیوں نہیں ہے۔“ وقاص نے بڑے جوش سے کہا۔ ”کیا مجھے تم سے نہیں؟“

”میرا مطلب ہے۔ یعنی یہ کہ آپ نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی؟“ زردار بیگ پریشان ہو گیا۔

سعد وقاص اس سے زیادہ پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ زردار بیگ کو کیا جواب دے۔ سرحد کے قریب جتنے گاؤں تھے وہاں وقاص کا اکثر جانا تھا۔ گاؤں میں عورتوں اور لڑکیوں سے بھی اس کا سابقہ پڑتا تھا۔ لیکن وقاص م اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اچھی صورتیں اسے بھی اچھی لگتی تھیں مگر اس پسندیدگی صرف نظروں ہی تک محدود تھی۔

وقاص نے الفاظ تولتے ہوئے کہا۔ ”میں اکثر لڑکیوں سے ملا ہوں مگر میں ان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ یہ ضرور ہے کہ خوبصورت لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔“

”سردار! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔“ زردار بیگ نے اسے سہارا دیا۔ ”شہزادی کے حضور پیش ہوں اور انہیں ادب سے سلام کریں پھر وہ جو بات پوچھیں اس کا سوچ سمجھ کے جواب دیں۔“

”اور اگر شہزادی نے کوئی ایسی ویسی بات پوچھی جس کا جواب مجھے نہ آتا پھر کیا کروں گا۔“ وقاص نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی بچہ اپنے استاد سے سوال

شجاعت اور سپہ گری کا چرچا بھی اس نے سن رکھا تھا۔ اس لئے وہ شہزادی کو پردے کا پابند بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ شاہ رخ مرزا ایک نیک طبیعت اور علم دوست انسان تھا۔ کسی کا خواستوار دل دکھانا وہ پسند نہیں کرتا تھا آخر کئی دن کی فکر و تردد کے بعد اس نے سلطانی مشیر کے نام ایک فرمان جاری کیا جس میں اسے حکم دیا گیا کہ وہ شہزادی کو مشورہ دے کر فوراً شادی کر لے اور شادی کی تاریخ سے دربار سرفرد کو مطلع کرے تاکہ شاہ کی طرف سے کسی امیر کو شاہ کی نیابت کے لئے تہنیت روانہ کیا جائے۔ فرمان میں یہ بھی درج کیا گیا کہ سلطانی مشیر کی درخواست کے مطابق عمل کرنا کو تہنیت بھیجا جا رہا ہے۔

شہزادی کو سرحد پر گئے ہوئے ڈیڑھ ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطانی مشیر نے سمرقند سے فرمان جاری کرا دیا۔ چنانچہ شاہی فرمان اور اس کا بیٹا تہنیت پہنچ گئے۔ مشیر نے فرمان پڑھا تو اسے اپنے مقصد کے مطابق پایا۔ ایک طرف تو اس نے بیٹے کو پٹی پڑھائی کہ وہ شہزادی کو اپنی محبت میں پھانس کر اس سے شادی کر لے دوسری طرف اس نے قاصد کو یہ بھی پیغام دیا کہ شہزادی پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ ان کی تہنیت میں موجودگی اس لئے ضروری ہے کہ سمرقند سے ایک سلطانی فرمان آیا ہے اور اس پر عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب شہزادی تہنیت میں موجود ہوں۔

شہزادی آغا بیگی اب تک دو شہزادی کی زندگی گزار رہی تھی۔ کسی مرد کا تصور اس کے ذہن سے دور بہت دور تھا لیکن جب سے اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ سلطانی مشیر اس کے معاملات میں خواستوار دخل دے رہا ہے تو وہ چونکا ہو گئی تھی۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو پھر بھی اسے کسی ہمدرد یا دوست کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شہزادی کو بھی یہ کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ وقاص سے حادثاتی ملاقات میں اسے وقاص کی مردانی وجاہت اور شائستگی نے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ اگر اسے کسی سہارے کی ضرورت پیش آئی تو وہ وقاص ہی کو منتخب کرے گی۔ اس بار سرحد پر آنے میں اس کا یہ مقصد بھی پوشیدہ تھا

کہ وہ وقاص کو قریب سے پرکھے گی چنانچہ ترکمانوں سے جنگ کا خطرہ ملتے ہی اس نے اس کو اپنے پاس بلوایا تھا۔ وہ آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔

تہنیت کے حضور پیش ہوا تو شہزادی تنہا نہ تھی۔ اس کے پاس زردار بیگ کے علاوہ بڑے آیا ہوا قاصد بھی بیٹھا تھا۔ وقاص نہ جانتا تھا کہ یہ اجنبی سلطانی مشیر کا قاصد ہے۔ اسے ایک غیر آدمی کی موجودگی بڑی شاق گزری۔ اس نے شکایت بھری نظروں سے زردار بیگ کی طرف دیکھا جو شہزادی کے دائیں جانب ادب سے کھڑا تھا۔ زردار بیگ کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ زردار بیگ کا ہاتھ ٹھنکا۔ وہ سمجھ گیا کہ دال میں ضرور ہتھکڑیاں لگا دی ہیں۔ زردار بیگ نے شہزادی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ شہزادی کی ہمت بھی پہلی پڑ گئی تھی اور فکر و تردد کے سائے اس کے چہرے کا ہالہ کئے ہوئے تھے۔

آخر شہزادی نے خود ہی اس طلسم کو توڑا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وقاص! ہم نے تمہیں کچھ ضروری گفتگو کے لئے طلب کیا تھا مگر اب بہت اہم مسئلہ پیش ہے۔ شاہ دوراں شاہ رخ میرزا گورگانی نے ہمارے بارے میں کوئی فرمان جاری کیا ہے۔ فرمان تہنیت پہنچ چکا ہے اور سلطانی مشیر نے اپنے قاصد کے ذریعے ہم سے "زرا" تہنیت پہنچنے کی درخواست کی ہے۔"

شہزادی خاموش ہوئی تو وقاص نے کمال ادب سے کہا۔ "شہزادی عالیہ! سلطانی فرمان ہر بات پر مقدم ہے۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ جب اور جہاں چاہیں آپ مجھے طلب کر سکتی ہیں لیکن اس وقت سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ فوراً تہنیت تشریف لے جائیں اور سلطانی فرمان ملاحظہ فرمائیں۔"

شہزادی خیالات میں بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ اس نے شاید وقاص کی بات بڑی طرح سنی بھی نہیں۔ اس نے اسی عالم میں کہا۔ "وقاص! ہمارا خیال ہے کہ ہمدرد کے حالات اب ٹھیک ہو گئے ہیں؟"

وقاص کو شہزادی کے اس اچانک سوال پر تعجب سا ہوا پھر بھی اس نے جواب دیا۔ "سرحد کی طرف سے شہزادی عالیہ بے فکر رہیں۔ میرے محافظ دستے ہر وقت

چو کس رہیں گے اور ہر ہفتے یہاں کر خبریں تمیز پہنچتی رہیں گی۔“

وقاص کو گمان ہوا تھا کہ شاید شہزادی نے یہ سوال قاصد کو سنائے کے لئے کہا ہے اس لئے اس نے سرحد کے پرسکون ماحول کی پوری وضاحت کر دی۔ لیکن اس نے یہ گمان غلط ثابت ہوا۔ شہزادی نے گہیر آواز میں کہا۔ ”وقاص صرف سرحدوں کو تمہاری اہلیت کی ضرورت نہیں۔ تمہاری شجاعت اور تدبیر سے سلطنت کے دوسرے حصوں کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

وقاص خاموش رہا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادی آگے کچھ اور بھی کہے گی مگر شہزادی خاموشی اختیار کر چکی تھی۔ وقاص کو جواب دینا لازمی ہو گیا۔ ”یہ شہزادی عالیہ کی ذرہ نوازی ہے۔ آقا اپنے خادموں کی اسی طرح حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“ کہہ کر شہزادی نے چند لمحے توقف کیا پھر بولی۔ ”اچھا اب نہ جاؤ۔ پھر کسی وقت تم سے گفتگو کریں گے۔“

وقاص نے شہزادی کے فکر مند چہرے پر نظریں ڈالیں پھر سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

شہزادی کے دل میں فرمان کے متعلق طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ اسے سلطانی مشیر کی طرف سے جو خطرہ تھا وہ اب شدید نفرت میں تبدیل ہو گیا۔ شہزادی کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ سلطانی مشیر نے ضرور اس کے خلاف کوئی سازش کی ہے۔ شاہی فرمان میں یقیناً ”کوئی ایسی بات ہے جس سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسے سلطانی مشیر پر اس لئے اور غصہ آ رہا تھا کہ اس نے سلطانی فرمان اس کے پاس کیوں نہ بھیجا۔ خیالات کے جھوم نے شہزادی کے دل و دماغ کو اس طرح گھبرا کہ وہ گھبرا اٹھی۔ وقاص کے واپس جانے کے چند ہی لمحوں بعد اس نے تمیز کے قاصد کو مخاطب کیا۔

”قاصد! ہمیں افسوس ہے کہ سلطانی مشیر نے سلطانی فرمان ہمارے پاس نہ بھیجا مگر ہمیں ذہنی کوفت پہنچائی ہے۔ بہر حال ہمیں فرمان کے ملاحظہ کے لئے فوراً تمیز جانا ہو گا۔ تم ایک دو دن آرام کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہی تمیز روانہ ہوں گے۔“

”سرکار عالیہ!“ قاصد نے کہا۔ ”میرے لئے حکم ہے کہ میں پیغام دے کر فوراً

اپنی چل پڑوں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ مجھے واپسی کی اجازت عطا فرمائی جائے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ شہزادی نے اجازت دے دی۔ ”مشیر محترم سے کہہ دینا کہ واپس آ رہے ہیں۔“

قاصد سلام کر کے خوش خوش دربار سے چلا گیا۔ اب سوائے زردار بیگ کے ابھی کسی کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔ شہزادی نے غمگین لہجے میں کہا۔ ”زردار بیگ افسوس ہے کہ ہم وقاص کی پذیرائی نہیں کر سکے۔ وہ اپنے دل میں کیا سوچتے رہے؟“

سوچتے ہوں گے کہ الفاظ پر زردار بیگ نے چونک کر شہزادی کو دیکھا۔ وقاص نے شہزادی کے منہ سے پہلی بار ایک برابری کا جملہ نکلا تھا۔ ”شہزادی عالیہ! بار وقاص تنگ نظر اور تنگ دل نہیں۔ وہ عقلمندی میں ارسطو اور بوعلی سینا سے آگے ہیں۔ انہوں نے تو آپ کے خیالات کی پوری پوری حمایت کی ہے اور آپ تمیز جانے کی پر زور درخواست بھی کی ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمارا بھی یہی خیال ہے۔“ اور شہزادی پھر خیالات میں لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے بھاری پلکیں جھپکائیں۔ ”زردار بیگ اگرچہ ہم تمہیں دل کا درجہ دینے پر تیار نہیں پر بھی عقل پر زور ڈال کر یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال سلطانی فرمان کس نوعیت کا ہو سکتا ہے؟“

”سلطانی فرمان کسی بھی نوعیت کا ہو مگر خاکم بدہن اس سے آپ کے وقار کو نامدہ نہ پہنچے گا۔ آپ کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔“ زردار بیگ نے امدتہ جواب دیا کہ شہزادی اس کا منہ دیکھ کر مر رہ گئی۔

”زردار بیگ! کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے؟“

”شہزادی عالیہ! یہ بات میرے دل سے نکلی ہے اور جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اپنے میں اثر اور وزن رکھتی ہے۔۔۔۔۔“ زردار بیگ نے زور دے کے کہا۔ ”اگر ان آپ کے خلاف ہوتا تو سلطانی مشیر آپ سے واپس آنے کی درخواست نہ کرتا۔ آپ کو واپسی کا حکم دیتا۔“

”زردار بیگ!“ شہزادی پھڑک اٹھی۔ ”تمہیں بے وقوف کون کہتا ہے۔ تمہارا سادگی میں تو ایک بہت اچھا دانشور چھپا ہوا ہے۔ تم نے جس بات کی گرفت کی اس کی طرف ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کیا بات پکڑی ہے تم نے۔“ سلطانی مشیر ہم سے درخواست کی ہے۔ طلب نہیں کیا ہے اور نہ حکم دیا ہے۔ تم نے بڑا بوجھ کر دیا زردار بیگ۔“

شہزادی نے اپنی کمر سے وہ خنجر نکالا جس کے دستے پر جواہرات جڑے ہو تھے۔ ”یہ لو زردار بیگ! یہ انعام نہیں بلکہ ہماری طرف سے تحفہ ہے۔“ زردار بیگ نے جھک کے ادب سے خنجر لے کر آداب پیش کیا۔

”جاؤ اور اعلان کر دو کہ ہم کل تہیز واپس جا رہے ہیں۔“ شہزادی نے مسرت لہجے میں کہا۔ ”اور ہاں! اپنے دوست وقاص سے کہہ دینا کہ سرحدی حالات سکون ہیں۔ انہیں بھی ہمارے ساتھ تہیز جانا ہے۔ ہم تہیز میں ان کی اور تمہارا موجودگی ضروری سمجھتے ہیں۔“

”خدا آپ کا جاہ و جلال برقرار رکھے اور آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔“ زردار بیگ نے اظہار تشکر میں سر کو خم کر کے کہا۔ ”آپ نے میری دلی مراد پوری کرنا میں آپ سے یہی درخواست کرنے والا تھا۔“

”زردار بیگ! ہم تہیز کے حالات سے مطمئن نہیں۔“ شہزادی نے زردار بیگ کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ”سلطانی مشیر بڑا گرگ باراں دیدہ ہے۔ ہمیں وقاص مشوروں کی بروقت ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”آپ میرے سردار پر مکمل اعتماد کر سکتی ہیں شہزادی عالیہ۔“ زردار بیگ نے نہ سا رہا تھا۔ ”مجھے اجازت دیجئے کہ میں یہ مرزہ جانفزا سردار وقاص تک پہنچاؤں۔“ تمہیں اجازت ہے۔“ اور شہزادی مسکرائے لگی۔

سلطانی مشیر کو شہزادی کی واپسی کی اطلاع ایک سوار کے ذریعے مل چکی تھی۔ اس نے شہر کے دروازے کے باہر تہیز کے معززین اور ریاست کے متعلقین کے ساتھ شہزادی کا استقبال کیا۔ شہزادی کو واپس آنے کی کچھ زیادہ خوشی نہ تھی۔ شاہی فرمان کے تحت تہیز آتا پڑا تھا لیکن سلطانی مشیر خوش و خرم دکھائی دے رہا تھا۔

ادنی کے لئے استقبال کرنے والوں کے چہرے جانے پہچانے تھے مگر اس دفعہ اس ایک نئے شخص کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ اجنبی جو معمولی چہرے مرے اور واجبی قد و قامت کا جوان تھا سلطانی مشیر کے ساتھ ساتھ لگا پھر رہا تھا۔ شہزادی نے اس پر ایک نئی نظر ڈالی تھی مگر کوئی توجہ نہ دی تھی۔

شہزادی نے محل میں پہنچتے ہی شاہی فرمان طلب کیا۔ ”مشیر محترم! شاہی فرمان لے کے لئے پیش کیجئے۔“

سلطانی مشیر مسکرایا۔ ”اتنی بھی کیا جلدی ہے شہزادی! سفر کی تھکن دور کر۔ فرمان کیس بھاگا تو نہیں جاتا۔ کچھ لوگ آپ کی ملاقات کے منتظر ہیں۔ پہلے ان کو مل لیجئے۔“

”ملاقات؟“ شہزادی چڑھی گئی۔ ”کیا ملاقات شاہی فرمان کے ملاحظہ سے زیادہ ہے؟“

”نہیں نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے شہزادی۔“ سلطانی مشیر نے بات بنائی۔ ”چاہتا تھا کہ جو لوگ آپ کی قدم بوسی کے مشتاق ہیں اگر انہیں موقعہ دیا جائے تو رہیں گے۔“

”کتنے لوگ ہیں؟“ شہزادی نے ناگواری سے جواب دیا۔ ”زیادہ نہیں صرف دو ایک آدمی ہیں۔“ سلطانی مشیر خوش ہوا مگر اس کی خوشی اُنہرے ہو سکی۔

شہزادی نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ”دو آدمی کچھ دیر اور انتظار کر سکتے ہیں۔ ان کا حشر کیا جائے۔“

”جی بہتر ہے۔“ سلطانی مشیر منہ بناتا ہوا باہر نکل گیا۔ شہزادی نے ایک کینز کو قریب بلا کر کچھ سرگوشی کی۔ کینز دوسرے کمرے میں چند لمحوں بعد واپس آئی تو اس کے ساتھ زردار بیگ اور سعد وقاص تھے۔

”وقاص! ہمارے سلطانی مشیر کی گفتگو ذرا غور سے سنا۔“ شہزادی نے زور دیا۔

”میں نے بھی کان صاف کر لئے ہیں شہزادی عالیہ۔“ زردار بیگ نے فوراً

کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔

مشر کے بیٹے کے ذکر پر زردار بیگ اور وقاص چونک پڑے تھے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے غل اللہ کو استقبال کے وقت دیکھا ہو لیکن ان کا خیال ادھر بالکل نہ گیا

”آپ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں؟“ شنزادی نے ایک دم سوال کیا۔
”مشورہ۔۔۔۔۔“ مشیر گھبرا گیا۔ ”میں۔۔۔۔۔ میں کیا مشورہ دے سکتا ہوں
انشاء اللہ بالغ اور سمجھدار ہیں۔“

”مشر محترم! فرمان شاہی میں حکم دیا گیا ہے کہ شنزادی آغا بیگی فوراً شادی کر
میں اس کے ساتھ اس بات کا بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ ہماری شادی آپ کے
رے سے ہو۔“

”جی بجا فرمایا آپ نے۔“ مشیر نے بڑے فخر سے کہا۔ ”یہ تو شاہ دوراں کی
بات ہیں کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا اور آپ بھی اس وفادار کے مشوروں
پزیرائی فرماتی رہے ہیں۔“

”مشر محترم! آپ انتظامی معاملات میں ہمارے مشیر ہیں۔“ شنزادی نے مضبوط
میں کہا۔ ”کیا آپ اسے بہتر سمجھتے ہیں کہ آپ آغا بیگی کے ذاتی معاملات میں بھی
مشورے پر زور دیں؟“
”شنزادی اگر پسند فرمائیں تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“ مشیر کا لہجہ پر
ن تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ شنزادی نے کچھ سکوت کیا۔ ”اچھا پہلے آپ ان لوگوں کو حاضر
میں جو ہم سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔“

”بہت اچھا۔۔۔۔۔“ کہہ کر مشیر باہر کی طرف چلا۔
”ٹھہریئے مشیر محترم!“ شنزادی نے اسے روکا۔ ”ہمارا خیال میں ہم سے ملنے کا
سے زیادہ مشتاق آپ کا بیٹا غل اللہ ہے کیوں نہ آپ اسے پہلے بلائیے۔“

”مشر نے حیرانی سے شنزادی کو دیکھا۔ ”شنزادی کا اندازہ کس قدر درست ہے۔
اللہ آپ کی واپسی کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ میں اسے حاضر کرتا ہوں۔“
”ہمیں علم ہے مشیر محترم۔“ شنزادی کے چہرے پر شرارت بھری مسکراہٹ

اسی وقت سلطانی مشیر فرمان لے کر آگیا۔ فرمان ایک ریشمی خروار میں بند
تھا۔ مشیر نے اسی طرح فرمان شنزادی کی طرف بڑھا دیا پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔
زردار بیگ شنزادی کے برابر کھڑا ہو گیا اور سعد وقاص نے شنزادی کے اشارہ پر مشیر
کے برابر اپنی جگہ سنبھال لی تھی۔ مشیر نے وقاص کو گھور کر دیکھا۔ وہ سعد سے واقف
نہ تھا۔ اسے شاید ایک اجنبی کی اس وقت موجودگی اچھی نہ لگی۔ وقاص نے اس کی
کوئی پروا نہ کی اور سر جھکائے اطمینان سے بیٹھا رہا۔

شنزادی نے جلدی جلدی فرمان پڑھا اور اس طرح اطمینان کا سانس لیا جسے کوئی
اور محسوس نہ کر سکا۔ کچھ دیر بالکل خاموشی رہی پھر شنزادی نے کہا۔ ”مشر محترم!
آپ نے شاہ دوراں کو کوئی خط لکھا تھا؟“

”جی ہاں! دربار سمرقند کو آپ کے سرحد پر جانے کی اطلاع دی تھی۔“ مشیر نے
اطمینان سے کہا۔

”وہ خط تو آپ نے ہمارے جانے سے پہلے بھیجا تھا۔ اس کے بعد بھی کچھ اور
لکھا تھا؟“ شنزادی نے فوراً ”گرفت کر لی۔“

”کچھ اور نہیں لکھا میں نے۔“ مشیر نے چالاکی دکھائی۔ ”کیا شنزادی کا خیال
ہے کہ میں ان کے خلاف کچھ لکھ سکتا ہوں۔ میں تو جس طرح شاہ دوراں کا نمک
خوار ہوں اسی طرح آپ کا بھی۔ آپ پر میری اولاد قربان۔ وفاداری تو میرے قبیلے کا
طرہ امتیاز ہے۔“

”اور شاید اس لئے آپ نے اپنے بیٹے کو تیز بلوایا ہے۔“ شنزادی غصہ دبانے
ہوئے بولی۔ ”آپ کو تیز میں اکیلے ڈر معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے آپ نے دربار سے
بیٹے کو بھیجنے کی درخواست کی اور شاہ نے درخواست قبول کرتے ہوئے اسے یہاں بھیج
دیا۔“

”شنزادی عالیہ!“ مشیر نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”ایک باپ کو اپنے بیٹے سے جو
محبت ہوتی ہے اس کا اندازہ آپ کو نہیں۔ میری بے چینی فطری تھی شنزادی۔ میرا بیٹا
انشاء اللہ مجھ سے بھی زیادہ آپ کا وفادار ثابت ہو گا۔“

کھینے لگی۔

سلطانی مشیر باہر گیا اور اپنے بیٹے ظل اللہ کو ساتھ لے کر اندر آیا۔ ظل اللہ کو مشیر نے خوف سکھا پڑھا دیا تھا۔ وہ بڑی شان سے داخل ہوا۔ کمر میں ایک طرف تلوار دوسری طرف خنجر۔ پشت پر ترکش کمان ترکش و کمان بازو پر چھوٹی تیوری ڈھال۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میدان جنگ میں جا رہا ہے۔ اس نے ابھی سلام بھی پیش نہ کیا تھا کہ شہزادی نے سلطانی مشیر سے سخت لہجے میں کہا۔ ”محترم! آپ کا بیٹا یہ بھی نہیں جانتا کہ شاہی درباروں میں مسلح ہو کر نہیں جایا کرتے۔ ظل اللہ ہمارے حضور آیا ہے میدان جنگ نہیں جا رہا ہے۔“

مشیر کے پیروں کے نیچے سے جیسے زمین نکل گئی اور ظل اللہ کے قدم سوسو من کے ہو گئے۔ مشیر جھل ہو کر گر گرایا۔ ”سرکار عالی! ظل اللہ ابھی نادان ہے۔ اس کی غلطی معاف فرمائی جائے۔“

ظل اللہ گھبرا کر سلام کے لئے جھک گیا اور اس قدر جھکا کہ اس کا سر زمین سے لگنے لگا۔

”مشیر محترم!“ شہزادی نے پھر اعتراض کیا ”ظل اللہ کو سمجھائے کہ انسان کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔“

ظل اللہ کے رہے سے ہوش بھی جاتے رہے۔ مشیر نے بیٹے کے کان میں کچھ کہا۔ وہ جلدی سے سیدھا ہو گیا۔

”شمیر زنی میں مہارت حاصل کر لی ہے ظل اللہ؟“ شہزادی نے براہ راست ظل اللہ سے سوال کیا۔

”جی ہاں سرکار عالیہ!“ ظل اللہ نے بولنا شروع کر دیا۔ ”ایک دو نہیں چپاول جنگوں میں حصہ لے چکا ہوں۔ دشمن کے سروں کے مینار لگا چکا ہوں۔ جدھر تلوار گھماتا نکل جاتا ہوں دشمن کاٹی کی طرح پھٹ جاتا ہے جھکائی دینا، نیشہ بدلتا، گھوٹا گھماتا۔۔۔۔۔۔“

”بس بس ظل اللہ ہم تمہاری شجاعت کے قائل ہو گئے۔“ شہزادی نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔ ”پھر بھی اگر تم تلوار بازی کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہو تو ہم خوش

ہو گئے۔“

”سرکار عالی! وقت آنے دیجئے۔ میں ثابت کر دوں گا کہ مجھ میں کتنی اہلیت اور ہمت ہے۔“ ظل اللہ نے ڈینگ ہانکنا شروع کر دی۔

”مگر ظل اللہ! ہم تو تمہاری اہلیت اور مہارت اسی وقت دیکھنا چاہتے ہیں؟“ شہزادی نے ظل اللہ کو گھور کے دیکھا۔

”ضرور ضرور۔۔۔۔۔ میں تیار ہوں سرکار عالی۔“ ظل اللہ نے بڑے تکبر سے کہا اور ساتھ ہی تلوار کھینچ لی۔

”تم کس سے لڑنا پسند کرو گے؟“ شہزادی کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔

”جو بھی مجھ سے مقابلہ کرنا چاہے۔“ ظل اللہ نے تلوار لہرائی۔

”زردار بیگ!“ شہزادی نے زردار بیگ کو دیکھا۔ ”وقاص کی تلوار لا کے انہیں دے دو۔“

زردار بیگ تلوار لینے فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ سعد وقاص اپنی جگہ سے اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

”مشیر محترم!“ شہزادی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں وقاص سے آپ کا فائدہ کرا دوں تاکہ آپ کو یہ شکوہ نہ رہے کہ ظل اللہ کسی عام آدمی سے لڑ رہا ہے۔ سعد وقاص ہمارے سرحدی دستوں کے سردار ہیں۔ سرحد پر سکون ہے اس لئے ہم نے انہیں تہیز کا ناظم اور شاہی محلات کا داروغہ مقرر کیا ہے۔“

سلطانی مشیر نے حیرت سے وقاص کو دیکھا پھر شہزادی کو دیکھ کے نظریں جھکا لیں۔ زردار بیگ نے وقاص کو تلوار پہنچا دی۔

”سعد وقاص!“ شہزادی بولی۔ ”ہم ظل اللہ کو کوئی اہم عہدہ دینا چاہتے ہیں۔ تم ان کی تلوار کی کاٹ دیکھو تاکہ ہم اندازہ کر سکیں کہ یہ کس عہدے کے لائق ہیں۔“

کراس بات کا خیال رہے کہ ظل اللہ مشیر کے پیارے بیٹے ہیں اگر انہیں کوئی زخم لیا تو تم سے جواب طلبی ہوگی۔“

”شہزادی عالیہ کے حکم کی پوری تعمیل ہوگی۔“ وقاص شہزادی کا مطلب سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔

شہزادی کو اپنا سر چکراتا محسوس ہوا۔ مگر اس نے فوراً "خود کو سنبھالا۔" خبر

اس اعلان پر سوائے سلطانی مشیر اور ظل اللہ کے اور سب نے خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور اعلان کے مطابق جمعہ کو بعد نماز عصر مسجد وقاص اور شہزادی آغا بیگی کا نکاح پڑھا گیا۔ شہزادی نے سادگی کا حکم دیا تھا اس لئے اس تقریب میں صرف بڑے بڑے سردار اور امیر شریک ہوئے اور دونوں کو مبارک باد دی۔ اس تمام سادگی کے باوجود محل کی کینوؤں اور شہزادی کی بعض سیلیوں نے جملہ عروسی کوشایان شان طریقے سے آراستہ کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ جملہ عروسی بڑی سلیقہ سے آراستہ کیا گیا تھا۔ نرم مسہری پر پھولوں کی دبیز تہ بچھائی گئی تھی۔ مسہری کے گرد

شترادی دو منزلہ اور سہ منزلہ کرتی شکست کھائے ہوئے محاذ پر پہنچ گئی۔ اس
 کے سوار بہت گھبرائے ہوئے تھے اور میدان چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ شترادی
 ٹوٹے کو ایڑ لگاتی اور بھاگتی ہوئی سواروں کے قریب پہنچی اور چیخ کر بولی۔

”تو جاؤ۔ پھولوں کی بیج الٹ دو اور مجلہ عروسی کے پردوں کو اپنے منجر سے چاک کر دو۔“ شزادی شیرنی کی طرح گرجی۔
وقاص خنجر کھینچ کر عروسی کمرے میں داخل ہوا۔ شزادی نے کینزوں کو مخالف

”اسی بزدلی پر صاحبزادے امیر گورگاہ کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ جاؤ اور چوڑیاں پہن کے گھروں میں بیٹھ جاؤ مگر یاد رکھو صاحبزادے کی روح تمہیں کبھی معاف نہ کرے گی میں تمہارا مقابلہ کروں گی۔“

شہزادی کے چند جملوں نے بھاگنے والوں میں نئی روح پھونک دی۔ وہ ایک دم جواں کے ساتھ پلٹے اور دوبارہ صف بندی کی۔ ترکمانوں کا لشکر دشمن کو ملک پہنچنے کی وجہ سے رک کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شہزادی نے فوراً ایک سوار دشمن کے لشکر کی طرف بھیجا اور کہا۔ ”جاؤ اور قرہ یوسف سے کہہ دو کہ خلق اللہ کا خون بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ وہ تمہارا لشکر سے نکلے اور مجھ سے مقابلہ کرے۔ ہم دونوں کا مقابلہ جنگ کا نتیجہ ہو گا۔ جو مارا گیا اس کا لشکر ہتھیار ڈال دے گا۔“

تیوری سوار گھوڑا بڑھاتا ترکمانوں کی صفوں تک پہنچ گیا۔ اس نے شہزادی کا پیغام دہرایا اور قرہ یوسف کو شہزادی سے مبارزت کی دعوت دی۔ قرہ یوسف کا جواں بیٹا یہ پیغام سن کر غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ اس نے گرج کر کہا۔ ”واپس جاؤ اور شہزادی سے کہہ دے کہ قرہ یوسف کا بیٹا اس کے مقابلے پر آ رہا ہے وہ بھی صفوں سے باہر آ جائے“

لیکن ترکمانوں کے دوسرے سوار نہ مانے۔ ایک کزیل جواں جو اپنی بہادری کے لئے پورے ترکمانی علاقے میں مشہور تھا۔ وہ گھوڑا بڑھا کر قرہ یوسف کے بیٹے کے سامنے آ گیا۔ ”ہم جاں نثاروں کے ہوتے ہوئے آپ میدان میں کیوں اتریں۔ اس چزیل کا میں خاتمہ کئے دیتا ہوں۔“

قرہ یوسف کے بیٹے کو اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ تیوری سوار نے واپس جا کر سب کچھ بیان کر دیا۔ شہزادی کو تو اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرنا مقصود تھا۔ وہ تلووار کھینچے۔ گھوڑا چمکاتی دونوں لشکروں کے درمیان پہنچ گئی۔ ”میں شہزادی آغا بیگی بنت صاحبزادے امیر تیمور گورگاہ ہوں اور پورے لشکر کو مقابلے کی دعوت دیتی ہوں۔ جس کا سر شانوں پر بار ہو وہ میرے مقابلے پر نکلے۔“

وہی ترکمان جواں مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا شہزادی پر حملہ آور ہوا۔ شہزادی نے کمال مہارت سے اس کا وار خالی دیا اور اپنی تلووار اس کی پشت میں اند

دی۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہو گیا۔ وقاص کی ڈوبتی نبضیں پھر واپس آ گئیں۔ قرہ یوسف کے بیٹے کو پسینہ آ گیا۔ اس نے فوراً عام حملے کا حکم دے دیا۔ شہزادی کے ہاتھ ہونے لشکر کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ انہیں کمک بھی حاصل ہو گئی تھی۔ پانچ تیوریوں نے اتنا زبردست جوابی حملہ کیا کہ ترکمان لشکر کے قدم اکھڑ گئے۔ قرہ یوسف کا بیٹا تین سو لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ شہزادی کے لشکر نے بگڑوں کا دور دور دور تک پہنچا کیا۔ قرہ یوسف کا بیٹا تو جان بچا کر نکل گیا مگر ترکمانوں کے ہیں بڑے بڑے سردار تیوریوں کے ہاتھوں مارے گئے اور ان کے سر شہزادی کے سامنے پیش کئے گئے۔

شہزادی نے دشمن کے خلاف حیرت انگیز اور شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ اس نے اس فتح کی اطلاع دربار سمرقند بھیجی اور دشمن سرداروں کے سر بھی روانہ کئے۔ قاصد کے فرائض زردار بیگ کے سپرد ہوئے۔ زردار بیگ نے دربار سمرقند میں اس خوبصورتی اور شگفتہ بیانی سے جنگ کی تفصیلات بیان کیں کہ پورا دربار شہزادی آغا بیگی کی جرات اور شجاعت پر عش عش کر اٹھا۔ اس کے بیان میں حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ خود اس جنگ میں شریک نہ ہوا تھا۔

شاہ سمرقند شاہ رخ مرزا شہزادی کی مردانگی اور بہادری سے بے حد خوش ہوا۔ اس نے اپنی خوشنودی کے اظہار کے طور پر شہزادی آغا بیگی کو آغا بیگ کا خطاب عطا کیا۔ اس کے ساتھ شہزادی کو آب زر سے لکھی ہوئی تقریبی سند بھی دی گئی۔ جس کی بٹالی پر یہ شعر لکھا تھا۔

ولو كان النساء بمثل هذا

لفضلت النساء على الرجال

(ترجمہ) ایسی عورتوں کی نظیر موجود نہیں۔ اس عورت کو مرد پر فضیلت حاصل ہے۔

لے میں صرف عبد الملک ہوں۔ اگر تم خلافت کے آداب کو درمیان میں رکھو گے تو
 اللہ ہم بچپن اور آغاز جوانی کا کوئی تذکرہ نہ کر سکیں۔“
 ”امیر المومنین یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ اس خادم کی کتنی ہی قدر دانی کریں
 میں خلیفہ اسلام کے نام لینے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔“
 ”چھا بھئی، تمہاری مرضی۔“ خلیفہ نے اسے منع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ”ہاں تو
 بہت جلد، تمہیں دمشق کی یاد کیسے آئی۔ خیرت تو ہے؟“
 ”میں شرمندہ ہوں امیر المومنین۔ میں نے بڑی تاخیر کی۔ مجھے تو اس وقت حاضر
 رہا چاہئے تھا جب آپ کی خلافت کا اعلان ہوا تھا۔ امید ہے کہ خلیفہ محترم مجھے معاف
 فرمائیں گے۔“

شوخی زبان حمیدہ

”یہ سب احباب اور بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے حارث۔“
 ”امیر المومنین کا انکسار قابل ستائش ہے ورنہ آپ اس مرتبے کے صحیح حقدار
 نہ۔“ حارث کا خلوص بڑھتا جا رہا تھا۔ ”مجھے یاد ہے کہ آپ کو صرف سولہ سال کی عمر
 میں مدینہ کی گورنری پر فائز کیا گیا تھا۔ میں نے دوستوں میں اسی وقت اعلان کر دیا تھا
 کہ مدینہ کا یہ نوجوان والی ایک دن آفتاب بن کر عالم اسلام پر چمکے گا۔“
 ”کون سا زمانہ یاد دلایا تم نے حارث! وہ بھی کیا دن تھے۔ مدینہ میں کیسے پر
 ان دن گزرتے تھے۔ کاش وہ روز و شب پھر واپس آجائیں۔“ خلیفہ کی نظروں میں
 بے کاشتہ گھوم گیا۔

”وہ آپ کی ابتدا تھی۔ ابتدا مبارک ہو تو انتہا بھی خوشگوار ہو جاتی ہے۔“
 خلیفہ عبد الملک نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”نہیں حارث۔ مدینہ کی ولایت اور
 امیر کی خلافت میں بڑا فرق ہے۔ خلافت کا بارگراں مجھے کبھی اپنے ماضی میں جھانکنے
 کی فرصت نہیں دیتا۔ اب تو یہ حال۔۔۔۔۔۔“

عبد الملک اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ قصر خلافت کا محافظ خاص اندر آیا اور ہاتھ
 کے اذن گفتگو کا منتظر تھا۔ خلیفہ کے چہرے پر ناگوار سے اثرات ابھرے۔ ”دیکھا
 نے حارث! تمہارے عبد الملک کو ماضی یاد کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔“ پھر اس نے
 نکلنے کی طرف دیکھا۔ ”کون آیا ہے۔ کہاں قیامت لٹتی ہے؟“

عبد الملک نے بغلیں ہونے کے لئے بازو پھیلائے۔
 حارث بن خالد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہیں یقین نہ آ رہا تھا کہ
 قصر خلافت میں ان کی اس درجہ پذیرائی ہوگی۔ حارث سسے سے آگے بڑھے اور خلیفہ
 وقت کے گلے لگ گئے۔
 ”امیر المومنین! کیا میں اس عزت افزائی کا اہل تھا؟“ حارث بن خالد نے الگ
 ہوتے ہوئے کہا۔

بنی امیہ کا خلیفہ عبد الملک بن مروان مسکرایا۔ ”حارث۔۔۔۔۔۔! دوست نہ امیر
 المومنین ہوتا ہے اور نہ عرب کا کوئی رئیس۔۔۔۔۔۔ دوست صرف دوست ہوتا ہے
 میں اس وقت صرف عبد الملک ہوں اور تم حارث ہو میرے دوست۔“
 حارث کی حیرت بھری آنکھوں سے مسرت کی پھوار پڑنے لگی۔ ”امیر المومنین!
 میں سوچ رہا تھا کہ شاید مجھے قصر خلافت میں باریابی بھی حاصل نہ ہو مگر۔۔۔۔۔۔“
 عبد الملک نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ”حارث میں کہہ چکا ہوں کہ تمہارے

ہم رہ سکیں۔“ عبد الملک نے شاید دل کے پھپھولے پھوڑے۔
حارث نے ہنس کے کہا۔ ”آپ تو اس کام میں ماہر ہیں۔ بچپن میں بھی آپ

نہ لایا کرتے تھے یا پھر حدیث کے درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔“
”یہ ٹھیک ہے حارث! لیکن میں تمہاری شعری محفلوں میں بھی بھرپور حصہ لیتا
عبد الملک نے جان بوجھ کے شعرو ادب کی طرف اشارہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ
ایک اچھا اور فی البدیہہ شعر کہنے والا شاعر مشہور تھا۔

”مگر اب تو آپ شاید شعر سننا بھی ناپسند کرتے ہوں گے؟“ حارث نے ہلکا سا
بل

عبد الملک مسکرایا۔ ”میری بات چھوڑو۔ اپنی سناؤ۔ تم نے کسی شاعرہ سے شادی
دی؟“

”نہیں عبد الملک۔“ حارث بے خیالی میں بالکل بے تکلف ہو گیا۔ ”میں اب
نوارہ کا کنوارا ہوں۔“

”ارے۔۔۔۔۔“ عبد الملک چونک پڑا۔ ”تم اب تک کنوارے ہو۔ میرے
میں تمہاری عمر تیس سال کے قریب ہو گی۔ تم مجھ سے چھ سال چھوٹے ہو۔“

”تمہارا خیال ٹھیک ہے۔“ حارث پر ماضی ایسا طاری ہو گیا تھا کہ وہ بالکل ہی
ایکا تھا کہ اس وقت وہ خلافت بنو امیہ کے امیر المومنین سے باتیں کر رہا ہے۔

”آخر شادی نہ کرنے کی کوئی وجہ؟“

”کیس دل نہیں لگا اب تک۔“ حارث نے ترنگ میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ دل لگا کے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ تمہارے کاروبار کا کیا
ہے پیسے کی پریشانی تو نہیں؟

”بالکل نہیں۔ خدا نے مجھے بہت دولت دی ہے۔“

”تعب ہے کوئی رشتہ اب تک نہیں آیا۔“

”رشتے بہت آئے مگر میں نے پسند نہیں کئے۔ جب تک لڑکی کو شعرو ادب کی

بہ۔ میرا نباہ کس طرح ہو سکتا ہے۔“ حارث نے دل کی بات کہہ دی۔

”اچھا تو کسی شاعرہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

محافظ خلیفہ کے تلخ لہجے سے کانپ اٹھا۔ ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”امیر المومنین! خلیفہ
بن یزید اور عمرو بن سعید قدم بوسی کی اجازت چاہتے ہیں۔“

خلیفہ عبد الملک نے بے بسی سے حارث کو دیکھا۔ ”اب شام تک ذہن کو سکون
نہیں مل سکتا۔ تم مہمان خانے میں ٹھہرو۔ یہیں خود بلوا لوں گا۔“

حارث بن خالد محافظ کے ساتھ باہر چلا گیا۔ پھر خلیفہ نے ملاقاتیوں کو طلب کیا
خالد بن یزید اور عمرو بن سعید امیہ خاندان کے با اثر شہزادے تھے۔ مشہور ہے کہ خلیفہ

عبد الملک کے باپ مروان نے اپنے بعد خالد اور عمرو کو ولی عہد بنانے کے وعدے
حکومت شام حاصل کی تھی لیکن جب مروان ان کا خلافت پر پورا تسلط ہو گیا تو اس نے

عہد شکنی کرتے ہوئے خالد اور عمرو سے اپنے بیٹوں عبد الملک اور عبد العزیز کے حق
میں دستبرداری لکھوا لی۔ اس وقت سے ان شہزادوں کے دل میں عبد الملک کے خلاف

بغض پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب عبد الملک اپنی خلافت کے پہلے سال یعنی ۶۶ ہجری میں
والی قریشیا کی شورش دبانے گیا ہوا تھا تو عمرو بن سعید نے علم بغاوت بلند کر کے دمشق
پر قبضہ کر لیا تھا۔

عبد الملک کو میدان جنگ میں اس کی خبر ملی تو وہ بڑی تیزی سے دمشق واپس
آیا۔ عمرو بن سعید قلعہ بند تھا۔ ایک طویل آگفت و شنید کے بعد عمرو بن سعید نے اس

شرط پر اطاعت قبول کی کہ اسے عبد الملک کا کاتبین مقرر کیا جائے۔ عبد الملک کو اس
وجہ سے عمرو بن سعید سے شدید نفرت تھی مگر اس کی طاقت اور اثر و رسوخ سے

خوف بھی کھاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ کے سخت حکم کے باوجود محافظ نے اندر آکر
عمرو بن سعید اور خالد بن یزید کے آنے کی اطلاع دی اور خلیفہ کو انہیں اندر بلانا پڑا۔

خلیفہ نے ٹھیک کہا تھا۔ دونوں شہزادے گھنٹوں اس کا دماغ چاٹتے رہے اور خلیفہ بڑے
تحمل سے ان کی باتیں سنتا رہا۔ رات کو دونوں دوستوں کی محفل پھر گرم ہوئی۔ حارث

کی گفتگو میں دن کے وقت جو حجاب تھا وہ ختم ہو گیا۔ عبد الملک نے پہلے ہی محفلات کو
خیر باد کہہ دیا تھا۔

”ہاں! اب کو حارث! ان بے وقوف شہزادوں نے میرا دماغ کھا لیا۔ ان کو
نہیں معلوم کہ خلافت صرف وہ شخص کر سکتا ہے جس کے ہاتھ تلوار پر بھی مضبوطی

”ہاں، خیال تو یہی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم لڑکی تلاش کرو۔ تمہاری بارات قصر خلافت سے چڑھے گی۔“
عبد الملک نے دوست کی دلداری کے خیال سے کہا۔
”لڑکی میں نے تلاش کر لی ہے عبد الملک۔ بالکل میرے خیالوں کے مطابق ہے۔“

”اس کے شوخ اشعار تو میرے کانوں تک پہنچے ہیں لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ والدہ کی محسوس کی شریر بیٹی ہے۔“
حارث نے پریشان نظروں سے عبد الملک کو دیکھا۔ ”شریر سے تمہاری کیا مراد عبد الملک؟“
”مجھے تفصیل تو نہیں معلوم۔“ عبد الملک نے بتایا۔ ”یہ ضرور معلوم ہوا ہے

اپنے امیدوار سے شاعری میں مقابلہ کرتی ہے۔“
حارث نے فوراً جواب دیا۔ ”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ شاعر ہر وقت مقابلے کے تیار رہتا ہے۔ میں اس پر ثابت کروں گا کہ میں نہ صرف اس سے بڑا شاعر ہوں بلکہ اس کے ناز اٹھانے کے لئے میرے پاس دولت بھی ہے۔“
”پھر اب تمہیں کس سارے کی ضرورت ہے۔ تمہارے پاس دولت ہے۔ شعر پر تمہیں ناز ہے اور حمیدہ کی یہی دو شرطیں ہیں۔“ عبد الملک نے حارث کو اسی الفاظ سے لاجواب کر دیا۔

حارث کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”عبد الملک کیا تمہیں یقین ہے کہ میں اس معیار پر پورا اتروں گا۔“
”میرے دوست ایک بات کا خیال رکھو۔“ عبد الملک نے متانت سے کہا۔ ”قصر ملک کا مالک سفارش نہیں کرتا بلکہ احکام جاری کرتا ہے۔ تمہارے لئے میں بے لابی برت جاؤں گا مگر اس کا انجام یہ ہو گا کہ تمہاری بیوی سفارش کی آڑ لے کر تمہیں طعنے دے گی یہاں تک کہ تنگ آکر تم اسے طلاق دے دو گے۔“
”مجھے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔“ حارث کی خود داری جیسے عود کر آئی۔
”خود ہی قسمت آزمائی کروں گا اور اگر قسمت سے میں نے حمیدہ حاصل کر لی تو بار پھر دمشق کی سیر کروں گا۔“

عبد الملک اس کے اس عزم اور حوصلے سے بہت خوش ہوا۔ ”مجھے تم سے مل خوش ہوئی حارث کیونکہ تم میں اب تک وہی حوصلہ ہے جس کا اظہار تم بچپن میں کرتے تھے۔ یوں تم مجھے اپنے ساتھ سمجھو۔ اگر کوئی مشکل پیش آئے تو میری مدد لے لیں۔“

حارث نے کہا تو عبد الملک اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔
”لڑکی تلاش کر لی ہے۔ تمہیں پسند بھی ہے۔ تمہارا خاندان امرائے عرب میں سے ہے پھر پریشانی کیا ہے۔ لڑکی یا لڑکی کے باپ نے انکار تو نہیں کر دیا؟“
”ابھی اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس ماہ پیکر کے لئے خلیفہ کی سفارش کی ضرورت ہو گی۔“ اور حارث بن خالد نے اسے پر امید نظروں سے دیکھا۔
”اب سمجھ میں آیا۔ تم بڑے چھپے رستم نکلے۔ اچھا وہ کون بت طراز ہے جو نے میرے دوست کے دل پر قبضہ کیا ہے؟“ عبد الملک کا انداز بھی حد درجہ دوستانہ تھا۔

”وہ دلربا والدہ کی محسوس کی بیٹی ہے عبد الملک۔“
”والدہ کی محسوس۔“ عبد الملک نے ذہن پر زور ڈالا۔ ”تمہارا اشارہ نعمان بن بشیر کی طرف ہے؟“
”ہاں عبد الملک، وہ بنت نعمان ہے۔“
”تم نے اسے دیکھا ہے حارث؟“ عبد الملک نے دریافت کیا۔
”دیکھا نہیں مگر سنا ہے اور بہت سنا ہے۔ اس کی شاعری دنیا کے عرب میں مشہور ہے۔“

”کیا نام ہے اس کا۔ کس نام سے شاعری کرتی ہے؟“ عبد الملک کو تعجب تھا کہ اس نے عرب کی مشہور شاعرہ کا نام کیوں نہیں سنا۔
”حمیدہ ہے نام اس کا۔ نعمان کی یہ خوش شکل بیٹی پورے عرب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔“ حارث نے اپنے تمام جذبات الفاظ میں سمو دیے۔
”حمیدہ۔۔۔۔۔!“ عبد الملک نے سر ہلایا پھر مسکرایا۔ ”حمیدہ کو کون نہیں جانتا

”شکریہ عبد الملک! مجھے اجازت دو۔ میں فوراً“ حمص جانا چاہتا ہوں۔“ حارث جانے کے لئے اٹھا۔

”افوہ۔۔۔۔۔ اس قدر بے قراری۔“ خلیفہ مسکرایا۔ ”کچھ میرا بھی خیال کر حارث! پندرہ سال بعد مجھے ایک سچے دوست کی صورت دکھائی دی ہے۔ تمہیں کم کم ایک ماہ دمشق میں ٹھہرنا ہو گا۔“

”یہ تمہارا حکم ہے عبد الملک؟“

”دوست کو حکم نہیں دیا جاتا۔“ خلیفہ نے نرمی سے جواب دیا۔

”لیکن میں۔۔۔۔۔“ حارث کے دل میں حمیدہ سے ملنے کی خواہش اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ دمشق میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن عبد الملک غلیظ وقت تھا۔ حارث تذبذب میں پڑ گیا۔

عبد الملک نے اس کی بے چینی محسوس کر لی۔ ”حارث پریشان نہ ہو۔ اگر ناگوار نہ ہو تو صرف ایک ہفتہ اور قیام کرو۔ یہ تو میرا حق ہے اس سے تم انکار نہیں کر سکتے۔“

حارث ہنس پڑا۔ ”انکار تو میں امیر المومنین سے بھی نہیں کر سکتا۔ حکم عدولیٰ سزا میں جانتا ہوں۔“



قصر خلافت میں ایک ہفتہ تک کسی ایسے شخص کا قیام کرنا جسے کاروبار سلطنت سے قطعی دلچسپی نہ ہو ایک ایسی عجیب بات تھی جس کی طرف سب ہی متوجہ ہوئے۔ حارث خلیفہ کی خلوت و جلوت میں اس کے ساتھ ہوتا۔ دربار میں اسے امراء کی صف میں جگہ دی جاتی اور خلوت میں حارث اس کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہوتا۔ خلیفہ کی قرب کی وجہ سے سرکار دربار اور تمام محلات والے حارث کی عزت کرتے اور اسے جھک جھک کے سلام پیش کرتے۔ یہاں تک کہ حارث کی ذات دمشق والوں کا سب سے اہم موضوع بن گیا اور ہر جگہ یہ مشہور ہو گیا کہ خلیفہ عبد الملک نے عرب کے ایک رئیس زادے حارث بن خالد کو اپنا مشیر مقرر کیا ہے۔ پھر حارث کی یہ شہرت دمشق

نکل کے دور دور تک پھیل گئی۔

خلیفہ عبد الملک کے لئے مشہور ہے کہ وہ سخت گیر اور ایک مضبوط سیاست دان تھا۔ حارث کو اس نے ایک ہفتے کے لئے دمشق میں اس لئے روکا تھا کہ حارث پندرہ شہرت حاصل کر لے کہ جب وہ حمص پہنچے تو فوراً اس کی شناخت ہو جائے اگر حمیدہ بنت نعمان اس کی دولت اور شاعری سے مرعوب نہ ہو سکے تو خلیفہ وقت دوست ہونے کی وجہ سے حارث کو قبول کر لیا جائے۔ خلیفہ نے حارث کی سفارش کی تھی لیکن جب حارث ایک ہفتے کے بعد دمشق سے حمص کی طرف روانہ ہوا تو خلیفہ عبد الملک کا یار غار مشہور ہو چکا تھا۔

دمشق سے حمص تک حارث نے بڑے شاہانہ انداز سے سفر کیا۔ وہ جس جگہ پر آتا لوگ اسے خلیفہ کا دوست سمجھتے ہوئے سر آنکھوں پر بٹھاتے۔ حارث حدود میں بڑی خاموشی سے داخل ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے آنے کی پہلے سے کوئی خبر ہو اور حمص والے خواجواہ اسے گھیر لیں۔ حارث ایک سرائے میں مقیم ہو باور دو روز تک بازاروں اور قہوہ خانوں میں چکر لگاتا رہا۔ اس سے اس کا مقصد یہ بنت نعمان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ حارث کو یہ سن کر سخت حیرت ہوئی کہ حمیدہ اس قدر ذہین شاعرہ ہے کہ وہ لمحوں میں شعر موزوں کرتی ہے اور اکثر ماکہ طویل گفتگو بھی نظم ہوتی ہے۔ یہاں آکر حارث کو یہ بھی علم ہوا کہ حمیدہ نہ صرف بدیہ گوئی یعنی برجستہ شاعری میں طاق ہے بلکہ وہ ہجو گوئی میں بھی مشاق ہے۔ ایسے خوبصورت انداز میں اپنے مقابل کی مخالفت میں شعر کہتی ہے کہ وہ سخت رنڈہ ہوتا ہے اور اس کے اشعار فوراً لوگوں میں مشہور ہو جاتے ہیں اور اس کے المہ کرنے والے کو میدان چھوڑ کے بھاگنا پڑتا ہے۔

ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد حارث نے دربار حمص کا رخ کیا۔ یہ بل صوبے کا چھوٹا سا دربار تھا مگر دو نیزے باز پہرے پر موجود تھے۔ حارث نے انہیں نام بتا کر والی حمص نعمان بن بشیر سے ملنے کی خواہش کی۔ پیریدار بڑی سختی سے پیش آئے اور اسے اندر نہ جانے دیا۔ حارث نے لاکھ کہا کہ وہ حارث بن خالد ہے اور اس سے ملاقات کے لئے آیا ہے مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ایک پیریدار کو شاید

اس پر رحم آگیا۔ اس نے حارث کو بتایا کہ اگر والی محص سے ملاقات ضروری ہے تو وہ میرنشی کے پاس جائے اور انہیں مطمئن کرے۔ میرنشی کی اجازت کے بغیر والی محص سے ملاقات ناممکن ہے۔

حارث کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے میرنشی کا پتہ پوچھا۔ پیریدار نے سامنے ایک حویلی کی طرف اشارہ کیا۔ حارث وہاں پہنچا۔ میرنشی اور زیادہ شاندار قلعہ اس نے اپنے دفتر پر بھی پہرہ لگا رکھا تھا۔ بڑی مشکل سے حارث کو میرنشی کے دفتر میں داخلہ ملا۔ میرنشی دیر تک حارث کو اس طرح اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا جیسے وہ کوئی مجرم ہو۔

”کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ میرنشی نے بڑے رعب سے پوچھا۔

حارث نے سوچا کہ صاف صاف بتا دے کہ وہ اپنے لئے والی محص کی بیٹی کا رشتہ مانگنے آیا ہے مگر اسے خوف پیدا ہوا کہ کہیں میرنشی اسے ٹال نہ دے اس لئے اس نے بھی بڑے رعب سے کہا۔ ”مجھے والی محص سے ایک ذاتی مسئلے پر بات کرنی ہے۔“

”ذاتی مسئلہ تمہارا یا۔۔۔۔۔؟“

”ہم دونوں کا ہے۔“ حارث نے اپنا لہجہ زیادہ سخت کر لیا۔

”کہاں سے آئے ہو۔ میرا مطلب ہے کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”دمشق۔۔۔۔۔“ حارث کی زبان سے جیسے دمشق کا لفظ پھسل گیا دمشق کے نام

پر میرنشی چونک پڑا۔ لہجہ نرم کر کے بولا۔ ”کیا دربار خلافت سے کچھ تعلق ہے؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ نہیں۔“ حارث گڑبڑا گیا۔ مگر فوراً ”سنہل گیا۔“ دیکھنے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔

میرنشی دمشق کا نام سن کر ہی گھبرا گیا تھا۔ اس نے ایک کانڈ حارث کی طرف بڑھایا۔ ”اس پر اپنا نام پتہ لکھ دیجئے۔ میں اندر بھیج دوں گا۔“

حارث نے کانڈ پر لکھا۔ ”حارث بن خالد۔ دمشق۔“

میرنشی نے اس کا نام پڑھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اس نے حارث کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کانڈ غلام کے حوالے کیا کہ وہ والی محص کے سامنے پیش

کرے۔ میرنشی کا غلام بہت آہستہ آہستہ محل کی طرف جا رہا تھا۔ حارث کو اس پر بڑا نفہ آ رہا تھا۔ اس کی نظروں نے غلام کا والی محص کے محل کی سیڑھیوں تک تعاقب کیا پھر وہ میرنشی کو گھورنے لگا۔ میرنشی کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس نے حارث کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ حارث کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اسے محل صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ والی محص کے محل کی سیڑھیوں پر ہلچل سی ہوئی۔ اس بارہ آدمی بڑی تیزی سے سیڑھیاں اترے اور اسی تیزی سے اس حویلی کی طرف بے جس میں حارث بیٹھا ہوا تھا۔ حارث کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون لوگ ہیں اور دھرم کیوں آ رہے ہیں۔ اس نے میرنشی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کہا۔ ”میرنشی آپ کی حویلی کی طرف بہت سے لوگ آ رہے ہیں۔“

میرنشی نے سر اٹھائے بغیر بے پروائی سے جواب دیا۔ ”یہاں تو صبح سے شام تک میلہ لگا رہتا ہے جناب۔ لوگوں کا کیا۔ وہ تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔“ اتنی دیر میں محل سے آنے والوں کا کردہ حویلی کے قریب پہنچ گیا۔ میرنشی کا پیریدار اسے دیکھ کر بھاگتا ہوا اندر آگیا۔ ”آقا، آقا۔۔۔۔۔ والی محص، والی محص“ پیریدار چیخنے لگا۔

میرنشی کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔ اس نے گھبرا کے پیریدار کو دیکھا۔ اسی وقت ایک بارعب انسان حارث کے ہاتھ کا لکھا ہوا کانڈ پکڑے ہوئے داخل ہوا۔ ”کہاں ہیں حارث بن خالد کدھر ہیں شاہی مہمان؟“

آنے والا محص کا والی نعمان بن بشیر تھا۔ جو حارث کا نام پڑھتے ہی ننگے پیر بھاگتا ہوا میرنشی کے دفتر میں آگیا تھا۔ حارث سمجھ گیا کہ والی محص نے اسے پہچان لیا ہے اور اسے شاہی مہمان تصور کرتے ہوئے استقبال کے لئے اس بدحواسی کے عالم میں آیا ہے۔ حارث نے مسکراتے ہوئے میرنشی کی طرف دیکھا۔ میرنشی کو پسینے چھوٹے ہوئے تھے۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور آواز نہ نکل رہی تھی۔ مگر بار بار انگلی سے حارث کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

حارث نے میرنشی کی مشکل آسان کی۔ ”امیر محترم! میں ہوں حارث بن

حارث اپنی جگہ سے اٹھ کے والی کی طرف بڑھا۔ والی حمص دوڑ کے اس سے بغل گیر ہوا۔

”آپ سیدھے میرے پاس تشریف لاتے۔ آپ کو کون نہیں جانتا۔“ والی نے بڑے عجز سے کہا۔

”میں آپ کے سلام کو گیا تھا لیکن۔۔۔۔۔“ حارث نے خود اپنی بات کاٹی۔ ”خیر چھوڑیے اس بات کو۔ اب میں آپ کے سامنے ہوں۔“

”میرے ساتھ محل تشریف لے چلے عالی مقام حارث بن خالد وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے حمص کے والی نے میرنشی پر نظر ڈالی۔ خوف کی وجہ سے وہ اب تک کانپ رہا تھا۔

حارث اور والی حمص نعمان بن بشیر، میرنشی کے دفتر سے نکل کے باہر آئے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا تھا۔ سب طرف خبر پھیل گئی تھی کہ دربار خلافت سے کوئی ایسی شخصیت آئی ہے جس کے استقبال کے لئے والی حمص ننگے پیر بھاگ کے گیا ہے۔ حمص کے معززین اور تمام بڑے بڑے امراء اور اکابرین بھی میرنشی کے دفتر پر اکٹھا ہو گئے تھے۔ نعمان بن بشیر نے کسی پر توجہ نہ دی۔ باہر آکر اس نے صرف جوتے پہنے جو اس کا غلام محل سے ملے کر آگیا تھا۔

محل میں نعمان نے حارث کو اپنے خاص کمرے میں بٹھایا۔ نعمان کا کمرہ دربار خلافت کی طرح تو سجا ہوا نہ تھا پھر بھی اس میں نوادرات کی کمی نہ تھی۔ اسے بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔ نعمان نے محل پہنچتے ہی حارث کی خاطر و مدرات شروع کر دی۔ طرح طرح کے مشروبات اور خشک میوے اس کے سامنے پیش کئے گئے۔ حارث گھبرا رہا تھا کہ وہ کسی مشکل میں نہ پھنس جائے اس لئے اس نے اپنے مقصد کے اظہار میں جلدی کی۔

”والی محترم! میں دمشق سے ایک خاص مقصد لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔“ حارث نے ابتدا کی۔

”عالی مقام مہمان۔“ نعمان نے اس سے زیادہ انکسار ظاہر کیا۔ ”جلدی کس بات

کی ہے۔ آپ مقصد بھی بیان کریں گے لیکن پہلے مجھے امیر المومنین! خلیفۃ المسلمین کی خیریت تو دریافت کر لینے دیجئے۔ آپ نے تو خلیفہ دمشق کو بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ جہاں تک مجھے علم ہے آپ ان کے حلقہ خاص سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ انام بھی قصر خلافت میں رہتا ہے۔“ والی حمص نے بڑی چالاکی سے اس بات کی مذہق کرنے کی کوشش کی کہ یہ وہی حارث بن خالد ہے جس کا ہر جگہ چرچا ہے یا کوئی اور ہر دیا ہے۔

حارث نے اس کا مقصد بھانپ لیا اور بے تکلفی سے کہا۔ ”یہ سب امیر المومنین کی اعلیٰ طرفی ہے کہ وہ اپنے قدم شاساؤں کی قدر کرتے ہیں۔ میں ہی بد نیت ہوں کہ خلیفہ کے اصرار کے باوجود ہفتے دو ہفتے سے زیادہ ان کے پاس نہیں ٹھہر رہا۔ جہاں تک امیر المومنین کی صحت اور خیریت کا تعلق ہے تو اس کے لئے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی مسکراہٹوں اور دعاؤں کے ساتھ حمص کے لئے نصت کیا تھا۔“

حارث نے دمشق اور دربار خلافت کے حوالے سے نعمان بن بشیر کو اس قدر رعب کیا کہ وہ اس وہم میں پڑ گیا کہ خلیفہ نے اسے معزول کر کے حارث بن خالد کو اس کا والی مقرر کیا ہے۔ اس وہم میں صرف نعمان ہی گرفتار نہ ہوا تھا بلکہ وہ تمام نژدین جو شاہی مہمان کے آنے کی خبر بن کر میرنشی کی حویلی پر پہنچ گئے تھے ان سب میں کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ ان کے اس خیال کو نعمان کے رویے نے بھی تقویت دی۔ نعمان اپنے مہمان کے سامنے اس طرح آنکھیں بچھا رہا تھا کہ سب اس شک میں گئے کہ نعمان کا آفتاب گمنا گیا ہے اور اس کی جگہ دمشق کے نئے مہمان کا تقرر ہوا ہے۔

نعمان بن بشیر خاموشی اور حیرت سے حارث کی باتیں سنتا رہا۔ یہ جھٹکے میں گفتگو رہے تھے۔ لیکن محلات میں خواہ وہ شاہی محلات ہوں یا کسی گورنر اور امیر کے محل وہاں غلاموں اور کنیزوں کی وجہ سے تخلیہ نہیں رہتا۔ غلام اور کنیزیں اپنے آقا، راز جانا اور ان سے فائدہ اٹھانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اس وقت کئی غلام اور کنیزیں لالہ سے کان لگائے اس گفتگو کا ایک ایک لفظ سن رہے تھے۔ نعمان اپنی جگہ

حارث کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ اپنی نظروں میں شرمندہ ہو گیا۔ اس نے لوگوں میں اپنے خیالات کو ترتیب کے دائرے میں پرویا، پھر اطمینان سے کہا۔ ”اے محس کے والی، نعمان بن بشر! میرا خاندان رؤسائے عرب سے تعلق رکھتا ہے۔ میں با عزت اور مشہور تاجر ہوں۔ کچھ چراگاہیں بھی میری ملکیت ہیں اس کے علاوہ۔“

”اس کے علاوہ آپ امیر المومنین کے یار غار بھی ہیں۔“ نعمان بن بشر نے لقمہ دیا۔ ”لیکن اے معزز مہمان میں نے آپ کی خاطر و مدارت میں تو کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ آپ ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ محترم ہیں۔ آپ اپنے بارے میں تفصیلات کیوں بیان فرما رہے ہیں؟“

حارث جھلا اٹھا اور تیز لہجے میں بولا۔ ”یہ سب کچھ اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں خود کو آپ کی فرزندی میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں محترمہ حمیدہ بنت نعمان کے رشتے کی درخواست کرتا ہوں؟“

”زہے نصیب!“ نعمان بن بشر کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ ”مجھے آپ جیسے بارسوخ انسان کو اپنا فرزند بنانے میں یقیناً“ فخر محسوس ہو گا۔“

حارث کی باچھیں کھل گئیں۔ ”کیا میں سمجھوں کہ مجھے والی محس کی فرزندی کا شرف حاصل ہو گیا۔ میری درخواست قبول کر لی گئی۔“

”اے حارث بن خالد! آپ اطمینان رکھئے۔ حمیدہ اس قدر احمق نہیں کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے۔“ نعمان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں اس سے گفتگو کرنے جا رہا ہوں تاکہ وہ اپنے منہ سے اس کی منظوری کا اعلان کرے۔“

”ایک بات کا اور خیال رکھئے گا محترم۔“ حارث نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”میں رئیس ابن رئیس ہونے کے علاوہ ایک تعلیم یافتہ اور بلند پایہ شاعر بھی ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ محترمہ شعر گوئی کے مقابلے کی دعوت دیتی ہیں میں اس مقابلے کے لئے بھی تیار ہوں۔“

نعمان بن بشر سر ہلاتا ہوا محل کے اندر چلا گیا اور حارث واپس آ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

حمیدہ بنت نعمان کی کنیزیں کان لگائے حارث اور نعمان کی باتیں سن رہی تھیں۔

پریشان تھا۔ اس کی ہمت نہ پڑتی کہ وہ حارث سے اس کے آنے کا مقصد دریافت کرے۔ اس کے خیال میں یہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ دوسری طرف حارث اس غلط فہمی کو دور کر کے مطلب کی بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نعمان کو خاموش دیکھا تو اپنی طرف سے بات چھیڑی۔ ”والی محترم! آپ میری خاطر و مدارت کر چکے ہیں۔ میں نے امیر المومنین کی خیریت سے بھی آپ کو آگاہ کر دیا اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے آنے کا مقصد بیان کروں؟“

نعمان بن بشر نے دھڑکتے دل سے حارث کو دیکھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر صرف ہونٹوں پر زبان پھیر سکا۔ حارث کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ نعمان بن بشر نے ایک دم خاموشی کیوں اختیار کر لی۔ ”محترم والی محس۔“ حارث نے تنگ آ کے کہا۔ ”آپ خاموش ہیں پھر میں اپنی درخواست کس کے سامنے پیش کروں؟“

”درخواست!“ نعمان بن بشر نے نظریں اٹھائیں۔ ”شاہی مہمان آپ دربار خلافت سے میرے لئے تو کچھ نہیں لائے۔ میرا مطلب ہے کوئی حکم۔ کوئی فرمان؟“

”نہیں محترم! اطمینان رکھئے۔ میں فرمانوں اور حکموں کے سارے چلنے کا عادی نہیں۔“ حارث نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”میں مقابلے کے لئے بھی تیار ہوں۔“

”مقابلہ۔۔۔۔۔!“ نعمان نے حیرت سے پوچھا۔ ”آپ کس سے مقابلہ کریں گے۔ امیر المومنین کے دوست سے کون مقابلہ کر سکتا ہے۔ کس میں ہمت ہے جو آپ کے مقابلے پر نکلے۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں“ میرا مطلب ہے۔“ حارث کو گمان ہوا کہ شاید اس کے منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہے۔ ”دیکھئے میں خود مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں اگر آپ کی صاحبزادی ارشاد فرمائیں تو میں مقابلے سے بھی انکار نہ کروں گا۔“

حارث نے پہلے کوئی غلط بات نہیں کی تھی لیکن جو اب کہا تھا وہ بالکل بے ربط اور مہمل تھا۔ اس نے نعمان سے اس کی بیٹی حمیدہ کا رشتہ ابھی تک نہ مانگا تھا اور مقابلے کا ذکر لے بیٹھا تھا۔

”معزز مہمان! آپ کی بات میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔ آپ کے تشریف لائے سے میری بیٹی کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟“ نعمان بن بشر نے پریشان ہو کے پوچھا۔

انہوں نے جیسے ہی حارث کے منہ سے حمیدہ کے پیغام کا سنا وہ بھاگتی ہوئی حمیدہ کے پاس پہنچیں۔ ”مبارک ہو۔ شاہی مہمان نے آپ کے لئے پیغام دیا ہے اور آٹائے محترم نے اسے قبول کر لیا ہے۔“ ایک کنیز نے شوخی سے کہا۔

حمیدہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر تیوریوں پر بل ڈال کے بولی۔ ”ابا حضور کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ میری مرضی معلوم کئے بغیر میری قسمت کا فیصلہ کریں؟“

”مگر امیر زادی کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ پیغام اس شخص کا ہے جس کے لئے مشہور ہے کہ وہ امیر المومنین کا گہرا دوست ہے اور وہ قصر خلافت میں قیام کرتا ہے۔“ ایک کنیز نے طنزیہ انداز میں کہا۔

دوسری کنیز نے شاید حمیدہ کو چڑانے کے لئے کہا۔ ”اب دیکھنا ہے کہ امیر زادی اس رشتے کو کس طرح رد کرتی ہیں یا اپنے امیدوار کو اپنے تلخ شعروں سے کیسے ذلیل کرتی ہیں۔۔۔۔۔ شاہی مہمان پر آپ کا کوئی زور نہ چل سکے گا۔“

امیر زادی حمیدہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اس کا باپ نعمان بن بشیر مسکراتا ہوا آ گیا۔ ”بیٹی حمیدہ مبارک ہو۔ آج تمہارا پیغام ایک ایسے شخص نے دیا ہے جو تمہارے معیار پر پورا اترنے کا اہل ہے۔“

”مجھے معلوم ہے ابا حضور! مگر آپ نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔“ حمیدہ نے غصے سے اٹھلا کر کہا۔

”میں نے کیا ظلم کیا ہے بیٹی! تم نے کیا سنا ہے ان کے بارے میں۔“ نعمان بن بشیر گھبرا گیا۔

”آپ نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ رشتہ کیسے منظور کر لیا؟“ حمیدہ کا لہجہ تیز ہو گیا۔

”میں نے کوئی منظوری نہیں دی۔ ہاں اس رشتے کے حق میں ضرور ہوں میں۔“ نعمان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”حارث بن خالد ایک مشہور امیر زادہ ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے خلیفہ عبد الملک کی دوستی کا فخر حاصل ہے۔“

حمیدہ تنک کے بولی۔ ”ابا جان آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ خلیفہ کے فرمان کے

رہے مجھے اپنی لونڈی بنانے آیا ہے۔ کیا خلیفہ کا یہی انصاف ہے؟“

”اس نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی۔“ نعمان نے تردید کی۔ ”حارث نے گفتگو میں خلیفہ یا قصر خلافت کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ اس نے بڑی سادگی سے ہمارے لئے درخواست پیش کی تھی۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ دوسرے امیدواروں کی طرح تم چاہو تو اسے بھی امتحان میں ڈال سکتی ہو۔ اس سلسلے میں یہ امید دور ہے کہ تم اس کی شان میں گستاخی سے گریز کرو گی کیونکہ اس کی خبر خلیفہ تک نہ جاسکتی ہے اور دمشق اور حمص میں جو تعلق ہے اس سے تم واقف ہو۔“

حمیدہ سر جھکا کے کچھ سوچتی رہی، پھر بولی۔ ”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ غلام کرائیے۔“

”یہ ٹھیک ہے حمیدہ“ نعمان نے بیٹی کی تائید کی۔ ”اس طرح تمہیں حارث کو اپنے کاموقع ملے گا اور اپنے مستقبل کا تم خود فیصلہ کر سکو گی۔“

حارث کو مطلع کر دیا گیا کہ حمیدہ بنت نعمان اس سے بالواسطہ اور بلا واسطہ گفتگو رہی گی اور ان کی درخواست کا جواب وہ خود دیں گی۔ حارث کو ایک کمرے میں پہنچایا گیا۔ جس کے درمیان ایک حریری پردہ پڑا ہوا تھا۔ حارث پردے کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ حارث سمجھ گیا کہ اس کمرے میں حمیدہ اپنے امیدواروں سے گفتگو کرتی اور اس امتحان لیتی ہے۔ کچھ دیر بعد حمیدہ کمرے میں آ کر دوسری طرف بیٹھ گئی۔ حارث اور بدہ دونوں آنے سے سانسے بیٹھے تھے مگر پردے کے حائل ہونے سے وہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے تھے۔

پہلے بالواسطہ یعنی کنیز کے ذریعے گفتگو شروع ہوئی۔ کنیز نے حمیدہ کی طرف سے ال کیا۔ ”کیا حارث بن خالد امیر المومنین کے دوست ہیں؟“

”میں اس فخر سے انکار نہیں کرتا۔“ حارث نے جواب دیا۔

”کیا حارث بن خالد اس رشتے کے سلسلے میں امیر المومنین کی سفارش یا فرمان دے ہیں؟“

”جو اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا حارث بن خالد رئیس ابن رئیس ہیں یا انہیں کسی فن میں بھی کچھ دخل ہے؟“

”میں شعر و ادب کا طالب علم بھی ہوں۔“ حارث بن خالد بڑی ذہانت سے کنیز کے ذریعے پیش ہونے والے حمیدہ بنت نعمان کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے۔ وہ جواب کے لئے مختصر سے مختصر الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

اسی وقت حمیدہ بنت نعمان کی مترنم آواز پہلی مرتبہ ابھری۔ حمیدہ کی کنیز پردے کے پاس کھڑی اس کی ترجمانی کر رہی تھی۔ حمیدہ نے کہا۔ ”کنیز تم درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میں خود حارث سے گفتگو کروں گی۔“

حمیدہ کی آواز سے حارث کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں اور دل کے تار مرتلش ہو گئے۔ ”میں حمیدہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے براہ راست گفتگو کا اعزاز بخشا۔“

حمیدہ نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔ ”شعر و ادب کا صرف دعویٰ ہے یا کچھ جاننے بھی ہو؟“

”دعویٰ کرنا کفر کے مترادف ہے۔ ہاں شعر و ادب کا مطالعہ میں نے ضرور کیا ہے۔“ حارث نے سنبھل کے جواب دیا۔

”پھر حارث کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ خطہ نجد کو شعر و ادب سے کیا تعلق ہے؟“ حمیدہ نے پوچھا۔

”نجد شعر و ادب کا گوارہ ہے۔ عربی نے یہیں آنکھ کھولی۔“

”مگر اس کے باوجود نجد نے کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔“ حمیدہ نے حارث کو بھلاوا دیا۔

حارث نے فوراً تردید کی۔ ”حمیدہ کا علم ناقص ہے۔ عربی کا سب سے بڑا شاعر امرؤ القیس اس علاقے کا باشندہ تھا۔“

”لیکن امرؤ القیس تو لکڑہارا تھا۔ اسے شاعری کے لئے وقت کب ملتا ہو گا؟“ حمیدہ نے پھر حارث کو برکانے کی کوشش کی۔

حارث نے پہلی جیسی سختی سے ایک بار پھر حمیدہ کے خیال کو رد کیا۔ ”اگرچہ

لکڑیاں کاٹنا بھی ایک معزز پیشہ ہے لیکن اس پیشے سے امرؤ القیس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ تو ریاست کند کا آخری تاجدار تھا۔“

حمیدہ اس کے جواب سے بہت خوش ہوئی۔ ”حارث! میں تمہاری علیت سے مطمئن ہوں۔ شعر و شاعری کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

”شعر و شاعری ذہنی غذا اور اصلاح معاشرہ کا بہترین ذریعہ ہے۔“ حارث نے زوراً جواب دیا۔

”شعر کتنی دیر بعد موزوں کر سکتے ہو؟“

”ضرورت پڑے تو لمحوں میں شعر موزوں کر لیتا ہوں۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ اتنا دعویٰ ہے تمہیں؟“

”دعویٰ نہیں، صرف اطلاع کے لئے عرض کیا ہے۔“

چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر حمیدہ نے کہا۔ ”ایک شعر موزوں ہوا ہے اس کا ب دو؟“

”فرمائیے حمیدہ!“

حمیدہ نے ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم کچھ اس قسم کا تھا۔

(مطلب) ”دل کی بستی پر بادشاہ کا جاہ و جلال قبضہ نہیں کر سکتا۔ صرف بستی کی ادول پر قبضہ ہو سکتا ہے۔ دیواریں ٹوٹ سکتی ہیں مگر جذبات قابو میں نہیں آسکتے۔“

حارث نے بھی چند لمحوں کے توقف کے بعد حمیدہ کے شعر کا جواب شعر ہی میں

(مطلب) ”وہ نادان ہیں جو دل کی بستی فتح کرنے کے لئے سارے ڈھونڈتے۔“

اس راستے میں طاقت کی بیساکھاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ دل صرف دل سے فتح ہوتا ہے۔“

”سبحان اللہ۔۔۔۔۔“ حمیدہ کے لبوں سے اضطراری کیفیت میں اک دم نکلا۔ پھر

بھل کے بولی۔ ”حارث! مجھ میں ایک عیب ہے، شاید تم اسے پسند نہ کرو۔“

”بے عیب صرف خدا کی ذات ہے۔“

”میں غصے کی حالت میں جھوگوئی پر اتر آتی ہوں پھر میں یہ نہیں دیکھتی کہ کس

کے میدان میں شکست سے دو چار کر دیتی۔ اس کی شاعری کا مقابلہ سوائے چند استادوں کے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

حمیدہ بنت نعمان کا زمانہ اسلام کے تمدن، ثقافت اور تہذیب کے عروج کا دور تھا۔ شعر و شاعری، بذلہ سخن، بدسمہ گوئی اور جھوگوئی کا عام رواج تھا۔ موجودہ زمانہ کی طرح مشاعرہ کی تو کوئی مستقل شکل نہ تھی لیکن دو بدو شاعری کا رواج تھا جس میں دو شاعر آئے سائے بیٹھ کر برجستہ شاعری کرتے تھے۔ ایک شاعر شعر کہتا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی مقابل کا شاعر اسی قافیہ اور ردیف میں اس سے بہتر شعر کہنے کی کوشش کرتا۔ اس مقابلے کے تمام سامعین منصف (جج) ہوتے تھے۔ جس کے اشعار عوام پسند کرتے، وہی کامیاب سمجھا جاتا۔

نعمان بن بشیر اس مقابلے کے انجام کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اسے حارث بن خالد کی شکست کا یقین تھا مگر حارث کا تعلق براہ راست خلیفہ وقت عبدالملک بن مروان سے تھا۔ اس لئے اس شکست سے نعمان کی امارت اور عہدہ بھی متاثر ہو سکتا تھا۔ اسی لئے وہ پریشان تھا اور حارث بن خالد کو مطمئن کرنے کے لئے معذرت کے سینکڑوں الفاظ اور جملوں کی ترتیب میں سرگرواں تھا مگر مقابلہ کا انجام اس کی توقع کے بالکل خلاف نکلا۔

حمیدہ کی کنیز نے نعمان کو اطلاع دی۔ ”آقائے معظم! امیر زادی حمیدہ نے رث بن خالد کو پسند کیا ہے اور وہ آپ کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہیں۔“
نعمان بن بشیر اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ ”کیا۔۔۔ کیا تم سچ کہہ رہی ہو کنیز؟“
”کنیز اپنے آقا کے حضور دروغ گوئی اور غلط بیانی نہیں کر سکتی۔“ کنیز نے سر اٹاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہمیں یقین ہے۔ تم واقعی سچ کہہ رہی ہو۔“ یہ کہتے ہوئے نعمان بن بشیر نے ہلکے گنگے میں پڑا ہوا دو لڑی ہار اتار کے لونڈی کی طرف بڑھایا۔ ”تمہاری زبان مبارک تمہیں اس وقت بھی انعام دیا جائے گا۔ جب ہماری بیٹی حمیدہ کے سر سرا بندھے

لہجوں میں یہ بات پورے محل میں پھیل گئی۔ پھر محل سے نکل کر یہ خبر محض

کے خلاف شعر کہہ رہی ہوں۔ اس سے اس کی کس قدر تذلیل اور تضحیک ہو گی۔“
حمیدہ نے صاف لفظوں میں اپنا عیب بیان کر دیا۔ حمیدہ بنت نعمان کو جھوگوئی میں ملکہ حاصل تھا۔ وہ جس کے خلاف ہو جاتی اس کے بارے میں ایسے ایسے شعر کہتی کہ وہ چیخ اٹھتا اور پھر یہ اشعار لوگوں تک پہنچتے تو اپنی شعریت کی وجہ سے زبان زد خاص و عام ہو جاتے۔ لوگ مزے لے لے کے شعر دوہراتے اور لطف اٹھاتے۔

حمیدہ کے اس عیب سے مقابلہ کرنا بڑا مشکل تھا لیکن حارث سر سے کفن باندھ کر حمیدہ کو حاصل کرنے نکلا تھا۔ اس نے ذرا دیر سوچنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”حمیدہ بنت نعمان کو معلوم ہونا چاہئے کہ حارث بن خالد میں ضبط کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ محبوب کے غصے کے عالم کو شاعروں نے بہت سراہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہر محبوب غصے کے وقت پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس نظارے سے محروم نہیں رہنا چاہتا۔ پھر اگر کبھی صبر کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے تو میں کوئے کھدروں میں منہ نہیں چھپاؤں گا بلکہ جھو کا جواب جھو سے دوں گا۔“
”بس تو پھر ہر بات طے ہو گئی۔“ حمیدہ نے پردے کے پیچھے سے جواب دیا۔
حارث! میں نے تمہیں پسند کیا۔ بشرطیکہ تم بھی مجھے پسند کرو۔“

”میں تمہیں پسند کر کے ہی یہاں آیا ہوں حمیدہ۔“ حارث کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے معیار پر پورا اترتا۔“

والہی محض نعمان بن بشیر اس جھگڑے سے دور تھا۔ حمیدہ نے دنیائے شعرو ادب میں ایسا نام پیدا کیا تھا کہ نعمان بن بشیر اپنی بیٹی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ نعمان نے حمیدہ کو اپنی بیٹی کی پسند کی شادی کی اجازت دے دی تھی۔ وہ حمیدہ کی شوخ طبیعت، زباں درازی اور جھوگوئی کی ڈسے داری نہیں لیتا چاہتا تھا۔ حارث بن خالد چونکہ خلیفہ عبدالملک کا دوست مشہور تھا اس لئے نعمان نے اس کی جھوٹ موٹ تسلی کر دی تھی ورنہ وہ جانتا تھا کہ حارث بن خالد کا بھی وہی انجام ہو گا جو اس سے پہلے آنے والے امیدواروں کا ہوا تھا۔ حمیدہ ہر امیدوار کو مقابلے کی دعوت دیتی۔ پہلے اس کی علییت کا اندازہ لگاتی اور اگر وہ ذرا بھی غلطی کرتا تو اسے ذلیل کر کے محل سے نکلا دیتی اور اگر کوئی سخت جان علییت کے امتحان میں کامیاب ہو جاتا تو حمیدہ اسے شاعری

حادث کچھ دنوں تک حمیدہ کی بے جا تکلمت اور مغرورانہ روش کو انداز
مستقلانہ اور چنچل پن سمجھتے رہے اور اس کی جا اور بے جا ناز نخرے کو ہنس ہنس کے
برداشت کرتے رہے لیکن اسے جلد ہی محسوس ہوا کہ حمیدہ اس کی محبت کی کوئی قدر
نہیں کرتی اور گفتگو کرتے وقت اپنے کو اتنا بلند کر لیتی ہے کہ سامنے والے کو احساس
کمتزی ہونے لگتا ہے۔ پہلے حمیدہ کی باتوں کے دوران اسے باہماری کے سبک جھوٹوں
کا احساس ہوتا تھا مگر اب حمیدہ کی گفتگو میں اس قدر تلخی پیدا ہو گئی تھی کہ جب وہ
حادث سے مخاطب ہوتی تو اسے خطرے کی گھنٹیاں بجتی ہوئی محسوس ہوتیں۔

وقت گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حمیدہ کی گفتار اور کردار میں تلخی بڑھتی
جاری تھی۔ کینزوں اور غلاموں کا کیا ذکر حمیدہ کسی کسی وقت تو حادث کو بھی پھٹکار دیتی
تھی۔ حادث بڑے تحمل کا ثبوت دے رہا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کا رئیس زادہ تھا۔ وہ
نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر کی تلخی پر کوئی باہر والا انگلی اٹھائے مگر بات بگڑتی ہی گئی پھر
اس دن تو حد ہو گئی جب حمیدہ نے حادث کی ہجو میں دو شعر کہے اور رات کے کھانے
پر خود ہی حادث کو سنائے۔ ان شعروں میں حادث کے قبیلے اور خاندان والوں پر شدید
طرز کیا گیا تھا۔

حادث بے قابو ہو گیا۔ ”حمیدہ! تم یہ اشعار پھاڑ کے پھینک دو اور آئندہ اس
طرح کے شعر نہ کہنا۔ یہ توہین میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔“

”کل تم یہ کہو گے کہ میں شاعری کرنا چھوڑ دوں؟“ حمیدہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

”ایسا وقت نہ آئے تو اچھا ہے۔“ حادث نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کی۔

”تم میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھیننا چاہتے ہو حادث؟“

”حمیدہ! مسکرانا اور دوسروں کا مذاق اڑانا دو مختلف جذبے ہیں۔“ حادث نے
صلحانہ انداز اپنایا۔ ”تم نے میرے قبیلے اور اہل قبیلہ کی کھلی ہوئی توہین کی ہے۔ میں
تمہیں اس دفعہ معاف کرتا ہوں۔ آئندہ یہ بات نہ ہونا چاہئے۔“

حمیدہ کے جیسے آگ لگ گئی۔ اکڑ کے بولی۔ ”مجھے تمہاری معافی کی پروا نہیں
اور نہ تمہارا خوف ہے۔ میں شاعرہ ہوں اور ”ہجو گوئی“ شاعری کی ایک ”صنف“ ہے۔
تم مجھے اس سے نہیں روک سکتے۔“

کے قہوہ خانوں کا موضوع بن گئی۔ جس نے سنا حیران رہ گیا۔ محسوس میں کچھ ایسے جوان
عمر شاعر اور اہل قلم بھی تھے جو حمیدہ کی آس لے کر اس کے پاس گئے تھے اور منہ پیٹتے
ہوئے واپس ہوئے تھے۔ انہیں حادث بن خالد پر بڑا رشک آیا۔ بعض حسد سے جل
بھن گئے۔ بہر حال محسوس کا ہر شخص اس خبر سے خوش تھا۔ سب کا یہ خیال تھا کہ حادث
کی چابکدستی نے حمیدہ جیسی منہ زور گھوڑی کو لگام دی ہے۔

والہی محسوس کے محل میں حادث اور حمیدہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔
حادث کے ہمرکاب صرف دو غلام اور کچھ رقم تھی مگر نعمان بن بشیر نے اسے ایک پیہر
بھی خرچ نہ کرنے دیا۔ اس نے دونوں طرف کا خرچ اٹھایا۔ میرمنشی نے اپنی خفت
مٹانے اور حادث کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی بارات اپنے گھر سے
چڑھائی۔ شاہی محل میں بارات کا شاندار استقبال کیا گیا اور شوخ و شک اور اس سے
زیادہ زباں دراز حمیدہ شادی کی زنجیروں میں جکڑ کے حادث کے گھر آ گئی۔ دوسرے دن
حادث نے شاندار ولیمہ کیا پھر دو چار دن میرمنشی کی مہمان نوازی کا لطف اٹھا کے اپنے
وطن مدینہ نئی نوبلی دہلی کے ساتھ روانہ ہوا۔ حادث نے اپنے دوست خلیفہ عبد الملک
کو اپنی شادی کی خبر محسوس کے قیام کے دوران ہی بھیج دی تھی۔

حمیدہ کی شادی کی دھوم مدینہ میں پہلے ہی مچی ہوئی تھی جب وہ رئیس زادی
حادث بن خالد کی دہلی کی حیثیت سے مدینہ پہنچی تو گھر گھر اس کی دعوت ہوئی۔ اہل
علم اور ارباب شعر و ادب نے حمیدہ اور اس کے شوہر حادث کی دلی خلوص سے پذیرائی
کی۔ حمیدہ نے ایک طرف تو اپنے شوہر کو بھرپور پیار دیا اور دوسری طرف اس نے اپنی
پر شباب شاعری سے اہل مدینہ کے دل جیت لئے۔ حمیدہ کی ہر طرف دھوم مچ گئی۔ یکا
وہ وقت تھا جب حمیدہ کے دماغ میں غرور اور نخوت کا شیطان داخل ہوا۔ اس کی
خودداری، خود پرستی اور اتنا غرور میں تبدیل ہو گئی۔ اب اس کے سامنے سوائے ”میں“
کے اور کچھ نہ تھا۔ بے شک وہ ایک پری جمال خاتون تھی۔ اس کے لہراتے بال، نرمی
آنکھیں اور کمان جیسے کھنچے ہوئے ابرو جواب نہ رکھتے تھے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ
ایک بے مثل اور نہایت حاضر جواب شاعرہ تھی۔ حادث بن خالد اسے ٹوٹ کے چاہتے
تھے لیکن حمیدہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔

”حمیدہ! میں بھی شاعر ہوں اور میرے منہ میں بھی زبان ہے۔“ حارث کا دماغ بھی بگڑ گیا۔

حمیدہ نے زہر خند کیا۔ ”تو پھر بسم اللہ کیجئے۔ میں آپ کی جھو لکھوں گی آپ میری جھو کئے۔ اچھا شغل رہے گا۔ ہار جیت کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔“

”تم سمجھتیں کیوں نہیں حمیدہ!“ حارث نے غصے میں بھی سمجھداری کا ثبوت دیا۔ ”اس کا نتیجہ ہم دونوں کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ ہم سب کی نظروں میں ذلیل ہو کے رہ جائیں گے۔ جگ ہنسائی کا موقع نہ دو حمیدہ۔“

حمیدہ کے اشعار پر لوگ جان دیتے تھے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر شعر لحوں میں لوگوں میں مشہور ہو جاتا تھا۔ حمیدہ نے حارث کی جھو میں جو دو شعر کہے تھے وہ کینیڑوں کے ذریعے محل سے باہر پہنچ چکے تھے۔ اس پر جھو گوئی کا جیسے بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس نے حارث کی ناکید اور منع کرنے کے باوجود ایک پوری نظم حارث کی جھو میں کسی اور کینیڑوں کو سنا کر باہر تک پہنچا دی۔ دوسرے دن جب حارث بازار گیا تو شریر جوانوں نے انہیں گھیر لیا اور حمیدہ کی کسی ہوئی نظم اسے لہک لہک کے سنائی۔ حارث شرم سے پانی پانی ہو گیا وہ غصہ میں بھرا ہوا گھر واپس آیا اور آتے ہی حمیدہ پر برس پڑا۔ ”حمیدہ! تم نے مجھے لوگوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے اس قدر رسوا کرو گی۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔ میں انتقام لوں گا۔ زبردست انتقام۔“ حارث غصے میں اور نہ جانے کیا کیا کہ گیا۔

حمیدہ بڑے تسخیر سے اسے دیکھتی رہی جب وہ دل کا غبار نکال چکا تو تنک کے بولی۔ ”حارث! شاعری میرا محبوب مشغلہ ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔ تم جو کرنا چاہتے ہو کر سکتے ہو۔“

”میں بھی تمہاری جھو لکھوں گا تمہیں اسی طرح کوچہ و بازار میں رسوا اور ذلیل کروں گا۔“ حارث نے دھونس دی۔

حمیدہ نے بڑی بے پروائی اور بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ”تم اپنے فعل کے مالک ہو جو چاہے کرو۔“

اور حارث بن خالد نے بڑی محنت سے حمیدہ کے خلاف جھو لکھی۔ اس نے اپنی طرف سے بڑا زور لگایا کہ اس کی جھو حمیدہ کی جھو سے زیادہ مقبول ہو مگر وہ اس میں ہام رہا۔ حمیدہ کی شوخ بندشوں اور طنزیہ اور مزاحیہ ترکیبوں کے سامنے حارث کی طبت اور فنکاری سے بھرپور جھو بے مزہ اور پھس پھسی ثابت ہوئی۔ اس کی جھو شرر میں بھی قبول عام حاصل نہ کر سکی۔ دوسری جانب حمیدہ کی اس جھو نے اتنی شہرت مائل کی کہ اس کے بعض اشعار مدینہ سے دمشق پہنچ گئے۔

ایک دن خلیفہ عبد الملک اپنے احباب سے محو گفتگو تھا کہ ایک صاحب نے کہا۔ ”امیر المومنین! حارث بن خالد کے حالات سے ضرور باخبر ہوں گے؟“

”ہاں! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ اپنی شاعری ہی حمیدہ بنت نعمان کے ساتھ بیٹے میں خوش و خرم زندگی گزار رہا ہے۔“ خلیفہ نے اپنے یار غار کے ذکر پر معقول سا مزہ کیا۔

”امیر المومنین نے درست ارشاد فرمایا۔“ مصاحب نے شاہی وقار برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن آج کل میاں بیوی میں بڑے زور کی چلی ہوئی ہے اور وہ ایک رے کے خلاف بڑی زبردست جھو گوئی کر رہے ہیں۔“

خلیفہ کو قدرے حیرت ہوئی۔ ”یہ خبر تصدیق شدہ ہے تو ہمیں افسوس ہوا۔“ مصاحب نے فوراً حمیدہ کی کسی ہوئی جھو کے دو شعر خلیفہ کے گوش گزار کئے۔ شعروں میں حارث کی ذات اور کردار پر مضحکہ خیز انداز میں کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ خلیفہ کچھ دیر سکوت فرمایا پھر غمگین لہجے میں کہا۔

”ان شوروں کا قول ہے کہ بادشاہ کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے ہر وقت رہنا چاہئے مگر ہمارے خیال میں بد گو شاعر کی صحبت اور جھو گو شاعرہ کی قربت ان مابین سے زیادہ خطرناک ہے۔“

خلیفہ کو حارث کی حالت پر بڑا افسوس ہوا لیکن با اختیار ہونے کے باوجود اس جھگڑے میں وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ میاں بیوی کے جھگڑے سے یوں بھی دور رہنے لڑھ دیا جاتا ہے۔ وہ صبح کو لڑتے ہیں اور شام کو گلے میں بانہیں ڈال کے بیٹھ جاتے اور ان کے معاملات میں دخل دینے والا کو بن جاتا ہے۔ اسے شرمندگی

حمیدہ پر اس طلاق کا مطلق اثر نہ ہوا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے شوہر کی
ت ہی نہیں ہے۔ اب وہ حمص کے محل میں تنہا رہتی۔ اس کی دونوں بہنیں ہند
وہ بیاہ کر اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اس تنہائی سے حمیدہ نے پورا فائدہ اٹھایا
جو کوئی چھوڑ کر اس نے اتنی اعلیٰ درجے کی شاعری کی کہ ہر طرف اس کی دھوم مچ
ا۔ بڑے بڑے شاعر اور باکمال حمیدہ سے ملاقات کی خواہش کرنے لگے مگر وہ حمیدہ کی
جو بیخبریاں کی طرح چلتی تھی، اس سے ڈرتے اور قریب آنے سے گھبراتے تھے۔
حمیدہ نے اپنی تنہائیوں میں ارفع اور اعلیٰ شاعری کے چراغ روشن کر لئے تھے
اس کے دل کے گوشے روشن نہ ہو سکے۔ ہجر و فراق کی اندھیری اداسیوں میں زہر
لگا۔ حمیدہ کی ہنسی ہوئی آنکھوں میں حسرتیں تیرنے لگیں اور حمیدہ کو پھر مضبوط
اس کے لمس کا تصور ستانے لگا۔ حارث کی محبت نہ معلوم کدھر سے اس کے دل
در کر آئی مگر دوسرے ہی لمحے اس کی جھوٹی انا اور خود پرستی راستہ روک کے کھڑی
گئی۔ اس نے سر کو ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ جس حارث کو اس نے کبھی منہ نہ لگایا
اب وہ اس کے سامنے کیوں جھکے۔ پھر اب تو وقت بھی نکل چکا تھا۔ شری
مگی کے بعد وہ حارث سے تعلقات استوار بھی تو نہ کر سکتی۔ تنہا راتیں اس کی
لوں بھری بیچ کو کانٹوں سے بھر دیتی تھیں اور وہ تڑپ تڑپ کر صبح کرتی تھی۔
ایک سال تک تنہائیوں کے کرناک زخم سننے کے بعد اس کی طرف باد بہار کا
ب جھونکا آیا۔ یہ روح بن زباع کا اس کے لئے شادی کا پیغام تھا۔ اس پیغام نے
بدہ کی انگلیوں کی سوکھی کھیتی پر ابر نیساں کا کام کیا۔ نعمان بن بشیر نے پیغام لانے
لے کو حمیدہ کے پاس بھیج دیا۔ حمیدہ کی طلاق کی وجہ سے وہ بھی بدنام ہوا تھا۔ اسے
روقت دربار خلافت کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ حارث خلیفہ وقت کا گہرا دوست
ماور اس کی شکایت پر نعمان کے خلاف کسی وقت کبھی کوئی غیر متوقع قدم اٹھایا جاسکتا
نہ۔

حمیدہ کی کیفیت تھکے ہوئے مسافر جیسی تھی۔ اسے سارے کی ضرورت تھی۔
روح کے پیغام کو اس نے غنیمت جانا اور پیغامبر سے سرسری سی گفتگو کر کے اسے
ایک ہفتہ حمص میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ حمیدہ اس مختصر عرصے میں خود کو تولنا چاہتی

اٹھانا پڑتی ہے۔ عبد الملک بھی حارث کے حق میں سوائے دعا کرنے کے اور کچھ نہ کر
سکا۔ اس طرف حارث کو عبد الملک سے مدد حاصل کرنے میں حجاب مانع تھا۔ حمیدہ کی
ذہنی کیفیت کچھ اس قسم کی تھی کہ اگر خلیفہ کے اثر و رسوخ سے دونوں میں صلح ممکن
ہو بھی جاتی تو وہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی تھی اور حمیدہ کو طعنہ دینے کا ایک نیا حربہ ہاتھ
آ جاتا۔

حمیدہ اور حارث کی ناچاقی بڑھتی رہی۔ حمیدہ بڑی غضب ناک بھوکتی جو فوراً
مشہور ہو کر حارث کی ذلت کا باعث بن جاتی۔ حارث بھی پورے زور بیان سے کام
لیتا۔ علم و فن کے جواہر بکھیرتا لیکن اس کی بھوک کو کامیابی حاصل نہ ہوتی اور اسے روز
ایک نئی ذلت اور مسئلہ کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ سلسلہ آخر کب تک چل سکتا تھا۔ حارث
کی رسوائی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا۔ کہتے ہیں کہ صورت
پیاری نہیں ہوتی۔ کام پیارا ہوتا ہے۔ حمیدہ کی صورت تو پیاری تھی لیکن اس نے اپنا
حرکتوں سے حارث کا ناظرہ بند کر دیا اور آخر حارث نے تنگ آ کر حمیدہ کو اس کے باب
کے پاس بھیج دیا۔ حمیدہ اس قدر بدطینت اور بے لگام تھی کہ اس نے شوہر کی محبت
کوئی پاس نہ کیا اور حمص پہنچ کر بجائے اس کے کہ اپنے فعل پر نادم ہوتی۔ اس
باپ کو حارث کے خلاف لکھی ہوئی ججوں بڑی فخر سے سنائیں۔ غریب باپ مبرا کر۔
رہ گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے حمیدہ کا تاریک مستقبل گھوم گیا۔

حمیدہ حمص پہنچ کر بھی خاموش نہ بیٹھی۔ اس نے وہاں بھی حارث کی طرف
طویل ججوں لکھیں جو نہ صرف حمص میں مشہور ہوئیں بلکہ مدینہ کے قبوہ خاندان
پہنچ گئیں۔ حارث کا خیال تھا کہ شوہر کی جدائی سے حمیدہ کی عقل ٹھکانے آ جائے
مگر اس کی زبان درازی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ادھر حارث کا قبیلہ بہت ناراض ہو
تھا۔ حمیدہ ہر جج میں اس کے قبیلے کی دل بھر کے برائی کرتی تھی۔ قبیلے والوں
حارث پر زور ڈالنا شروع کیا۔ یہ دباؤ بڑھتا رہا۔ حارث خود بھی تنگ آ گیا تھا۔ آخر
نے مہر کی رقم کے ساتھ حمیدہ کو طلاق نامہ بھیج دیا۔ بیٹی کا طلاق نامہ پڑھ کے وہ
حمص نعمان بن بشیر کے دل سے ایک سرد آہ نکلی مگر حمیدہ نے ایک تہقیر لگا کر
نامہ پر تھوک دیا۔

ایہ! ہن بھائی اور تمام قریبی عزیز فردا" فردا" اسے مبارک باد دینے ان سب کو یہ معلوم تھا کہ حمیدہ دنیائے عرب کی ایک مشہور شاعرہ ہے۔ اسے حسن و جمال کی دولت سے بھی نوازا ہے پھر وہ والئی محس کی بیٹی تھی۔ ن زبنا دمشق کی فوج کا ایک مشہور سالار تھا۔ یوں بھی اس کا امراء دمشق ہوتا تھا۔ بنت نعمان اور روح کا برابر کا جوڑ تھا پھر اہل خاندان خوش کیوں نہ

لیکن روح کے دوست متفکر تھے۔ روح کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ وہ صرف سیف ہی نہیں صاحب قلم بھی تھا۔ شاعری بھی کر لیتا تھا۔ گو وہ کوئی بڑا شاعر لرزدہ گو اور اپنے مطلب کے شعر فوراً" موزوں کر لیتا تھا۔ روح کے احباب کو درحادث کی شادی اور اس کے انجام کی ذرا ذرا سی تفصیل معلوم تھی۔ ان کا ناکہ جب خلیفہ کا دوست حادث اس منہ پھٹ شاعرہ پر قابو نہ پاسکا تو بھلا روح پر کس طرح زور چلے گا۔ روح قلم سے زیادہ تلوار چلانے کا عادی تھا۔ دوستوں ناکہ کہیں اس شادی کا انجام کشت و خون تک نہ پہنچے۔

روح کے مخلص دوست نے سمجھایا۔ "روح ابھی حالات تمہارے اختیار میں ت نعمان کے سلسلے میں سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو۔" روح ہنس دیا۔ "فکر کرنے کی ضرورت نہیں دوست۔ میں نے تلوار کی نوک سے بڑے کچ کلاہوں کی گردنیں ختم کر دی ہیں۔" "مگر یہ میدان جنگ نہیں ہے روح! یہاں نوک شمشیر کے بجائے نوک زبان کا ہو گا۔" دوست نے نرمی سے کہا۔ "بنت نعمان کی زباں سیف براں مشہور اس نے اپنی جہو سے حادث بن خالد کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ آخر اسے طلاق امن میں پناہ حاصل کرنا پڑی۔"

روح نے تسخیر سے کہا۔ "حادث بزدل تھا جو میدان چھوڑ گیا۔ روح نے کبھی مک دکھائی پھر وہ عورت سے کس طرح دب سکتا ہے۔ بگڑی گھوڑی کو لگام دینے مک جانتا ہوں۔"

روح نے دوست کی ایک نہ سنی۔ وہ منہ ٹٹکائے چلا گیا۔ روح نے شادی کا

تھی۔۔۔۔۔ اپنی سرشت کا امتحان لینا چاہتی تھی۔ اس نے جھوگوئی اگرچہ ترک کر دی تھی مگر اس موزی مرض کا خطرناک کیزا ابھی اس کے ذہن کے کسی گوشے میں چھپا بیڑا ہوا تھا۔ وہ اس کیزے کو مار ڈالنا چاہتی تھی تاکہ اس کا مستقبل سنور سکے اور وہ دماغ کے ساتھ ایک کامیاب زندگی کا آغاز کرے۔ پورے ہفتے وہ کشمکش میں مبتلا رہی۔ وہ بڑے خلوص سے خود کو "سپردگی" کے لئے تیار کرتی۔ شوہر کی اطاعت اور فرمانبرداری کو تصور میں لاتی اور جب اس میں کامیاب ہو جاتی تو ایک دم اس کی انا بھڑک اٹھتی اور اس کا مغرور سر بلند ہو جاتا۔ حمیدہ آخری وقت تک اسی کشمکش میں مبتلا رہی مگر اس کا ذہن اس وقت بالکل صاف تھا جب اس نے پیغام لانے والے کے سامنے روح کے پیغام کو قبول کر لیا۔

روح بن زبنا کا قاصد اپنے آقا کے لئے مسرت کا پیغام لے کر دمشق واپس آیا۔ "آقا! مبارک ہو۔ بنت نعمان نے رشتہ منظور کر لیا ہے۔" قاصد نے سر جھکا کے عرض کیا۔

روح خوشی سے کھل اٹھا۔ "کیا حمیدہ نے اپنے باپ کے سامنے اس بات کا اقرار کیا ہے؟"

"والئی محس ہماری گفتگو میں شریک نہیں تھے آقا۔"

"پھر تجھے کیسے معلوم ہوا کہ حمیدہ رضامند ہے؟" روح کو الجھن محسوس ہوئی۔

قاصد نے وضاحت کی۔ "آقا! مجھے بنت نعمان نے اپنے حضور طلب کیا تھا۔ وہ بہت دیر تک آپ کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں پھر مجھے جواب کے لئے محس میں ایک ہفتہ قیام کا حکم دیا گیا اور ٹھیک ایک ہفتے بعد بنت نعمان نے مجھے تنہائی میں بلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اسی وقت نعمان بن بشیر کو بلوایا اور ان سے بھی اپنے فیصلے پر مہر تصدیق لگوا لی۔ آقا مجھے محس سے بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا گیا ہے۔"

روح کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ بہت دیر تک حمیدہ کے سوالات اور قاصد کے جوابات کو کرید کرید کر پوچھتا رہا۔ اسے کوئی ایسی بات محسوس نہ ہوئی جس سے انکار کا ذرا بھی پہلو نکلتا ہو۔ یہ بات روح کی حویلی میں پھیلی تو مبارک باد دینے والوں کا تہنا

کہہ سکتے ہوئے خلیفہ نے منہ پھیر لیا جو اس بات کی علامت تھا کہ وہ اس سلسلے میں متفقہ پسند نہیں کرتا۔ وزیر کا خیال تھا کہ وہ ایک فوجی ملازم کے غلط اقدام کی کو اطلاع دے کر اس کی خوشنودی حاصل کرے گا مگر بات بالکل الٹی ہو گئی۔ خوش ہونے کے بجائے بے کیف ہو گیا اور وزیر سلطنت چپ چاپ واپس آ گیا۔ روح بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر محض گیا۔ حمیدہ نے حارث کو جلائے لئے دوسری شادی میں خود دلچسپی لی اور مہمانوں کی اس قدر خاطر و مدارت کی کہ ان کے دلے دنگ رہ گئے۔ روح کے ساتھ فوجی اور غیر فوجی ارکان دولت کے علاوہ ائے دمشق کی کثیر تعداد تھی۔ نعمان بن بشیر نے باراتیوں کی شایان شان مہمان دہی کا فرض ادا کیا اور حمیدہ کو شہزادیوں کی طرح رخصت کیا۔ حمیدہ کی تنہائیوں کا داہو گیا اور وہ خوشی خوشی رخصت ہو کر دمشق پہنچ گئی۔ دمشق کی عورتوں نے جب ب اٹھا کر حمیدہ کا چہرہ دیکھا تو ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ وہ کی دوسری شادی ہے مگر حمیدہ تو کھلتا ہوا گلاب اور دکتا ہوا ماہتاب تھی۔ جس نے دیکھا وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ پورے شہر میں حمیدہ کی خوبصورتی کی شہرت ہو گئی۔

شادی کے چند ماہ بڑے سکون سے گزرے۔ روح، حمیدہ پر جان چھڑکتا اور حمیدہ اس کی دل جوئی میں لگی رہتی تھی۔ حمیدہ کے بے پناہ حسن نے روح کو بوکھلا کر رکھ لیا۔ کبھی کبھی عورت کا حسن اس کے اور اس کے متعلقین کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔ روح کو حمیدہ سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی مگر اس کی بڑھتی ہوئی خوبصورتی نے روح کو شکی بنا دیا تھا۔ وہ گھر میں ہر آنے والے کو شک کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ غلاموں کو اس نے زنا خانے میں آنے سے بالکل روک دیا تھا۔ جس کنیز پر اسے برا بھی شبہ ہوتا اسے فوراً نکال دیتا۔ اس طرح روح کا خوبصورت اور سجا ہوا مکان کچھ عرصہ بعد سونے کا پتھر بن کر رہ گیا۔ حمیدہ کو محسوس ہونے لگا کہ روح نے اسے نذر کر دیا ہے۔ وہ جب بھی روح سے شکوہ کرتی، روح بڑی خوبصورتی سے ہنس کے ٹال جاتا۔

پھر ایک دن حمیدہ اس کے سر ہو گئی۔ ”روح! تم نے مجھے قید کر دیا ہے۔“

اعلان کر دیا اور زور و شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دوستوں نے نصیحت سے ہاتھ کھینچ لیا اور انتظام میں مصروف ہو گئے۔

اسی دوران یہ خبر دربار خلافت تک پہنچ گئی۔ خلیفہ عبد الملک نے ا حریف عمرو بن سعید سے نجات حاصل کر لی تھی اور اب وہ مسرور نظر آتا تھا۔ سلطنت نے ایک دن خلیفہ کو خوش دیکھ کے عرض کیا۔ ”امیر المومنین کا سالار بن زنباع شادی کر رہا ہے۔“

خلیفہ عبد الملک بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ ہنس کے بولا۔ ”تمہیں رشک پیدا ہوا۔ وہ ایک کر رہا ہے تم دو کر لو۔ اس پر بھی صبر نہ آئے تو چار کر ہو۔“

وزیر کھسیانا ہو گیا۔ ”امیر المومنین! غلام یہ کہنا چاہتا ہے کہ روح بنت نم سے شادی کر رہا ہے۔“

عبد الملک، اشارہ نہ سمجھ سکا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو تم۔ تمہارا اس سے کیا تہ ہے؟“

وزیر نے سنبھل کے کہا۔ ”امیر المومنین، حمیدہ بنت نعمان سے واقف ہر والی محض کی اس زباں دراز بیٹی نے اپنے پہلے شوہر حارث بن خالد کی اس قدر جھو لکھیں کہ وہ غریب تنگ آ کر ہمیشہ کے لئے اس سے دستبردار ہو گیا۔ روح، سالار اور ارکان دولت امیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا انجام بھی حارث سے مختلف نہ گا۔“

”اچھا تو روح، حمیدہ سے شادی کر رہا ہے۔“ پھر ایک لمحہ خاموش رہنے کے ل کہا۔ ”کیا روح کو علم ہے کہ حمیدہ ایک بے مثل شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی بے مثال جھو گو بھی ہے؟“

”جی، امیر المومنین! روح کو سب کچھ معلوم ہے پھر بھی وہ اس جہنم میں کد ہے۔ اس سے۔۔۔۔۔“

”جہنم میں کودنے والے کو کون روک سکتا ہے؟“ عبد الملک نے وزیر کو ڈکا ”روح سالار فوج ہے۔ ہمارا تعلق اس کے فن سپہ گری سے ہے۔ یہ اس کا ڈاڈا“

ہو گئی۔

بظاہر زیادتی روح کی تھی اس لئے تمام کنیزیں اور غلام، حمیدہ ہی کا ساتھ دیتے اور اسے روح کے خلاف بھڑکاتے بھی تھے۔ اس تو تو میں میں نے دونوں کے ہاں ایک خلیج سی پیدا کر دی جو وقت کے ساتھ بڑھنے لگی۔ جب دونوں میں چھڑتی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا اور خوب ترکی بہ ترکی سوال و جواب ہوتے مگر اب نہ تو حمیدہ نے زبان کی تلوار بلند کی تھی اور نہ روح نے گالی گلوچ کا سلسلہ دیا کیا تھا۔ دن بھر دونوں طرف سے طر کے تیر چلتے اور شام ہوتے ہی وہ گلے لگنے لگے۔ ایک ساتھ کھانا کھایا جاتا اور وہ اچھے میاں بیوی کی طرح رات گزارتے تھے۔ پھر ایک دن حمیدہ کی بد قسمتی سے یا پھر حمیدہ اور روح دونوں کی بد قسمتی سے روح کے بھانجے کی سالگرہ کی تقریب ہوئی۔ روح کی بہن کا گھر چھوٹا تھا اس لئے حمیدہ اجازت سے تقریب کا اہتمام روح کی حویلی میں کیا گیا۔ اس تقریب میں روح کے نزدیک کے سب ہی عزیزوں کو مدعو کیا گیا۔ روح کا تعلق قبیلہ بنی جزام سے تھا۔ اٹھان کے تین بڑے قبیلے حمیر، کملان اور ازد ہیں۔ حمیر کی تین شاخیں تھناہ، ناک اور زید الجہور تھیں۔ شاہ ذوالقرنین جو عوام میں سکندر کے نام سے مشہور ہے اسی حمیری خاندان کا ایک مشہور بادشاہ تھا۔ اسی طرح کملان کی سات شاخیں یعنی ران، انمار، طے، منج، لحم، کندہ اور جزائم تھیں۔ کندہ کا مشہور بادشاہ امرؤ القیس عربی کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا گیا ہے جب اس کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو قبیلہ زام نے اس کی جانشینی کا دعویٰ کیا۔ اس وقت جزام قبیلہ کے عرب اپنے کو بادشاہ زادہ کہتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

روح چونکہ جزام قبیلہ کا فرد تھا اس لئے یمن کے بڑے بڑے بادشاہ زادے اس کی تقریب میں آئے تھے۔ جس وقت یمن کے یہ بادشاہ زادے محفل میں آنا شروع ہوئے تو حمیدہ نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر ناک جھانک شروع کر دی۔ حمیدہ میں یہ بدی عادت روح کی سخت گیری اور بے جا پابندیوں کی وجہ سے پڑ گئی تھی۔ روح اسے غیر مردوں کی نظروں سے بچانے کی جس قدر زیادہ کوشش کرتا اسی قدر حمیدہ میں مردوں کی صورت دیکھنے کی خواہش میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر یہ اس کی عادت سی بن

”توبہ کمو حمیدہ! تم تو میرے دل کی ملکہ ہو۔“ روح نے بڑے پیار سے کہا۔
”پھر یہ سب کیا ہے۔ غلام اندر نہیں آ سکتا۔ روز ایک کنیز بدل دی ہے۔“

”میں تمہارا شوہر ہوں حمیدہ! کیا تم یہ حق مجھے نہیں دیتیں کہ میں تمہاری تمہارے حسن کی حفاظت کروں؟“ روح کا سوال اب بھی محبت سے پر تھا۔
”تم ایک محبت کرنے والے شوہر ہو۔ تمہیں مجھ پر ہر قسم کا حق اور اقتدار حاصل ہے۔ میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں لیکن تم میری حفاظت میں غیر معمولی احتیاط کیوں کرتے ہو۔ میں خود بھی اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ میں بچہ نہیں۔ تم میرے لئے اس قدر فکر مند نہ ہونا چاہئے۔“ حمیدہ نے اس کی محبت کا جواب مجھ سے دیا مگر گفتگو میں شکوے کا انداز برقرار رکھا۔

روح اپنی شکی طبیعت سے مجبور تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا کروں حمیدہ! مجھے تو بھی گوارہ نہیں کہ چاند یا سورج کی کرنیں بھی تمہارا چہرہ دیکھیں۔ ہوا کے جھوکور سے مجھے رقابت کی بو آتی ہے۔“

حمیدہ اس قسم کی بے نیکی باتوں کی عادی نہ تھی۔ اس کی نازک اور نفیس طبیعت پر روح کی بازاری سی گفتگو بہت گراں گزری۔ اس نے ترشی سے کہا۔ ”اگر مجھے سب کی نظروں سے بچانا ہے تو ذبیہ میں بند کر کے گلے میں لٹکا لو پھر کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔“

حمیدہ کی تلخی کا یہ پہلا دن تھا۔ یہ نہیں کہ اسے روح سے محبت نہیں تھی۔ وہ روح پر جاں نثار کرتی تھی مگر اس کی بے جا پابندیاں حمیدہ کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ یہاں نہ بیٹھو۔ اس جگہ مت کھڑی ہو۔ ادھر مت دیکھو۔ روح بات بات پر نوکا چوکی کرتا اور حمیدہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتی۔ رفتہ رفتہ حمیدہ کے دل میں روح کی طرف سے ایک گرہ سی پڑ گئی اور دل میں مچلتا لاوا بغاوت بن کے اس کے لبوں پر آ گیا۔ حمیدہ کے لب ایک بار کھلے تو پھر کھلتے ہی چلے گئے۔ پہلے اس نے روح کو نرمی سے جواب دیئے مگر جب روح کے لہجے میں سختی آئی تو حمیدہ بھی پتھر کی طرح

گئی۔

روح مہمان نوازی میں مصروف تھا لیکن اس کا شکی ذہن تمام تر حمیدہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ حمیدہ اس کی طرف سے بے پرواہ ہو کر ایک کھڑکی سے مہمانوں کو گزر جاتے دیکھ رہی تھی اور کینزوں سے ہنس ہنس کے ان پر تبصرہ کر رہی تھی۔ اچانک روح کی نظر اس پر پڑی مگنی اور اس کے ساتھ ہی وہ جذبات رقابت سے جل اٹھا۔ تیزی سے کمرے میں آیا اور غصے سے کھلی ہوئی کھڑکی کو بند کر دیا۔

حمیدہ کو اس کا یہ رویہ سخت ناگوار گزرا۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”روح! کیا حماقت ہے۔ آخر تم کیا چاہتے ہو؟“

روح پہلے ہی بھرا ہوا تھا اس نے چیخ کے کہا۔ ”تمہیں معلوم ہے میرے قبیلہ جزام کے تمام بڑے بڑے سردار اس محفل میں موجود ہیں۔ انہیں جھانکتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟“

روح کے اس اظہار سے حمیدہ کی فطری شوخی عود کر آئی۔ اور رگ ظرافت پھڑک اٹھی۔ اس نے بڑے تمسخر سے کہا۔ ”اے قبیلہ جزام کے میرے شوہر نامدار! جب مجھے تم سے جائز تعلق رکھنا دل سے گوارہ نہیں تو پھر تمہارے قبیلہ جزام کے کسی دوسرے فرد سے ناجائز تعلق کس طرح گوارہ کر سکتی ہوں۔“

حمیدہ کے اس بر محل اور سخت جواب سے روح ہکا بکا رہ گیا۔ حمیدہ نے کینزوں کی موجودگی میں اسے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔ روح کو کوئی جواب نہ سوجھا اور وہ خوار کے گھونٹ پیتا واپس چلا گیا مگر اس دن سے دونوں کے درمیان کی خلیج ناقابل عبور ہو گئی۔ روح نے اس سے بات کرنا تک چھوڑ دی اور دوسرے کمرے میں سوئے لگا۔ حمیدہ انتظار کرتی رہی کہ شاید روح کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ پھر پہلے ہی کی طرح زندگی گزارنے لگیں لیکن روح نے اپنا رویہ سخت کر لیا اور اس کی طرف بالکل توجہ نہ دی۔

حمیدہ ایک بار پھر تنہا رہ گئی۔ اس کی اداسیاں لوٹ آئیں۔ اس نے اپنے وقار سے گر کر بھی مصالحت کی کوشش کی لیکن روح کا دل صاف نہ ہوا اور کھنچاؤ بڑھتا ہی گیا۔ حمیدہ دل برداشتہ ہو گئی اور اس میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس نے زندگی

لی آستانوں کے لئے شعر و شاعری کو خیر باد کہہ دیا تھا لیکن اس کی یہ قربانی کام نہ آئی اور پھر ایک دن اس نے قلم کی تلوار سنبھال لی۔ قلم کا اس کے ہاتھ میں آنا تھا کہ ناگہان ہاتھ باندھ کے اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ حمیدہ نے روح کی ہجو میں دو شعر لے اور صبح کو جب وہ باہر جانے لگا تو حمیدہ نے اسے روک کر وہ شعر اس کو سنائے۔ روح کا خون کھول کے رہ گیا۔ وہ باہر چلا گیا لیکن اس کے پیچھے پیچھے حمیدہ کے دونوں درہمی بازار میں پہنچ گئے۔ لوگوں کو تو مشغلہ چاہئے وہ حمیدہ کے شعر لے اڑے۔ پھر رے شہر کو معلوم ہو گیا کہ حمیدہ بنت نعمان دمشق میں موجود ہے اور وہی آبدار ہجو رہ رہی ہے جس نے حارث کو ناکوں پنے چبوا دیئے تھے۔

روح بھی ذی شعور اور پڑھا لکھا انسان تھا۔ شعر کہتا وہ بھی جانتا تھا چنانچہ اس نے اپنی ہجو کے جواب میں حمیدہ کے خلاف دو شعر کہے اور اس میں حمیدہ سے بی زیادہ زہر اگلا اور کچڑا اچھالا۔ روح نے ان شعروں کو کئی بار پڑھا۔ پرکھا اور نہ چھانٹ کی جب پوری طرح مطمئن ہو گیا تو اس نے حمیدہ کو آواز دی۔ حمیدہ اس آواز پر چونک پڑی اور سوالیہ نظروں سے اپنی کینز کو دیکھا۔

”آقا! آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔“ کینز نے تصدیق کی۔ حمیدہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی روح کے قریب پہنچی۔ ”مجھے یوں محسوس ہوا ہے تم نے مجھے آواز دی ہے۔“ حمیدہ نے بڑے غور سے کہا۔

”ہاں! میں نے آواز دی ہے۔“

”مگر تم تو بات کرنا بھول گئے تھے؟“

”میرے منہ میں بھی زبان ہے حمیدہ۔“ روح نے اسے گھورا۔

حمیدہ مسکرائی۔ ”چلو یہ اچھا ہوا۔ پندرہ دن سے تمہاری زبان پر جو تالے پڑے ان میرے دو شعروں نے کھول دیا۔ تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہئے۔“

”تمہیں بھی میرا شکر گزار ہونا چاہئے کیونکہ جن غلیظ الفاظ میں تم نے میری برے قبیلے کی ہجو کہی تھی۔ انہی الفاظ میں میں نے تمہاری تعریف کی ہے۔“ روح جل کے کہا۔

”اچھا تو تم نے ہجو لکھی ہے؟“

شعر کا لفظ لفظ نثر تھا جو حمیدہ کے جگر میں اترتا چلا گیا۔ ایک تو گرا طنز پھر زہر میں
بے ہوئے الفاظ۔ خوبصورت بندش نے شعر کو آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ حمیدہ کو روح
ایسی شعری بلاغت کی امید نہ تھی۔ حمیدہ پر اس کا دوہرا اثر ہوا۔ بھوکے مضمون
اس کا سینہ چھلنی ہو گیا۔ دوسری طرف وہ روح کی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیت کی قائل
مگر وہ کب ماننے والی تھی۔ سمجھدار اور تربیت یافتہ کینز تھرتھراتے لبوں سے
ان کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ حمیدہ کم از کم شعری شاعرانہ خوبی کی ضرور
لاف کرے گی لیکن حمیدہ خاموش بیٹھی رہی۔

روح کچھ دیر تک حمیدہ کے تبصرے اور تنقید کا انتظار کرتا رہا پھر بولا۔ ”کیا
ہاں ہے دوسرا شعر عرض کرو؟“

”پڑھو۔“ حمیدہ نے جلتے بھنے لہجے میں کہا۔

روح نے دوسرا شعر سنایا۔ یہ شعر پہلے سے زیادہ وزنی اور بلند تھا۔ کینز تڑپ
میں مگر تعریف نہ کر سکیں۔ حمیدہ کے سینے میں آگ لگی تھی۔ خون کی گردش تیز ہو
اگر لب بند تھے اور سکتہ سا طاری تھا۔

”اب کیا خیال ہے؟“ روح مسکرایا۔

”کس کے بارے میں؟“

”شعر اور شاعر کے بارے میں۔“

”جیسے تم گندے ہو ویسی ہی گندی بھوکھی ہے۔“

”میں زبان بند رکھ سکتا ہوں۔ یہ اشعار بھی حویلی کی دیواروں کے باہر نہیں جا
سکتے۔ بشرطیکہ تم بھی اپنی زبان بند کرلو۔“ روح نے مخلصانہ پیش کش کی۔

”ان کمزور اور پھس پھسے شعروں سے میرا کچھ نہ بگڑے گا جو سننے کا تم پر
کے گا۔“ حمیدہ نے پیش کش رد کردی اور الٹی اسے دھونس دی۔

”کوئی بات نہیں۔ میں انہیں عوام کی عدالت میں پیش کروں گا۔“

☆☆☆

روح کو کوئی کوشش نہ کرنا پڑی۔ اس کے دونوں اشعار کینزوں کے منہ سے

”ہاں لکھی ہے اور ڈنکے کی چوٹ پر لکھی ہے۔“

”تو پھر جاؤ۔ لوگوں کو سناؤ اور مجھے ذلیل کرو۔“

”پہلے تمہیں سناؤں گا۔“

”میرے منہ سے تعریف سننا چاہتے ہو؟“

”ہرگز نہیں۔ بھوکے ڈنک مارتا ہے۔ تم نے آج تک کسی کی تعریف نہیں

کی بلکہ ہر ایک کی پڑی اچھالی ہے۔“ روح نے وہ کانڈ کا پرزہ جیب سے نکال لیا جس
پر اس نے بھوکے دونوں شعر لکھے تھے۔

”پھر مجھے سنانے پر کیوں بند ہو؟“ حمیدہ کا انداز تحقیر آمیز تھا۔

روح نے زہریلی مسکراہٹ کے درمیان کہا۔ ”میں تمہارے چہرے پر وہ کرب

دیکھنا چاہتا ہوں جس کرب میں میں اس وقت مبتلا ہوتا ہوں جب بازاری لڑکے

تمہارے کہے ہوئے بھوکے اشعار مجھے سناتے ہیں۔“

”تم یہ تمنا ضرور پوری کرو۔ میں تمہارے شعروں کی تعریف بھی کروں گی

کیونکہ تم نے میرے خلاف جو شعر کہے ہیں وہ یقیناً ”بودے اور پھس پھسے ہوں گے۔“

ان کی کوئی تعریف نہیں کرے گا۔“

”خیر یہ تو اس وقت پتہ چلے گا جب یہ بھوکے دمشق کے کوہوں میں پہنچے گی۔“

”تمہیں بھی سناؤں؟“ روح نے بھی یوں کا جیسے اسے دھمکی دے رہا ہو۔

”ٹھہرو، پہلے میں کینزوں کو آواز دے لوں تاکہ تمہیں یہ افسوس نہ رہے کہ

تمہاری لکھی ہوئی بھوکے صرف میں نے سنی ہے۔ تم چاہو تو غلاموں کو بھی جمع کر سکتے

ہو۔“

روح نے کوئی جواب نہ دیا۔ حمیدہ نے حویلی کی تمام کینزوں کو وہیں بلا لیا۔

روح نفرت کی اس حد میں داخل ہو گیا تھا جہاں اسے یہ خیال نہ آیا کہ کینزوں کے

سامنے وہ جس ہستی کی بھوکے بنا رہا ہے وہ اب تک اس کی بیوی ہے اور بیوی کی ذلت

شوہر کی ذلت بھی ہوتی ہے۔

کینزیں گوش بر آواز ہو گئیں اور حمیدہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ روح نے

کا پہلا شعر پڑھا۔ کینزیں دم بخود رہ گئیں اور حمیدہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ دہا

شام کو روح واپس آ رہا تھا کہ بازار میں گھر گیا۔ لوگوں نے اس کی جھوٹا
 باغ کر دی۔ خوب پھتیاں کسی گئیں اسی پر۔ بہت مذاق اڑایا گیا اس کا۔ روح کے
 لٹاڑ گئے۔ منہ چھپاتا۔ نظریں بچاتا بڑی مشکل سے گھر پہنچا حمیدہ نے اس کی
 لٹاڑ دیکھتے ہی پہچان لیا کہ روح پر پھنکار پڑ چکی ہے اور یہ جھوٹا اس کے آ رہا ہے۔
 حمیدہ نے بڑھ کے استقبال کیا۔ ”خیریت تو ہے۔ جناب کی رنگت کیوں پیلی ہو
 ہے؟“

روح نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا۔ ”تم نے پھر بے ہودگی شروع کر

”خاموش رہتے رہتے منہ کا زائقہ کیلا ہو گیا تھا۔“ حمیدہ ہنسنے لگی۔
 ”آغاز تم نے کیا ہے۔ پھر شکوہ نہ کرنا؟“ روح نے اپنا رعب برقرار رکھتے
 معاملہ سلجھانے کی کوشش کی۔

”میدان میں اترنے والے پیٹھ نہیں دکھاتے۔“ حمیدہ نے آگ اور بھڑکائی۔
 ”ابھی سردار ہو۔ کمر میں تلوار ہاتھ میں نیزہ گھبراتے کیوں ہو؟“

”ٹھیک ہے۔ پھر دیکھو تلوار کے جوہر۔“ روح نے چیلنج قبول کر لیا۔ ”مجھے اپنی
 باہوئی جھو کی نقل دو تا کہ پورا پورا جواب دیا جائے اور تمہیں تشنگی محسوس نہ

حمیدہ آخر عورت تھی۔ وہ ہتھکڑی کے رہ گئی۔

روح نے حمیدہ کی لکھی جھو کو سامنے رکھ کر اس کا جواب لکھا اور لا جواب
 لکھا۔ جھو کوئی شاعری کی کوئی مستقل صنف نہیں اور نہ اسے دنیا کے شعریں کوئی مقام
 مل ہے مگر روح نے اس میں بھی فصاحت و بلاغت کے ایسے دریا بہائے کہ لوگ
 مائش کر اٹھے۔ روح کی جھو حمیدہ کی جھو سے کسی طرح کمتر نہیں تھی بلکہ بعض
 بار سے وہ زیادہ پر معنی اور تلخی اور تیزی میں حمیدہ کی جھو سے بلند تھی۔ روح کا
 مغللوں میں چرچا ہونے لگا۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگ روح کی کسی جھو کی تعریف اس
 کرتے ہوں کہ یہ آگ بھڑکتی رہے اور وہ اس جلتے گھر کی آگ سے ہاتھ سینکتے
 لہ۔ پھر تو ہر دوسرے ہفتے حمیدہ کی ایک نئی جھو عوام تک پہنچتی اور اس کی بازگشت

اڑے سر سے بلند ہوئے اور دمشق کے کوچہ و بازار میں پھیل گئے۔ جس نے نئے
 تعریف کی۔ حمیدہ کی جھو سے موازنہ اور مقابلہ کیا گیا تو روح کا پلڑا بھاری نکلا۔ پھر کیا
 تھا۔ شہر بھر میں روح کی دھوم مچ گئی جو لوگ حمیدہ کی لکھی ہوئی جھو پڑھ کے روح کو
 چڑاتے تھے اب وہ شعر پڑھتے اور اس کی تعریفوں کے پل باندھتے ایک ہی دن میں
 روح کو عظیم شاعر تسلیم کر لیا گیا۔ حضوں نے اسے حمیدہ کا ہم پلہ قرار دیا۔ حمیدہ کو
 معلوم ہوا تو ناگن کی طرح بل کھانے لگی حالانکہ اس کے تمام کس بل روح کے
 صرف دو شعروں نے نکال دیئے تھے مگر اس سے یہ ضرور ہوا کہ حمیدہ کو ایک مد مقابل
 مل گیا اور اسے اپنی صلاحیت دکھانے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔

حمیدہ نے روح کی عظمت دل سے تو قبول کر لی لیکن زبان اور چہرے سے اس
 کا مطلق اظہار نہ ہونے دیا۔ اب دونوں میں ایک خاموش معاہدہ ہو گیا تھا۔ بات چیت
 جو عرصے سے بند تھی وہ کھل گئی۔ روح کا بستر پھر حمیدہ کے کمرے میں لگ گیا۔ آئے
 جانے والوں کو بھی احساس ہوتا کہ میاں بیوی میں میل ملاپ ہے اور ان کی زندگی پر
 سکون طریقے سے گزر رہی ہے مگر اندر سے وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ رقب
 تھے اور خائف رہتے تھے کہ پتہ نہیں کب حملہ ہو جائے۔ ادھر شر والے میاں بیوی
 کی جھو کوئی کا مقابلہ دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ وہ ہر روز نئے شعروں کا انتظار
 کرتے مگر حمیدہ اور روح کئی دنوں تک خاموش رہے جیسے انہوں نے جھو نہ کہنے کی قسم
 کھالی ہو۔

مگر یہ سمندر کا عارضی سکوت تھا۔ دونوں کے دل میں طوفان پرورش پا رہا تھا۔
 وہ بحر، قافوں اور الفاظ کے ہتھیاروں سے خود کو سجا رہے تھے صرف پہل کا انتظار
 تھا۔ پہل کرتے دونوں ہی ڈر رہے تھے کیونکہ مقابلہ برابر کا تھا اور دوسرے کا حملہ
 روکنا دشوار نظر آتا تھا۔ پھر حمیدہ کی سیمائی طبیعت زیادہ دن پر سکون نہ رہ سکی۔ ایک
 دن روح باہر گیا تھا کہ حمیدہ نے روح کی ایک طویل جھو لکھی اور شام سے پہلے اسے
 بازار میں اس طرح پہنچا دیا جیسے وہ بکاؤ مال ہو مگر مفت تقسیم کیا جا رہا ہو۔ حمیدہ کی
 لکھی جھو دم کے دم میں تمام بازاروں میں پھیل گئی۔ لوگ سنتے اور سردھنتے۔ حمیدہ
 نے بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا۔ بڑی تعریف ہوئی جھو کی۔

ختم نہ ہوتی کہ جواب میں روح کی بھی ہجو پہنچ جاتی۔

ہوئی کہہ دیا۔

روح نے پہلے اسے تعجب سے دیکھا پھر شاید اسے غصہ آگیا۔ ”ہجو ضرور لکھو
روح کے لئے تیار رہو۔ تم مجھے ہر وقت تیار پاؤ گی جو رسوائی ہو چکی اس سے
مبارادل نہیں بھرا۔ ہلکا کرو ذہن کا بوجھ۔“

”مگر اب جو ہجو لکھوں گی وہ صرف تمہیں سناؤں گی۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟“

”میں دل کی بھڑاس صرف تمہارے سامنے نکالوں گی۔ باہر والوں کو اس کی خبر
ہو گی۔“

روح کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ میں تمہاری ہجو
ہوشی سے سنا کروں؟“

”تم بھی اپنا بوجھ ہلکا کر سکتے ہو مگر۔۔۔۔۔۔“

”مگر کیا۔۔۔۔۔۔؟“

”مقصود یہ کہ میں جو لکھوں تم کو سناؤں اور تمہارا کہا ہوا میں سنوں۔ اس سے
بدنامی ہو گی اور نہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل سکے گا۔“

”عجیب طبیعت ہے تمہاری حمیدہ! تمہارا مرض لاعلاج معلوم ہوتا ہے۔“ روح
برا سامنہ بنایا۔

”پھر تیار ہو تم؟“

”میں سپاہی زادہ ہوں۔ آگے بڑھا ہوا قدم پیچھے ہٹانا نہیں جانتا۔“

معاہدہ ہو گیا اور دو بدو ہجو گوئی کا مقابلہ شروع ہوا۔ صرف کینزوں کو اس میں
کے اجازت تھی اور انہیں یہ حکم دیا گیا کہ اگر ہجو کا ایک شعر بھی حویلی کے باہر
پاؤ انہیں نکال دیا جائے گا۔ کینزوں کو اپنی ملازمت عزیز تھی۔ انہیں کیا پڑی تھی
وہ خطرہ مول لیتیں۔ حمیدہ اور روح آمنے سامنے بیٹھ جاتے۔ حمیدہ اس کی ہجو میں
شعر پڑھتی اور روح اسی وقت اسی قافیہ اور بحر میں حمیدہ کے شعر کا جواب دیتا۔
ہجو گوئی اور بدیمہ گوئی یعنی برجستہ شاعری کا مقابلہ تھا۔ کینزیں خوب مزے لیتیں اور
الہیوی اپنی طبیعتوں کا زور دکھاتے۔ ان کے شعر بڑے تابدار اور اعلیٰ درجے کے

سب کا خیال تھا کہ حمیدہ اور روح کی اس نوک جھونک نے ان کا گھر پھونک
ڈالا ہو گا لیکن یہ عجب طرح کے میاں بیوی تھے۔ ان کے قلم کی لڑائی گھر کے باہر لڑی
جاتی اور گھر کے اندر یہ دونوں سر جوڑے بیٹھے نظر آتے۔ باہر والے تو الگ رہے مگر
کی کینزوں اور دوسرے ملازمین کو ان کی اس قسم کی زندگی پر بڑا تعجب تھا۔ ان کے
اشعار تیز و نشتر سے زیادہ تیز ہوتے اور یوں معلوم ہوتا جیسے دو دشمن ایک دوسرے کو
زیر کرنے کے لئے ہر قسم کے حربے استعمال کر رہے ہیں۔ ان سب باتوں کے ہوتے
ہوئے بھی وہ حویلی کے اندر بڑے پیار سے رہتے اور ایک دوسرے کی ضروریات کا
خیال کرتے تھے۔

پھر جب حمیدہ اور روح کی ہجو گوئی عروج پر پہنچ گئی اور ان کی ہر جگہ خوب
رسوائی ہو چکی تو وہ تھکے ہوئے پہلوانوں کی طرح سستانے اور دم لینے کے لئے رک
گئے، مقابلہ سست پڑ گیا اور انہوں نے بغیر کسی کے کہنے کے ہجو گوئی بند کر دی۔ اس
کے ساتھ ہی چسکے لینے والوں کی محفلیں بھی سرد پڑ گئیں۔ پھر انہیں یقین ہو گیا کہ
میاں بیوی میں ملاپ ہو گیا ہے اور اب وہ حمیدہ اور روح کی ہجو کے جواہر ریزوں سے
اپنی محفلیں نہ سجا سکیں گے مگر یہ دور بھی زیادہ دن قائم نہ رہا۔ ہجو گوئی حمیدہ کی
سرشت میں داخل ہو گئی تھی۔ بغیر کسی کی ہجو کے حمیدہ کے پیٹ میں جیسے درد ہونے
لگتا تھا۔ روح کو خوشی تھی کہ حمیدہ کی عقل ٹھکانے آگئی ہے اور اس کا ظنہ اور
طمطراق ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے مگر حمیدہ کی سیماب صفت طبیعت میں پھر اضطراب
ہوا۔

”ایک دن حمیدہ بڑے پیار سے بولی۔ ”روح! آج طبیعت پریشان ہے۔“

”خیریت تو ہے۔ کسی حکیم کو بلواؤں؟“ روح نے فکر مندی سے کہا۔

”حکیم کی ضرورت نہیں۔ میرا علاج اس کے پاس نہیں۔“

”پھر مجھے بتاؤ۔ تمہاری طبیعت کس طرح بحال ہو سکتی ہے؟“ روح نے پیار

سے کہا۔

”ذہن پر بوجھ سا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہاری ہجو لکھوں۔“ حمیدہ نے بے

ہوتے۔ وہ شعر پڑھتے اور قہقہے لگاتے ان قہقہوں میں کینیزیں بھی شریک ہو جاتیں اور حویلی میں رات گئے تک ادھم مچا رہتا۔

شاہی تلون تو مشہور ہے۔ بادشاہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہوتے ہیں مگر حمیدہ کا شاعرانہ تلون کسی بادشاہ سے کم نہ تھا۔ پہلے بھو پر طبیعت کھلی تو سینکڑوں بھویر لکھ ڈالیں۔ پھر دو بدو شاعری کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو مہینوں روح سے مقابلہ ہوتا رہا۔ بھو گوتی میں حمیدہ اور روح کا پلہ برابر رہا تھا۔ دو بدو شاعری کا ڈول شاید اس نے اس لئے ڈالا تھا کہ وہ روح کو اس میدان میں پچھاڑ دے گی لیکن سپاہی زادہ نے جو کہا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ اس میدان میں بھی ڈٹا رہا اور حمیدہ کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ حمیدہ خود دار بھی تھی اور خود پرست بھی۔ وہ نہ اپنے برابر کسی کو سمجھتی تھی اور نہ اپنے آگے کسی کا چراغ جلنے دیتی تھی۔ جب دو بدو شاعری میں بھی وہ روح کو شکست نہ دے سکی تو اس نے مدح سرائی شروع کی۔ اب وہ اپنی تعریف میں اس طرح شعر پڑھتی جیسے شہسوار میدان جنگ میں رجز پڑھتے ہیں۔

روح نے حمیدہ کی طبیعت کا یہ رخ دیکھا تو وہ اس صنف میں بھی مقابلے پر گیا۔ حمیدہ اپنی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملاتی تھی۔ روح نے اسی کے الفاظ میں اپنی تعریف میں شعر کہنے شروع کئے اور اس میں ایسی ایسی شاعرانہ نزاکتیں پیدا کیں کہ حمیدہ دنگ رہ گئی۔ روح کی طبیعت بڑی ترنگ پر تھی۔ اس نے تعریف و نظموں کے ڈھیر لگا دیئے۔ حمیدہ دس شعر کہتی تو روح بیس اشعار سے بھی بڑھ جاتا کہ وہ ہی عرصے بعد حمیدہ کا ذہن تھکن محسوس کرنے لگا۔ اس کی خود داری اور خود پرستی بری طرح مجروح ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو اس کی شہرت کا جنازہ نکل جائے گا اور وہ دوسرے درجے کی شاعرہ بن کے رہ جائے گی۔ اب اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ روح سے ہمیشہ کے لئے پیچھا چھڑا لے اور اپنے باپ کے پاس محض واپس چلی جائے۔

حمیدہ کے ذہن نے ایک منصوبہ تراشا۔ اس نے روح سے کہا۔ ”روح! تم اپنے کو بنی جزام سے بتاتے ہو لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارا اس قبیلے سے کوئی تعلق نہیں۔“

حمیدہ کا لہجہ طنزیہ مگر نرم تھا۔ روح نے بھی ملائمت سے جواب دیا۔ ”حمیدہ! تم رے قبیلے بنی جزام کی ایک محفل دیکھ چکی ہو پھر بھی تمہیں میرے بنی جزام ہونے پر ہے۔ آخر اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”روح! تم جانتے ہو کہ میں بغیر دلیل کے کوئی بات نہیں کہتی۔“

”یہ بحث بیکار ہے۔“ روح نے تلخی سے کہا۔ ”تمہارے پاس دلیل ہے تو“

حمیدہ نے بڑے انداز سے کہا۔ ”قبیلہ بنی جزام کی تین صفیں مشہور ہیں اور یہ تمہارے اندر ان کی ایک صفت بھی نظر نہیں آتی۔“

روح کو تعجب ہوا۔ وہ حمیدہ کی علمی استعداد سے واقف تھا مگر عرب قبائل کی موصیات سے واقف ہونا تو علم الانسان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ بدو جیسی لاپالی طبیعت کی عورت اس خشک اور دقیق علم میں بھی درک رکھتی ہے۔

”کیا تم نے علم الانسان پڑھا ہے؟“ روح نے اسے آزمانے کی کوشش کی۔

حمیدہ نے بنی جزام کی بات اس لئے شروع کی تھی کہ وہ بنی جزام کے حوالے سے روح کو ذلیل کرے اور اسے اس قدر غصہ دلائے کہ وہ اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے۔ روح کے سوال سے اسے موقع مل گیا۔ تیوریاں چڑھا کر بولی۔ ”میں تمہاری لرح جاہل نہیں ہوں روح۔ تم سوال کرو۔ میں جواب دوں گی۔“

روح رعب میں آگیا۔ دبی آواز میں کہا۔ ”اچھا بتاؤ بنی جزام کی وہ کون سی تین خصوصیات ہیں جو مجھ میں موجود نہیں۔“

”کیا بنی جزام کا لے یا سانولے ہوتے ہیں؟“ حمیدہ نے اس سے سوال کیا۔

”ٹھیک ہے بنی جزام سفید رنگ رکھتے ہیں۔“ روح نے تائید کی۔

حمیدہ مسکرائی۔ ”اور تم شب فراق کی طرح سیاہ ہو۔ پھر تم بنی جزام ہونے کا کوئی کس طرح کرتے ہو؟“

”اس کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ تم بنی جزام کی دوسری خصوصیت بتاؤ؟“

”بنی جزام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ جواں مرد اور بہادر ہوتے ہیں۔“

کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے۔ روح مختصر جواب دے کر خاموش ہو گیا۔“

حمیدہ کا لہجہ ایک دم سخت ہو گیا۔ ”بزدل! تم بزدل ہو روح! جب کہ بنی جزام شجاع اور بہادر ہوتے ہیں۔ تم اس صفت سے بھی محروم ہو پھر میں تمہیں بنی جزام کا فرد کیسے سمجھ لوں؟“

”اس کا جواب بھی میں بعد میں دوں گا۔ تم بنی جزام کی تیسری خصوصیت بیان کرو۔“ روح بن زباع جواب دینے سے پہلے اس کی علیت کا پورا پورا امتحان خود بھی لینا چاہتا تھا۔

”ان کی تیسری اور آخری صفت یہ ہے کہ وہ کھلے ذہن و دل کے ہوتے ہیں۔ رشک، حسد یا شک کا ان میں شائبہ تک نہیں ہوتا۔“ حمیدہ نے اسے نفرت اور پر غرور نظروں سے دیکھا۔ ”اگر تم بنی جزام کے ہوتے تو مجھ پر پابندیاں نہ لگاتے اور میرے تاکنے جھانکنے کو ایک فطری عمل سمجھتے ہوئے درگزر کرتے لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ اگر تمہیں درپچے میں کھڑی نظر آ جاؤں تو تم خود سے بھی گزر جاتے ہو۔ بھلا اس طرح کے شکی اور مغلوب الغضب انسان کو بنی جزام کا فرد کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟“ اب روح کے بولنے کی باری تھی۔ اس نے کڑک کے کہا۔ ”تمہاری بکواس ختم ہو چکی ہو تو میں بھی جواب دوں مگر خبردار میری باتوں کے درمیان ہرگز نہ بولنا اور نہ بحث کرنا۔ جب میری بات مکمل ہو جائے تو پھر جو چاہے جواب دینا۔“

”تم جواب کیا دو گے روح!“ حمیدہ چیخ کے بولی۔ ”میری ہر بات تم نے تسلیم کر لی ہے اور اس سے تمہارے بنی جزام ہونے کی نفی ہو گئی ہے۔“

”یہ غلط ہے حمیدہ!“ روح جھلا گیا۔ ”تم نے بنی جزام کی جو خصوصیات بیان کی ہیں انہیں تمام دنیا تسلیم کرتی ہے لیکن افسوس تمہاری پھوٹی آنکھوں کو یہ خصوصیات مجھ میں نظر نہیں آتیں۔ یہی بات میں تمہیں بتانا اور سمجھانا چاہتا ہوں۔“

”اچھا تم بھی بکواس کر لو۔“ حمیدہ نے بے دلی سے کہا۔

”دیکھو حمیدہ! تم نے بنی جزام کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ وہ گورے ہوتے ہیں۔“ روح نے جواب دینا شروع کیا۔ ”لیکن تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ موسم آب و ہوا اور زمین کی سختی وہاں کے باشندوں کی رنگ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سفید

بک والے اگر نقل مکانی کر کے گرم علاقوں میں آباد ہو جائیں تو ان کا رنگ برقرار میں رہتا اور وہ سانولے ہو جاتے ہیں۔“

روح نے رک کر حمیدہ کی طرف دیکھا کہ وہ مطمئن ہوئی کہ نہیں۔ حمیدہ ہوش بیٹھی اسے گھور رہی تھی۔

”اطمینان ہوا کہ نہیں؟“ روح نے اسے چھیڑا۔

”آگے بولو بزدل۔“ حمیدہ کی نفرت دیکھنے والی تھی۔

”تم مجھے بزدلی کا طعنہ دیتی ہو حمیدہ!“ روح نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ ”پاپی بزدل نہیں ہوا کرتا۔ میں میدان جنگ میں بے جگری سے لڑتا ہوں لیکن میں بے جگری تمہارے جھگڑے میں کیوں دکھاؤں۔ میرے پاس صرف ایک جان ہے اگر دو بائیں ہوتیں تو تمہیں قتل کر کے ایک جان سولی پر چڑھا دیتا۔ اب رہا تمہاری تیسری بات کا جواب تو میں بنی جزام کے معزز ترین گھرانے کا فرد ہوں لیکن مجھ میں جوش و رقابت موجود ہے۔ اس لئے کہ عورت کے معاملے میں کوئی شخص کسی دوسرے کی حرکت برداشت نہیں کر سکتا پھر تم تو ایسی گدھی بیوی ہو جسے اچھے برے کی کوئی تمیز ہی نہیں۔ تمہاری مثال تو اس بکری کی مانند ہے جو ہر چارے پر منہ ڈالنے کو تیار رہتی ہے۔“

حمیدہ سگ اٹھی۔ ”دیکھو روح تم حد سے بڑھ رہے ہو۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔“

”میں تمہاری ہر بات برداشت کرتا ہوں تم اتنی سی بات پر تن پھن ہونے لگیں۔“ روح نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”میں تو نثر میں شاعری کر رہا ہوں حمیدہ!“ حمیدہ کا یہ وار بھی خالی گیا۔ اس نے روح کو ذلیل کرنے کی کوشش کی مگر الٹی اس کی ذلت ہو گئی۔ میاں بیوی میں روز چچ چچ رہنے لگی اور روح روز بروز حاوی ہوتا گیا۔ حمیدہ اسے سخت سے سخت بات کہہ جاتی۔ روح کی جگہ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو ٹیڈہ کا منہ توڑ دیتا لیکن روح کو حمیدہ کی سرکشی کچھ ایسی بھاگتی تھی کہ وہ اس کی ہر بات برداشت کر لیتا مگر اسے چھوڑنے کا کبھی ارادہ نہ کرتا۔ ایک دن حمیدہ نے اسے لکلی ایسی بات کہہ دی کہ روح غصے سے سرخ ہو گیا۔ حمیدہ کو یقین ہو گیا کہ آج

ہے نہیں کہ حمیدہ کے ادبی کمالات، فصاحت و بلاغت۔ نازک خیالی اور نفاست مزاجی کے بڑے بڑے ادیب و شاعر قائل تھے اور اس کی زیارت کی تمنا بھی رکھتے تھے لیکن حمیدہ کی زبان درازی نے اس کی تمام خوبیوں کو گھنایا تھا۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس کے دروازے پر دستک دے اور پھر ذلت اٹھا کے واپس آئے۔

حمیدہ کی زندگی سنان اور ویران ہو گئی تھی۔ اسے اب واقعی بیوگی کی زندگی گزارنا پڑ رہی تھی۔ اس کی تمام شوخیاں اور زبان درازیاں ٹھنڈی پڑ رہی تھیں۔ حمیدہ نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس پر ایسے دن آئیں گے۔ اس کے باپ نعمان بن بشیر کو بھی بڑا ملال تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ حمیدہ نے خود اپنی زندگی تباہ کی ہے اور ان برے دنوں کی وہ خود ذمہ دار ہے۔ حمیدہ دو سال تک تنہائی کے دکھ سہتی رہی۔ وہ اپنے کئے پر نادم تھی۔ حادثہ نے اسے تنگ آ کے چھوڑا تھا اور روح کو خود اس نے چھوڑ دیا تھا۔ زندگی کا یہ عذاب اس سے جھیلنا نہ جا رہا تھا۔ روایت ہے کہ حمیدہ نے رو رو کے خدا سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگی اور رحم کی طالب ہوئی۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ غفور الرحیم ہے آخر اس کے دریائے رحمت میں جوش آیا اور حمیدہ کی سنی گئی۔

باکس سال کی عمر میں حمیدہ کی ایک ایسے نوخیز اور خوبو جوان پر نظر پڑی جسے دیکھ کر حمیدہ کو محسوس ہوا کہ یہی اس کے خوابوں کا شہزادہ ہے اور آغاز جوانی سے وہ اسی کو تلاش کر رہی تھی۔ عفوان شباب میں قدم رکھنے والا یہ البیلا جوان فیض بن عم بن حکم بن عقیل تھا۔ اس کا باپ نیا نیا مرا تھا اور کثیر رقم ترکے میں چھوڑی تھی۔ حمیدہ اور فیض کی پہلی ملاقات بڑی دلچسپ تھی۔ حمیدہ اپنے علم و فضل اور کمال فن کی وجہ سے دور دور مشہور تھی۔ شرفا اور رؤسا سے تقاریب میں بلانا باعث فخر سمجھتے تھے۔

حمیدہ ایک ایسی ہی تقریب میں مدعو تھی۔ وہ لباس فاخرہ پہن کے شرکت کے لئے روانہ ہوئی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اب بھی چودھویں کے چاند کی طرح روشن تھا۔ میزبان کی حویلی پر وہ سواری سے اتر رہی تھی کی فیض زناخانے سے نکلا۔ وہ میزبان کا قریبی عزیز تھا۔ حمیدہ نے غیر مرد کو دیکھ کر فوراً "غلب ڈالنا چاہا مگر فیض کی نظر اس کے رخ تاباں کا طواف کر کے وہیں ٹھہر گئی تھی۔ فیض کی شوخ طبیعت نے

روح ضرور اسے چھوڑ دے گا لیکن روح نے اپنا غصہ کسی اور طرح سے ختم کیا۔ روح نے خاموشی سے وضو کیا اور جانناز بچھا کر بیٹھ گیا۔ پتہ نہیں اس نے کس وقت کی نماز پڑھی پھر ہاتھ اٹھا کے بلند آواز میں دعا مانگنا شروع کی۔

"اے پاک پروردگار تو نے اس دنیا میں خوفناک دردے پیدا کئے ہیں جو انسان کو چیر پھاڑ کے کھا جاتے ہیں۔ تو نے زہریلے سانپ بچھو پیدا کئے ہیں جن کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا لیکن میری بیوی حمیدہ ان سب سے زیادہ زہریلی اور خطرناک ہے۔ یہ اپنی زبان سے ایسے ڈنک مارتی ہے کہ میں بلبلا کے رہ جاتا ہوں۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا کہ مجھے اس سے محبت ہے اور قتل اس لئے نہیں کر سکتا کہ یہ گناہ عظیم ہے اور میں جان نہیں گنونا چاہتا۔ میری تجھ سے صرف یہ دعا ہے کہ اگر میں مر جاؤں اور حمیدہ زندہ رہے تو تو اسے ایسا شوہر دے جو اس کے منہ پر دن رات تھپڑ مارے اور جوتے بازی کرتا رہے اور پھر یہ رو رو کے مجھ مرنے والے کو یاد کرتی رہے۔"

"اب میرا تمہارے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے چھوڑ دو روح!" حمیدہ چیخ پڑی۔

"واہ یہ خوب رہی۔ میں گزارہ کر رہا ہوں تو تم کیوں گزارہ نہیں کر سکتیں۔ میں اس قدر بے وقوف نہیں کہ تمہیں چھوڑ کے تمہارے مہر کی رقم بھی ادا کروں۔"

حمیدہ نے روح سے نکاح کے وقت مہر کی رقم بہت زیادہ مقرر کی تھی جس کی ادائیگی روح کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔ حمیدہ اس سے تنگ آ گئی تھی۔ اس کی اپنی پہچان اور شخصیت دب کے رہ گئی تھی۔ روح نے اسے علیحدگی کا راستہ بھی دکھا دیا تھا۔ پس اس نے فوراً "قاضی شرک کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنا مہر معاف کر کے روح سے طلاق (خلع) حاصل کر لی۔ روح نے بظاہر اس پر افسوس کیا لیکن اسے جلد ہی صبر آ گیا وہ حمیدہ کو بھول گیا۔

حمیدہ کی دوسری طلاق نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ حمیدہ بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ شاعری میں بھی اس نے بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اسے یہ زعم بھی تھا کہ روح سے علیحدگی کے بعد اسے روح سے بہتر شوہر مل جائے گا اور پہلے کی طرح اس کے گھر پر امیدواروں کی قطار لگ جائے گی لیکن یہ اس کا خیال خام تھا۔ اس میں

لکھ سچے کہ آپ بچ گئے ورنہ۔۔۔۔۔
 ”چپ رہو۔“ فیض نے اسے ڈانٹ دیا۔

فیض کے دوستوں نے بہت سر مارا۔ عزیزوں نے سمجھایا۔ مگر فیض پر حمیدہ کا عشق سوار ہو گیا اور اس سر پھرے عاشق نے حمیدہ کی تمام کمزوریوں کو جانتے ہوئے بھی اس کے لئے پیغام بھیج دیا۔ حمیدہ کی نظر سے اتنا خوبصورت جوان پہلے نہ گزرا تھا۔۔۔۔۔ وہ تنہائیوں سے پہلے ہی پریشان تھی۔ حمیدہ شادی کے امیدواروں کا امتحان لیا کرتی تھی لیکن اس نے فیض کے ساتھ خاص رعایت کی۔ اس کا پیغام فوراً قبول کیا گیا اور چٹ مکتبی پٹ بیاہ کے مصداق حمیدہ رخصت ہو کر فیض کی شاندار حویلی میں آ گئی۔

حمیدہ نے شادی کی چند ہی راتیں گزاری تھیں کہ اس پر عقدہ کھلا کہ فیض بلا کا سے نوش ہے۔ وہ شراب پی کر رات کو گھر آتا اور جب تک نہ سو جاتا حویلی میں ادھم مچا رہتا۔ حمیدہ اس کی جوانی پر رتی بھی تھی۔ اس نے فیض کو نرمی سے سمجھایا مگر فیض نے اس کی مطلق نہ سنی۔ اب وہ گھر میں بھی شراب پینے لگا۔ حمیدہ نے جل کے اپنا پرانا حربہ استعمال کیا اور فیض کی بھوکہ ڈالی۔ حمیدہ کی بھوکہ نے دھوم مچا دی۔ فیض جدھر سے نکلتا لوگ اسے چھیڑتے اور بھوکہ کے اشعار دوہراتے۔ فیض میں شاعری کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ حمیدہ کی بھوکہ کا کیا جواب دیتا۔ فیض باہر سے خجل ہو کے آتا اور منہ ڈھانپ کے پڑ رہتا۔

حمیدہ کا بھوکہ ہتھیار بھی ناکام ہو گیا تو اس نے پھر سمجھانا بھجانا شروع کیا۔ فیض کا دماغ الٹ چکا تھا۔ اس نے اور زیادہ شراب نوشی شروع کر دی۔ حمیدہ اس کے ساتھ سخت رویہ نہ اختیار کرنا چاہتی تھی لیکن جب فیض کی بد مستیاں اور ادھم دھاڑ حد سے بڑھ گئی تو حمیدہ بھی مقابلے پر اتر آئی۔

حمیدہ کا خیال تھا کہ وہ حادث اور روح کی طرح فیض کو بھی دبا لے گی لیکن ایک شب فیض نے اس پر ہاتھ چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ اور بے تحاشہ طمانچے مار مار کے اس کے رخسار سجا دیئے۔ حمیدہ خوب پھوٹ پھوٹ کے روئی اور اس کی زبان سے نکلا۔
 ”جئے خدا عارت کرے روح! یہ سب تیری بدعا کا اثر ہے۔“

ایک اور غضب ڈھایا۔ اس نے بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ ”میں سرکار حسن میں نظروں کی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔“

فیض کا یہ جملہ حمیدہ کے زخمی دل کو اور زخمی کر گیا۔ قریب کھڑی ہوئی کینز نے یہ منظر دیکھا تو کانپ گئیں۔ انہیں خوف پیدا ہوا کہ حمیدہ فیض کی جان کو آج لے گی اور ایسے لے لے گی کہ فیض کی عقل ٹھکانے آ جائے گی۔ مگر خلاف امید حمیدہ نے نقاب ڈالنے سے ہاتھ کھینچ لیا اور نغمہ بار آواز میں بولی۔ ”گستاخی ہو ہی گئی۔ تو جی بھر کے دیکھ لو تاکہ دوبارہ دیکھنے کی آرزو نہ رہے۔“

”آرزو زندگی کا دوسرا نام ہے۔ اس حسن کو تو عمر بھر دیکھنے کی آرزو رہے گی۔“ فیض کی سرمستی بڑھ گئی

حمیدہ اس حسن کلام پر مر مٹی۔ اس نے حیا آلود نظر سے دیکھا۔ ”اس پر خط راہ میں چلنا بہت مشکل ہے۔“

فیض کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اس نے فوراً کہا۔ ”اور اگر میں یہ راہ اختیار کروں تو۔۔۔۔۔“

حمیدہ نے اب اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ ”تم میرا نام نہیں جانتے ورنہ۔۔۔۔۔“

”پھول کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ پھول تو صرف پھول ہوتا ہے۔“ فیض کا لہجہ انتہائی شاعرانہ تھا۔

حمیدہ نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا پھر مسکراتی ہوئی زانخانے میں داخل ہوئی۔ فیض ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحوں بعد اس کے حواس درست ہوئے تو اس نے ایک کینز سے پوچھا۔ ”یہ پھول کس باغ کا ہے؟“

”پھول نہیں سراسر خار ہے آقا زادے!“ شوخ کینز ہنسنے لگی۔ ”دور رہنے ہاتھ زخمی ہو جائیں گے۔“

”میں کانٹوں سے کھیلنا چاہتا ہوں۔ تم نام بتاؤ؟“ فیض کو کینز پر غصہ آ گیا۔
 ”آقا زادے! یہ حمیدہ بن نعمان ہے۔ والئی محس کی تیسری صاحبزادی۔ بھوکائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ ان کے دو شکار اب تک اپنے زخموں کو چاٹ رہے ہیں۔“

روح نے حمیدہ کو صرف اتنی ہی بد دعا دی تھی لیکن فیض نے اس کا مار مارے وہ حال کیا کہ حمیدہ کو چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ اس کی ساری اکڑ نکل گئی اور اسے تو بدن کا ہوش نہ رہا لیکن فیض کی جوانی اسے اس قدر بھاگنی تھی کہ وہ چار چوٹ کی ماں کھاتی اور اف تک نہ کرتی۔ اس نے جیسے فیض سے اور خود اپنی زندگی سے سمجھو کہ لیا تھا لیکن اس کی بھوگوئی کی عادت اب بھی نہ گئی۔ اب وہ فیض کی بھو نہ لکھتی بلکہ ان بڑے لوگوں کو اپنی بھو کا نشانہ بناتی۔ جن سے غریب عوام کو نقصان پہنچتا۔ وہ جر کے خلاف قلم اٹھاتی وہ پورے شہر میں بدنام ہو جاتا اور منہ چھپاتا پھرتا۔ سرکاری عہدیدار تو اس سے ہر وقت لرزتے رہتے۔ حمیدہ جس حاکم کی بھو لکھتی اس کے خلاف فوراً تحقیقات شروع ہو جاتی۔ بعض اعلیٰ حکام اس کی بھو کی وجہ سے برخاست کر دیئے گئے۔ اب اس کی بھو تعمیری ہوتی تھی کیونکہ وہ ایسے ہی لوگوں کے خلاف قلم اٹھاتی جو واقعی بری حرکتیں کرتے تھے۔

حمیدہ کی زندگی کے دو ہی کام رہ گئے تھے۔ ایک تو روز کسی نہ کسی کی بھو لکھ دوسرے فیض کے طمانچے کھا کر آنسو بہانا۔ وقت اسی رفتار سے آگے کی طرف بہت رہا۔ حمیدہ کی دونوں بہنیں ہند اور عمرہ بال بچوں والی ہو گئی تھیں۔ حمیدہ کے بھی ایک لڑکی ہوئی تھی جو اب جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ بچی کی پیدائش نے فیض کا ہاتھ روک دیا اور حمیدہ کو طمانچوں سے نجات مل گئی تھی۔ حمیدہ کا دوسرا کام جاری تھا۔ اس نے بھوگوئی میں کمال حاصل کر لیا تھا۔ ہر امیر اس سے لرزتا رہتا تھا۔ حمیدہ کی زبان درازی اور بھوگوئی کی وجہ سے اس کی بیٹی کا کہیں سے پیغام نہ آتا تھا۔

حمیدہ کی بیٹی اپنی ماں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اپنی ماں کی طبیعت کے برعکس وہ نہایت کم گو۔ سلیقہ شعار اور ملنسار تھی اس نے تمام رائج علوم کی تعلیم بھی حاصل کی تھی مگر حمیدہ کی حرکتوں کی وجہ سے کوئی اس کا رشتہ نہ مانگتا۔ فیض اور حمیدہ دونوں ہی لڑکی کے لئے پریشان رہتے تھے۔ پھر جیسے بلی کے بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ حمیدہ کی سوتیلی بہن ام ابان کی شادی قصاب عرب حجاج بن یوسف ثقفی سے ہوئی تھی۔ ام ابان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ حجاج بن یوسف اس وقت عراق کا گورنر تھا۔ اس نے حمیدہ کی بھوئیں بھی سنی تھیں اور اس کی ماہ پیکر بیٹی کے حسن و جمال کی کہانیاں بھی سنی

نہیں۔ اس نے حمیدہ کی بیٹی کے لئے پیغام دیا اور حمیدہ نے اسے فوراً منظور کر لیا حجاج نے یہ شرط رکھی کہ شادی کے بعد اس کی ساس یعنی حمیدہ اپنی بیٹی سے لے سال میں صرف ایک بار آ سکے گی۔ حمیدہ نے حجاج کی یہ شرط بھی منظور کر لی اور بی دھوم دھام سے بیٹی کو رخصت کر دیا بیٹی کی رخصتی کے بعد حمیدہ نے سب سے پہلے شادی کی اس شرط کو بنیاد بنا کر اپنے داماد حجاج بن یوسف کی پہلی بھو لکھی اور اس کا اس قدر زبردست خاکہ اڑایا کہ حجاج دانت پیس کے رہ گیا۔ حجاج بن یوسف کی نصیحت تاریخ اسلام میں بڑی متاثر ہے۔ حجاج نے شدت پسند طبیعت پائی تھی۔ اس نے اچھی یا بری جو بھی شہرت حاصل کی وہ اس کا واقعی اہل تھا۔

حجاج اس قدر نڈر تھا کہ وہ دشمنوں کے گروہ میں بے دھڑک کھس جاتا اور نہیں زیر کر لیتا۔ جس وقت ایسے عراق کا گورنر مقرر کیا گیا تو وہ صرف بارہ سواروں کے ساتھ منہ پر نقاب ڈالے ہوئے کوفہ میں داخل ہوا۔ کوفہ کے لوگ بڑے بد مذہب اور بے وفا مشہور تھے۔ حجاج سے پہلے جو بھی وہاں کا گورنر مقرر ہوا اسے کوفیوں نے ہل کر کے بھگا دیا۔ حجاج سیدھا جامعہ مسجد پہنچا اور اعلان کرایا کہ —————
برالمومنین خلیفہ عبد الملک کا فرمان آیا ہے لوگ فرمان سننے کے لئے جمع ہو جائیں۔ اپنی خلافت کے فرمان کا اس طرح استقبال کرتے تھے کہ وہ فرمان لانے والے پر پتھراؤ رتے اور اسے مار کر بھگا دیتے۔ اس دن بھی وہ ہاتھوں میں کنکر پتھر لے کر شغل میلہ کے لئے جامعہ مسجد میں آئے۔ حجاج نقاب ڈالے ممبر کے پاس اپنے بارہ آدمیوں کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ لوگ جمع ہو گئے تو حجاج نے کھڑے ہو کر چہرے سے نقاب الٹ لیا۔ جس کی نظر بڑی اس کی زبان سے حجاج بن یوسف نکلا۔

حجاج بن یوسف کا نام سننے ہی لوگوں کے بدن کانپنے لگے۔ کنکر پتھران کے قتلوں سے مر گئے اور تمام لوگ مودب ہو کر بیٹھ گئے۔ حجاج بھی صورت دکھا کر بیٹھ لیا پھر اس نے حکم دیا کہ خلیفہ کا فرمان پڑھا جائے۔ حجاج کے ایک ساتھی نے فرمان اعلان شروع کیا۔ ابھی اس نے ابتدائی لفظ السلام علیکم پڑھا تھا کہ حجاج بن یوسف کھڑا دگیا اور اس نے پوری آواز سے کہا۔ ”امیر المومنین تم کو سلام کہتے ہیں اور تم اب نہیں دیتے۔ خدا کی قسم میں تمہیں ادب سکھا کر رہوں گا۔“

کوئی اس قدر مرعوب ہوئے کہ انہوں نے فوراً کہا۔ ”السلام اللہ علی امیر المؤمنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“

یہ وہی حجاج بن یوسف ہے جس کے چار سرداروں۔ محمد بن قاسم، عبید بن مسلم، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد نے ایشیاء، یورپ اور افریقہ الٹ کے رکھ دیا تھا۔ اس حجاج نے قرآن حکیم پر اعراب لگوائے مگر اس کی سفاکی سے عوام تو الگ رہے بڑے بڑے علماء اور فضلا بھی نہ بچ سکے۔ اس کے ہاتھوں یا اس کے حکم سے قتل ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ تیس ہزار بتائی جاتی ہے اور جس وقت اس کا انتقال ہوا تو پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں قید سے رہا کی گئیں۔

ہائی پے شیا

حمیدہ ایسے سفاک کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جہاں کوئی محترم اور مکرم ہستی اس کے ہاتھ سے قتل ہوئی حمیدہ نے فوراً اس کی جھوکی اور اس کی دجیاں اڑا دیں۔ مشہور ہے کہ حجاج اگر کسی ہستی یا چیز سے خائف تھا تو وہ حمیدہ کی ہستی اور اس کی جھوکی تھی۔ اس کے خلاف اس قدر لکھنے کے باوجود حمیدہ بیٹی سے ملنے بے دھڑک اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ ایک بار وہ بیٹی سے ملنے گئی تو حجاج نے اس سے کہا۔ ”تم میری ساس ہو۔ میں تمہارا احترام کرتا ہوں لیکن یہ عراق ہے۔ میں یہاں کا گورنر ہوں اگر تم نے یہاں رہتے ہوئے زبان کھولی اور ایک شعر بھی میرے خلاف لکھا تو میں تمہارا سر قلم کر دوں گا۔“

حمیدہ نے فوراً جواب دیا۔ ”یہ تمہارا علاقہ ہے میں یہاں خاموش رہوں گی لیکن عراق سے نکل کے جب تمہاری جھوکیوں کی تو میرا کیا بگاڑ لو گے۔“

حجاج بن یوسف اپنی زبان دراز ساس کی جرات پر حیران رہ گیا۔ اس بے باک خوبصورت اور بے مثال جھوکی شاعره نے خلیفہ عبد الملک کے عہد خلافت کے آخری زمانے میں انتقال کیا اور اپنا نام تاریخ میں چھوڑ گئی۔

بند گاڑی گورنر کے محل کے سامنے رک گئی۔ محل کے محافظ دستے کا سردار گھوڑا بڑھا کے گاڑی کے پاس آگیا۔ ”گاڑی کے کن ہے؟“ اس کا لہجہ پر رعب مگر مودبانہ تھا۔

گاڑی کے اندر سے ایک مترنم آواز گونجی۔ ”میں ایک بے کس فریادی ہوں اور ز کے حضور اپنی درخواست پیش کرنا چاہتی ہوں۔“

”اگر میں کہوں کہ گورنر بہادر مصروف ہیں تو کیا معزز مہمان انتظار فرمائیں

”کیوں نہیں سردار۔ فریادی تو عمر بھر بھی انتظار کرتا ہے مگر میری ضرورت گورنر بہادر کی مصروفیت سے زیادہ اہم ہے۔“ فریادی کی آواز میں غضب کا لوچ

پہریدار سردار فکر میں پڑ گیا۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ گھوڑا گاڑی کے اگلا پردوں میں ایک بار پھر جنبش ہوئی۔ ”کیا مجھے گورنر کے دربار سے بھی انصاف

سچہ دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ خاتون کی محویت ٹوٹ گئی۔ اس نے پلٹ
بھا۔ محافظ سردار واپس آ گیا تھا۔

”کیا حکم ہے میرے لئے سردار؟“ خاتون نے اٹھا ہوا نقاب پھر ٹھیک کر لیا۔

”گورنر بہادر آپ کا انتظار کر رہے ہیں خاتون۔“

خاتون کے ہونٹ خوشی سے کپکپا کے رہ گئے۔ محافظ اسے لئے ہوئے کئی
سے گزر کر سنگی راہداری میں چلے لگا۔ جگہ جگہ نیزہ بردار تعینات تھے اور بڑی

اری سے پہرہ دے رہے تھے۔ دوسری راہداری کے پہلے موڑ پر گورنر فارس

خاص کمرہ تھا جہاں وہ لوگوں سے ملاقات کیا کرتا تھا۔ دروازے پر سردار ایک

کے لئے رکا۔ شاید وہ خاتون کو باہر چھوڑ کے اندر جانا چاہتا تھا کہ گورنر سے

نے لے کر خاتون کو اس کے سامنے پیش کرے لیکن اسے یہ زحمت نہ اٹھانا پڑی۔

ی وہ دروازے پر رکا۔ اندر سے ایک کرخت سی آواز آئی۔ ”بے خوف چلے

میں انتظار کر رہا ہوں۔“

سردار نے فوراً ”سرگوشی کی۔“ گورنر بہادر اندر ہیں۔ آپ چلی جائیے۔“

”تم بھی اندر آؤ اور خاتون کے ساتھ اس وقت تک ٹھہرے رہو جب تک

باہر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔“ گورنر نے سردار کو بھی اسی سخت اور

رے لہجے میں حکم دیا تھا۔

سردار نے سنبھل کے پردہ ہٹایا اور اندر چلا گیا۔ نقاب پوش خاتون اس کے

میں تھی۔ سردار چند قدم آگے جا کر رک گیا۔ خاتون کی نظریں نیچی تھیں۔

رکے رکنے سے اس نے اندازہ کیا کہ وہ اسکندریہ کے گورنر کے سامنے ہے۔

”اسکندریہ کی ایک مصیبت زدہ طالبہ عظیم شہنشاہ کے عظیم گورنر کو سلام پیش

ہے۔“ خاتون نے یہ کہتے ہوئے اپنا سر اٹھایا اور نقاب کی دہری جالیوں سے

نر کو دیکھا مگر اس پر نظر پڑتے ہی خاتون چونک پڑی۔ اس کے سامنے کوچ سے

لگائے ایک نہایت وجیہ جوان بیٹھا تھا۔ خاتون کی پریشانی کی وجہ یہ تھی کہ اس

سامنے کے گورنر اور اس آواز میں جو اس نے دروازے کے باہر سے سنی تھی کوئی

البتہ نہ تھی۔ وہ آواز اس قدر کرخت تھی جس کے بارے میں یہ گمان ہو ہی

نہیں ملے گا؟“

سردار گھبرا گیا۔ ”فکر نہ کیجئے خاتون۔ گورنر بہادر سے آپ کی ضرور ملاقات ہو

گی۔ آپ ایک لمحے کے لئے گاڑی سے باہر تشریف لے آئیے۔“

اندر بیٹھی خاتون نے شاید انکار کیا۔ ”میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتی سردار۔ اگر

میرے لئے یہ دروازہ بھی بند ہے تو میں رومۃ الکبریٰ پہنچ کر قیصر روم سے فریاد کروں

گی۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں خاتون۔“ سردار اور زیادہ نرم پڑ گیا۔ ”آپ کو اس

لئے زحمت دی جا رہی ہے کہ میں احتیاط کے طور پر گاڑی کے اندر ایک نظر ڈالنا چاہتا

ہوں۔ اس کے بعد میں آپ کے آنے کی اطلاع اندر تک پہنچا سکوں گا۔“

”میں اس غلط فہمی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی ایک دروازہ قامت خاتون گاڑی سے برآمد ہوئی۔ اس کے

چہرے پر دہرا نقاب پڑا تھا۔ مگر اس کی عیاں باہیں اس بات کی غمازی کر رہی تھیں کہ

کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ سردار نے حریری پردے ایک طرف کھینچ کے

گاڑی کے اندر غور سے دیکھا۔

”میں بھی اس زحمت کے لئے معذرت خواہ ہوں۔“ سردار مسکرایا۔ ”میں

ناگوار فرض ادا کرنے کے لئے مجبور تھا خاتون۔ اب آپ میرے ساتھ تشریف لائیے

میں کوشش کروں گا کہ آپ کی اسی وقت گورنر سے ملاقات ہو جائے۔“

”شکریہ سردار۔“ اور نقاب پوش خاتون اس کے پیچھے چلنے لگی۔

صدر دروازے کے اندر کچھ ہی دور ایک آراستہ مہمان خانہ تھا۔ اسکندر

کے رومی گورنر فارس ڈورا کا محل ایک بلند جگہ واقع تھا۔ محل کے شمالی جانب کھلا

والی کھڑکیوں سے بحیرہ روم کی بل کھاتی لہریں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ محافظ سردار

اسے چھوڑ کے باہر چلا گیا تو نقاب پوش خاتون نے چہرے پر پڑے نقابوں میں سے او

کا نقاب ہٹا دیا اور کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر سمندر کا نظارہ کرنے لگی۔ خاتون اگر

سخت پریشان تھی اور اپنی رام کہانی سننے اسکندریہ کے گورنر کے پاس آئی تھی

سمندر کا نظارہ اس قدر سحر انگیز تھا کہ وہ اس میں کھو کر رہ گئی۔

نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک ایسے خوبصورت جوان کے منہ سے نکل سکتی ہے۔

ادھر گورنر پر بھی ایک سکتہ سا طاری تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ایک پریشان حال عورت فریاد لے کر حاضر ہوئی ہے اور اس وقت اپنی روداد بیان کرنے کی خواہش مند ہے مگر فریاد کی نغمہ بار آواز نے تو گورنر فارس ڈورا پر جیسے سحر کر دیا تھا۔ اس کے کانوں میں بہت سی جوان آوازیں پڑی تھیں۔ مگر فریادی کی آواز کا اتار چھاؤ اور زیروم تو سر اور تال میں پوری طرح ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دل بے آواز دی کہ نقاب کے پیچھے فریاد کے روپ میں یقیناً "کوئی آسمانی حور ہے۔"

ایک طرف نقاب پوش خاتون اور دوسری طرف اسکندریہ کا جواں عمر گورنر اپنے اپنے خیال میں گم تھے اور خاتون کو پیش کرنے والا سردار گھبرا گھبرا کے نکلیوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اس کا سخت مزاج گورنر اس وقت اس قدر خاموش کیوں ہے۔

خاتون کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گورنر ٹپ اٹھا۔ "لڑکی!" گورنر کے منہ سے ایک دم نکلا مگر اس نے فوراً "خود کو سنبھالا۔" میں نے تمہیں لڑکی اس لئے مخاطب کیا ہے کہ تم نے خود کو ایک طالبہ کہا ہے۔ بہر حال لڑکی یا طالبہ۔ تمہیں یہ کس طرح اندازہ ہوا کہ میں تمہاری فریاد نہیں سنوں گا جب کہ شہنشاہ روم نے مجھے اسکندریہ کا گورنر بنا کر اسی واسطے بھیجا ہے کہ میں ان کی رعایا کی فریاد سنوں اور بلا رنگ و نسل انصاف کروں۔"

نقاب پوش لڑکی نے بلا جھجک جواب دیا۔ "اے اسکندریہ کے جواں عمر عامل۔ میرا نام ہائی پے شیا ہے اور میں شہر کے مشہور ریاضی داں تمبروں کی بیٹی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کا تعلق عیسائی مذہب سے ہے اس لئے شاید آپ بنی اسرائیل کی ایک فریادی کی شکایت سننا بھی گوارہ نہ فرمائیں گے۔ اس لئے کہ اسکندریہ میں ہم یہودیوں کی کثیر تعداد ہونے کے باوجود ہم پر ہونے والے مظالم پر نہ کسی آنکھ میں آنسو آتے ہیں اور نہ کسی کا دل پیبتا ہے۔ آپ نے بلا رنگ و نسل انصاف کا جو دعویٰ کیا ہے اس سے مجھے امید بندھی ہے کہ اس دربار میں اگر میرے ساتھ انصاف نہ بھی کیا گیا تو کم از کم آپ میری روداد سننے کی ضرورت زحمت فرمائیں گے۔"

"ہائی پے شیا! اگر تم یہ نہ بتاتیں کہ تم یہودی ہو تب بھی میں تمہارے ساتھ راہ پورا انصاف کرتا۔" اسکندریہ کے عامل نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ "یاد رکھو انصاف ایک ایسی لاشی ہے کہ جب گھومتی ہے تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتی کہ اس کی کس کے سر پر پڑے گی۔ انصاف سے تو تمہارے سامنے بیٹھا ہوا گورنر بھی نہیں بچ سکتا۔"

ہائی پے شیا نے قریب کھڑے ہوئے سردار کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کے اب دیا۔ "عامل محترم کی اس مزید وضاحت نے مجھ میں اعتماد پیدا کیا ہے اور اب پوری جرات سے گفتگو کر سکتی ہوں۔"

"ٹھہرو ہائی شیا۔" گورنر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ "تمہاری باتوں کا ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں غلطی سطح پر انصاف نہیں ملا اور تمہیں ہمارا دروازہ کھٹکھٹانا اس کا مطلب ہے کہ تمہاری دشمن شر کی کوئی ایسی ہستی ہے جس کے خلاف شکایت زباں پر لاتے ہوئے تم گھبرا رہی ہو۔ تمہاری اس فکر کو دور کرنے کے لئے میں تمہیں چند لمحے دیتا ہوں تاکہ تم پوری طرح اپنے حواسوں پر قابو پاسکو اور پھر بری سچائی اور ایمانداری سے اپنے دل کا حال بیان کر سکو۔ اس سے قبل میں یہ بھی بتاتا ہوں کہ تم اپنا پورا تعارف کراؤ تاکہ انصاف کی ترازو اٹھاتے وقت تمہارا پس فٹ بھی میری نظروں کے سامنے رہے۔" یہ کہتے ہوئے عامل اسکندریہ نے ہائی پے شیا کے ساتھ آنے والے سردار کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

سردار نے سر جھکا کر عامل کو سلام پیش کیا اور دروازے کی طرف واپس ہوا۔ اٹل نے اسے تاکید کی۔ "تم باہر ٹھہرو اور اس وقت تک کسی کو اندر آنے کی اجازت نہ دو جب تک ہماری گفتگو ختم نہیں ہو جاتی۔"

سردار نے رک کر عامل کا حکم سنا اور تعمیل حکم میں سر ہلاتا باہر چلا گیا۔ "ہائی شیا! عامل بڑی اپنائیت سے بولا۔" میں نے تمہارا نام مختصر کر دیا ہے۔ نہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"آپ اسکندریہ کے عامل ہیں اور میں آپ کی ایک ادنیٰ کنیز۔ یوں بھی خادموں اور کنیزوں کے کوئی نام نہیں ہوا کرتے۔ آقا انہیں جس نام سے بھی پکاریں وہ اسی

جس نے تم جیسی حور شائسل اور عاتقہ و فائدہ لڑکی کی طرف ظلم کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ اپنے احساس جمال سے عاری اور انسانیت کا دشمن ہے۔“

”اگر اس میں ذرا بھی انسانیت ہوتی تو مجھے آپ کے حضور پیش ہونے کی نوبت نہ پڑتی۔“ ہائی پے شیا نے بڑے درو سے کہا۔ ”وہ انسان نہیں درندہ ہے اور نہ بہادر۔ اس نے میرے درس میں آنے والوں کو روک دیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنا درس بند کر دوں کیوں کہ اس کے خیال کے مطابق میرے درس سے ان میں لادینیت پھیل رہی ہے اور عیسائیوں کے اعتقادات متزلزل ہو کر رہ گئے ہیں۔“

”یہ حکم تمہیں کس نے دیا ہے؟“ گورنر کو جلال آگیا۔ ”اسکندریہ کا گورنر میں ہوں۔ شہنشاہ روم نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ اسکندریہ میں صرف اور صرف میرا حکم ہوتا ہے۔ کسی اور نے حکم دینے کی جرات کیسے کی؟“

”گورنر بہادر۔“ ہائی پے شیا نے بڑی جرات سے کہا۔ ”میں تسلیم کرتی ہوں کہ اسکندریہ کے قانونی گورنر آپ ہیں اور آپ ہی قیصر روم کے نائب کی حیثیت سے یہاں مقیم ہیں مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت اسکندریہ کے دیوانی اور ابداری کے تمام اختیار ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہیں جو اپنے آپ کو شر کا عالم اعلیٰ کہتا ہے۔“

”ہائی پے شیا! سنبھل کے بات کرو۔“ گورنر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”اسکندریہ کی دیوانی، فوجداری اور تمام دوسرے انتظامات کا ذمہ دار میں ہوں۔ تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے یا پھر تم کسی پر غلط الزام لگا رہی ہو؟“

”مجھے کچھ ایسے ہی رد عمل کی امید تھی گورنر بہادر۔“ ہائی پے شیا بڑی بے فہمی سے بولی۔ ”لیکن میں شہر میں رہتی ہوں اور عام لوگوں سے میرا میل جول ہے جب کہ آپ اس عالیشان محل میں قید ہیں جہاں صرف وہی باتیں پہنچتی ہیں جو آپ کے نائب آپ کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے کسی نائب نے آج تک اسکندریہ کے لارڈ پادری کی بے جا حرکتوں کے بارے میں آپ کو کچھ نہ بتایا ہو گا۔“

لارڈ پادری کے نام پر گورنر چونکا۔ ”تمہارا اشارہ لارڈ پادری سائرل کی طرف

میں خوش رہتے ہیں۔“

”ہائی شیا! تمہاری گفتگو بڑی فصیح ہے۔ تم کس درس گاہ کی طالبہ ہو؟“ گورنر اسکندریہ اسے بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”عالی مقام عامل اسکندریہ۔“ ہائی پے شیا نے اپنے دونوں نقاب ایک ساتھ الٹ دیئے۔ ”میں نے اپنے نقاب اس لئے اٹھائے ہیں کہ فریادی کا چہرہ بھی فریادی ہوتا ہے۔ جہاں تک میری درس گاہ کا تعلق ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ علم ریاضی کی تعلیم میں نے اپنے گھر میں اپنے محترم باپ سے حاصل کی ہے۔ اس کے علاوہ ہیئت اور فلسفہ کا علم میں نے اپنے طور پر قدیم کتب سے حاصل کیا ہے اور اب میں اپنے گھر میں مشہور علم کو ان علوم کا درس دیتی ہوں۔ میرے حلقہ درس میں ہر عمر اور ہر مذہب کے لوگ شامل ہیں۔“

عامل اسکندریہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”تم اس عمر میں علم ہیئت اور فلسفہ کا درس دیتی ہو اور پھر بھی اپنے آپ کو طالبہ کہتی ہو؟“

”علم ایک بیکراں سمندر ہے عالی مقام عامل۔“ ہائی پے شیا نے متانت سے جواب دیا۔ ”اس سمندر کے ایک قطرے کا راز معلوم کرنے کے لئے کئی عمریں درکار ہوتی ہیں۔ میں تو ابھی ان علوم کی پہلی سیڑھی پر بھی نہیں پہنچی۔“

”بے شک۔ علم کی وسعتیں کوئی نہیں ناپ سکتا۔“ اور پھر اسکندریہ کے گورنر کی نظریں ہائی پے شیا کے سراپا میں گم ہو کر رہ گئیں۔ اس کی آواز میں جو ہمکنش تھی اس سے کہیں زیادہ جاذبیت اور کشش ہائی پے شیا کے چہرے میں تھی۔ نیلگوں جمیل کی طرح گہری آنکھیں جن سے ذہانت کی کرنیں پھونتی معلوم ہوتی تھیں۔ ستواں ناک، چھوٹا سا دہانہ اور گلاب کی طرح دکتے ہوئے رخسار۔ ہائی شیا واقعی آسمانی حور تھی۔

ہائی پے شیا نے گورنر کی محویت کا طلسم توڑا۔ ”کیا آپ مجھے اپنی داستان سنانے کی اجازت نہ مرحمت فرمائیں گے؟“

اسکندریہ کا عامل جیسے خواب سے چونکا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں سب کچھ سنوں گا۔ ہائی پے شیا مگر میں یہ سوچ کے پریشان ہو رہا ہوں کہ وہ کون ظالم

ہے؟

یہ کوئی ایسی خبر نہ ملی تھی جو اسے ان کے خلاف کرتی۔
اس نے قدرے تعجب سے ہائی پے شیا کو دیکھا۔ ”ہائی شیا! تمہاری باتیں سچ ہو
یعنی ہیں لیکن لارڈ پادری سائرل کی تم سے اس درجہ مخالفت اور نفرت صرف اس وجہ
سے نہیں ہو سکتی کہ تم اہل یسوع ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس نفرت کی وجہ کچھ اور
ہی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ تمہاری قوم کے کسی فرد نے کوئی ایسی حرکت کی ہو جس
نے لارڈ پادری کو تمہارا اس قدر مخالف بنا دیا ہو۔ تم نے اپنا مقدمہ پیش کر دیا لیکن
میں اس کا فیصلہ اس وقت کروں گا جب میں تمہاری قوم کے متعلق پوری طرح
معلومات حاصل کر لوں گا۔

”میں آپ کی ذہانت کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں گورنر بہادر۔“ ہائی پے شیا
نے بڑی صاف دلی سے کہا۔ ”میں آپ کی تعریف اس وجہ سے نہیں کر رہی ہوں کہ
آپ میرے مقدمے کے منصف ہیں یا اسکندریہ کے حاکم ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے
کہ آپ کی نظر اس نکتہ کی طرف پہنچ گئی جس کی وجہ سے لارڈ پادری میرے مخالف
ہوئے ہیں اور یہ آپ کے تدبیر کی نشانی ہے۔“

”تو کیا میں امید کروں کہ تم مجھے اس راز سے آگاہ کرو گی جو اس مقدمے کی
اصل بنیاد ہے۔“ گورنر نے کوشش کی کہ وہ اس بات کو ہائی پے شیا کی زبان سے
معلوم کرے جس کے لئے اسے دوسرے کا سہارا لینا پڑتا۔

”میں اس سے بھی پردہ اٹھائے دیتی ہوں گورنر بہادر۔“ ہائی پے شیا نے پر
مکون لہجے میں کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میری ذات کی وجہ سے میری پوری قوم کسی
مذاب میں مبتلا ہو۔“

ہائی پے شیا رک کے کچھ سوچنے لگی۔ گورنر کی بے چینی بڑھ گئی۔ اس نے
اضطراب کے عالم میں ہائی پے شیا کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ہائی پے شیا نے اسے زیادہ
انتظار میں نہ رکھا اور دہی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”یہ ان دنوں کی بات ہے جب
اسکندریہ کے لارڈ پادری تھیوفیلوس کا انتقال ہوا تھا اور ان کی جگہ ان کے بھتیجے سائرل
نے لارڈ پادری کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس موقع پر اسکندریہ کے تمام معززین اور
بہال آباد قوموں کے نمائندے لارڈ پادری کو مبارک باد پیش کرنے ان کے حضور پیش

”جی ہاں گورنر بہادر۔“ ہائی پے شیا کا لہجہ بھی ہلکا سا تلخ ہو گیا۔ ”میں اسی لارڈ
پادری کی شکایت لے کر حاضر ہوئی ہوں جو اسکندریہ کا نہ صرف سب سے بڑا مذہبی
پیشوا ہے بلکہ اس شہر میں صرف اسی کا سکھ چلتا ہے۔ عوام کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ
اسکندریہ میں قیصر روم کا کوئی نائب موجود ہے۔“

”لارڈ پادری تمہارے درس میں مغل ہوتا ہے مگر کیوں؟“ گورنر نے شاید خوا
سے سوال کیا۔ ”تم تو علم کی روشنی پھیلاتی ہو۔ انہیں دنیاوی علوم سے کیا تعلق؟“
”اگر گورنر بہادر نے یہ سوال مجھ سے کیا ہے تو اسکا جواب میرے پاس نہیں
ہے۔“ ہائی پے شیا نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

گورنر اٹھ کر بے چینی سے ٹٹلنے لگا۔ پھر قدم روک کے بولا۔ ”کیا لارڈ پادری
نے تمہیں بلا کر یہ حکم دیا تھا میرا مطلب ہے کہ یہ حکم تمہارے پاس کس طرح
پہنچا؟“

ہائی پے شیا نے جواب دیا۔ ”یہ سلسلہ کافی عرصے سے چل رہا ہے گورنر بہادر۔
دو ایک بار لارڈ پادری خود میرے مکان پر آئے تھے اور میں جو نکتے لوگوں کے سامنے
پیش کرتی ہوں انہیں آپ کے لارڈ پادری نے بھی سنا ہے مگر پتہ نہیں انہیں میرے
لیکچر اور تقریریں کیوں پسند نہیں۔ پہلے انہوں نے میرے گھر پر دو سپاہیوں کا پہرہ لگا دیا
کہ میرے پاس آنے والوں کو روکیں مگر جب لوگوں نے پھر بھی آنا نہ چھوڑا تو انہوں
نے اپنے نائب واعظ بطرس کو میرے پاس بھیجا اور اس نے مجھے سخت تاکید کی کہ اگر
میں نے یہ علم پڑھانا بند نہ کئے تو صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے ساتھ اسکندریہ کے
تمام یہودی شہر بدر کر دیئے جائیں گے۔“

اسکندریہ کے گورنر کے لئے یہ باتیں بالکل نئی تھیں۔ اسے یہ تو علم تھا کہ
یسودی ایک فتنہ پرور اور خود غرض قوم ہے اور سوائے اپنے مفاد کے کسی اور طرف
توجہ نہیں کرتی۔ عیسائی اس قوم سے اس لئے متنفر تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو
صلیب پر چڑھانے میں یہودیوں کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا مگر گزشتہ دو سال سے جب
سے اس نے اسکندریہ کی گورنری کا چارج لیا تھا۔۔۔۔۔ اسے یہودیوں کے بارے

ہمارے معاملات میں دخل دے۔ میں آج ہی سب انتظام کر دوں گا۔“
ہائی پے شیا نے گورنر کا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے واپس ہوئی۔ گورنر اسے
کچھ دیر اور روکنا چاہتا تھا لیکن یہ اس کے وقار کے خلاف تھا اس لئے اس نے
ناموشی اختیار کی۔

☆☆☆

مصر میں فرعونوں نے تقریباً پانچ ہزار سال تک بڑی شان و شوکت اور جبر و
تندد کے ساتھ حکومت کی۔ فرعونوں کا پہلا خاندان ۳۴۰۰ قبل مسیح میں برسر اقتدار
آیا۔ اس خاندان کا پہلا فرعون یا بادشاہ مینس تھا۔ اس کے بعد تین اور خاندان حاکم
رہے۔ آخر فرعونیت کا خاتمہ ۳۳۲ قبل مسیح میں سکندر اعظم کے ہاتھوں ہوا۔ ان
فرعونوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام والا فرعون بھی تھا۔ اس کا نام منفتاح اول تھا۔
اس بدبخت کا تعلق فرعونوں کے انیسویں خاندان سے تھا۔ منفتاح ۱۲۵۸ قبل مسیح
میں سریر آرائے حکومت ہوا تھا۔ اس زمانے میں بنی اسرائیل (آل یعقوب) پر بڑے
ظلم ہو رہے تھے۔ حضرت موسیٰ اس فرعون کی اصلاح پر مقرر ہوئے۔ انہوں نے بنی
اسرائیل کو مصر سے نکالا اور فرعون ان کا تعاقب کرتا ہوا غرق ہو گیا۔

سکندر کے مرنے کے بعد اس کی عظیم سلطنت جنزلوں میں تقسیم ہو گئی۔ مصر
کی سلطنت سکندریہ کے ایک جزائری بطلموس کے حصہ میں آئی اور اس کا خاندان تین
سویس تک مصر پر قابض رہا۔ اس خاندان کی آخری حاکم ملکہ کلوپٹرہ تھی جس کی
عشوہ طرازیں تمام عالم میں مشہور ہیں مگر اس کی عشوہ طرازیں ہی اسے لے ڈوبیں
اور مصر کی حکومت، سلطنت روما کا ایک صوبہ بن کر رہ گئی۔ رومنہ الکبریٰ کے قیصر
اپنے گورنروں کے ذریعہ اس پر حکومت کرتے رہے۔ پھر عیسائیت کا دور، دورہ ہوا۔
رومنہ الکبریٰ کے قیصر قسطنطین اعظم نے عیسائیت اختیار کی تو عیسائی مذہب دور دور
تک پھیل گیا۔ مصر والے بھی عیسائی ہو گئے لیکن یہاں یہودی بھی آباد تھے۔ اسکندریہ
اس وقت دارالسلطنت تھا۔ یہاں سکندر نے یہودیوں کو آباد کیا تھا اور اس وقت ان
کی تعداد چالیس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔

ہوئے۔ میرے باپ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کی جگہ میں اہل علم کی تشنگی دور کرنے
کے لئے تدریس کا کام کر رہی تھی۔ میری قوم کو مجھ پر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے
مجھے اپنا نمائندہ بنا کر لارڈ پادری کے پاس بھیجا اور یہی وہ غلطی تھی جس کا خیانہ میں
اور میری قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ پتہ نہیں میری صورت میں ایسی کیا خاص بات
تھی کہ لارڈ پادری مجھے دیکھتے ہی اپنے حواس کھو بیٹھے اور انہوں نے یہ بھی خیال نہ
کیا کہ وہ کس اہم عہدے پر فائز ہوئے ہیں اور ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔“

”پھر اس کے بعد کیا ہوا؟“ گورنر نے دلچسپی کا اظہار کیا۔
”کنیز کو زیادہ رسوا نہ کیجئے گورنر بہادر۔“ ہائی پے شیا نے سسکی بھری۔
”ہائی شیا! میرا مقصد تمہیں رسوا کرنا ہرگز نہیں۔ گورنر گھبرا گیا۔“ یہ معلوم
کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد لارڈ پادری نے تمہارے خلاف کیا قدم اٹھایا۔ میرا یہ
سوال مقدمہ کے قانونی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔“
ہائی پے شیا نے دوسری سسکی کے ساتھ کہا۔ ”گورنر بہادر، لارڈ پادری نے جو
قدم اٹھایا اس میں آپ کوئی قانونی پہلو نہ ڈھونڈ سکیں گے۔“
”خیر اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔“ گورنر کا انداز کچھ
اکھڑا اکھڑا تھا۔“

ہائی پے شیا نے گورنر کی ناراضگی فوراً محسوس کر لی۔ ”گورنر بہادر! میں آپ
سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہتی۔ اس کے بعد لارڈ پادری نے مجھے اپنے واعظ بطرس
کے ذریعے کئی بار تنہائی میں ملاقات کی دعوت دی جسے میں نے ہر بار بڑی ملامت سے
رد کر دیا ان کا خیال ہے کہ وہ مجھے پریشان کر کے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں
گے مگر یہ ان کا خیال خام ہے۔ میں اپنی عزت پر جان قربان کرنے کا فیصلہ کر چکی
ہوں۔“

گورنر بڑا متاثر ہوا۔ اس کے دل میں ہائی پے شیا کی قدر و منزل اور بڑھ گئی۔
”ہائی شیا۔ میں تمہارے عزم کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں اور تمہارے صبر کی بھی داد
دیتا ہوں۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اب تمہاری اور تمہارے
مدرسہ کی حفاظت میرا فرض ہے۔ لارڈ پادری کو یہ اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ

کہہ سکتے ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ آج ہی مجھے یہاں سے نکال باہر کرائیں۔“
سائزل اگرچہ آوارہ مزاج جوان تھا مگر اس میں بڑی ذہانت تھی۔ اس نے چچا کو
ی بات بتائی کہ وہ لرز کر رہ گیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”تمہاری
بات تو میں تسلیم کرتا ہوں۔ بعض پادری میرے مخالف ہیں کیونکہ ان کے عقائد اور
برے عقائد میں اختلاف ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے اس عمدے سے
حذل کرنا چاہتے ہیں۔ بہر حال تم اگر اچھے بھی ہو تو اپنے کو اور زیادہ اچھا ثابت
رہنے کی کوشش کرو۔“

سائزل نے فوراً ”لارڈ پادری کے ہاتھ چوم کر نیک بننے کا وعدہ کر لیا مگر بری
دشمنی مشکل سے چھوٹی ہیں۔ کچھ دن احتیاط برتنے کے بعد سائزل نے پھر وہی
بتیں شروع کر دیں۔ یہ چار سو عیسوی کا زمانہ تھا اور عیسائی دو فرقوں میں تقسیم ہو
چکے تھے اور اسکندریہ میں بھی پادریوں کے دو گروہ تھے جو ایک دوسرے کی کاٹ کرتے
ہے تھے۔ سائزل کی بدعنوانیاں بڑھیں تو لارڈ پادری تھیو فلوس کے مخالف گروہ نے
رگرفت کی اور مطالبہ کیا کہ سائزل کو گر جا سے فوراً نکال دیا جائے۔ تھیو فلوس کے
اس بھی سائزل کی کچھ ایسی شکائتیں پہنچی تھیں جنہیں وہ رد نہ کر سکا۔ اور اس نے
بور ہو کر سائزل کو گر جا سے نکال دیا۔

سائزل کا خیال تھا کہ اس نے چچا پر ایسا روغن قاز ملا ہے کہ وہ کسی شکایت پر
ان نہ دھریں گے مگر جب اسے ایک دن صاف جواب مل گیا تو اس کے ہوش اڑ
گئے۔ اس نے اپنے دوستوں کا سہارا ڈھونڈا مگر انہوں نے بھی اسے منہ نہ لگایا۔ اس
کے دوست خود غرض تھے اور سائزل کو اپنے ساتھ اس لئے رکھتے تھے کہ وہ چچا سے
لے نہ کسی بہانے رقم لے آیا کرتا تھا۔ اب وہ بے سہارا ہو گیا تھا اس لئے اسے کسی
جگہ بھی پناہ نہ ملی۔ آخر سائزل نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ سب سے
ایس ہونے کے بعد اس نے رہبانیت کا ڈھونگ رچایا۔ مذہبی تعلیم اس نے چچا سے
اصل کی تھی جو کچھ باقی تھی وہ کتابیں پڑھ پڑھ کے حاصل کر لی اور اب وہ ایک بڑا
راہب ہو گیا۔ اس نے داڑھی بڑھالی۔ سفید لباس پہنا اور دنیا کو چھوڑ کے جنگلوں
درویرانوں میں بسیرا اختیار کیا۔

اسکندریہ کا لارڈ پادری سائزل اداکل عمری میں ایک ادبش جوان تھا۔ اس
باپ سائزل کی حرکتوں کی وجہ سے سخت پریشان تھا۔ اس نے بیٹے کو سمجھانے کی بڑی
کوشش کی مگر سائزل کا حلقہ احباب اسکندریہ کے ان جوانوں کا تھا جو پورے شرمیر
بدنام تھے اور معززین انہیں اپنی محفلوں میں بلانے سے گریز کرتے تھے۔ باپ کی تہا
تر کوششوں کے باوجود جب سائزل نہ سدھر سکا تو اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ اب اس
کے لئے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ کچھ روز تو دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا رہا مگر
جب فاتے ہونے لگے تو وہ اپنے چچا تھیو فلوس کے پاس گیا۔ تھیو فلوس ایک دیدار
انسان تھا اور ان دنوں اسکندریہ کے لارڈ پادری کے جلیل القدر عمدے پر فائز تھا۔
چونکہ لارڈ پادری کو شادی کی اجازت نہ ہوتی تھی اس لئے اس کے چچا نے رحم کھا کر
سائزل کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اسے گر جا میں رہنے کی اجازت دے دی مگر سائزل تو ایک
شیطان صفت جوان تھا۔ چچا اسے مذہبی تعلیم دیتا تھا اور وہ گر جا میں نماز کے لئے آنے
والی دو شیڑاؤں کو چھیڑتا رہتا تھا۔

سائزل کی بد اعمالیاں اور چہرہ دستیال حد سے بڑھ گئیں اور اس کی شکائتیں
اس کے چچا لارڈ پادری تک پہنچیں تو اس نے ایک دن سائزل کو سختی سے تنبیہ کی۔
”سائزل! میں نے تجھے اس لئے پناہ نہیں دی ہے کہ تو مجھے بدنام کرے۔ اپنے کردار کو
درست کر ورنہ تجھے یہاں سے بھی نکلنا پڑے گا۔“

اور سائزل نے سوکھا سامنہ بنا کر جواب دیا تھا۔ ”محترم فادر! لوگوں نے میری
غلط شکائتیں کی ہیں۔ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ میں گر جا میں عزت حاصل کروں اور پھر
کسی بڑے عمدے تک پہنچوں۔“

پادری تھیو فلوس نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ”سائزل! آخر لوگ تیرے مخالف
کیوں ہیں اور تجھے وہ کون سا عمدہ ملنے والا ہے جس کی وجہ سے وہ تیرے مخالف
ہیں؟“

”آپ نے مجھے اپنا بیٹا بنایا ہے فادر۔ کیا ان کی مخالفت کی یہ وجہ کچھ کم ہے؟“
سائزل نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ ”دراصل آپ کے مخالف پادریوں کا گروہ آپ کو
اس عمدے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ جب وہ آپ کے دوست نہیں تو پھر مجھے کیسے اچھا

دنیا میں ضعیف العقیدہ لوگوں کی کمی نہیں۔ وہ تو اپنے گناہ کم کرنے کے لئے پادریوں اور راہبوں کی نگاہ کرم کے متلاشی ہوتے ہیں۔ چند ہی دنوں بعد سائرل کے عقیدت مندوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ سائرل آبادی میں بہت کم آتا مگر اس کے عقیدت مند اسے جنگلوں اور ویرانوں میں گھیر لیتے۔ سائرل اپنے اس روپ پر بہت خوش تھا جس وقت لوگ اس کے قدم چومتے اور اس کے سامنے سر جھکاتے تو اس کا سر غرور سے بلند ہو جاتا۔ اس نے ایک باعزت مقام حاصل کر لیا تھا مگر جب وہ تنہائی میں سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے تو اس کے دل سے ایک ہوک اٹھتی اور یہ تنہائی اسے کانٹے کو دوڑتی۔ اس نے تو دنیا کو حاصل کرنے کے لئے دنیا کو چھوڑا تھا لیکن وہ تو ویرانے کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی رنگین اور کوئی خوشی نہ تھی۔ کسی وقت تو اس کی طبیعت ایسی گھبراتی کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس جھوٹے پندار کو توڑ کے پھر زندگی کے ہنگاموں میں شامل ہو جائے مگر اس نے یہ مقام حاصل کرنے کے لئے جو محنت اور ریاضت کی تھی وہ اس کے قدم روک لیتی اور ایک بہتر اور خوشنما مستقبل کے تصور سے دل کو تسلی دے لیتا۔

سائرل نے پانچ سال اس کرب مسلسل میں گزار دیئے۔ اس کا چچا اسکندریہ کا لارڈ پادری تھیو فلوس کافی بوڑھا ہو گیا۔ تھیو فلوس کو اس کے ہمدردوں نے اطلاع دی تھی کہ سائرل کی کایا پلٹ ہو گئی ہے اور اب وہ ایک راہب بن گیا ہے۔ اس کے عقیدت مندوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ تھیو فلوس اس سے بہت خوش ہوا۔ جوں جوں وہ بوڑھا ہو رہا تھا اس کا مخالف گروہ اتنا ہی طاقتور ہوتا جا رہا تھا۔ فلوس کو اس وقت ایک مضبوط سارے کی ضرورت تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سائرل کو پھر بلائے گا اور کوشش کرے گا کہ اس کے بعد سائرل اس کے عہدے پر فائز ہو جائے مگر یہ کام بڑا مشکل تھا۔ اسکندریہ کے فوجی اور دوسرے حکام تھیو فلوس کے مخالف گروہ کے ہمدرد تھے۔ عوام کی ہمدردیاں ضرور تھیو فلوس کے ساتھ تھیں۔ ایک شب وہ گر جاس سے سائرل کو بے عزتی کے ساتھ نکالا گیا تھا۔ اسی گرجا میں لارڈ پادری تھیو فلوس نے اس کا استقبال کیا۔ تھیو فلوس نے سائرل کو بڑی خاموشی سے گر جاس میں بلایا تھا۔ اس نے سائرل کے لئے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا تھا۔

نیل نے تھیو فلوس کے سامنے پہنچ کے حسب عادت اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور موشی سے سر جھکا کے کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ سائرل کو کسی کے سامنے سر جھکانا عجیب سا رہا تھا کیونکہ اب تو لوگ اس کے سامنے سر جھکاتے تھے۔

”میرے بچے! میرے بیٹے سائرل۔“ لارڈ پادری کی آواز بھرانے لگی۔ اس پر نٹ طاری ہو گئی۔

”فادر! آپ کو کیا ہوا فرمائیے۔ مجھے آپ نے کیوں طلب کیا ہے؟ میں آپ کا ہوں۔ بیٹا ہوں۔ مجھے حکم دیجئے میں آپ کے لئے جان تک دے سکتا ہوں۔“

نیل نے اپنی چرب زبانی سے تھیو فلوس کو ایک ہی جملے میں مرعوب کر دیا۔

”میں تمہارا گناہ گار ہوں سائرل۔ مجھے معاف کر دو تم۔“ پادری کے اٹک رہی ہو گئے تھے۔

”فادر! آپ معافی کا لفظ استعمال کر کے مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔ خداوند یسوع مسیح کی قسم مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ آپ ہی تو میرے سب کچھ ہیں۔ میری ماں پہلے ہی مرجی ہے۔ باپ ابھے تھے یا برے مگر تھے تو میرے ہی مگر اب وہ بھی تو ہیں رہے۔ میں صرف آپ کے پیکر میں اپنے تمام عزیزوں کو دیکھتا ہوں۔ آپ کی لاؤں سے مجھے سب کچھ مل گیا مگر میں خود کو اب بھی یتیم اور بے سارا سمجھتا ہوں۔ برے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں۔“

چالاک اور شاطر سائرل نے موٹے موٹے آنسو بہانا شروع کر دیئے۔ لارڈ پادری نے جلدی سے آگے بڑھ کے سائرل کو سینے سے لگا لیا۔ ”سائرل! تو بے سارا لب ہے۔ تیرے سر پر میرا جو ہاتھ ہے۔“ لارڈ پادری نے اسے سینے سے ہٹا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”آنسو پونچھ ڈال سائرل! تو میرا بیٹا ہے اور میں تجھے دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرنا چاہتا ہوں جس طرح اپنے حقیقی بیٹے کو پیش کرتا۔“

”فادر!“ سائرل نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دنیا سے کچھ نہ ملا اس لئے میں نے اسے ٹھکرا دیا ہے۔ میں جنگلوں اور ویرانوں میں خوش ہوں لیکن آپ کا انہار ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے اسے بسر و چشم بجا لاؤں گا۔“

”شاباش سائرل! مجھے تم سے ایسی ہی تابعداری کی امید تھی۔“ لارڈ پادری تھیو

فلوس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تو میرے ساتھ گرجا میں رہ میرے بعد میری جگہ سنبھال۔“

سائزل بوکھلا گیا۔ لارڈ پادری نے اسے ایک بار پھر سینے سے لگایا۔ ”سائزل، دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے تمہارے جیسے سمجھدار جوان کی ضرورت ہے۔ اپنے تمام جھگڑے نمٹا کے میرے پاس آ جاؤ۔ تم نے اپنی کوشش سے جو مقام حاصل کیا ہے اس کے پیش نظر کس میں ہمت ہے کہ تمہاری مخالفت کر سکے۔“

”آپ فکر نہ کیجئے فادر۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کے راستے کے تمام کار ہٹا دوں اور آپ امن و سکون کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض ادا کرتے رہیں۔“

شاطر سائزل نے فوراً حائی بھر لی۔ اس وقت دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ لارڈ پادری اپنے مخالف گروہ کو سائزل کے ذریعے دبانا چاہتا تھا اور سائزل کی آنکھوں میں اسکندریہ کی لارڈ شپ رقص کر رہی تھی۔ طے یہ ہوا کہ سائزل اگلی اتوار کو گرجا میں حاضر ہو کر عوام کے ساتھ نماز ادا کرے گا اور لارڈ پادری اس وقت سائزل کو اپنے ساتھ رکھنے کا اعلان کر دے گا۔ سائزل جس خاموشی سے آیا اسی خاموشی سے اپنے مسکن کی طرف لوٹ گیا پھر اگلی اتوار کو وہ جس شان سے اسکندریہ میں داخل ہوا وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ آگے آگے سائزل ایک چاندی صلیب اٹھائے چل رہا تھا اور اس کے جلو میں اس کے تقریباً ایک ہزار عقیدت مند تھے۔ یہ جلوس عین نماز کے وقت گرجے میں داخل ہوا۔ لارڈ پادری کے مخالفوں کو آنکھیں پھٹی رہ گئیں ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ تھیو فلوس کا آوارہ اور بدکار بھتیجا ایک بڑا راہب بن جائے گا۔

سائزل نے عوام کے ساتھ نماز ادا کی اور لارڈ پادری نے وعدہ کے مطابق اعلان کر دیا کہ اس کے بھتیجے سائزل نے پچھلے گناہوں سے توبہ کر کے حق کا راستہ اختیار کر لیا ہے اس لئے اب وہ گرجا میں اس کے ساتھ رہے گا اور اسکندریہ کے عوام کو اپنے وعظ اور خطبوں سے مستفید کرے گا۔ عوام سائزل کی شان و شوکت سے پہلے ہی متاثر ہو گئے تھے۔ اس لئے انہوں نے لارڈ پادری کے اس اعلان پر اپنی خوشی کا اظہار کیا اور لارڈ پادری کے مخالفوں کو زبان کھولنے کی جرات نہ ہو سکی۔ دوسری

ی اتوار کو سائزل نے ایک ایسا عظیم الشان وعظ دیا کہ عوام عش، عش کر اٹھے اور ہر طرف سائزل کی دھوم مچ گئی۔ لارڈ پادری کو سائزل کی چرب زبانی اور لسانی کا پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہی سسی کسرنے اس کے وعظ نے پوری کر دی۔

”سائزل۔“ لارڈ پادری نے اس سے تنہائی میں کہا۔ ”بلاشبہ، تم میں لارڈ پادری ہونے کی پوری صلاحیت موجود ہے لیکن ہر نئے لارڈ پادری کا انتخاب اسکندریہ کے گرجوں کے تمام پادری مل کے کرتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہاں کے زیادہ پادری عیسائیوں کے دوسرے عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ میرے خلاف ہیں۔ اس لئے تمہیں اپنے انتخاب کے لئے سخت مقابلہ کرنا پڑے گا جس کے لئے تم ہر حربہ استعمال کر سکتے ہو۔“

”خداوند یسوع مسیح کا سایہ رہتی دنیا تک آپ پر قائم رہے۔“ سائزل نے شاطرانہ انداز اختیار کیا۔ ”ابھی یہ باتیں سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ اگر پادریوں کا بڑا گروہ آپ کے خلاف ہے تو آپ کو فکر نہ کرنا چاہئے کہ کیونکہ سب سے بڑا گروہ عوام کا ہوتا ہے۔ ملک کی اصل طاقت عوام ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے پر کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔“

لارڈ پادری نے دل ہی دل میں سائزل کی عقلمندی کی داد دی۔ ”تم ٹھیک کہتے ہو بیٹے مگر عوام کو ساتھ لانے کیلئے بھی تو تمہیں ابھی سے اپنی کوششیں شروع کر دینا چاہئے کیونکہ عقلمندوں کا قول ہے کہ سیلاب کی روک تھام کے لئے پشتوں کو پہلے ہی مضبوط کر لینا چاہئے۔“

”بجا فرمایا آپ نے فادر۔“ سائزل نے یوں کہا جیسے وہ فادر کی تائید کر رہا ہو حالانکہ یہ بات تو خود اس کے ذہن میں تھی۔ ”میری زندگی کا مقصد آپ کے ذہن کو سکون پہنچانا ہے۔ میں صرف وہی قدم اٹھاؤں گا جسے آپ کی تائید حاصل ہو۔“

اس گفتگو کے بعد سائزل بڑے بے چینی سے اپنے چچا کی موت کا انتظار کرنے لگا کیونکہ وہ اپنی طاقت کا اظہار اس وقت ہی کر سکتا تھا جب انتخاب کا موقع آئے اور یہ انتخاب لارڈ پادری کے مرنے کے بعد ہی ہوتا تھا۔ سائزل اب ہفتے میں کئی کئی بار وعظ کرتا۔ وہ اکثر گرجا سے نکل جاتا اور شہر کے کسی گمنجان بازار کے کھڑے ہو کر

لما ہے۔ عوام پوری طرح اس کے ساتھ تھے اور گرجا کے پادری اس کی چالوں سے
ن قدر خائف تھے کہ جب اس نے پادریوں سے کہا کہ وہ اس کے حق میں آواز بلند
کریں تو انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا وعدہ کر لیا مگر جس پادری کو اس کے
مقابلے میں کھڑا کیا گیا تھا اسے فوجی اور سول حکام کا تعاون حاصل تھا۔ پھر وہ سائل
سے کیوں دیتا۔ اسے اپنی کامیابی کی پوری امید تھی کیونکہ ان دونوں حکام کے سامنے
عوام کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

سائل بڑا چالاک اور مرگ باراں دیدہ تھا۔ اس نے حالات کا بغور مطالعہ کیا
اور پھر ایسا منصوبہ بنایا کہ عین انتخاب کے دن جب گرجا میں تمام فوجی اور سول حکام
اور دوسرے پادری جمع ہوئے تو دس ہزار مسلح عوام گرجا میں زبردستی گھس آئے اور
انہوں نے اعلان کیا کہ اگر واعظ سائل کو لارڈ پادری نہ منتخب کیا گیا تو وہ گرجا میں
موجود تمام لوگوں کو قتل کر دیں گے۔ عوام کے جوٹیلے نعروں سے گرجا کے در و دیوار
کانپنے لگے اور سائل کے مخالفین نے مجبور ہو کر سائل کو لارڈ پادری تسلیم کر لیا۔
اس طرح سائل بزور شمشیر اسکندریہ کا لارڈ پادری بن گیا۔ اس نے یہ عمدہ سنبھالتے
ہی اسکندریہ کے دیوانی اور فوجداری اختیار سنبھال لئے اور شہر کا انتظام بھی اپنے ہاتھ
میں لے لیا۔ اسی کا حکم ہر جگہ چلتا تھا۔

اسکندریہ کا جوان عمر رومی گورنر کچھ ہی عرصہ پہلے یہاں آیا تھا۔ اسے سائل
کی دیدہ دلیریوں کا کوئی علم نہ تھا۔ پھر اسے سلطنت روم کی طرف سے حکم تھا کہ وہ
گرجا کے معاملات میں دخل نہ دے۔ اس لئے اس نے لارڈ پادری پر کوئی توجہ نہ دی
تھی۔ مگر جب ہائی پے شیا نے اسے اسکندریہ اور سائل کے حالات سے آگاہ کیا تو
اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ برائے نام گورنر ہے اور
اصل اختیارات سائل کے پاس ہیں۔ یہ اس کی بہت بڑی توہین تھی۔ دوسرے وہ پہلی
ہی نظر میں ہائی پے شیا کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو گیا تھا۔ ان دونوں باتوں نے اسے
سائل کے خلاف سخت اقدام پر آمادہ کر دیا۔

سائل کا بھی اب تک گورنر سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ ان میں ایک دو بار رسمی
مفتگو ہوئی تھی اور گورنر نے اسے ایک مذہبی پیشوا سمجھتے ہوئے پوری عزت دی

وعظ دینے لگتا۔ کہتے ہیں کہ دانشور دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک پڑھے ہوئے
دوسرے کڑھے ہوئے۔ سائل پڑھا ہوا تھا اور مذہبی باریکیوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔
اس لئے کہ اس نے اپنی آوارگی کے زمانے میں بڑے تجربات حاصل کئے تھے اور
انسانی ذہن کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کن نکتوں کے اظہار سے
عوام کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ عوام کے بھڑکنے
ہوئے جذبات سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

پھر وہ وقت بھی آگیا جس کا سائل کو انتظار تھا۔ اسکندریہ کا لارڈ پادری اس
دنیا کو چھوڑ گیا۔ پتہ نہیں وہ طبعی موت مرا تھا یا اسے زہر دیا گیا۔ ایک روایت سے تو
یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدس مریم کے قد آدم بت والے اس گرجے کے لارڈ پادری کو
اس کے بھتیجے نے زہر دے کر مار ڈالا تھا مگر اس کی تحقیق کون کرتا۔ گرجا کے تمام
پادری اس عظیم عہدے کے امیدوار تھے۔ سائل کی طرح ان کی بھی یہ خواہش تھی
کہ تھیو فلو س اس دنیا سے رخصت ہو تو وہ اپنا اپنا دعویٰ پیش کریں۔ جیسا کہ پہلے کہا
گیا ہے کہ مصر میں آباد رومی دو گروں میں تقسیم تھے۔ ان میں سے ایک گروہ ازارقہ
یعنی آسمانی رنگ والا اور دوسرا خاضرہ یعنی سبز رنگ والا کہلاتا تھا۔ ان میں صدیوں سے
چچقلش چلی آرہی تھی۔ اسکندریہ میں بھی ان کے جھگڑے ہوا کرتے تھے اور اکثر یہ
خانہ جنگی خطرناک صورت اختیار کر لیتی تھی۔ پس ان دونوں گروہوں سے ایک ایک
امیدوار سامنے آیا۔

سائل یوں تو بہت مشہور تھا۔ اس نے اپنے خطبوں اور وعظوں سے عوام کو
قابو میں کر لیا تھا مگر فوجی اور سول حکام اسے پسند نہ کرتے تھے۔ اسکندریہ کے بیشتر
پادری بھی نہیں چاہتے تھے کہ اقتدار سائل کے ہاتھ میں آئے کیونکہ سائل کسی کو
خاطر میں نہ لاتا تھا۔ وہ لارڈ پادری کی زندگی ہی میں اپنی من مانی کرنے لگا تھا۔ لارڈ
پادری کی جگہ زیادہ دن تک خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے جیسے ہی سائل نے اپنے
لئے کوشش کی اس کے مخالف فوجی افسروں اور سول حکام نے ایک بوڑھے پادری کو
اس کے مقابلے پر کھڑا کر دیا اور انتخاب کے لئے ایک دن بھی مقرر کر دیا گیا۔

سائل کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کے مقابلے پر گرجا کا کوئی پادری کھڑا ہو

فوجی نے بطریق کو سلام تو کیا مگر اپنی جگہ سے نہ ہٹا اور نہ اسے اندر جانے کا
 نہ دیا۔ فوجی کے سلام کرنے سے بطریق کا کچھ حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے قدم
 لے پھرایا۔

”معزز پادری! آگے بڑھنے کی کوشش نہ کیجئے۔“ فوجی مزاحم ہو گیا۔
 مغرور بطریق کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ مگر ضبط کر کے نرمی سے بولا۔ ”میں
 رپادری سائرل کا قاصد ہوں۔“

بطریق نے فوجی کو نکھیلوں سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ لارڈ پادری سائرل کے
 ام سے فوجی مرعوب ہو کر راستہ چھوڑ دے گا لیکن فوجی اپنی جگہ سے مطلق نہ ہٹا۔
 ”عزز پادری! اگر آپ کو صاحب خانہ سے ملنا ہے تو درس کے وقت تشریف لائیے۔
 اس سے پہلے یا بعد میں کسی کو اندر جانے کا حکم نہیں۔“

”یہ حکم کس کا ہے بہادر فوجی؟“ بطریق نے مصلحت سے کام لیا۔ ”صاحب خانہ
 ایہ اختیار کس نے دیا کہ وہ رومی فوجیوں کو ایسا حکم دے؟“
 ”آپ غلط سمجھ رہے ہیں معزز پادری۔ ہم صرف اسکندریہ کے فوجی گورنر کا
 حکم مانتے ہیں۔ آپ واپس جاسکتے ہیں۔“

”مگر مجھے لارڈ پادری کا ایک ضروری پیغام ہائی پے شیا کو پہنچانا ہے۔“

”بغیر اجازت نامے کے آپ اندر نہیں جاسکتے معزز پادری۔“

”کس کا اجازت نامہ چاہئے؟“ بطریق چڑ کے بولا۔

”اسکندریہ کے گورنر بہادر کا جو مصر کے رومی حاکم ہیں۔“

”میرے پاس لارڈ پادری سائرل کا حکم ہے اور اسکندریہ کا انتظام ان کے ہاتھ

میں ہے۔“

”پادری۔“ فوجی چیخ اٹھا۔ ”اس قسم کی بکواس کرنے سے تمہارا کیا مقصد ہے۔“

میں اس دسے کا سردار ہوں اور اسکندریہ کا کوئی شخص اس وقت تک مکان میں داخل
 نہیں ہو سکتا جب تک اس کے پاس خصوصی اجازت نامہ نہ ہو۔ لارڈ پادری کے
 اختیارات مذہبی معاملات تک محدود ہیں۔ ان کا یہ منصب نہیں کہ وہ شہری انتظامات
 میں دخل دیں۔“

تھی۔ سائرل لارڈ پادری ہونے کی وجہ سے شادی کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اسی لئے وہ حیلے
 بہانوں سے ہائی پے شیا کو گرجا میں بلواتا تھا مگر ہائی پے شیا بھی حیلے بہانے سے کام لیتی
 اور اب تک اس نے گرجا کی چار دیواری میں قدم نہ رکھا تھا۔

یہ زمانہ ہائی پے شیا کے دور شباب کا تھا۔ یہ پری پیکر اور پری جمال، ماہ و ش
 نازنین اپنے حسن صورت، حسن سیرت علم و فضل اور فصاحت و بلاغت میں ناخند
 روزگار تھی۔ چہرے سے نقاب اٹھاتی تو دیکھنے والوں کے دل دھڑکنے لگتے۔ لب کشا
 ہوتی تو منہ سے جیسے پھول جھڑتے اور علم و دانش کے نکتے بیان کرتی تو سننے والے
 حیران رہ جاتے۔ اس نے مختلف علوم پر کئی کتابیں لکھی تھیں۔ اسکندریہ کے مدرسے
 کے علاوہ ہائی پے شیا، مدرسہ اشیشیلہ میں بھی درس دیتی تھی۔ ہائی پے شیا کی شہرت کا
 یہ عالم تھا کہ مصر کے عوام اور خواص کے علاوہ یونان اور ایشیا کے مختلف ممالک سے
 لوگ اسے دیکھنے اور اس کی گفتگو سننے آیا کرتے تھے۔ اتوار کے دن گرجا گھر میں اس
 قدر مجمع نہ ہوتا تھا جتنا ہجوم ہائی پے شیا کے گھر پر روز ہوا کرتا تھا۔ سائرل یہ سب کچھ
 دیکھتا اور کڑھا کرتا تھا۔ طرہ یہ تھا کہ اسکندریہ والے ہائی پے شیا کو زہرہ جیوں کے نام
 سے پکارنے لگے تھے اور وہ دیوی زہرہ کا مقام حاصل کرتی جا رہی تھی۔

آج سائرل نے اپنے نائب بطریق کو ہائی پے شیا کے گھر ان ہدایات کے ساتھ
 بھیجا کہ وہ ہائی پے شیا پر یہ بات واضح کر دے کہ اگر اس نے گرجا آکر اپنے اعمال
 اور کردار کی وضاحت نہ کی تو اسے گرفتار کر کے اس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا جائے
 گا مگر جب بطریق اس کے دروازے پر پہنچا تو اس نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ ہائی
 پے شیا زہرہ جیوں کے مکان کے گرد اسکندریہ کے گورنر کا ایک فوجی دستہ پہرہ دے رہا
 تھا۔ بطریق اس صورت حال سے خاصا پریشان ہوا۔ وہ دروازے پر پہنچا تو ایک فوجی
 اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

”میں اسکندریہ کے بڑے گرجا کا واعظ بطریق ہوں۔“ بطریق نے گھبراتے ہوئے
 کہا۔

فوجی نے فوراً ”بطریق کو ادب سے سلام کیا۔“ میں بزرگ پادری کو سلام پیش
 کرتا ہوں۔“

ہم پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے گفتگو کی اجازت مرحمت فرمائیں گی؟“

ہائی پے شیا۔ بطرق کے بدلے ہوئے لب و لہجے پر متعجب ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لئے لارڈ پادری کا یہ پہلا پیغام نہ تھا لیکن بطرق کے بدلے ہوئے لہجے نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے نرمی سے کہا۔ ”معزز پادری! اگر لارڈ پادری کا وہی پیغام ہے جسے آپ پہلے بھی کئی بار لاکھ ہیں تو میں اس کا جواب پہلے بھی کئی بار دے چکی ہوں۔ ہاں اگر کوئی اور اہم پیغام ہے تو میں اسے سننے پر تیار ہوں۔“

”لارڈ پادری کا پیغام دراصل آپ کے لئے مفید ثابت ہو گا۔“ بطرق خوفزدہ ہونے کے باوجود اس تک لارڈ پادری کا پیغام پہنچانے پر بغض نظر آتا تھا۔ ”اب آپ کو اختیار ہے کہ آپ چاہیں تو پیغام وصول کریں یا مجھے واپس بھیج دیں۔“

ہائی پے شیا اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔ ”اسکندریہ کے لارڈ پادری میرے لئے بھی قابل احترام ہیں۔ میں ان کا پیغام ضرور سنوں گی۔ آپ اندر تشریف لے آئیے۔“ پھر اس نے رومی سردار کی طرف دیکھا۔ ”براہ کرم آپ انہیں اندر آنے دیجئے۔“

بطرق کو راستہ مل گیا اور وہ ہائی پے شیا کے پیچھے پیچھے اس کے مہمان خانے میں پہنچ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ تشریف رکھئے اور اطمینان سے بیان کیجئے کہ لارڈ پادری نے میرے مفید مطلب کیا پیغام دیا ہے؟“

بطرق نے اس دوران اپنے کو گفتگو کے لئے تیار کر لیا تھا۔ وہ ہائی پے شیا کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور الفاظ تولتے ہوئے بولا۔ ”زہرہ جی! بطرق نے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔“ آپ تو جانتی ہیں کہ لارڈ پادری کس قدر صاحب اقتدار شخصیت ہیں۔ دیوانی، فوجداری اور شر کے تمام انتظامات ان کے ہاتھ میں ہیں۔“

ہائی پے شیا نے الجھتے ہوئے قطع کلام کیا۔ ”معزز پادری! آپ وہ پیغام بیان کیجئے جس کے لئے آپ کو میرے پاس بھیجا گیا ہے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ یہ میرا

بطرق سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ فوجی سردار کی آواز اس قدر گرجدار تھی وہ زہرہ جیوں ہائی پے شیا کے مکان کے احاطے سے گزر کر رہائشی حصے تک پہنچ گئی تھی اور وہ گھبرا کر دروازے پر آگئی تھی۔ زہرہ جیوں نے ایک ہی نظر میں صورت حال کا اندازہ کر لیا۔ وہ جب گورنر سے مل کے واپس آئی تھی تو اس کے ساتھ ہی رومی دستہ اس کے گھر پر پہنچ گیا تھا۔ دستے کے سردار نے اسے اطمینان دلایا تھا کہ وہ دل میں کسی قسم کے خوف و دہشت کو جگہ نہ دے۔ اسکندریہ کا کوئی شخص اس وقت تک اس کے مکان میں داخل نہ ہو سکے گا جب تک وہ گورنر سے اجازت نامہ نہ حاصل کر لے یا پھر ہائی پے شیا خود اسے اندر آنے کی اجازت دے۔

”کیا ہوا سردار؟ آپ شاید کسی پر بگڑ رہے تھے؟“ زہرہ جیوں سب کچھ سمجھتے ہوئے انجان بن گئی۔ اس نے بطرق کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا حالانکہ وہ سردار کے قریب ہی کھڑا تھا۔

سردار کا غصہ اب تک کم نہ ہوا تھا۔ زہرہ جیوں کی آواز پر اس نے چونک کے دیکھا پھر بطریق کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”معزز خاتون! یہ شخص اپنے آپ کو لارڈ پادری کا قاصد کہتا ہے اور بغیر خصوصی اجازت کے اندر داخل ہونا چاہتا ہے۔ براہ کرم اسے بتائیے کہ رومی گورنر کی حکم عدولی کتنا بڑا جرم ہے۔“

اب زہرہ جیوں نے نظریں گھما کر بطرق کو دیکھا اور ہونٹوں پر زبردستی کا تبسم لاتے ہوئے بولی۔ ”ارے آپ پادری بطریق! خیریت تو ہے۔ آپ نے کیسے زحمت فرمائی؟“

بطریق کا خوف سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے آج تک کسی کی ڈانٹ نہ سنی تھی۔ سائزل کا نائب ہونے کی وجہ سے حکم دینا اور حکم چلانا اس کا کام تھا۔ پہلی بار اس کا ایک فوجی سے سابقہ پڑا تھا اور فوجی بھی ایسا اکھڑا کہ جس نے بطرق کے منجے ادھیڑ کے رکھ دیئے تھے۔ زہرہ جیوں کی مسکراہٹ اور نرم آواز نے اس کے زخمی دل پر مرہم کا کام کیا تھا۔

”معزز زہرہ جیوں ہائی پے شیا۔“ بطرق نے بڑے ادب سے عوامی خطاب ”زہرہ جیوں“ کے ساتھ پہلی مرتبہ اسے مخاطب کیا۔ ”میں آپ کے پاس لارڈ پادری کا ایک

مطالعہ کا وقت ہے اور مجھے ان اوقات میں کسی کی مداخلت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ امید ہے کہ آپ مختصر گفتگو فرمائیں گے؟“

”بالکل، بالکل۔ میں آپ کا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“ بطرق نے فوراً کہا۔ ”لارڈ پادری یہ پسند نہیں کرتے کہ اسکندریہ میں کسی قسم کا فساد ہو یا بے چینی پھیلے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ان کی ذمہ داریوں سے اچھی طرح واقف ہیں؟“

”پادری صاحب۔“ ہائی پے شیائے ناگوار انداز میں جواب دیا۔ ”لارڈ پادری اسکندریہ کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا ہیں اور میرے درس و تدریس کو کسی مذہب سے بھی کوئی علاقہ نہیں پھر آپ مجھے کیا باور کرانا چاہتے ہیں اور لارڈ پادری کی ذمہ داریوں کا حوالہ کیوں دے رہے ہیں؟“

”ناراض نہ ہوں زہرہ جی۔“ بطرق نے فوراً بات سنبھالی۔ ”لارڈ پادری تو آپ کے علم و فضل کے قدر دان ہیں اسی وجہ سے وہ نہیں چاہتے کہ آپ کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ رہی ہوں۔ آخر آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟“ بطرق ذرا سا کھلا۔ ”زہرہ جی! آپ کا میدان ریاضی، فلسفہ اور علم ہیئت ہے۔ اس کی درس و تدریس بھی ایک اہم کام ہے لیکن بعض بدطینت آپ پر طرح طرح کے الزام لگائے جا رہے ہیں جس سے آپ کی ذات پر اثر پڑ سکتا ہے؟“

”مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ کون الزام لگا رہا ہے اور کیا الزام لگائے جا رہے ہیں؟“ ہائی پے شیائے لہجہ سخت ہو گیا۔

بطرق کو بات بڑھانے کا موقع مل گیا۔ ”زہرہ جی! میں تفصیل تو نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور علم ہے کہ لارڈ پادری کے پاس مختلف ذرائع سے یہ شکایت پہنچی ہے کہ آپ درس و تدریس کے پردے میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی ہیں۔ لارڈ پادری کو اس بات کا یقین نہیں تھا۔ خود میں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ زہرہ جی! بوجہ غیر مذہب ہونے کے سیاست میں حصہ نہیں لے سکتیں کیونکہ وہ ایک عالمہ اور فائدہ خاتون ہیں ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ سیاست جیسے فضول کام میں حصہ لیں۔“

سیاست کا نام سن کر ہائی پے شیائے گھبرا گئی مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور ن سے جواب دیا۔ ”میں آپ کی ہمدردی کی شکرگزار ہوں معزز پادری۔ میں اس وقت کی وفادار ہوں اور ملکی قوانین کا اسی طرح احترام کرتی ہوں جس طرح لوگ۔ یہ سراسر بہتان ہے۔ میں اس الزام کی سختی سے تردید کرتی ہوں۔“

”میرا اور لارڈ پادری کا بھی یہی خیال ہے زہرہ جی۔“ بطرق نے بڑی فراخ دلی سے تائید کی۔ ”یہ سراسر الزام اور بہتان ہے۔“

ہائی پے شیائے بڑی حیرت سے بطرق کو دیکھا۔ ”معزز پادری! جب آپ اور پادری میری طرف سے مطمئن ہیں تو پھر جھگڑا کیسا۔ لارڈ پادری مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”صرف یہ کہ آپ لارڈ پادری کے سامنے اپنی صفائی پیش کر کے لوگوں کی میں بند کر دیں۔“

ہائی پے شیائے چونک پڑی۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا اور تیوریاں چڑھ گئیں۔ ”اس کا لب ہے کہ مجھے گرجا میں جا کر لارڈ پادری کے سامنے پیش ہونا ہو گا؟“

بطرق نے ہائی پے شیائے کا متغیر چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے فوراً بولا۔ ”ہاں ہائی پے شیائے، صرف ایک بار لارڈ پادری سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ مطمئن ہو جائے گا اور بات ہمیشہ کے لئے ختم۔“

”اور مجھے تنہا ملنا ہو گا؟“

”بالکل۔ الزام صرف آپ پر لگا ہے۔ کسی دوسرے کو خواہ مخواہ ساتھ لے جانے کی ضرورت ہے؟“ واعظ بطرق اپنی رو میں کہتا چلا گیا۔

”پادری بطرق۔“ ہائی پے شیائے اس زور سے چیخی کہ بطرق گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ مارے اور تمہارے لارڈ پادری کے ہتھکنڈوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ میں لارڈ پادری کی ان ابوالوس آنکھوں کو دیکھ چکی ہوں جن میں شیطان کوٹھیں لیتا ہے۔ انہیں اپنے مقدس عہدے کا احترام ملحوظ رکھنا چاہئے۔ ان سے کہہ دینا کہ ہائی پے شیائے ان لڑکیوں میں نہیں جو طاقت سے مرعوب ہو کے اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہیں۔ اس لئے پہلے دن گرجا جانے سے انکار کیا تھا۔ میرا انکار اب تک قائم ہے اور اس

انکار کو دنیا کی کوئی طاقت اقرار میں نہیں تبدیل کر سکتی۔ ان سے یہ بھی کہنا کہ اسکندریہ اور مصر کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ ان کا واحد مالک اسکندریہ کا رومی گورنر ہے۔ اگر کسی کو مجھ پر سیاست یا بغاوت کا شبہ ہے تو وہ گورنر اسکندریہ کے سامنے مقدمہ پیش کرے۔ کسی پادری کا یہ کام نہیں کہ وہ شہر کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑائے۔ اب تم جاسکتے ہو بطرق۔“

ہائی پے شیا نے فوراً اپنی پیٹھ بطرق کی طرف کر لی اور تیز قدموں سے مہمان خانہ پار کر کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بطرق حیران، حیران نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اسے ہمت نہ ہوئی کہ وہ ہائی پے شیا کو روکے یا اس سے کوئی مزید گفتگو کرے۔ ہائی پے شیا کے غصے سے وہ گھبرا گیا تھا۔

ہائی پے شیا کے گھر سے نکل کر بطرق، لارڈ پادری کے پاس پہنچا۔ آج اس کی بڑی بے عزتی ہوئی تھی۔ ”لارڈ پادری۔“ بطرق نے غصے سے کہا۔ ”آپ نے مجھے اس یسودن کے پاس بھیج کے میری توہین کرائی اور اپنی بھی۔ اب میں وہاں کبھی نہ جاؤں گا۔“

لارڈ پادری سائزل نے اندازہ لگایا کہ ہائی پے شیا نے ضرور بطرق کو برا بھلا کہا ہو گا۔ نرمی سے پوچھا۔ ”بطرق! اطمینان رکھو، اگر اس نے تمہاری توہین کی ہے تو بچ بازار اس کی بے عزتی ہو گی اور دنیا تماشہ دیکھے گی۔ تم بتاؤ تو اس نے کیا کہا۔ کیا اس نے یہاں آنے سے صاف انکار کر دیا ہے؟“

”آپ انکار کی بات کر رہے ہیں لارڈ پادری۔ وہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا ہے۔“ بطرق نے بڑے تسخر سے کہا۔ ”اب آپ زہرہ جیوں کو بھول جائیے۔ اس پر تو رومی گورنر کا رنگ چڑھ گیا۔ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ لارڈ پادری کو اس کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اسکندریہ کا حاکم رومی گورنر ہے اور صرف وہی اس سے باز پرس کر سکتا ہے۔“

”اس کیتا کی یہ ہمت۔“ سائزل بلبلاتا کھڑا ہو گیا۔ ”میں آج ہی اس کے گھر کو آگ لگوا دوں گا۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔“

”لارڈ پادری! یہ کام اتنا آسان نہیں۔“ بطرق نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ”زہرہ

کے گھر پر فوجی دستہ پہرہ دے رہا ہے۔ اس کے مکان میں کوئی داخل بھی نہیں ہو گا۔ میں آپ کو نیک مشورہ دیتا ہوں کہ زہرہ جیوں کا خیال دل سے نکال دیجئے ورنہ آپ کو سلطنت روما سے نکلنا ہو گا اور اس کا جو انجام ہو گا۔ اس سے تو آپ واقف ہیں۔“

لارڈ پادری سائزل کے ہوش اڑ گئے۔ وہ تھوڑی دیر بلبلاتا ہوا ٹھٹھا رہا پھر رک بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ بات دور تک پہنچ گئی ہے مگر ہائی پے شیا گورنر تک نہ کیسے۔ یہ کوئی بڑی سازش ہے؟“

بطرق ہنس پڑا۔ ”لارڈ پادری۔ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ اس میں سازش کا کیا ل ہے۔ صاف بات ہے۔ آپ نے زہرہ جیوں سے اپنا شہستان سجانا چاہا۔ اس نے آپ کو رد کر دیا اور گورنر کے محل میں جا بیٹھی۔ آپ میں ہمت ہے تو اسے رومی درنر سے چھین لیجئے۔“

”مگر ہائی پے شیا یسودن ہے۔ گورنر اس سے شادی نہیں کر سکتا۔“ سائزل نے بے خیال میں بڑا اہم نکتہ تلاش کیا۔

”آپ بھی تو اس سے شادی نہیں کر سکتے لارڈ پادری۔“ بطرق نے سختی سے اب دیا۔ ”شادی کرنا نہ آپ کا مقصد تھا اور نہ گورنر ایسی حماقت کی کوشش کرے گا لہائی پے شیا زہرہ جیوں بھی تو ہے وہ محفل کی رونق اور محل کی زینت تو بن ہی سکتی ہے۔ کیا آپ گورنر کو روک سکتے ہیں؟“

”ہاں! میں اسے روکوں گا۔“ سائزل نے مٹھیاں جھنجھٹے ہوئے کہا۔ ”اگر گورنر نے اس یسودن کا ساتھ دیا تو میں اس کا ایسا حشر کروں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔“

”سوچ لیجئے لارڈ پادری۔ یہ آگ کا کھیل ہے۔ اس میں ہاتھ جل بھی سکتے ہیں۔“

”یہ میرے وقار کا سوال ہے بطرق۔ صرف میرا نہیں بلکہ تمہارا اور مگر جا کے قار کا بھی سوال ہے۔“ سائزل نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اگر میں اس معاملے میں بے گیا تو مگر جا کے تمام اختیار گورنر کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے پھر نہ کہیں میری عزت ہو گی اور نہ تمہاری۔ ہم صرف مگر جا کی گھنٹیاں ہی سنتے رہیں گے اور یہ گورنر

ہمارا حاکم بن بیٹھے گا۔

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں لارڈ پادری۔“ بطرق نے تائید کرتے ہوئے کہا۔
”میں خود نہیں چاہتا کہ گرجا کے اختیارات چھینے جائیں مگر یہ بڑا سخت مقابلہ ہے۔
آپ کو پھونک پھونک کے قدم اٹھانا ہو گا۔“

”دیکھا جائے گا۔ تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ سائرل نے جیسے کوڑ
فیصلہ کر لیا تھا۔ ”گورنر ابھی میرے اختیارات اور طاقت سے واقف نہیں۔ کچھ ع
دونوں بعد اسے معلوم ہو جائے گا کہ اسکندریہ کا اصل حاکم کون ہے اگر اس کا دماغ
بھی ٹھیک نہ ہو تو اس کے راستے میں مشکلات کی ایسی دلدل پیدا کر دوں گا کہ اس
میں پھنس کر رہ جائے گا اور ساری شان نکل جائے گی۔“

☆☆☆

دوسری ملاقات میں زہرہ جیوں نے گورنر کو اپنی اور بطرق کی گفتگو سے آگاہ
کیا۔ گورنر اس کی باتیں سن کے پہلے مسکراتا رہا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”ہائی پے شیا
مجھے بتایا گیا ہے کہ مجھ سے پہلے والے رومی گورنر اور پادری سائرل میں خوب گمراہ
چھنتی تھی اور گورنر نے اسکندریہ کے معاملات میں دلچسپی لینے کے لئے اپنے اختیارات
سائرل کے سپرد کر دیئے تھے۔ یہ دراصل گورنر کی کمزوری تھی مگر میں ایسا نہ ہوئے
دوں گا اگر شر کے پادریوں کو انتظامی اختیارات بھی حاصل ہو گئے تو شہنشاہ روم کا وقار
خاک میں مل جائے گا اور سلطنت روما بچوں کا کھیل بن جائے گی۔ شہنشاہ نے مجھے
خاص طور پر تاکید کی تھی کہ میں صرف گرجا کے معاملات میں دخل نہ دوں مگر مجھے
شہنشاہ اور سلطنت روما کا وقار برقرار رکھنے کا حکم بھی ہے اس کے لئے میں ہر قسم
اقدام کر سکتا ہوں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب میں نے تمہارے گھر پر پہرہ ل
دیا تھا تو پھر پادری کے نائب نے تم سے ملنے کی کوشش کیوں کی؟“

”یہ میری غلطی تھی گورنر بہادر۔“ زہرہ جیوں نے اعتراف کیا۔ ”میں ملاقات
سے انکار کر سکتی تھی لیکن بطرق نے مجھے فریب دیا۔ اس نے سائرل کے کسی اہم
پیغام کا حوالہ دے کر مجھ سے اجازت حاصل کر لی اگر مجھے شک بھی ہو تا کہ بطرق مجھے

بناوت کا خوف دلا کر اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہے تو میں اس سے ملاقات ہر
گز نہ کرتی۔“

”خیر۔ جو ہوا اس پر خاک ڈالو ہائی شیا۔“ گورنر نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”یہ بھی
اچھا ہوا کہ تم نے اس کے کان کھول دیئے۔ اب شاید وہ تم سے دوبارہ ملنے کی
کوشش نہ کرے۔“

”میں معذرت کے ساتھ آپ کے اس خیال کی تردید کرنے پر مجبور ہوں۔“
ہائی پے شیا زہرہ جیوں نے ادب سے جواب دیا۔ ”سائرل ایسا نہیں کہ خاموش ہو کے
بیٹھ جائے۔ وہ ضرور کوئی دوسری چال چلے گا۔“

”تم بہت خوفزدہ معلوم ہوتی ہو ہائی شیا۔“ گورنر نے سامنے بیٹھی ہوئی زہرہ
جیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ شاید وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا لیکن اس
نے فوراً اپنا بڑھا ہوا ہاتھ کھینچ لیا۔

”گورنر بہادر کے اس خیال کی میں پوری تائید کرتی ہوں۔“ زہرہ جیوں نے
جواب دیا۔ ”سائرل‘ آپ کے تصور سے زیادہ خطرناک انسان ہے۔ اس سے ہر وقت
ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“

”زہرہ جیوں!“ گورنر نے کچھ ایسے پیار سے کہا کہ زہرہ جیوں متاثر ہوئے بغیر نہ
رہ سکی۔

زہرہ جیوں نے سمجھتے ہوئے اپنی بھاری پلکیں اٹھائیں۔ گورنر کی آواز اس کے
کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا پورا وجود ایک کیف میں
ڈوب کے رہ گیا تھا۔ گورنر کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ شاید اس نے زہرہ جیوں کی
گہری آنکھوں میں جھانک کے دیکھا اور زہرہ جیوں کی رگ و پے میں بجلیاں سی بھر
گئیں۔

”زہرہ جیوں۔“ گورنر نے ایک بار پھر اسی پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔
”کاش میں تمہیں اپنی ذاتی حفاظت میں رکھ سکتا۔“

زہرہ جیوں کے چہرے پر کئی تاثر ابھرے۔ کتنے ہی رنگ آئے لیکن حیا کا رنگ
سب پر غالب آگیا۔ ”میں۔۔۔۔ میں گورنر بہادر کی بات سمجھ نہیں سکتی؟“

”زہرہ جی! مجھے تمہاری ایک بات اچھی نہیں لگتی۔“ گورنر نے فوراً دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔

زہرہ جیوں گھبرا گئی۔ ”میں آپ کی یہ بات بھی نہیں سمجھ سکی گورنر بہادر۔“
 ”یہ گورنر بہادر ہی تو اصل بات ہے زہرہ جیوں۔“ گورنر نے ہلکی سی سانس لے کر کہا۔ ”دیکھو نا۔ میں تمہیں ”تم“ سے مخاطب کرتا ہوں۔ اس تم میں کتنی اپنائیت ہے شاید تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں مگر تم ہر جملے میں گورنر بہادر کی رٹ لگاتی ہو۔ پھر تم میں اور دوسروں میں فرق ہی کیا رہ گیا؟“
 ”آپ کیا چاہتے ہیں گورنر بہادر۔“

”پھر وہی گورنر بہادر۔“ گورنر نے مصنوعی غصے سے کہا۔ ”اگر صرف گورنر کو یا میرا نام لے کر آواز دو تو کیا میری گورنری میں کوئی فرق پڑ جائے گا؟“
 ”میں اس عزت افزائی کے لئے آپ کی شکر گزار ہوں۔“ زہرہ جیوں پر جیسے سرشاری چھا گئی۔ ”اسکندریہ کے حاکم اعلیٰ کا نام لینا میرے خیال میں قانوناً جرم ہے اور گورنر بہادر کو صرف ”گورنر“ سے مخاطب کرنا شاید میرا منصب نہیں۔ آقا اور غلام کے درمیان کوئی دیوار تو ہونا ہی چاہئے؟“

”تمہارا منصب اور مقام کیا ہے یہ میرا دل جانتا ہے۔“ گورنر نے اس طرح سانس لی جیسے آہ بھری ہو۔ ”خیر یہ میری ایک ادنیٰ خواہش تھی اگر تم اسے پسند نہیں کرتیں اور درمیان میں فاصلے برقرار رکھنا چاہتی ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں؟“
 گورنر کا لہجہ افسردہ سا ہو گیا۔ ”اے اسکندریہ کے جوان عمر گورنر۔“ زہرہ جیوں نے مسکرا کے اسے دیکھا۔

گورنر کا دل غنچے کی طرح کھل اٹھا۔ ”زہرہ جیوں۔ تم نے بہت سے فاصلے صرف ایک نا تمام جملے سے کم کر دیئے ہیں میں جانتا ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان بہت گہری خلیج ہے لیکن اس خلیج کو۔۔۔۔۔۔“

”گورنر میری حفاظت کے لئے کچھ فرما رہے تھے۔“ زہرہ جیوں نے قطع کلام کر کے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ دراصل وہ اس موضوع پر فی الحال زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔

گورنر اس کی ذہانت کا پہلے ہی قائل تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ زہرہ جیوں موضوع بدل کر رہی ہے۔ ”ہاں زہرہ جیوں۔ میری خواہش تھی کہ تمہیں اپنے محل میں لے جاؤں تاکہ تم سائل کی ریشہ دوانیوں اور زیادتیوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاؤ۔“
 ”نہیں! میں آپ کی اس نوازش کی دل سے قدر کرتی ہوں۔“ زہرہ جیوں نے

ی اسی خلوص سے جواب دیا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ آپ کے محل میں پہنچ کر میں سائل کے ظلم و ستم سے محفوظ ہو جاؤں گی لیکن کاش میں اس بات پر قادر ہوتی۔ آپ کو علم ہے کہ میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد علم کی تدریس ہے۔ میں اپنے گھر کے اداہ مدرسہ اشیلہ اور مدرسہ اسکندریہ میں بھی درس دیتی ہوں۔ آپ کی حفاظت میں لے کے بعد مجھے اپنے اصل مقصد سے منہ موڑنا پڑے گا۔ پھر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میں آپ کے محل میں مستقل طور پر رہائش اختیار نہیں کر سکتی۔ میرا وہاں قیام رضی ہو گا اور محض ایک عارضی آرام کے لئے دنیا کو چھوڑ دینا میرے خیال میں کوئی عقلمندی نہیں۔“

زہرہ جیوں ہائی پے شیا نے الفاظ کے پردے میں وہ سب کچھ بیان کر دیا تھا جو اس کے دل میں تھا۔ ایک طرف یہودی اور عیسائی مذہب کے شدید اختلافات کے باعث وہ دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ دوسرے یہ کہ اگر گورنر اپنے دل سے مجبور ہو کر زہرہ جیوں کو اپنانے کا اعلان کر دیتا تو اسکندریہ میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوتا۔ اس کا سب سے بڑا مخالف لارڈ پادری سائرل تھا اور وہ یہودیوں کا بھی سب سے بڑا دشمن تھا۔ زہرہ جیوں بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سائرل کے شر سے بچنے کے لئے گورنر کے محل میں پناہ حاصل کرے۔ اگر وہ مجبور ہو کر بھی یہ قدم اٹھاتی تو سوائے ”گورنر کی اشد“ کے اسے اور کچھ حاصل نہ ہوتا۔ یہی تمام باتیں زہرہ جیوں نے الفاظ میں بدل کر گورنر پر واضح کی تھیں۔

گورنر اگرچہ جوان تھا مگر وہ بھی ذہین اور عقلمند تھا۔ زہرہ جیوں کی بات سمجھنے کے بعد اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ ”زہرہ جیوں تمہارے اور میرے خیالات میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ میں نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا۔ تم نے

مگر زہرہ جیسے کا جھکاؤ گورنر کی طرف تھا اور گورنر کا محافظ دستہ سائزل کی ایک نہ چلنے دیتا تھا۔ سائزل میں یہ ہمت نہ تھی کہ وہ کھل کے گورنر کے مقابلے پر آئے۔ اگرچہ اسکندریہ میں سائزل کے عقیدت مندوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن عیسائیوں کا دوسرا فرقہ جس کے عقائد سائزل کے عقیدے سے مختلف تھے وہ فرقہ گورنر اسکندریہ کا ہمدرد اور طرفدار تھا کیونکہ گورنر بھی سائزل کے عقیدہ کا مخالف تھا۔ اس بات نے سائزل کو سب سے زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ زہرہ جیسے اس کے قابو میں نہیں آ سکتی تو اس کا غم و غصہ عروج پر پہنچ گیا اور اس نے طے کر لیا کہ اگر زہرہ جیسے اسے نہیں حاصل ہو سکتی تو وہ اسے گورنر کے پہلو میں بھی نہیں بیٹھنے دے گا خواہ اس کے لئے اسے گورنر سے کوئی خونی معرکہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

سائزل کے ارادے بڑے خطرناک ہو گئے تھے اور اس کی اطلاعات گورنر کو اپنے جاسوسوں سے برابر مل رہی تھیں۔ زہرہ جیسے بھی گورنر کو اکثر سائزل کے ارادوں سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ گورنر اور زہرہ جیسے کی ملاقاتیں بھی ڈھکی چھپی نہ رہ گئی تھیں اور اسکندریہ والوں میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ سائزل اور گورنر کے اختلافات کی اصل وجہ اسرائیلیہ عورت زہرہ جیسے ہائی پے شیا ہے۔ عیسائیوں کو اسرائیلیوں سے سخت نفرت تھی۔ یہودی قوم اپنی چال بازیوں اور عیاریوں کی وجہ سے ہر دور میں مظلوم اور مردود رہی ہے مگر عیسائیوں میں دو فرقے پیدا ہو جانے کی وجہ سے گورنر کا مضبوط گروہ یہودیوں کی طرفداری کرتا تھا اور جب بھی کسی یہودی پر ظلم ہوتا تو مخالف عیسائی گروہ اس کی طرفداری پر تلوار تک بلند کر لیتا تھا۔

یہ یہودی قوم کی بد قسمتی تھی یا ہائی پے شیا کی تقدیر کا چکر کہ ایسے پر آشوب دور میں جب عیسائیوں کے دونوں فرقے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، اسکندریہ میں سالانہ کھیل تماشے شروع ہوئے۔ یہ کھیل قومی اہمیت کے حامل تھے اور اس میں کامیاب ہونے والوں کو اعزازات کے علاوہ نقد انعام بھی دیا جاتا تھا۔ یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل تھے اس لئے وہ ان کھیلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے اور انعامات حاصل کرتے تھے مگر اس سال حالات مختلف تھے۔ کھیلوں کے پہلے ہی دن سے عیسائیوں اور یہودیوں میں تو، تو، میں، میں شروع ہو گئی۔ یہودیوں کا شکوہ تھا

ان خدشات کو حقیقت کے روپ میں میرے سامنے پیش کیا۔ سائزل کے پیش نظر میں بھی کچھ اور انتظامات کرنا چاہتا ہوں۔“

”گورنر جو بھی انتظام کریں اس بات کا ضرور خیال رہے کہ میرا نام کسی صورت بھی ملوث نہ ہو۔“ زہرہ جیسے نے پریشان لہجے میں کہا۔

”تم اطمینان رکھو ہائی شیا۔ مجھے تمہاری بدنامی خود گوارہ نہیں مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ پادری سائزل تمہارے علمی کاموں میں کسی طرح دخل در معقولات نہ کر سکے۔ اس کا میں ضرور انتظام کروں گا۔“

”اگر گورنر پسند کریں تو مجھے ان اقدام سے آگاہ فرمائیں جو اس سلسلے میں اٹھانا چاہتے ہیں؟“

”ایک تو میں تمہارے مکان پر پہرے میں اضافہ کر دوں گا۔“ گورنر نے بڑی بے تکلفی سے بیان کرنا شروع کر دیا۔ ”دوسرا قدم میں یہ اٹھاؤں گا کہ ان مدرسوں کو بھی حکومت کی حفاظت میں لے لوں جہاں تم درس دینے جاتی ہو۔“

زہرہ جیسے ہائی پے شیا فکر مند ہو گئی۔ گورنر نے اسے پریشان دیکھا تو فوراً کہا۔ ”زہرہ جیسے اگر تمہیں یہ انتظامات پسند نہیں تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ میں تو تمہاری اور تمہارے مدرسوں کی پوری پوری حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔“

زہرہ جیسے اور گورنر کی ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ زہرہ جیسے جب درس و تدریس سے فارغ ہوتی تو گورنر کی سلامی کو حاضر ہوتی۔ اسے اپنے دشمنوں کے ملک میں جس مضبوط سہارے کی ضرورت تھی وہ اسے گورنر کی شکل میں مل گیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے گورنر کی قربت میں ایک فرحت بخش سکون بھی ملتا۔ ہو سکتا ہے کہ اسے بھی گورنر سے اسی طرح محبت ہو گئی ہو جیسے گورنر اسے چاہنے لگا تھا مگر دونوں طرف سے اظہار محبت کا موقع نہ آتا۔ اگر بات اس نکتے تک پہنچ بھی جاتی تب بھی ان کی زبانیں نہ کھلتیں اور سوائے ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھنے کے اور کچھ نہ کرتے تھے۔

ادھر سائزل زخمی شیر کی طرح بل کھایا کرتا تھا۔ اس کے بوڑھے عشق میں شدت پیدا ہو گئی تھی اور وہ زہرہ جیسے کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کے جتن کیا کرتا تھا

کہ جج صاحبان جانبداری کا اظہار کر رہے ہیں اور اس طرح یہودی کھلاڑیوں کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے برسوں میں عیسائیوں اور یہودیوں کے دل میں پوشیدہ کدورتوں کے باوجود کھیل کے میدان میں کبھی جھگڑا نہ ہوا تھا مگر اس سال سائزل نے کوشش کر کے تمام ایسے جج مقرر کئے تھے جو اس کے فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سائزل نے انہیں تاکید کر دی تھی کہ کوئی یہودی کھلاڑی انعام حاصل نہ کرنے پائے۔ سالانہ کھیل شروع ہوئے تو سائزل کے منتخب شدہ ججوں نے بے ایمانی شروع کر دی۔ جج کا فیصلہ چونکہ آخری فیصلہ ہوتا تھا اور اس کی کوئی اپیل نہ تھی اس لئے یہودی کھلاڑی کو ہر فیصلہ تسلیم کرنا پڑتا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ مشکوک فیصلوں کو تو یہودیوں نے تسلیم کر لیا مگر جب ججوں نے کھلی دھاندلی شروع کر دی تو یہودیوں کی طرف سے واویلا شروع ہوا مگر ان کی بات کون سنتا۔ یہودی ہمیشہ سے مردود اور بے ایمان مشہور ہیں اس لئے ان کے ہر اعتراض کو رد کر دیا جاتا اور ان کا تسخیر بھی اڑایا جاتا۔

پہلے دن کے کھیلوں میں سوائے ایک دو کے باقی تمام فیصلے عیسائیوں کے حق میں ہوئے اور انہیں انعام کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ یہودی کھلاڑی اس پر بہت کڑھے۔ بعض یہودی کھلاڑیوں نے برملا جج کے فیصلے کو غلط قرار دیا۔ اس پر کچھ جھگڑا ہوا۔ ہاتھ پائی تک بھی فوجیت پہنچی مگر منتظمین نے ڈانٹ ڈپٹ کے جھگڑا ختم کرا دیا۔ لیکن دوسرے دن جب کھیل شروع ہوئے تو حالات بڑے کشیدہ تھے۔ ہر کھلاڑی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ گورنر کو کل کے جھگڑے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے ایک فوجی دستہ میدان میں بھیج دیا تھا لیکن جس میدان میں پچاس ہزار کا مجمع ہو وہاں ایک دستہ کیا کر سکتا ہے۔ پھر سائزل نے منصوبہ بھی بہت سوچ سمجھ کے بنایا تھا۔ اس نے رات کے اندھیرے میں کافی اسلحہ میدان میں پہنچا دیا تھا۔ یہودی بھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ وہ دوسرے دن کھیل کے میدان میں جانے لگے تو انہوں نے لباس کے اندر خنجر چھپا لئے۔ کھیل کے میدان کے دروازوں پر تلاشی لی جاتی تھی۔ اس لئے یہودیوں کے وہ تمام خنجر جو وہ چھپا کر ساتھ لے گئے تھے تلاشی کے دوران ضبط کر لئے گئے۔ سائزل کے آدمی رات کو میدان میں پہنچائے گئے اسلحہ سے مسلح ہو گئے تھے

جب کہ یہودی بالکل نیتے تھے۔ کھیلوں کے شروع ہوتے ہی کل کا دبا ہوا جھگڑا پھر شروع ہو گیا۔ ایک یہودی کھلاڑی کو عیسائی کھلاڑی نے دھکا دیا۔ یہودی کھلاڑی تو ضبط کر گیا مگر اس کے قریب کھڑا ہوا ایک یہودی تماشاخی بگڑ گیا۔ اس نے بڑھ کے عیسائی کھلاڑی کا گریبان پکڑ لیا۔

”تم نے کیوں دھکا دیا اسے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”مجھے پہلے اس نے دھکا دیا تھا۔“ عیسائی نے جھٹکا دے کر گریبان چھڑا لیا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تم نے اسے

بلا وجہ دھکا دیا ہے۔“

”جھوٹا تو ہے یہودی کہتے۔“ عیسائی نے اس جواب کے ساتھ ہی اس کے منہ پر

ایک طمانچہ جڑ دیا۔

یہودیوں کو ان کی کمینہ حرکتوں سے عام طور پر کتا ہی کہا جاتا تھا اور وہ اس خطاب کے عادی بھی ہو گئے تھے مگر طمانچہ کھانے والا یہودی کچھ زیادہ ہی چل چلا ہوا منچلا تھا۔ اس نے بھی طمانچے کا جواب طمانچے سے دیا، پھر کیا تھا، ہاتھ پائی شروع ہو گئی۔ عیسائیوں نے خنجر نکال لئے اور یہودیوں پر پل پڑے۔ یہودی خالی ہاتھ تھے۔ انہوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ سائزل کے آدمیوں نے افواہ پھیلا دی کہ ایک یہودی نے ایک عیسائی کھلاڑی کو قتل کر دیا ہے۔ عیسائی بھڑک اٹھے اور یہودیوں کو پکڑ پکڑ کے پشیمان شروع کر دیا۔ کتنے ہی یہودی خنجروں سے زخمی ہوئے اور بہتوں کے ہاتھ پیر ٹوٹے۔

گورنر کے فوجی سوار ایک طرف کھڑے تھے۔ انہوں نے ہنگامہ دیکھا تو ہنر سمھاتے ہوئے میدان میں داخل ہوئے۔ بے شمار آدمی ان کے ہنروں سے زخمی ہوئے۔ بہت سے گھوڑوں سے بھی کچلے گئے مگر فوجی سواروں کو دیکھ کر عیسائی گھبرا گئے۔ انہیں اپنی فکر پڑ گئی اور انہوں نے بھی میدان سے بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا۔ اس بھاگ دوڑ میں کچھ عیسائی بھی زخمی ہو گئے اور پچاس ہزار انسانوں سے بھرا ہوا میدان دیکھتے ہی دیکھتے خالی ہو گیا۔ سائزل کیا تمام آدمی بھاگ کھڑے ہوئے صرف ایک آدمی گورنر کے ایک سوار کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ عیسائی بھی سائزل کا آدمی تھا۔

اطلاع مل گئی تھی اور وہ مزید فوجی دستوں کے ساتھ محل سے نکل رہا تھا۔ اس نے کو واپس آتا دیکھ کر اس نے اپنا گھوڑا روک لیا۔

”کوئی جانی نقصان تو نہیں ہوا؟“ گورنر بہت پریشان تھا۔

”میدان جنگ میں کوئی لاش نہیں ملی گورنر بہادر۔“ دستے کے سردار نے اب دیا۔

”کوئی شدید زخمی حالت میں بھی نہیں ملا؟“ گورنر کی پریشانی برقرار تھی۔
”جی نہیں۔ میدان بالکل صاف ہے۔ کھیل کے منتظمین کو میں ساتھ لے کے جاؤں۔“

”تعب ہے!“ گورنر نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ پھر سردار سے پوچھا۔
”یہ سچ ہے کہ اکثر فسادوں کے پاس خنجر تھے۔“

”جی گورنر بہادر۔ میں نے میدان سے بھاگنے والوں میں سے بعض لوگوں کے تھوکوں میں خنجر دیکھے ہیں۔“ سردار نے گورنر کی بات کی تائید کی۔

”کاش کوئی ایسا شخص گرفتار ہوتا جو بتا سکتا کہ خنجر میدان میں کس طرح پہنچا۔“ میدان کے دروازوں پر لوگوں کی تلاشی لی گئی تھی اور ان سے اسلحہ چھین لیا گیا۔
”نا۔“ گورنر نے قدرے غصے سے کہا۔ ”اس میں کچھ ہمارے سواروں کی بھی کوتاہی ہے اگر تلاشی اچھی طرح لی گئی ہوتی تو اتنی کثیر تعداد میں خنجر اندر نہیں پہنچ سکتے تھے۔“

فوجی سردار کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا کیونکہ وہ خود پہرے پر موجود تھا اور ایک ایک گیٹ پر تلاشی لینے والے فوجی جوانوں کی نگہداشت کر رہا تھا۔
”تم خاموش ہو اس لئے کہ اس غفلت کے اصل ذمہ دار تم ہو۔“ گورنر کا لہجہ بہت کڑھتا ہو گیا۔

فوجی سردار واقعی اپنی کوتاہی پر شرمندہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اپنی صفائی کن الفاظ میں پیش کرے۔ اسی وقت ایک دم اس کے دماغ میں خیال آیا۔ اس نے ادب سے جواب دیا۔ ”گورنر بہادر۔ میں اپنی کوتاہی پر بہت شرمندہ ہوں مگر میں نے ایک ایسے شخص کو گرفتار کیا ہے جو خنجر تانے ایک یہودی کے سینے پر سوار تھا

اس نے ایک یہودی کو نیچے گرا دیا تھا اور خنجر نکال کر اس کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا۔ نیچے گرے ہوئے یہودی نے عیسائی کا خنجر والا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی وقت دستے کا سردار ان کے سر پر پہنچ گیا۔ سوار کو دیکھ کر عیسائی کا رنگ فق ہو گیا۔ یہودی کے لئے جیسے فرشتہ رحمت آگیا تھا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے سوار کو دیکھا۔

عیسائی کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ یہودی کے سینے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”فوجی جوان! یہ یہودی کتا ہے۔ اس نے مجھ پر خنجر سے وار کیا تھا۔“ عیسائی نے سفید جھوٹ بولا۔

”وار اس نے کیا اور خنجر تمہارے ہاتھ میں تھا۔ کیوں جھوٹ بول کے اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔“ فوجی کا لہجہ بڑا سخت تھا اور قہر آلود نظروں سے عیسائی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا خنجر اٹھا کے اپنے قبضے میں کر لیا۔

”مگر یہ یہودی ہے۔“

”یہودیوں کو بھی تمہاری طرح شہری حقوق حاصل ہیں۔“
سوار نیچے اتر آیا۔ ”قانون تمہیں اجازت نہیں دیتا کہ تم ایک نئے شہری کا قتل کرو۔“

”تم بھی عیسائی ہو فوجی جوان۔ تمہیں میرا ساتھ دینا چاہئے؟“ عیسائی نے فوجی کے مذہبی جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی۔

”میں تمہارا ساتھ ضرور دوں گا مگر پہلے تم میرا ساتھ دو۔“ یہ کہتے ہوئے سردار نے عیسائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

فوجی سردار نے اس یہودی کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا جس پر حملہ کیا جا رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو لے کر دوسرے سواروں کے پاس پہنچا۔ میدان خالی ہو چکا تھا کھلاڑی اور تماشاخی بھاگ گئے۔ سوائے منتظمین کے اور کوئی وہاں موجود نہ تھا۔ فوجی سردار نے منتظمین کو بھی ساتھ چلنے کا حکم دیا اور سب کو ایک گاڑی میں سوار کرا کے سیدھا گورنر کے محل کا رخ کیا۔ گورنر کو کھیل کے میدان میں ہونے والے جھگڑے

اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو شاید وہ یہودی کا خاتمہ کر دیتا۔
”وہ شخص کہاں ہے؟“ گورنر نے چونک کے پوچھا۔

”اسی گاڑی میں ہے جس میں منتظین کو لایا گیا ہے۔“ سردار نے سنبھل کے جواب دیا۔ ”میں اس یہودی کو بھی ساتھ ہی لایا ہوں جس پر اس نے حملہ کیا تھا۔“
”شاباش۔ تم نے اپنی غفلت اور کوتاہی کا آدھا داغ دھو ڈالا ہے۔“ گورنر نے گھوڑا موڑتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں کو فوراً ہمارے سامنے پیش کرو۔ ممکن ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو جائے کہ آج کا جھگڑا کس نے اور کس طرح شروع کیا۔ اس کے ساتھ اس بات کی بھی امید ہے کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ خنجر لے جانے والوں نے ان خنجروں کو اپنے کپڑوں میں کس طرح پوشیدہ کیا تھا کہ تم اور تمہارے ساتھی انہیں تلاش کرنے میں ناکام رہے۔“ گورنر گھوڑا بڑھا کے محل میں واپس ہو گیا۔

محل کے دربار ہال میں گرفتار عیسائی کا مقدمہ پیش ہوا۔
”تمہارا کیا نام ہے؟“ گورنر نے سخت لہجے میں ملزم سے سوال کیا۔
”سائرس۔“ ملزم نے تن کر جواب دیا۔
”کیا کام کرتے ہو؟“

”ہوٹل میں نوکر ہوں۔“ عیسائی کا لہجہ بڑا سخت تھا۔
”کیا تمہیں معلوم تھا کہ کھیل کے میدان میں اسلحہ لے جانا منع ہے؟“
”معلوم تھا۔“

”پھر تم خنجر لے کر اندر کیوں گئے؟“
”میں خنجر اندر نہیں لے گیا تھا۔“ عیسائی ملزم نے فوراً انکار کر دیا۔
گورنر نے فوجی سردار کی طرف دیکھا۔ اس نے وہ خنجر پیش کیا جو اس نے عیسائی ملزم سے برآمد کیا تھا۔

”کیا یہ خنجر تمہارے پاس سے برآمد نہیں ہوا؟“ گورنر نے اسے خنجر دکھایا۔
”برآمد ہوا ہے۔“ ملزم نے اقبال کیا۔
”پھر تم کس طرح کہتے ہو کہ خنجر لے کر تم میدان میں نہیں گئے؟“

”میں نے خنجر میدان میں حاصل کیا تھا۔“ ملزم نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔
”تمہیں خنجر کس نے دیا تھا۔ اس کا نام بتاؤ؟“

”میں یہ نہیں بتا سکتا۔“ ملزم نے صاف انکار کر دیا۔
گورنر کو اس کے انکار پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”دیکھو۔ تم اگر خنجر دینے والے کا نام نہیں بتاؤ گے تو تمہارا جرم بڑھ جائے گا؟“
مقدمہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ پادری بطریق لوگوں کو ہٹاتا ہوا گورنر کے سامنے پہنچ گیا۔ بطریق کو بعض کتابوں میں بطرس بھی لکھا گیا ہے۔ گورنر نے تیز نظروں سے نووارد کو گھورا۔

”تم کون ہو؟“ گورنر نے سوال کیا۔
”میں پادری بطریق ہوں اور لارڈ پادری سائرل کا نائب ہوں۔“ بطریق نے جواب دیا۔

”پادری کو کرسی دی جائے۔“ گورنر نے فوراً حکم دیا۔
”میں بیٹھنے نہیں آیا بلکہ لارڈ پادری کا ایک خاص پیغام لے کے آیا ہوں۔“
پادری بطریق تیز آواز میں بولا۔

گورنر نے اس کے لہجے کی سختی کی پروا نہ کی اور نرمی سے کہا۔ ”میں لارڈ پادری کا پیغام سنوں گا مگر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ایک معزز پادری میرے سامنے کھڑا ہو کر گفتگو کرے۔ براہ کرم آپ کرسی پر تشریف رکھئے۔“
پادری کے لئے کرسی گورنر کے قریب ہی رکھ دی گئی تھی۔ بطریق اس پر بیٹھ گیا۔

”اب فرمائیے لارڈ پادری نے کیا پیغام بھیجا ہے؟“ گورنر کا لہجہ بہت دھیما تھا۔
بطریق نے ملزم عیسائی کی طرف دیکھا پھر بڑے بے باک انداز میں کہا۔ ”لارڈ پادری نے کہا ہے کہ اسکندریہ کے گورنر کے فوجیوں نے جس عیسائی کو گرفتار کیا ہے اسے فوراً چھوڑ دیا جائے۔“

اسکندریہ کے گورنر کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”پادری بطریق! کیا آپ اس بات کی وضاحت کریں

گے کہ لارڈ پادری نے جو کچھ فرمایا ہے وہ لارڈ پادری کی سفارش ہے یا انہوں نے حکم دیا ہے۔

”میں اس کی وضاحت نہیں کر سکتا۔“ پادری نے کھردرے لہجے میں بولا۔
”گورنر جو چاہیں سمجھ سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ گورنر کی آواز میں ایک دم گرج پیدا ہو گئی۔ ”اگر لارڈ پادری نے مجھے حکم دیا ہے تو انہیں بتا دیا جائے کہ گورنر اسکندریہ صرف قیصر روم کا حکم مانتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص نہ اسے حکم دے سکتا ہے اور نہ جواب طلبی کا مجاز ہے۔ ہاں اگر لارڈ پادری نے ملزم کی سفارش کی ہے تو مقدمہ کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد اس پر غور کیا جائے گا۔“

پادری بطرق کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ”میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”آپ بغیر بلائے تشریف لائے تھے اس لئے بغیر اجازت کے واپس جاسکتے ہیں مگر میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اگر لارڈ پادری کے نائب مقدمہ کی کارروائی کے اختتام تک ٹھہرنا پسند فرمائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ اس طرح وہ آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن سکیں گے کہ ملزم نے کیا کیا ہے اور اس کا کس طرح فیصلہ کیا گیا۔“

گورنر نے بڑی معقول بات کہی تھی لیکن پادری جیسے گھوڑے پر سوار تھا۔ ”مجھے نہ مقدمے سے دلچسپی ہے اور نہ میں کارروائی دیکھنے آیا ہوں۔ میں نے لارڈ پادری کا پیغام اسکندریہ کے گورنر تک پہنچا دیا۔ اسے ماننا نہ ماننا ان کا کام ہے مگر گورنر کو اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہئے کہ یہ پیغام انہیں لارڈ پادری سائرس نے بھیجا ہے۔“

گورنر کو پادری کے اس سخت جواب پر جو ایک طرح کی دھمکی تھی، بہت غصہ آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ ”پادری بطرق۔ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“

پادری بطرق نے گورنر کو رخصتی سلام بھی کیا اور منہ موڑ کے دربار سے نکل گیا۔ ملزم عیسائی کو شاید امید تھی کہ گورنر لارڈ پادری کی سفارش پر اسے چھوڑ دے گا لیکن جب پادری بطرق کا کام واپس ہوا تو اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ اسکندریہ میں لارڈ پادری سے بڑی ایک اور شخصیت بھی ہے جو اس کے حکم یا درخواست کی مطلق پرواہ نہیں کرتی۔ اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔

گورنر نے مقدمے کی کارروائی پھر وہیں سے شروع کی۔ جہاں پادری بطرق کی کی وجہ سے رک گئی تھی۔ گورنر نے ملزم سے پوچھا۔ ”تم اپنا جرم بڑھانے کی کار رہے ہو اگر تم خنجر میا کرنے والے کا نام بتا دو تو شاید تم پر رحم کیا جاسکے بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں حکومت کا گواہ بنا کر بری کر دیا جائے۔“

عیسائی ملزم پہلے بڑی بے باکی سے سر اٹھا کر بات کر رہا تھا مگر پادری بطرق کے بعد اس پر مایوسی طاری ہو گئی تھی اس نے سر جھکا لیا تھا۔ گورنر کے سوال نے تھوڑا سا سراونچا کیا اور مردہ آواز میں جواب دیا۔

”گورنر بہادر! آپ مجھ سے یہ سوال نہ کیجئے۔ میں اس کا جواب دینے سے ہوں۔ کھیل کے میدان میں اور بھی بہت سے لوگوں کے پاس خنجر موجود تھے۔

یہ سوال ان سے بھی کر سکتے ہیں۔“

گورنر نے چند لمبے سوچنے کے بعد کہا۔ ”شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جن لوگوں اس خنجر تھے وہ میدان میں تمہاری طرح خالی ہاتھ آئے تھے اور انہیں بھی کھیل میدان میں خنجر میا کئے گئے تھے؟“

”بالکل، بالکل۔ گورنر بہادر۔ بالکل یہی بات تھی۔“ عیسائی نے فوراً اقبال کر

گورنر نے اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ایک شخص یا گروہ نے ایک سازش کے تحت کھیل کے میدان میں خنجر لائے تھے اور کھیل شروع ہونے سے پہلے یہ خنجر خاص خاص لوگوں میں تقسیم کر لئے تھے تاکہ جھگڑا شروع ہوتے ہی نئے یہودیوں پر حملہ کر دیا جائے۔“

”میں گورنر بہادر کے خیال کی صرف تائید کر سکتا ہوں لیکن اپنی طرف سے انہیں کہہ سکتا۔“ یہ کہہ کر عیسائی نے پھر گردن جھکا لی۔

”تمہاری زبان شاید اس وجہ سے بند ہے کہ اس سازش کا سرغنہ کوئی اتنی بڑی میت ہے جس کا نام لیتے تم خوف کھاتے ہو۔ تمہیں ڈر ہے کہ وہ تمہیں نقصان لائے یا قتل نہ کرا دے۔ کیا تم میرے اس خیال کی بھی تائید کر سکتے ہو۔“

گورنر نے بڑے اشتیاق سے ملزم کو دیکھا مگر ملزم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے

سراونچا بھی نہیں کیا۔

گورنر نے اسے خاموش دیکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تمہارا فیصلہ اس سوال کے جواب پر منحصر ہے سائرس۔ میں اسکندریہ کا حاکم اعلیٰ ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صحیح جواب دینے کی صورت میں تمہاری اور تمہارے اہل خانہ کی جان و مال اور عزت و آبرو کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ تمہاری طرف کوئی نظر بھی نہ اٹھائے گا۔“

”میں مجبور ہوں گورنر بہادر۔ میں بہت مجبور ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور نہیں بتا سکتا۔“ عیسائی نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ اس نے سراٹھا کر شاید رحم طلب نظروں سے گورنر کو دیکھا مگر فوراً ہی گردن نیچی کر لی۔

”تمہاری طرح میں بھی مجبور ہوں۔“ پھر گورنر نے ایک ملازم کو حکم دیا۔ ”سائرس کو قید میں رکھا جائے مگر مہمانوں کی طرح۔ جس وقت بھی سائرس مجھ سے ملاقات کی خواہش کرے اسے میرے سامنے پیش کیا جائے۔“

ادھر پادری بطرق یا بطرس نے لارڈ پادری کے پاس پہنچ کے اپنی اور اسکندریہ کے گورنر کی گفتگو خوب نمک مرچ لگا کے پیش کی۔ ”لارڈ پادری! گورنر تو پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیتا۔ اس کی نظروں میں آپ کی کوئی وقعت نہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو بطرق۔ اس ہنگامے کے بعد بھی گورنر کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ اسے عقل نہیں آئی؟“ پادری اٹھ کے ٹہلنے لگا۔

”معاف کیجئے لارڈ پادری۔ آپ نے گورنر کے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ وہ آپ کے خیالوں سے بہت اونچا ہے۔“ بطرق نے اس کا غصہ تیز کرنے کی کوشش کی۔

”فضول باتیں مت کرو بطرق۔ بتاؤ اس نے کیا جواب دیا؟“ لارڈ پادری پھنکارنے لگا۔

”جواب!“ بطرق سنبھل کے بولا۔ ”سن سکتے ہیں تو سنئے۔ اس نے جواب دیا ہے کہ اگر سائزل نے مجھے حکم دیا ہے تو اس سے جا کے کہہ دو کہ اسکندریہ کا گورنر میں ہوں۔ حکم دینا صرف میرا کام ہے۔ سائزل صرف پادری ہے اسے گرجا پر حکم چلانا

۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر لارڈ پادری مجھ سے ملزم سائرس کی رہائی کے درخواست کرے تو میں شاید اس پر کچھ غور کر سکوں۔“

سائزل جل بھن کے رہ گیا۔ ”کیا تم نے مظلوم سائرس سے ملاقات کی؟“

”سائرس تو میرے سامنے ہی تھا لارڈ پادری۔“ بطرق نے بتانا شروع کیا۔ ”جس میں گورنر کے محل میں پہنچا۔ اس وقت سائرس کا مقدمہ گورنر کے سامنے پیش میں نے کہا کہ میں لارڈ پادری کا پیغام لایا ہوں۔ گورنر نے مجھے جھڑک دیا اور کہا مقدمے کے دوران کوئی پیغام نہیں سنا جاسکتا۔ بڑے انتظار کے بعد اس نے میری سنی اور مجھے کورا جواب دے کر اپنے دربار سے نکال دیا۔“

”کیا۔ کیا کہا تم نے۔ گورنر نے تمہیں دربار سے نکال دیا؟“ غصے کی وجہ سے ل کے منہ سے تھوک اڑ رہا تھا۔

”لارڈ پادری۔“ بطرق نے اس طرح سانس لی جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس کا غرور اور تکبر تو دیکھئے۔ میں آپ کے پیغام کی وکالت اور وضاحت کر رہا تھا کہ میں نے مجھے روک دیا اور کرخت لہجے میں کہا فضول باتیں مت کرو اور فوراً واپس جاؤ۔ کیا یہ دربار سے نکالنا نہیں ہے لارڈ پادری؟“

”توہین، بے عزتی۔ اس نے تمہیں ذلیل نہیں کیا بلکہ پورے چرچ کی تذلیل کی ہے۔“ اس نے ایک ہاتھ کی مٹھی بند کر کے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر زور سے ماری۔ اب مجھے آخری قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔“

”آپ قدم اٹھاتے ہی رہ جائیں گے اور گورنر مظلوم سائرس کو سولی پر چڑھا دے گا۔“ بطرق نے زہر خند کیا۔

”آج۔ آج ہی۔۔۔ تم دیکھو گے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ گورنر سر پکڑ کے دئے گا اور پھر میری خوشامد کرنے آئے گا۔“ پادری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”آپ کچھ کریں یا نہ کریں لارڈ پادری۔“ بطرق جھلا گیا۔ ”مگر آپ نے ایک ہودی لڑکی کے لئے جو ہنگامہ برپا کیا ہے اس کا نتیجہ کچھ اچھا نظر نہیں آتا۔ اس کینت نے پورے شر کو عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔ میرا تو جی چاتا ہے کہ اس ذلیل لورت کو قتل کر ڈالوں۔“

مرکی فضا مکدر کر دی اور ایک زبردست ہنگامہ شروع ہو گیا۔ یہودی عام طور پر بارت پیشہ ہوتے تھے اور تجارت کی آڑ میں دوسری قوموں کی جڑیں کاٹتے تھے۔ وہ لہروں میں اسلحہ بھی جمع نہ کرتے تھے کیونکہ آئے دن ان کے گھروں کی تلاشی ہوتی رہتی تھی۔ عیسائیوں کے اس اچانک حملے سے ان کا بہت نقصان ہوا۔ دکانیں لوٹ لی گئیں اور ان کے مکانات میں آگ لگا دی گئی۔ یہودیوں کے سنگاگ (عبادت خانے) بھی لوٹ مار سے محفوظ نہیں رہے۔ ان کے کئی عبادت خانوں کو منہدم کر دیا گیا۔

اسکندریہ کے گورنر کو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ لارڈ پادری کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ ایک مذہبی پیشوا ہے اور لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں صبح کو جو ہنگامہ ہوا تھا اس کے بارے میں اس کا یہی خیال تھا کہ اس کے پیچھے لارڈ پادری کا ہاتھ ہے اور وہ پس پردہ رہ کر سازشیں کر رہا ہے مگر وہ یہ سوچ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ لارڈ پادری سائرل اس کی طاقت کو بالکل نظر انداز کر دے گا اور خود اسکندریہ کے حاکم کی طرح یہودیوں کو غدار اور باغی قرار دے کر انہیں شہر بدر کرنے کا اعلان کرے گا۔ گورنر ہنگامے کی خبر پاتے ہی رومی دستوں کے ساتھ فوری یہودی بستیوں میں پہنچا مگر اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فساد اپنا کام کر کے واپس جا چکے تھے۔ یہودی محلے عبرت کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ لوگ گھربار چھوڑ کر ادھر ادھر چھپ گئے تھے۔ فوجی دستوں کے آنے پر یہودی روتے پیٹتے آئے اور گورنر سے فریاد کرنے لگے۔ گورنر نے انہیں بہت تسلیاں دیں اور ان کے مخلوں پر فوجی پہرہ لگا دیا۔

گورنر نے زہرہ جبین ہائی پے شیا کے مکان پر سخت پہرہ لگایا تھا۔ اس وجہ سے ان ہنگاموں اور فسادات کی آگ سے وہ بالکل محفوظ رہی مگر شہر کے مخدوش حالات سے وہ بہت پریشان تھی۔ گورنر خود اس کے مکان پر گیا اور اپنی پیش کش دوہرائی۔ ”زہرہ جبین! اگر مناسب سمجھو تو میرے محل میں منتقل ہو جاؤ۔ وہاں تم زیادہ محفوظ رہو گی؟“

”نہیں گورنر۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔“ زہرہ جبین نے نرمی سے انکار کیا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اپنے ہم قوموں میں بدنام ہوں۔ اگر میری موت آ

”بھیک! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ لارڈ پادری نے اس کے جوش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ”ہائی پے شیا اسی قابل ہے کہ اس کے کٹڑے کر دیئے جائیں اور اس کی ہڈیوں کو آگ میں جلا کر خاک کر دیا جائے۔ اسی طور پر یہ فتنہ ختم ہو سکتا ہے۔ اگر تمہارا یہی ارادہ ہے تو اس سلسلے میں تمہاری مدد کی جائے گی۔“

بھرق جوش میں بھرا ہوا تھا۔ اس نے کڑک کے کہا۔ ”لارڈ پادری! آپ صرف زبانی باتیں کرتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں ہنگامہ کرا کے ہمیں کیا حاصل ہوا۔ صرف چند یہودی زخمی ہوئے اور بس۔ ہمارا ایک کارکن گرفتار کر لیا گیا اور لوگ خوفزدہ ہو کر گھروں میں دبک گئے۔ کیا آپ کا یہی مقصد تھا؟“

”تم مجھے طعنہ نہ دو بطریق۔“ لارڈ پادری چیخ اٹھا۔ ”آج رات میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناؤں گا پھر تم دیکھنا کہ ان مردود یہودیوں کا کیا حال ہوتا ہے۔“ لارڈ پادری غصہ میں بھرا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

اسی رات لارڈ پادری کا ایک اعلان اسکندریہ کی گلی کوچوں میں شہر کیا گیا۔ اعلان انتہائی اشتعال انگیز تھا۔ اس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے۔

”اسکندریہ کے بھائیو! اپنے لارڈ پادری سائرل کا اعلان سنو۔ تمہارے مذہبی پیشوا نے یہودیوں کو ملک کا غدار اور حکومت کا باغی قرار دیا ہے۔ ان کے گھربار لوٹ لو اور انہیں اسکندریہ سے نکال دو۔ تمہارا یہ فعل قومی فریضہ سمجھا جائے گا۔“ اسی طرح کا ایک اور اعلان کیا گیا جس کے الفاظ یہ تھے۔

”یہودی ملک دشمن اور عیسائی حکومت کے باغی ہیں مگر ان کی مدد اسکندریہ کا رومی گورنر کر رہا ہے۔ لارڈ پادری کا اعلان ہے کہ گورنر کے کسی حکم کی پروا نہ کی جائے اور یہودیوں کو ان کی غدار کی سزا دی جائے۔“

ان اعلانات نے اسکندریہ میں نفرت کی آگ بھڑکا دی۔ عیسائی مسلح ہو کر گھروں سے نکل پڑے اور یہودی مخلوں پر بلر بول دیا۔ دن کے وقت گورنر نے رومی دستوں کو شہر میں پھیلا کر امن و امان کرا دیا تھا اور فوجی مطمئن ہو کے بیرکوں میں واپس چلے گئے تھے۔ ان کے بہت سے آدمی کھیل کے میدان میں زخمی ہوئے تھے مگر گورنر کی مداخلت سے شہر میں امن ہو گیا تھا لیکن لارڈ پادری کے تازہ اعلانات نے ایک بار پھر

گورنر نے حالات پر بظاہر قابو حاصل کر لیا تھا۔ اس کے دسے پورے شرم میں
ات کر رہے تھے۔ تباہ شدہ یہودی محلوں کی بھی پوری حفاظت کی جا رہی تھی لیکن
لاڈری سائل کا اعلان اب بھی گلی کوچوں میں گشت کر رہا تھا۔ قہر خانے ہوں یا
پار ہر جگہ لوگ دہی زبان سے اس اعلان پر گفتگو کرتے۔ ان کے جذبات بھڑکے
ئے تھے اور کسی وقت بھی کوئی بڑا فتنہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ گورنر پر یہ بات روز روشن
طرح عیاں ہو گئی تھی کہ یہ سب کچھ لاڈری پادری کا کیا دھرا ہے مگر وہ سائل کو
رفتار نہیں کر سکتا تھا۔ چرچ میں فوج کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی اور سائل
ہج میں بیٹھے بیٹھے ہی لوگوں کو بھڑکاتا اور یہودیوں کو شہر بدر کرنے کا اعلانات کیا کرتا
ا۔

گورنر کو بھی احساس تھا کہ یہودیوں کے خلاف نفرت کا لاوا اندر ہی اندر پک
ا ہے اور یہ آتش فشاں کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ اسکندریہ کے حالات درست
رنے کے لئے لاڈری پادری سائل کو قابو میں کرنا ضروری تھا مگر اسکندریہ کے سب
ے بڑے مذہبی پیشوا پر گورنر اس وقت تک ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ جب تک اسے
م کے دربار سے حکم نہ ملے یا قیصر روم خود اس معاملے میں مداخلت نہ کرے۔

بہت کچھ سوچ بچار کے بعد گورنر نے اسکندریہ میں ہونے والے فسادات کی
پورٹ تیار کی جس میں لاڈری پادری سائل کے ان اعلانات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا
خالص انتظامی قسم کے تھے اور جنہیں سوائے گورنر کے اور کوئی جاری نہ کر سکتا
ا۔ گورنر نے قیصر روم کو صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر اسکندریہ کو قابو میں رکھنا ہے تو
پادری سائل کی معزولی اور گرفتاری کا شاہی فرمان جاری کیا جائے اور کسی دوسرے
پادری کو سائل کی جگہ پر اس ہدایت کے ساتھ مقرر کیا جائے کہ وہ اپنے اختیارات
سے تجاوز نہ کرے اور اپنے احکامات اور اعلانات صرف مذہبی معاملات تک محدود
لکے۔ گورنر نے رپورٹ اور درخواست اپنے ایک خاص آدمی کے ہاتھ رومۃ الکبریٰ
انہ کی اور اسے سخت تاکید کی کہ وہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے قیصر سے اس کا
اب لے کر اسکندریہ واپس آئے۔

اس زمانہ میں قیصر روم کی عظیم الشان سلطنت آہستہ آہستہ کمزور ہو رہی تھی۔

گئی ہے تو میں وہاں بھی محفوظ نہ رہ سکوں گی۔ آپ اپنی پوری توجہ شہر کی طرف رکھیں
اور امن و امان قائم کرنے کی پوری کوشش کیجئے۔“

”زہرہ جی! تم صرف زہرہ جی نہیں بلکہ ہائی پے شیا بھی ہو۔“ گورنر نے
اسے سمجھایا۔ ”تم اسکندریہ میں علم و فضل کی ایک درخشاں شمع ہو۔ تم اس ملک کی
آن ہو۔ میں تمہیں جنونی مذہب پرستوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یقین کرو
کہ میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ تمہاری قربت سے مجھے سکون حاصل ہو گا بلکہ میں یہ
اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ علم کی اس جنگلاتی شمع کو جہالت کی آندھیوں سے بچاؤں۔“

”مجھے آپ کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں گورنر۔“ ہائی پے شیا نے مغموں لہجہ
اختیار کیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے محل میں اپنی جان محفوظ رکھ سکوں مگر اس
قدم کے اٹھانے سے آپ کے راستے میں اتنے کانٹے بچھ جائیں گے کہ آپ چن بھی
نہ سکیں گے۔ آپ کا وقار خاک میں مل جائے گا اور ممکن ہے کہ اسکندریہ کی گورنری
سے بھی آپ کو ہاتھ دھونا پڑیں۔ ایک اپنی اکیلی جان کے لئے میں آپ کی اتنی قربانی
قبول نہیں کر سکتی۔“

”زہرہ جی! تمہیں میری فکر بالکل نہ کرنا چاہئے۔“ گورنر کے لہجے میں بھی
دکھ چھلک رہا تھا۔ ”میں فرض کی ادائیگی کے لئے ہی اپنا شر چھوڑ کے اتنی دور آیا
ہوں۔ ملک مصر اور خصوصاً اسکندریہ میں امن قائم کرنا میرا اولین فرض ہے۔ اگر
اس فرض کی ادائیگی میں میری جان بھی چلی جائے تو کچھ مذاقتہ نہیں۔“

”گورنر! مجھے مجبور نہ کیجئے۔ آپ سے انکار کرتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی
ہے۔“ زہرہ جی کی آواز بھرا گئی۔ ”میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر آپ کے
دل میں میرے لئے ذرا سی بھی جگہ ہے تو اس مسئلے کو پھر نہ اٹھائیے گا۔ آپ نے
میرے لئے پہلے جو انتظامات کئے ہیں اس احسان کے بوجھ سے میں تمام عمر سرنہ اٹھا
سکوں گی۔“

گورنر نے پھر اپنی بات پر زور نہ دیا۔ وہ کچھ دیر شہر کے حالات پر گفتگو کر کے
واپس آگیا۔

تھے۔

”تمہیں ہر صورت قیصر روم سے جواب لے کے واپس آنا ہے۔“

سلطنت روما کے وزیر سلطنت نے دراصل اسکندریہ کے قاصد کو ٹال دیا تھا۔ رومی سلطنت کے حالات اس وقت دگرگوں ہو رہے تھے چنانچہ جب گورنر اسکندریہ کی درخواست قیصر روم کے سامنے پیش کی گئی تو وہ بجائے اس پر توجہ دینے کے سخت ناراض ہوا۔

”کیا تم نہیں جانتے کہ مشرقی علاقوں میں کیا ہو رہا ہے۔“ قیصر نے وزیر سلطنت کو ڈانٹ دیا۔ ”اسکندریہ ہو یا قسطنطنیہ۔ ہم وہاں کے کسی پادری کو ناراض نہیں کر سکتے۔ گورنر کو حکم دو کہ وہ انتظام نہیں سنبھال سکتا تو واپس آ جائے۔ اس کی جگہ دوسرا گورنر بھیج دو۔“

وزیر سلطنت میں ہمت نہ تھی کہ وہ قیصر روم کو قائل کرتا۔ گورنر نے بڑی تفصیل سے اسکندریہ کی حالت لکھی تھی جس سے یہ ظاہر تھا کہ اسکندریہ کے لارڈ پادری نے خود ہی گورنر کا عہدہ بھی سنبھال لیا ہے۔ وزیر کا خیال تھا کہ قیصر روم ضرور کوئی قدم اٹھائے گا۔ اگر اسکندریہ کے گورنر کی فوری مدد نہیں کی جاسکتی تھی تو قیصر روم کے لئے یہ تو ممکن تھا کہ وہ رومنہ الکبریٰ کے ”پوپ اعظم“ سے کہہ کے اسکندریہ کے لارڈ پادری سائل کو تنبیہ کرا دیتا۔ روم کے پوپ کا حکم تو دونوں فرقوں کے پادری مانتے تھے مگر قیصر کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اس درد سری میں پڑتا۔ وزیر سلطنت بھی زیادہ عقلمند نہ تھا۔ اس نے اسکندریہ کے قاصد کو صاف جواب دینے کے بجائے اسے دو ماہ کے لئے ٹال دیا۔

وزیر سلطنت نے اسکندریہ کے قاصد کو کوئی امید نہ دلائی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ قاصد دو ماہ تک انتظار کرنے کے بعد خود ہی نا امید ہو کر واپس چلا جائے گا مگر جب ایک ہفتے کے بعد اس نے قاصد کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو اسے بتایا گیا کہ اسکندریہ کے قاصد نے سرائے میں غیر معینہ مدت کے لئے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا ہے اور اس نے طے کیا ہے کہ وہ بغیر قیصر کا جواب لئے روم سے واپس نہ جائے گا۔ وزیر کے لئے یہ بات بڑی پریشان کن تھی۔ قیصر نے مدد سے صاف انکار کر

یورپ، افریقہ اور ایشیا میں پھیلی ہوئی سلطنت کے گورنر خود کو خود مختار بادشاہ سمجھنے لگے تھے۔ ان کا روم کے قیصر سے برائے نام ہی علاقہ تھا ورنہ ہر کام وہ اپنی مرضی سے کرتے تھے۔ امانام پرست رومی جب سے عیسائی ہوئے تھے اسی وقت سے وہ ہنر اور نیلے گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ رومیوں کے افریقی اور ایشیائی علاقوں میں آباد عیسائیوں کے عقائد یورپ اور خصوصاً روم کے عیسائیوں سے مختلف تھے اور شاید اسی وجہ سے سلطنت روما کے مشرقی علاقوں میں علیحدگی کی تحریک نے سر ابھارا تھا اگرچہ اس تحریک میں زور پیدا نہ ہوا تھا مگر قیصر روم کو یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جلد یا بدیر سلطنت روما دو حصوں میں بٹ جائے گی۔ اس وجہ سے قیصر روم مشرق کے معاملات میں بڑی نرمی اور رحمتی کا مظاہرہ کرتا تھا۔

ایسے ہی وقت میں گورنر اسکندریہ کا قاصد دار السلطنت روم پہنچا۔ تھیوڈوس کی شہنشاہی کا یہ عالم تھا کہ دوسرے ممالک سے آنے والے سفیروں کو بھی ہفتوں اور مہینوں انتظار کے بعد قیصر کے دیدار کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اس سے زیادہ بدتر حالت ان قاصدوں کی تھی جو ایشیا اور افریقہ کی ریاستوں سے اہم پیغامات لے کر روم پہنچتے تھے۔ ان قاصدوں میں سے مشکل ہی سے کوئی ایسا قاصد ہوتا تھا جسے دو ماہ بعد دربار میں حاضری کا حکم ملتا تھا۔ اسکندریہ کے گورنر کے قاصد کو بھی اسی صورت حال سے دو چار ہونا پڑا۔ ایک تو اسکندریہ سے روم تک کا سفر ہی کافی طویل تھا۔ سمندر کا سفر اس زمانے میں بہت مخدوش تھا اس لئے لوگ خشکی کا راستہ اختیار کرتے جو نسبتاً محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ گورنر کے قاصد نے بڑی تیزی دکھائی مگر خشکی کا راستہ طے کر کے روم پہنچنے میں ایک ماہ لگ گیا۔

قاصد نے وزیر سلطنت سے ملاقات کر کے اسکندریہ کے گورنر کی درخواست اور رپورٹ پیش کی۔ وزیر نے اس کے کاغذات رکھ لئے اور دو ہفتے کے بعد آنے کا حکم دیا۔ اسے شاہی مہمان خانے میں بھی نہیں ٹھہرایا گیا۔ چنانچہ اس غریب نے ایک کارواں سرائے میں قیام کیا۔ پندرہ دن بعد جب قاصد پھر وزیر سے ملا تو اسے بتایا گیا کہ قیصر روم اسے دو ماہ بعد قدم بوسی کی اجازت دیں گے۔ قاصد کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اسی وقت واپس چل پڑے مگر گورنر کے آخری الفاظ اسے اچھی طرح یاد

کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

وزیر سلطنت، قاصد کو اپنے ڈھپ پر لے آیا تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”میرا نیک مشورہ ہے کہ تم جلد از جلد اسکندریہ پہنچو اور گورنر کو میری طرف سے حکم دو کہ وہ اسکندریہ کے لارڈ پادری سے تعلقات بگاڑنے کے بجائے فوراً صلح صفائی کر لے کیونکہ اگر اسکندریہ کے حالات پر گورنر قابو نہ پاسکا تو اسے تبدیل کر دیا جائے گا۔“

”جی وزیر سلطنت مگر لارڈ پادری سائل“ قاصد نے کچھ کہنا چاہا مگر وزیر سلطنت نے اسے روک دیا۔

”گورنر سے صاف الفاظ میں کہہ دینا کہ سلطنت روما کی پالیسی ہے کہ چرچ کے معاملات میں بالکل دخل نہ دیا جائے اور اگر چرچ اور گورنر کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو تو معززین شہر کے مشورے سے اسے فوراً ختم کر دیا جائے۔ حکومت کسی مذہبی پیشوا کے خلاف کوئی قدم اٹھانے پر تیار نہیں۔ خواہ خطا پیشوا ہی کی کیوں نہ ہو۔“

اس سے زیادہ صاف اور کورا جواب کیا ہو سکتا تھا۔ قیصر روم کا وزیر سلطنت وہی شخص تھا جسے قیصر کے مزاج میں پورا دخل حاصل ہو کیونکہ قیصر روم کے تمام فرمان وزیر سلطنت کے ذریعے جاری ہوتے تھے۔ اس طرح وزیر سلطنت کا حکم یا مشورہ قیصر روم کا حکم سمجھا جاتا تھا اور اس سے انکار کرنے کی کسی میں جرات نہ تھی۔

”میں آج ہی اسکندریہ واپس روانہ ہو جاؤں گا۔“ قاصد نے گھبرا کے اعلان کر دیا۔

”معلوم ہوا کہ تم میں کچھ عقل بھی ہے قاصد۔“ وزیر سلطنت نے اطمینان کا مانس لیا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تمہارے گورنر نے پادری سے معاملہ صاف کر لیا تو اس کی گورنری کم از کم میری وزارت تک ضرور برقرار رہے گی اور دربار روما میں اسکندریہ کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہ ہوگی۔“

اسکندریہ کا قاصد ابھی راستے ہی میں تھا کہ اسکندریہ کے حالات ایک دم بگڑ

دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ گورنر تبدیل کر دیا جائے۔ اب اسے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں اسکندریہ کا قاصد کسی اور ذریعے سے قیصر روم تک نہ پہنچ جائے اور اس سے مدد کی درخواست کرے۔ اس صورت میں وزیر سلطنت کی شامت آجانا لازمی تھی۔ اس نے فوراً اپنے بچاؤ کی تدبیر کی اور اسکندریہ کے قاصد کو بلا بھیجا

وزیر سلطنت نے بڑی رکھائی سے اسے مخاطب کیا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے کارواں سرائے میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے؟“

قاصد نے حیرت سے وزیر سلطنت کو دیکھا۔ ”وزیر محترم! آپ نے مجھے دو ماہ انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔ مجھے شاہی مہمان خانے میں بھی جگہ نہیں دی گئی۔ میں نے مجبور ہو کے سرائے میں قیام کیا ہے۔“

”مگر کیوں۔ تم سرائے میں کب تک ٹھہرو گے؟“ وزیر کے لہجے میں بڑی غیرت تھی۔

قاصد نے وزیر سلطنت کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے صاف الفاظ میں کہا۔ ”محترم وزیر سلطنت! مجھے اسکندریہ کے گورنر نے حکم دیا ہے کہ میں ان کی درخواست کا جواب لے کر اسکندریہ واپس جاؤں۔ میں اس وقت تک سرائے میں مقیم رہوں گا جب تک شہنشاہ روم میرے گورنر کی درخواست پر غور نہیں فرماتے۔“

”قاصد یا تو تم بہت نیک ہو یا پھر انتہائی بے وقوف۔“ وزیر نے سخت لہجہ اختیار کیا۔ ”تمہیں رومی سلطنت کے حالات کا قطعی علم نہیں۔ سلطنت کے مشرقی علاقوں میں جو تحریک چل رہی ہے تم اس سے بھی ناواقف ہو۔ میں تمہیں آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اگر تم نے قیصر سے مدد کی درخواست کی یا اسکندریہ کے پادری کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا تو تمہارا گورنر اپنے عہدے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اسکندریہ کی گورنری کے لئے کتنے ہی رومی سردار منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ تمہارے گورنر کو معزول کر کے کسی اور کو اس کی جگہ لگا دیا جائے گا۔“

قاصد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کے روم آنے کا مقصد اسکندریہ کے گورنر کے لئے زیادہ اختیارات اور کمک حاصل کرنا تھا مگر یہاں تو مسئلہ ہی دوسرا ہو گیا تھا۔ اس نے سرجھکا کے کہا۔ ”وزیر محترم! پھر آپ ہی مجھے حکم دیجئے

گئے۔ لارڈ پادری کو کسی طرح علم ہو گیا تھا کہ گورنر نے دربار روم میں اس کے خلاف رپورٹ بھیجی ہے۔ یہ سن کے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دربار روم کے خلاف جو تحریک در پردہ چل رہی تھی لارڈ پادری اس کا ایک سرگرم رکن تھا۔ اس نے اپنے فریے اور گردہ کے تمام پادریوں کو چرچ میں جمع کیا۔ لارڈ پادری سائزل کا اثر اسکندریہ کے باہر بھی تھا۔ اس لئے اس مجلس میں اسکندریہ کے باہر کے پادریوں نے بھی شرکت کی۔ سائزل بڑا زبردست خطیب اور مقرر تھا۔ اس نے پادریوں کو اس قدر جوش دلایا کہ وہ سب دربار روم کے مخالف ہو گئے اور انہوں نے سائزل پر زور دیا کہ وہ سلطنت روما کے خلاف بغاوت کر دے اور اسکندریہ میں ایک آزاد حکومت قائم کر لے۔ مگر سائزل بے وقوف نہ تھا۔ رومی دستے اسکندریہ میں موجود تھے۔ اگر وہ کھلی بغاوت کرتا تو بڑا قتل و خون ہوتا اور ممکن تھا کہ سائزل بھی مارا جاتا۔

سائزل نے فوراً "پینترا بدلا۔ اس نے بظاہر اس خیال کی تائید کی مگر پادریوں کو سمجھایا کہ رومی دستے رومی گورنر کے ماتحت ہیں اور رومی گورنر کی موجودگی میں بغاوت کرنا خود اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ اس نے اپنی طویل تقریر کے آخر میں کہا۔ "اسکندریہ میں ایک آزاد حکومت قائم کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر اسی وقت ہو سکتا ہے جب اسکندریہ کے گورنر کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ گورنر کو پہلے نرمی سے سمجھایا جائے کہ وہ یہودیوں کی طرفداری چھوڑ دے اور اگر وہ باز نہ آئے تو پھر گورنر کو قتل کر دیا جائے۔"

شریک مجلس پادری جوش میں اس قدر بھرے ہوئے تھے کہ انہوں نے سائزل کے حق میں نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ اور سائزل پر زور دیا کہ وہ گورنر کو کوئی مہلت نہ دے اور نہ سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرے بلکہ پادریوں کو حکم دے کہ وہ گورنر کے محل پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیں

"میرے ساتھیو! میرے دوستو۔" سائزل نے انہیں سمجھایا۔ "ہمارا مقصد گورنر کو راستے سے ہٹانا ہے لیکن سانپ کے بل میں انگلی ڈالنا کوئی عقلمندی نہیں۔ اگر ہم نے گورنر کے محل پر حملہ کیا تو ہمیں سخت مدافعت کا سامنا ہو گا۔ ہمارے ہمت سے ساتھیوں کو شہادت کا درجہ حاصل ہو گا لیکن میں چاہتا ہوں کہ سانپ مر جائے اور

اٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ گورنر کو قتل کرنا ہے تو اس کے محل پر حملہ کرنے کے بجائے سے کسی ایسی جگہ کیوں نہ گھیرا جائے جہاں اسے کے ساتھ محافظ بھی کم ہوں اور اسے مزید مدد نہ مل سکے۔ اس طرح ہم اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں گے اور ہمارا نقصان بھی کم ہو گا۔"

پادری تو سائزل کے اندھے مقلد تھے۔ انہوں نے فوراً اس کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ طے ہوا کہ گورنر کے محل کے گرد جاسوسوں کا جال بچھا دیا جائے جو اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں اور جس وقت گورنر کم تعداد محافظوں کے ساتھ شہر کے اندر آئے تو اس کی اطلاع لارڈ پادری کو پہنچائی جائے۔ لارڈ پادری نے پچاس پادریوں کا ایک دستہ بنایا تھا۔ یہ دستہ پوری طرح مسلح تھا۔ اس دستے کے ہر پادری کو لارڈ پادری نے جنت کی بشارت دے دی تھی۔

اس طرف تو لارڈ پادری نے اسکندریہ کے گورنر کے قتل کا یہ منصوبہ بنایا اس طرف گورنر کو اک دوسری ہی تدبیر سوچھی۔ گورنر نے سوچا کہ قیصر روم کا جواب آنے میں کئی ماہ لگیں گے اس لئے اسکندریہ میں شورش کو دبانے کے لئے وہ لارڈ پادری سے وقتی مصالحت اور دوستی کی تدبیر کرے۔ اس کے لئے اس نے اعلان کیا کہ وہ لارڈ پادری سے برابری کے اصول پر گفتگو کرنا چاہتا ہے تاکہ اسکندریہ کے حالات کا کوئی سیاسی حل نکل سکے۔ اس سلسلے میں اس نے خود پہل کی اور لارڈ پادری کو پیغام بھیجا کہ وہ خود بڑے گرجا میں گفتگو کے لئے آنا چاہتا ہے۔ لارڈ پادری اور زیادہ پھول گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گورنر نے اسے کم از کم برابری کا درجہ تو دے دیا تھا۔ سائزل نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد گورنر کا پیغام قبول کر لیا۔ قاصد جواب لے کر واپس گیا تو بطریق نے لارڈ پادری کو مشورہ دیا۔

"خداوند یسوع مسیح نے آپ پر مہربانی کی ہے۔ شکار خود ہی جال کی طرف آ رہا ہے آپ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے گا۔"

لارڈ پادری نے بطریق کو حیران نظروں سے دیکھا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو بطریق؟" بطریق زور سے ہنسا۔ "لارڈ پادری آپ مجھ سے زیادہ عقلمند ہیں۔ گورنر کو راستے سے ہٹانے کا اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو گا۔ وہ آپ کی ملاقات کو آ رہا

ہے فوجی دستے تو اس کے ساتھ ہوں گے نہیں۔ بس آپ کا ایک اشارہ کافی ہو گا پھر اسکندریہ کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہو گی۔ رومی دستے بے بس ہو کے رہ جائیں گے۔“

”تم بے وقوف ہو بطرق؟“ لارڈ پادری نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم گورنر کو عبادت خانے میں بلا کر قتل کرنا چاہتے ہو۔ میرے منہ پر سیاہی ملو گے؟“

”آپ خواہناواراض ہو رہے ہیں۔“ بطرق نے منہ بنایا۔ ”آپ کو میرا شکر گزار ہونا چاہئے۔ کیا پیاری ترکیب بتائی ہے میں نے۔ ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے“

”رہنے دو اپنی ترکیب اپنے پاس۔ خردار گورنر کے ساتھ گرجا میں کوئی حرکت ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“

لارڈ پادری کی مخالفت کرنا بطرق کے اختیار میں نہ تھا۔ سائزل کی تند و تیز باتیں سن کے خاموشی سے چلا گیا مگر وہ اس سہرے موقعہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہتا تھا۔ اس نے پادریوں کے اس گروہ سے رابطہ قائم کیا۔ جنہیں سائزل نے گورنر کے قتل پر مامور کیا تھا۔ دو دن اور دو راتیں بطرق اور پادریوں میں گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا تیسرے دن گورنر کو گرجا میں سائزل سے ملاقات کے لئے آنا تھا۔ سائزل کو بھی کسی طرح بھٹک پڑ گئی تھی کہ بطرق نے جنونی پادریوں سے رابطہ قائم کیا ہے۔ اس نے تمام پادریوں کو گرجے میں طلب کر لیا۔

”میرے معزز ساتھیو! آپ لوگ جو قدم اٹھائیں گے اس میں میں آپ کا برابر کا شریک ہوں۔ یہ بات میں نے پہلے بھی کہی تھی اور اس وقت بھی آپ کے سامنے اس ارادے کی تجدید کر رہا ہوں۔ اس تجدید عہد کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کل اسکندریہ کا گورنر اپنا غرور و گھمنڈ توڑ کے خود ہی مجھ سے ملاقات کے لئے آ رہا ہے۔ کل گورنر کی حیثیت گرجا کے ایک معزز مہمان کی ہو گی۔ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ گرجا کے اندر کوئی ایسی حرکت ہو جو ہماری بدنامی کا باعث بنے اور یہاں کی مقدس زمین انسانی خون سے رنگین ہو۔“

ایک پادری نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”لارڈ پادری! آپ کو یہ کہنے کی ضرورت ہی

نہیں۔ کیا ہم گرجا کے تقدس کو نہیں سمجھتے۔“

لارڈ پادری خوش ہو گیا۔ ”میں آپ لوگوں کا شکر گزار ہوں۔ مجھے امید ہے کہ

آپ گرجا میں کسی قسم کے تشدد کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔“

ایک دوسرے پادری نے یقین دلایا۔ ”لارڈ پادری۔ آپ بالکل مطمئن رہئے گرجا کی پاکیزگی ہمیں اتنی ہی عزیز ہے جتنی آپ کو۔ ہم آپ کے ساتھ گورنر کا استقبال کریں گے۔“

دوسرے دن جنونی پادریوں نے واقعی اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ لارڈ پادری کے سچے دوست اور ساتھی ہیں۔ انہوں نے لارڈ پادری کے ساتھ گرجا کے بڑے دروازے پر گورنر کا استقبال کیا۔ گورنر مصالحت کے مشن پر آیا تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ صرف پانچ سوار تھا۔ اظہار دوستی کے طور پر وہ اپنے ساتھ قیدی سائزل کو بھی لایا تھا جو گھوڑے پر سوار گورنر کے پہلو میں چل رہا تھا۔

سائزل نے گورنر کا پر جوش استقبال کیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے درازی عمر کی دعا بھی دی۔ اس کی اس دعا میں مذہبی جنونی اور گورنر کے خون سے پیاسے پادری بھی پورے خلوص سے شامل تھے۔ گورنر نے اپنے پانچوں محافظوں کو باہر ہی چھوڑ دیا کیونکہ گرجا کے اندر کسی مسلح فوجی کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ گورنر نے اپنی تلوار اور خنجر بھی گرجا کے پیریدار کے حوالے کر دیا۔

”لارڈ پادری!“ گورنر نے مسکرا کے کہا۔ ”یہ شخص کھیل کے میدان میں گرفتار ہوا تھا۔ یہ پہلا اور آخری شخص ہے جو ہماری قید میں تھا۔ اسے قید کے دوران جو تکلیف اور زحمت ہوئی اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔“

”میں گورنر کا ذاتی حیثیت سے شکر گزار ہوں۔“ سائزل نے بھی پورے خلوص کا اظہار کیا۔

لارڈ پادری اور گورنر میں بڑے دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں گفتگو ہوئی۔ اگر دونوں طرف مصالحت کی خواہش ہوئی تو کچھ لو اور کچھ دو پر معاملہ طے ہو جاتا ہے۔ گورنر وقت گزاری کے لئے سائزل کی ہر بات تسلیم کرتا چلا گیا۔ سائزل نے خود بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ گورنر کے سامنے کوئی شرط نہیں رکھے گا جس سے بحث کے

ہوئے پادری جوش و خروش سے نعرے لگا رہے تھے۔ دونوں فرقوں کے عیسائی ان نعروں میں شامل تھے۔ جلوس آگے بڑھتا گیا اور اسی اعتبار سے مجمع میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اتنے بڑے مجمع اور جلوس میں گورنر کے پانچ سوار، گورنر کے گرد اپنا گھیرا قائم نہ کر سکے اور مجبور ہو کر جلوس کے کنارے کنارے چلنے لگے۔

کہتے ہیں کہ برا وقت کہہ کے نہیں آتا اور جب قسمت بدلتی ہے تو اپنے بھی پرانے ہو جاتے ہیں۔ سایہ تک ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ گورنر کا جلوس نکالنے والے اس کے حق میں نعرے لگانے والے پادریوں کے ارادے کچھ اور تھے۔ انہوں نے لارڈ پادری سائرل کی بات مان لی اور گر جابیں کوئی حرکت نہ کی تھی مگر جس وقت گورنر کا جلوس اسکندریہ کے بڑے بازار میں پہنچا تو پادریوں نے اپنے لبادوں میں چھپے ہوئے خنجر نکال لئے اور گورنر پر اچانک حملہ کر دیا۔ گورنر کو اس کا امکان بھی نہ تھا۔ وہ گھوڑے پر اطمینان سے بیٹھا تھا۔ چونکہ گورنر گھوڑے پر تھا اس لئے خنجر کے وار پہلے اس کے گھوڑے پر پڑے۔ گھوڑا تڑپ کے اچھلا۔ گورنر ایک اچھا شہسوار تھا اور اسے ایک ہی نظر میں حالات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کے گھوڑے پر چاروں طرف سے پے بہ پے وار ہو رہے تھے اور گھوڑا بے قابو ہو گیا۔ گورنر نے محسوس کیا کہ اگر وہ زیادہ دیر تک گھوڑے پر سوار رہا تو زخمی گھوڑا یقیناً اسے گرا دے گا۔ اس لئے وہ گھوڑے سے جست لگا کر کود گیا اور فوراً تلوار بلند کر لی۔ گورنر چاروں طرف سے گھر گیا تھا مگر اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ پادری بچ بچ کے حملہ کر رہے تھے۔ گورنر صرف اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔

جلوس کے درمیان یہ خونی ڈرامہ شروع ہو چکا تھا مگر دور کے لوگوں کو اس کی کوئی خبر نہ تھی اور وہاں سے اب بھی نعرے بلند ہو رہے تھے مگر جب گورنر کا بے سوار گھوڑا مجمع کو پھلانگتا ہوا بھاگا تو لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ گورنر کے محافظوں کو بھی ہوش آ گیا اور گھوڑا دوڑا کے گورنر کے پاس پہنچ گئے۔ گورنر کی طرفدار جماعت بھی گورنر کے گرد جمع ہو گئی اور خالی ہاتھوں سے خنجر بدست پادریوں کو روکنے لگی۔ پھر بھی اس دارو گیر میں گورنر کافی زخمی ہو گیا اور اگر اس کے مسلح سوار مدد کو نہ پہنچتے تو شاید اس کا خاتمہ ہو جاتا۔

دروازے کھلیں اور جھگڑا پیدا ہو۔ اسے اپنے جنونی پادریوں پر پورا اعتماد تھا جن کے سپرد اس نے گورنر کو قتل کرنے کا کام کیا تھا۔ گورنر کے خاتمے کے بعد تو طاقت خود بخود اس کے ہاتھ میں آ جائے گی۔ اس وجہ سے اس نے بھی نہایت نرم رویہ اختیار کیا۔ زہرہ جبین ہائی پے شیا جو جھگڑے کی اصل وجہ تھی۔ سائرل نے اس کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے یہودیوں کو کچھ مراعات دینے کا وعدہ کیا

مگر جاکے باہر لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے تھے۔ ان میں عیسائیوں کے دونوں مخالف فرقے بھی تھے۔ گورنر کے ہم خیال عیسائیوں کو سخت غصہ آ رہا تھا کہ گورنر بغیر فوجی دستوں کے گر جاکوں آیا اور اگر آیا تھا تو اپنے محافظوں کو ساتھ لے کے اندر کیوں نہ گیا۔ وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہے تھے کہ کہیں سائرل دغا بازی نہ کرے اور گورنر کو اندر ہی قتل نہ کرا دے۔ مگر انہیں اس وقت بڑا اطمینان ہوا جب لارڈ پادری سائرل اور گورنر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مسکراتے ہوئے باہر آئے۔ ان کے ساتھ سینکڑوں پادری چل رہے تھے۔ ان میں وہ پچاس پادری بھی شامل تھے جو گورنر کو قتل کرنے کا بیڑا اٹھا چکے تھے۔ سائرل بہت خوش تھا کہ جنونی پادریوں نے کوئی ناشائستہ حرکت نہیں کی اور گفتگو کے دوران پشیداروں کی طرح اس کمرے کی حفاظت کرتے رہے جہاں گورنر اور سائرل میں گفتگو ہو رہی تھی۔

لارڈ پادری نے معاہدہ طے ہو جانے کا اعلان کیا۔ عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ گورنر کو بڑی عزت سے سوار کیا گیا۔ گورنر کے محافظوں نے اسے اپنے پہرے میں لے لیا۔ اس موقع پر ایک پادری نے آگے بڑھ کے گورنر سے درخواست کی۔ ”اے اسکندریہ کے حاکم! اس وقت ہمارے دل خوشی کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس خوشی کے اظہار کے لئے ہمیں اجازت دی جائے کہ ہم آپ کو شہر کی بڑی بڑی شاہراہوں پر جلوس کی شکل میں لے جائیں۔ کیا آپ ہمیں اس کی اجازت دیں گے۔“

گورنر نے اس درخواست کو بخوشی قبول کر لیا۔ گورنر کے ہم خیال عیسائیوں نے بھی اسے بڑا اعزاز سمجھا اور خوشی کے نعرے لگانا شروع کر دیے اور پھر گورنر اپنے میزبان سائرل سے رخصت ہوا تو اس کے جلوس میں ایک جم غفیر تھا۔ گورنر کو گھیرے

لئے آمادہ تھی۔ اس نے فوراً ”مردانے کپڑے پہنے اور سوار کی طرح مسلح ہو کر گھوڑے پر بیٹھی۔ زہرہ جبین نے سب کو روک دیا کہ اس کے ساتھ کوئی اور سوار نہ جائے ورنہ لوگوں کو خواخوہ شک ہو گا۔ محافظوں نے بڑے دھکے کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

ایک روایت کے مطابق کسی عیسائی عورت نے بطرق سے مخبری کر دی کہ ہائی پے شیا رومی سوار کے بھیس میں گورنر کے محل کی طرف جا رہی ہے۔ یہ روایت حقیقت سے قریب معلوم ہوتی ہے کیونکہ بغیر کسی مخبری کے کسی عورت کو مردانے لباس میں مشکل سے ہی پہچانا جاسکتا ہے۔ پس وہی صورت پیش آئی جس کا ذکر تھا۔ عین اس مقام پر جہاں عیسائی پادری کو سولی پر لٹکایا گیا تھا۔ پادری بطرق نے اپنے دو سو (200) جوشیلے ساتھیوں کے ساتھ ہائی پے شیا کو گھیر لیا۔ وہ غریب تلوار بھی نہ نکال سکی اور اس پر ڈنڈے پڑنا شروع ہو گئے۔ گھوڑے سے کھینچ کر اس کے کپڑے پھاڑ دیئے گئے اور بطرق اسی طرح مارتا پھینتا اسے حضرت مریم کے گرجا میں لے گیا۔ رومی سواڑوں نے ہائی پے شیا کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن مخالف عیسائیوں کا مجمع ہزاروں تک پہنچ گیا تھا اور اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

لارڈ پادری گرجا میں موجود تھا۔ اس کی موجودگی میں بطرق نے اپنی قسم پوری کی اور ہائی پے شیا کو حضرت مریم کے بت کے سامنے مار مار کر ختم کر دیا۔ تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ میں علوم و فنون کی اس ماہر زہرہ جبین ہائی پے شیا کی المناک موت کا حال دائرۃ المعارف کے حوالے سے اس طرح لکھا گیا ہے مگر دوسرے حوالے اس نازک اندام زہرہ جبین کی موت کا حال اس سے بھی زیادہ دردناک بتاتے ہیں۔ ان حوالوں کے مطابق ہائی پے شیا جسے مصری بپاتیا زہرہ جبین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ تو پہلے بطرق نے مریم کے بت کے سامنے ڈنڈوں سے مار کر ختم کیا پھر حسن کی اس دیوی کے جسم کے ٹکڑے کر کے اسے نذر آتش کیا اور اس کی راکھ ایک بوتل میں بھری کے اسکندریہ کے گورنر کے پاس تحفے کے طور پر بھیجی۔